تاریخِ تحریکِ آزادیِ ہند

مصنف

ڈاکٹر تاراچند

مترجم

قاضی محمد عدیل عباسی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل

حکومت ہند

ویسٹ بلاک-I، آر-کے-پورم، نئی دہلی-110066

تاریخِ تحریکِ آزادیِ ہند

تاریخِ تحریکِ آزادیِ ہند

جلدِ اوّل

مصنّف
ڈاکٹر تارا چند

مترجم
قاضی محمد عدیل عباسی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل
حکومت ہند
ویسٹ بلاک۔I، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

پیش لفظ

"ابتدا میں لفظ تھا۔ اور لفظ ہی خدا ہے"

پہلے جمادات تھے۔ ان میں نمو پیدا ہوئی تو نباتات آئے۔ نباتات میں جبلت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

انسان اور حیوان میں صرف نطق اور شعور کا فرق ہے۔ یہ شعور ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر ٹھہر جائے تو پھر ذہنی ترقی، روحانی ترقی اور انسان کی ترقی رک جائے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے انسان کو ہر بات یاد رکھنا پڑتی تھی، علم سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو پہنچتا تھا، بہت سا حصہ ضائع ہو جاتا تھا۔ تحریر سے لفظ اور علم کی عمر میں اضافہ ہوا۔ زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے اور انھوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔

لفظ حقیقت اور صداقت کے اظہار کے لیے تھا، اس لیے مقدس تھا۔ لکھے ہوئے لفظ کی، اور اس کی وجہ سے قلم اور کاغذ کی تقدیس ہوئی۔ بولا ہوا لفظ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہوا تو علم و دانش کے خزانے محفوظ ہو گئے۔ جو کچھ نہ لکھا جا سکا، وہ بالآخر ضائع ہو گیا۔

پہلے کتابیں ہاتھ سے نقل کی جاتی تھیں اور علم سے صرف کچھ لوگوں کے ذہن ہی سیراب ہوتے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کا سفر کرنا پڑتا تھا، جہاں کتب خانے ہوں اور ان کا درس دینے والے عالم ہوں۔ چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد علم کے پھیلاؤ میں وسعت آئی کیونکہ وہ کتابیں جو نادر تھیں اور وہ کتابیں جو مفید تھیں آسانی سے فراہم ہوئیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں، کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ نہ صرف وسیع ہو بلکہ سارے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور نصابی اور غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبعی علوم کی کتابوں کی اہمیت ادبی کتابوں سے کم نہیں، کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، زندگی سماج سے جڑی ہوئی ہے اور سماجی ارتقاء اور ذہنِ انسانی کی نشو و نما طبعی، انسانی علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں۔

اب تک بیورو نے اور اب تشکیل کے بعد قومی اردو کونسل نے مختلف علوم اور فنون کی کتابیں شائع کی ہیں اور ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے یہ اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔ میں ماہرین سے یہ گذارش بھی کروں گا کہ اگر کوئی بات ان کو نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں نظر ثانی کے وقت خامی دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائریکٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

فہرست

مقدمہ ——— ہمایوں کبیر	9
دیباچہ ——— مصنف	15
تعارف (خیالِ ماضی)	19
یورپ میں نیشنلزم کا ارتقاء	29
پہلا باب : سلطنت مغلیہ کا زوال اور خاتمہ	74
دوسرا باب : اٹھارویں صدی میں سماجی نظام	103
تیسرا باب : ہندوستان کا سیاسی نظام	172
چوتھا باب : اٹھارویں صدی میں (اقتصادی حالات)	221
پانچواں باب : کلچرل زندگی ——— تعلیم، فن اور ادب	249
چھٹا باب : ہندوستان پر برطانیہ کا تسلط	280
ساتواں باب : برطانوی نظم ونسق کا نشوونما 1793 تک	336
آٹھواں باب : 1793 سے 1857 تک برطانوی نظم ونسق کا نشوونما	338
نواں باب : برطانوی حکومت کے سماجی واقتصادی نتائج ——— دیہی معاشیات کا انتشار	423
دسواں باب : برطانوی حکومت کے سماجی واقتصادی نتائج ——— تجارت وصنعت کا زوال	450

مقدمہ

انسانی تاریخ کی پوری سرگذشت اس بات کی گواہ ہے کہ ہمیشہ علم کے نتیجے میں طاقت اور شرف ہی ظہور میں آئے ہیں۔ یہ انسان کے علم حاصل کرنے کی استعداد ہی تھی جس نے اسے تمام جان دار ہستیوں میں برتری عطا کی۔ انسانوں میں فضیلت ان لوگوں کو ملی جن میں زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے اور اسے استعمال کرنے کی صلاحیت تھی۔ قدیم زمانہ میں مذہبی پیشواؤں اور ساحروں نے جو رسوخ حاصل کیا وہ ایک بہتر علم ہی کے ذریعہ کیا تھا جسے وہ ایک بیش بہا راز کی طرح محفوظ رکھتے تھے۔ ان لوگوں کو اندازہ نہ تھا کہ علم کو چھپانے یا اسے محدود کرنے کی کوشش خود شکستگی کے مترادف ہے۔ بالآخر یہ بات نہ صرف علم کے بلکہ طاقت اور شرف کے بھی زیاں پر آکر پڑتی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے علم کو منتخب گروہوں اور مشترک الاغراض ٹولیوں میں محدود کر کے کیسی کیسی مصیبتیں اٹھائیں۔

مادی دولت کے سراسر برعکس علم کو صرف پھیلنے اور بانٹنے سے اضافہ ہوتا ہے۔ اورنگ زیب بہت سے پہلوؤں سے ایک انتہائی تنگ نظریہ رکھتا تھا اور اس نے الگ تھلگ رہنے کی بنیاد پر اپنے اختیار کو قائم رکھنا چاہا۔ لیکن وہ بھی ہندوستان کے ان چند شہنشاہوں میں تھا جن کو طاقت کو برقرار رکھنے کے لئے علم کو ایک اوزار بنانے کی اہمیت کا پورا پورا احساس تھا۔ جب ایک عالم نے تعلیم کی بنیاد پر اس سے مخصوص مراعات کی

درخواست کی تو اورنگ زیب نے اس مطالبہ کو نامنظور کردیا اور کہا کہ "اگر تم نے مجھ کو اس فلسفہ کی تعلیم دی ہوتی جو دماغ کو جو ہر عقل سے مطابق کرتا ہے تاآنکہ انتہائی قوی دلائل سے کم پر وہ مطمئن نہ ہوسکے۔ اگر تم نے مجھ کو انسان کی فطرت سے واقف کرایا ہوتا اور میری عادت بنائی ہوتی کہ میں بنیادی اصول پر نظر رکھتا اور تم نے مجھ کو اس کائنات اور اس کے اجزاء کی ترکیب اور ان کی حرکات کا ایک ارفع اور جامع تصور دیا ہوتا تو میں تمہارا اس سے زیادہ ممنون ہوتا جتنا کہ سکندر اعظم ارسطو کا تھا۔" اورنگ زیب نے یہ بھی واضح طور پر کہا کہ "ایک حکمران کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کرۂ ارض کی ہر قوم کی ممتاز خصوصیات، اس کے وسائل، طاقت، اس کے قواعد جنگ، اس کے طور طریقے، مذہب اور طرز حکومت سے واقف ہو۔" اس کا یہ بھی احساس تھا کہ " ہر بادشاہ کی تربیت کا ایک ضروری جزو یہ ہے کہ وہ تاریخ کے باضابطہ اور بالترتیب مطالعہ سے حکومتوں کے آغاز، ان کی ترقی اور زوال سے اور ان واقعات اور حادثات یا غلطیوں سے، جن کی وجہ سے بڑی تبدیلیاں واقع ہوئیں اور عظیم انقلابات پیش آئے، پوری طرح واقف ہو۔" یہاں یہ قیاس کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہندوستان کی تاریخ کی راہ کیا ہوگئی ہوتی اگر اورنگ زیب کو اس کے شک و شبہے سے بالاتر دماغی طاقتوں کے ساتھ اس قسم کی تربیت بھی دی گئی ہوتی۔ اس نے سیکھا ہوتا کہ قوموں کی ترقی اور خوش حالی کا انحصار بلا لحاظ، مذہب، نسل، سیاسی خیالات یا سماجی حیثیت تمام شہریوں کے ساتھ مساویانہ انصاف پر ہے۔ بہرحال اس کے اس اصول کو تسلیم کرنے سے چارہ نہیں کہ جن لوگوں پر انسانی معاملات کے نظم و نسق کی ذمہ داری ہے ان کو لازمی طور پر ان بنیادی اصولوں کا علم ہونا چاہئے جو حکومتوں کے عروج و زوال کی بنا ہیں، نیز ان طریقوں کا بھی جن میں انسان مختلف قسم کے برتاؤ پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس قسم کے تاریخی مطالعہ کی اہمیت بڑھ گئی ہے، حتیٰ کہ خود انسان کی بقا کے لئے وہ ایک شرط بن گیا ہے۔ دنیا کی موجودہ جمہوری طرز حکومت میں (اور یہ بڑی حد تک ان ممالک کے بارے میں بھی صحیح ہے جہاں کوئی باضابطہ جمہوریت نہیں ہے) ہر فرد پر ملک کی پالیسیوں اور پروگرام کی ذمہ داری ہے۔ اس کے علاوہ سائنس اور ٹکنالوجی (تاریخ حرفت اقوام) کے ذریعہ مختلف ممالک کی دولت کی باہمی وابستگی نے یہ بھی قطعی کردیا ہے کہ افراد کی ذمہ داری اپنے ملک کے حدود کے باہر تک وسعت رکھتی ہے۔

یہاں تک کہ ساری دنیا کو اپنے اندر سمو لیتی ہے۔ اس لئے ایک ملک میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے بالواسطہ اثرات کا ردعمل تمام دوسرے ملکوں پر ہوتا ہے۔ ہر شہری اپنی انفرادی حیثیت میں پہلے زمانوں کے بادشاہوں اور شہزادوں سے زیادہ بنی نوع انسان کے انجام سے سروکار رکھتا ہے۔ اورنگ زیب نے یہ سمجھ لیا تھا کہ شہزادوں کے لئے تاریخ کی تعلیم ضروری ہے آج اس طرح کی تعلیم ہندوستان جیسے جمہوری ری پبلک کے تمام شہریوں کے لئے لازمی ہے۔

ہندوستان کی تقریباً دو صدی تک ایک بیرونی طاقت کی غلامی نے ہندوستانیوں کو قوموں کے زوال اور تباہی کے اسباب کے بارے میں حساس بنا دیا تھا جب قدم بہ قدم انھوں نے اپنی آزادی پھر حاصل کر لی تو انھوں نے اس سبق کو دل میں محفوظ کر لیا تاکہ اس سے قبل کی دردناک کہانی کا پھر اعادہ نہ ہو۔ علاوہ ازیں جس طرح ہندوستان نے اپنی آزادی کھوئی اور جس طرح اس نے اسے پھر حاصل کیا، ان دونوں کے بعض انوکھے خدوخال تھے جنھوں نے اس کی تاریخ کو تمام دنیا کے لئے ایک عظیم خصوصیت عطا کر دی ہے۔ بالخصوص مہاتما گاندھی نے اہنسا کے ذریعہ مقابلہ کے طریقہ کار کو جو فروغ دیا وہ انسانی تعلقات کے ایک پیچیدہ مسئلہ کا حل پیش کرتا ہے۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد انڈین ہسٹاریکل ریکارڈس کمیشن کی سب سے پہلی میٹنگ میں یہ تجویز منظور ہوئی کہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے مختلف ادوار کی ایک مستند اور مکمل تاریخ مرتب کی جائے۔ اس سفارش پر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اپنے فوری تاثر کا اظہار کرتے ہوئے حکم دیا کہ اس پر عمل درآمد کرنے کے لئے فوراً کارروائی کی جائے۔

کچھ لوگ ایسے تھے جن کا خیال تھا کہ یہ کام سرکاری ذرائع سے کیا جائے۔ مگر بہت جلد یہ محسوس کر لیا گیا کہ اس قسم کی ایجنسیاں اس غرض کے لئے غالباً موزوں نہ ثابت ہوں۔ ایک بات تو یہ ہے کہ سرکاری تنظیم لازمی طور پر اس وقت کی حکومت کے افکار و آراء کی عکاسی کرنے پر مجبور ہے حالانکہ قومی مفاد کے پیش نظر اور تاریخ کی حقیقت پسندی کا تقاضہ ہے کہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی تاریخ معروضی (واقعاتی) اور غیر جانبدار ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس طرح کی تاریخ کا کچا مواد تمام ملک میں پھیلا ہوا ہے اور اکثر ان لوگوں کے پاس ہے جنھوں نے جنگ آزادی میں عملی حصہ لیا تھا اس لئے یہ امر مشتبہ معلوم ہوا کہ کوئی سرکاری ایجنسی اپنے علاقی

طریقوں کی موجودگی میں اپنے میلان طبع اور مخصوص مزاج سے مصالحت کرکے معلومات حاصل کرسکے
گی اس لئے قومی سطح کی کوشش ضروری تھی تاکہ عظیم مقدار میں جو مواد حکومت اور نجی ذخائر میں اور
ان مردوں اور عورتوں کے پاس جمع ہے جنھوں نے جدوجہد کے آخری دور میں حصہ لیا تھا ان سب
کو اکٹھا کیا جائے۔

پہلا قدم یہ اُٹھایا گیا کہ ممتاز اہل علم پر مشتمل ایک ماہرفن کمیٹی ڈاکٹر تاراچند کی صدارت میں
جو اس وقت گورنمنٹ آف انڈیا کے تعلیمی مشیر تھے مقرر کی گئی۔ اس کمیٹی کو جو کام سپرد ہوئے
تھے ان میں اہم ترین یہ تھا کہ مواد جمع کرنے کے لئے وسائل و ذرائع منظم کرے اور تاریخ کی
تیاری کے لئے دوسری عملی کارروائیاں کرنے کی تجاویز پیش کرے۔ کمیٹی نے یہ سفارش کی کہ
علاوہ ایک مرکزی نظام کے جو مورخین اور سیاسی کارکنوں پر مشتمل ہو اسی طرح کے لوگوں پر مشتمل
علاقائی کمیٹیاں بھی ملک کے مختلف حصوں میں بنائی جائیں۔ چنانچہ ایڈیٹروں کا ایک مرکزی بورڈ
بنایا گیا جس کے ڈاکٹر سید محمود چیرمین اور شری این گھوش سیکریٹری تھے۔ جنوری 1953ء
میں بورڈ کی پہلی میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے مولانا آزاد نے تحریکِ آزادی کی تاریخ کو واقعیت
پسندانہ اور غیر جانب دارانہ انداز پر مرتب کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ آزادی حاصل ہوجانے
کے بعد یہ ممکن بھی تھا اور ضروری بھی کہ جذبات سے پرہیز کیا جائے۔ کیوں کہ جذباتیت فیصلوں کو
مسخ کردیتی ہے۔ اور اس قسم کے فیصلوں پر عمل کو منحصر کرنا قومی مفاد کے خلاف ہوگا۔ انھوں نے
اس جانب بھی اشارہ کیا کہ اگرچہ بنیادی طور پر یہ سیاسی جدوجہد کی تاریخ ہوگی لیکن دوسرے
میدانوں خلاً ادب، تعلیم، سماجی اصلاح اور سائنس و صنعتی ترقی میں قومی بیداری کو بھی یہ کافی
اہمیت دے گی۔

بورڈ نے تین سال تک کام کیا اور علاقائی کمیٹیوں کی مدد سے ایک بڑی مقدار میں ہندوستان
کے اندر قومی بیداری کے تقریباً ہر پہلو پر ضخیم مواد اکٹھا کرلیا۔ اس نے نہ صرف مرکزی اور ریاستی حکومتوں
کے محافظ خانوں اور قومی اور مقامی اخبارات کے فائلوں کا جائزہ لیا بلکہ ان لوگوں کی شہادتوں کو
بھی استعمال کیا جو مختلف سیاسی جماعتوں سے متعلق تھے، نیز سماجی اور اقتصادی امور کے بارے میں
ایک دوسرے سے مختلف نظریات رکھتے تھے۔ اس نے اس کوشش میں کہ مواد ہر ممکن حد تک
مکمل ہو ہندوستان کے باہر کے وسائل سے بھی رابطہ پیدا کیا۔

بورڈ نے بڑی مفید خدمات انجام دیں لیکن بہت جلد یہ واضح ہوگیا کہ ایک ہنگامی

جماعت جو عارضی طور پر قائم کی گئی تھی وہ ضروری مواد جمع کرنے کا کام مکمل نہیں کر سکتی - اور جو واقعات موصول ہوں ان کی چھان بین اور شرح کر کے ایک جامع تاریخ تیار کرنا بھی اس کے بس کا نہ تھا۔

بورڈ میں اصول علم تاریخ کے ماہرین بھی تھے اور عملی سیاست کے افراد بھی۔ اور دونوں کے نقطۂ نظر کا اختلاف مواد کے جمع کرنے کے وقت ہی دکھائی دینے لگا تھا۔ اور جو مواد اکٹھا ہوا تھا جب اس کی تعبیر کا وقت آیا تو یہ اختلافات اور بھی نمایاں ہوئے۔ اس لئے یہ طے کیا گیا کہ مزید مواد کے جمع کرنے کا کام آرکائیوز (قومی قدیم دستاویزات کے محافظ خانہ) کے سپرد کر دیا جائے اور شرح اور ترتیب کا کام کسی ایک ممتاز اہل علم کے سپرد کیا جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر تاراچند کو جو اس سے قبل کے زمانہ میں پلیننگ کمیٹی کے چیرمین رہ چکے تھے اور اس کام کے کرنے کی مخصوص استعداد رکھتے تھے، مواد کی چھان بین کرنے اور ہندوستان کی تحریک آزادی کی ایک جامع تاریخ مرتب کرنے کی خدمت سپرد کی گئی۔

جیسا کہ ناظرین ملاحظہ کریں گے ڈاکٹر تاراچند نے ایک وسیع اور ذہین نقطۂ نظر اختیار کیا ہے انھوں نے نہ صرف برطانوی حکومت کے آغاز کے وقت ہندوستان کے اندرونی حالات کا ایک مکمل نقشہ پیش کیا ہے بلکہ ہندوستان اور یورپ کی تاریخ کے تقابلی مطالعہ پر بھی کام کیا ہے تاکہ ہماری توجہ ان اسباب پر مرکوز کر سکیں جن سے زیر غور زمانہ میں برطانیہ کا عروج اور ہندوستان کا زوال ہوا۔ ان کا طریقۂ استدلال معروضی اور مؤرخانہ ہے۔ انھوں نے تعریف و مذمت کا فیصلہ تاریخی اصولوں پر مبنی کیا ہے نہ کہ قومی اور نسلی تعصبات پر۔ تجزیے اور آرا ان کے اپنے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ان کے تمام نتائج اور تشریحات سے اتفاق نہ کرے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہر شخص اس بات سے اتفاق کرے گا کہ انھوں نے واقعات کی ترتیب میں مکمل ہنرمندی اور فن کارانہ مہارت برتی ہے۔

ہندوستان کی آزادی کو کھونے اور اسے پھر سے حاصل کرنے کی داستان انسانی تاریخ میں مطالعہ کا ایک نہایت دلکش مضمون ہے۔ قابل فخر اور شاندار ماضی رکھنے والے اعلیٰ ترقی یافتہ صنعت اور حرفت کے مالک اور تقریباً غیر محدود انسانی و مادی وسائل سے بھرپور لوگوں کو ذلت اور شکست برداشت کرنی پڑی۔ کیوں کہ انھوں نے نہ تو یہ سیکھا تھا کہ طاقت کا مدار سوسائٹی کے ہر طبقہ میں قومی جذبات کو پھیلانے پر ہے۔ اور نہ بیرونی دنیا میں سائنس اور علم صنعت و حرفت کی

جو ترقی ہوئی تھی اس کے دوش بدوش اپنے کو دکھا سکا۔ ان کی دوبارہ زندگی اس وقت شروع ہوئی جب سلطنت کی خلافت سے ان میں ایک بیش از بیش احساس قومیت پیدا کیا۔ اور بیرونی حکمرانوں نے ایک قدیم سوسائٹی میں جدید تعلیم اور سائنس کی دعوت نے والی طاقتیں داخل کرنے کا آغاز کیا۔ اس طرح جو خمیر تیار کیا گیا وہ آج تک قومی زندگی کی ہر سطح تک پہنچ رہا ہے اور سماجی نظام، علمی نقطۂ نظر بلکہ مذہبی معتقدات اور اعمال تک میں عظیم تبدیلیاں لا رہا ہے۔ جب قومی بیداری، قومی خودداری کو واپس لائی تب ہندوستان پھر آزاد ہو گیا۔ اگرچہ قدرتاً اس کو اس راہ میں ان عالمگیر قوتوں کے عمل سے جو جنگ عظیم دوم پر منتج ہوئیں، مدد ملی۔

ارادہ کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی تحریک آزادی کی داستان تین جلدوں میں بیان ہو اور ہر جلد چار سے پانچ سو صفحات پر مشتمل ہو۔ پہلی جلد میں جس کا آج اجرا ہو رہا ہے (پانی پت کی تیسری لڑائی کے دو سو سال بعد جس نے ہندوستان میں برطانوی اقتدار کو لازمی بنا دیا تھا) اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کے سماجی، سیاسی، ثقافتی (کلچرل) اور اقتصادی حالات کو ان تاریخی غیر اختیاری احوال و واقعات کے پس منظر میں بیان کیا گیا ہے جنہوں نے اس کے اوائل میں اقوام ہند کی زندگی اور تاریخ کا مرقع تیار کیا تھا۔ اس میں ایک مکمل تصویر ان ترقیات کی بھی دی گئی ہے جو موجودہ زمانہ میں یورپ میں نمایاں ہوئیں، تاکہ ہم لوگوں کو اس اثر کے سمجھنے میں آسانی ہو جو مغرب کی برق رفتاری نے ہندوستان کی جامد سوسائٹی پر قائم کیا۔

اس طرح کا وسیع کام سرکاری اور غیر سرکاری جماعتوں اور ہند اور بیرون ہند مردوں اور عورتوں کے تعاون کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نیشنل کام کے مکمل کرنے میں ہم ان سب کے زیر بار احسان ہیں۔ ڈاکٹر تاراچند اور ان کے ساتھیوں نے جس خلوص اور گہری توجہ سے اس کثیر مقدار میں جمع کئے ہوئے مواد کا جائزہ لیا اور ان بنیادی اصولوں کو دریافت کرنے کی فکر کی جنہوں نے ان مختلف اور بعض اوقات متضاد رجحانات کی جانب رہنمائی کی اور ان میں اتحاد کی راہ دکھائی جو اس عبوری لیکن انقلابی دور کی خصوصیات ہیں۔ اس لئے ہم ان کے اور بھی زیادہ احسان مند ہیں۔

ہمایوں کبیر

26 جنوری 1961ء

نئی دہلی

دیباچہ

تحریک آزادی کی تاریخ لکھنے کا کام اپنے ذمہ لیتے وقت میں گوناگوں سوالات سے دوچار تھا۔ یہ تاریخ کہاں سے شروع ہو؟ ایک جواب یہ تھا کہ انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے سال 1885ء سے لیکن کانگریس بتدریج بڑھتی ہوئی ایک قومی تحریک کا منظم اظہار تھی۔ قومی شعور کے طلوع کی تاریخ کا پتہ لگائے بغیر کانگریس کے نمودار ہونے کا سبب بیان کرنا ناممکن ہوگا۔ تو یہ قومی شعور کب آشکارا ہوا؟ کیا 1857ء کی ملک گیر بربادی اور قتل عام کے زمانہ میں یا اس سے پہلے۔ اس لئے لازمی طور پر یہ ضروری ہوا کہ پیچھے مڑ کر رام موہن رائے تک جایا جائے۔ لیکن رام موہن رائے برطانوی فتح کے اثرات کی پیداوار تھے اس لئے اس تقاضہ سے دامن بچانا ممکن نہ تھا کہ اولیں زمانہ نے جو اثرات مرتب ہوئے ان کا مطالعہ کرنے اور ان کی شرح کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک دوسرے سوال کا جواب دینا اور بھی مشکل تھا۔ مجھے تحریک آزادی کی تاریخ کو ترتیب دینا تھا کہ صرف حصول آزادی کی تاریخ بیان کرنا۔ آزادی ایک منفی تصور ہے۔ اس کا منشا تابعداری کا فقدان ہے۔ اس کا کوئی مثبت تصور نہیں ہے۔ یہ اس سماج کی صفات اور امتیازی نشانات کو ظاہر نہیں کرتی جو بیرونی دباؤ کو پھینک کر سیاسی اقتدار اعلیٰ حاصل کرتی ہیں۔ آزادی محض بیرونی کنٹرول کے فقدان کا نام نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کا اطلاق ایک ایسی سوسائٹی پر ہوتا ہے جو چند مثبت صفات رکھتی ہو۔ یعنی اپنے معاملات ابنائے ملک کی مرضی کے مطابق

چلانے کی استعداد اور ایک جمہوری طرز زندگی۔ جس میں ہر فرد کے لئے آزادی اور مساوات کی ضمانت ہو۔

اٹھارھویں صدی میں برطانیہ کی مداخلت کی وجہ سے ہندوستان نے اپنی آزادی کھو دی لیکن برطانیہ ہی کی حکومت کے زمانہ میں جو دو سو سال تک قائم رہی اس نے آزادی حاصل کرلی۔ اس نے ایک دوسرے سے متعلق دو سوالات پیدا کئے۔ ہندوستان نے اپنی آزادی کیوں کھوئی؟ اور اس کھونے کا مادی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے کیا نتیجہ نکلا اور دوسرے یہ کہ کس طرح ہندوستان نے اپنے کو آزادی حاصل کرنے کے قابل بنایا۔ یورپ نے غیروں کی پابندی سے نکل کر خود مختاری تک بتدریج ترقی کی۔ اور اس نے یہ سفر ایک ہزار سال سے زائد عرصے میں طے کیا۔ یعنی جب سے رومن امپائر میں ٹیوٹانی قوم کے لوگ آباد ہوئے اس وقت سے اٹھارہویں صدی تک۔ لیکن اس کو بیرونی قبضہ اور حکومت سے کبھی سابقہ نہیں پڑا۔ دوسری جانب اس خطرناک سفر پر روانہ ہونے سے پہلے جس کا نتیجہ سلف گورنمنٹ ہوا ہندوستان کو اپنی قوت فرماں روائی سے دست بردار ہو جانا پڑا اور ہندوستان نے اس سفر کی مختلف منزلوں کو یورپ سے ۱/۵ وقت میں طے کیا۔

مجھے یہ نظر آیا کہ جو کچھ ہندوستان میں ہوا اس کی شرح کرنے کے لئے یورپ کے تجربات کو اختصار کے ساتھ ہی سہی، بیان کرنا ضروری ہے۔ اس لئے میں نے ہندوستان کی آزادی کی کہانی میں یورپ کے اندر کی تدریجی ترقی کا خلاصہ بطور تمہید بیان کرنے کی جسارت کی ہے۔

ہندوستان میں آزادی کا حصول ایک عجیب منظر ہے۔ یہ ایک تہذیب کا قومیت کے سانچے میں ڈھلنا ہے۔ یہ قومی حاکمانہ اقتدار اعلیٰ کے ذریعہ قومیت کی تکمیل ہے۔ اپنے بتدریج بڑھنے کے پورے عرصے میں یہ ایک ایسی تحریک ہے جس کا رخ جہاں ایک طرف اغیار کے تشدد کے خلاف ہے وہاں اس کا دوسرا رخ اپنے نفس کی بے شعوری کے خلاف بھی ہے۔

آزادی کی تاریخ ایک منطقی عمل ہے۔ اس کا پہلا قدم جہاں تک طرز قدیم کو مسمار کرنا تھا متناقض تھا۔ یہ بحث اس سلسلہ کی ہے جو اٹھارھویں صدی میں شروع ہوا اور 1857ء کی بغاوت پر ختم ہوا۔ دوسرا قدم ایک نئے طرز کا ظہور ہے جو 1857ء کے بعد نصف صدی کے اندر رفتہ رفتہ حرکت عمل سے بہت زوردار ہو گیا۔ تیسرا قدم مشرق اور مغرب کے اندر قدیم و جدید طرز کا تصادم اور جنگ ہے اور دنیا میں ایک نئی ہستی انڈین نیشنل اسٹیٹ (ہندوستان کی قومی حکومت)

کا ورود ہے۔

میں نے اس منطقی بحث کے مضمون کو تین جلدوں میں بیان کیا ہے جن میں سے پہلی جلد بحث اول سے متعلق ہے۔

یہ خیال کہ تحریک آزادی کی تاریخ لکھنی چاہئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے دماغ کی تخلیق ہے جو اس وقت گورنمنٹ آف انڈیا کے وزیر تعلیم تھے۔ مولانا آزاد تحقیق علم اور تدبر، دنیائے قدیم کی نفاستوں اور کلچروں اور دور جدید کے جوش آزادی و ترقی کا ایک نادر مجموعہ تھے انھوں نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ اسی جنگ میں صرف کیا تھا۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ اپنی پوری قوت، اپنی بے مثال خطابت، اپنے متوازن نظریئے، اپنے عاقلانہ مشورے، اپنی وسیع النظر حب الوطنی، اپنا ابلتا ہوا جوش، اپنا احساس برتری، اپنی مقصدیت۔ یہ سب انھوں نے ہندوستان کی آزادی کی بھینٹ چڑھا دیا۔ لیکن خوفناک ترین تصادم اور وقتی سکون دونوں زمانوں میں انھوں نے علمی اشغال سے کبھی کنارہ کشی اختیار نہیں کی۔ ان کا حافظہ عظیم الشان تھا۔ اور ان کا دماغ اردو، فارسی اور عربی کے بہت سے اشعار، بیشتر ممالک کی تاریخ اور مذہبی حقائق کا خزانہ تھا۔ وہ اس وقت سے زیادہ کبھی مسرور نہیں ہوتے تھے جب وہ اپنی کتابوں سے گھرے اور علمی مباحث میں مصروف ہوتے تھے۔ ہندوستان کی آزادی ان کا جذبۂ قلبی تھا۔ اور اس کے حصول کے بعد اس دور کی کہانی کی تدوین ان کی محبوب اور دلی تمنا تھی۔

مجھے یہ فخر حاصل تھا کہ میں نے ان کے ساتھ وزارت تعلیم میں چار سال کام کیا تھا اور تاریخ میں میری دلچسپی سے وہ واقف تھے۔ اس لئے جب انھوں نے مجھ سے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے فرمایا تو میں نے اس پیش کش کو بخوشی منظور کر لیا۔ میں ان کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے ایک ایسے کام کے مکمل کرنے کا موقع دیا جو مجھے دل سے عزیز تھا۔ انھوں نے مجھے مدد دینے کے لئے تین دانش وروں کو میرے سپرد کر دیا۔ ڈاکٹر وی، ڈی، ڈیگی۔ ڈاکٹر آر، کے، پرمو اور ڈاکٹر بی، ایم، بھاٹیہ۔ ان لوگوں نے پورے لگن اور پرجوش دلی عقیدت کے ساتھ کام کیا۔ اس کتاب کے لکھنے میں ان لوگوں کا معتد بہ حصہ ہے۔ اس جلد کی تکمیل میں ان کی بیش بہا امداد کے لئے ان کا ممنون ہوں۔ میں شری ہمایوں کبیر مرکزی وزیر سائنٹیفک ریسرچ اینڈ کلچرل افیئرس کا بھی ان کی امداد کے لئے شکر گزار ہوں۔ اس کام کے لئے ان کے اضطراب اور فکر مندی کی میرے دل میں بڑی عزت ہے۔ کیوں کہ بغیر ان کی ذاتی دلچسپی کے بہت سی دقتوں پر اور بالخصوص طباعت کی دقتوں پر قابو

پا نا ممکن نہ تھا۔ میں ڈائرکٹر نیشنل آرکایوز آف انڈیا اور نیشنل لائبریری کلکتہ کے لائبریرین کا بھی ممنون ہوں کہ ان دونوں حضرات نے اپنے ریکارڈ اور کتابوں تک آزادی کے ساتھ رسائی کے لئے مجھے اجازت دی۔

تاراچند

نئی دلی۔ 5 رجنوری 1961ء

تعارف

خیالِ ماضی

اٹھارھویں صدی میں ہندوستان برطانیہ کے زیرِ اقتدار آیا۔ اس کی پوری تاریخ میں تقریباً پہلی بار ایک پردیسی ملک کے افراد نے جن کا وطن ہندوستان سے کئی ہزار میل کے فاصلہ پر تھا اس کی حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی اور اس کی تقدیر کے رہبر بنے۔ ملک پر اس طرح کا قبضہ ایک نیا تجربہ تھا۔ اگرچہ ماضی میں ہندوستان پر بہت سے حملے ہوئے تھے اور کبھی کبھی ملک کا کچھ حصہ عارضی طور پر فاتحین کی حکومت میں چلا گیا تھا پھر بھی ایسے مواقع بہت کم پیش آئے اور ان کا دور بہت مختصر تھا مثلاً فارس کی Achaemenian حکومت میں کنارے کا علاقہ شامل ہو گیا تھا۔ اور وادی سندھ سے وہ خراج بھی وصول کرتے تھے۔ کشن نے اپنی فتوحات کو کشمیر اور شمالی مشرقی ہندوستان تک پھیلا دیا تھا اور ایک صدی سے زیادہ تک ان پر حکمراں رہے غزنوی حکومت میں پنجاب شامل تھا اور عرب سندھ پر حکمراں ہوئے Pahlavas ساکس اور ہن کی مداخلت عارضی واقعات کے سوا اور کچھ نہ تھے۔ ان عارضی حکومتوں کے واقعات کے ماسوا ہندوستان پر بہت سے حملوں کی بھی آفت آئی۔ لیکن حملہ آوروں کے طوفان نے ملک کو کچھ عرصہ تاخت و تاراج کیا پھر یہاں سے گذر گیا۔ ان میں اہم سکندر، تیمور، نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملے تھے۔ جن فاتحین نے ہندوستان کے بڑے حصے پر مستقل حکومت قائم کی وہ ازمنہ وسطیٰ میں ترک اور بعدہ چغتائی مغل تھے۔

کشن فاتحین جو شمالی مغربی ہندوستان کو اپنے اقتدار میں لیے تھے مکمل طور پر ہندوستانی ہو گئے تھے انھوں نے ہندوستان کا مذہب، ہندوستان کی زبانیں اور ہندوستان کے رسم

درواج کو اختیار کرلیا تھا۔ وہ ہندوستان کی سوسائٹی میں گھل مل گئے تھے۔ شروع میں جو مسلم فاتحین افغانستان اور وسط ایشیا سے آئے ان کی بہرحال ایک مختلف کہانی ہے۔ محمود غزنوی، شہاب الدین غوری یا باہر کے مسلم سپاہیوں، فوجی افسروں اہل علم اور تاجروں نے ساکاس، یوہ چین اور ہنس کی طرح اپنی انفرادیت ختم نہیں کی۔ وہ اپنے مذہب پر برابر قائم رہے اور اپنے کلچر کا بھی بہت سا حصہ اپنائے رہے۔ لیکن انھوں نے اس ملک میں مستقل طور پر رہنے کا فیصلہ کیا۔ اپنے بیرونی ہونے کے تصورات کو خیرباد کہا اور اپنی قسمت ابناء ہند کے ساتھ وابستہ کردی۔ عملی ضروریات زندگی نے ان کو مجبور کیا کہ وہ اپنی رعایا سے روزافزوں سماجی تعلقات قائم کریں۔ جدید ماحول کے دباؤ اور انتظام ملکی کے مفاد کے لیے انھوں نے انتظام حکومت قانون اور نظم وضبط کے اپنے تصورات میں ترمیم کی۔ ان میں بہت سے بیرونی طور طریقے اور رسم ورواج تھے اور ہندوستان کی زندگی اور کلچر کے ابتدائی اصول کو بھی انھوں نے اپنے اندر سمولیا تھا۔ ہندوستان جو بہت سے مذاہب کا گنجینہ تھا ایک مزید مذہب کے اضافہ سے اور بھی مالدار ہوگیا اور نئے عناصر (مبادیات اصول مذہبی) کے شامل ہونے سے اس کی رنگ برنگی تہذیب میں اور بھی تنوع آگیا۔

اس طرح اگرچہ مسلمانوں کے فتوحات ہندوستان کی قدیم سوسائٹیوں میں بہت سی سیاسی اور ثقافتی تبدیلیاں لائے لیکن اس قدیم کلچر کی بنیادیں اور اس کا ڈھانچہ بدستور قائم رہا۔ ہندوستان کے بسنے والوں نے نئے آنے والوں کو بہت کچھ دیا اور معاوضہ میں بہت کچھ پایا۔ فاتحین سے انھوں نے جدید معاشرتی طور طریقے سیکھے جو انھوں نے جاری کیے تھے۔ مسلم مذہب کا جس میں شدت سے توحید الٰہی پر زور دیا جاتا تھا اور جس کے سماجی تنظیمات کا Egalitarein فلسفہ تھا ردعمل پیدا ہوا اور ہندو مذہب اور سماجی طور وطرز ایسی تحریکات سے جھنجھوڑا ٹھے جنھوں نے دونوں کے ذہنی رجحان اور عمل میں تقرب پیدا کیا۔ مسلمانوں کی زبان اور ان کے علمی خزانہ نے ہندوؤں کی تقریروں اور تحریروں پر ایک سرایت کن اثر پیدا کیا۔ نئے الفاظ محاوروں اور ادبی شکل نے اپنی جڑیں مضبوطی سے جمالیں اور نئے اسلوب اور مضامین نے ان کے خیالات کو مالدار بنادیا ایک جدید ادبی زبان عالم وجود میں آئی۔ اور بہت سی انڈو آرین بولیاں پھل پھول کر ادبی زبان بن گئیں۔ فن تعمیر، رنگ سازی، موسیقی دوسرے چھوٹے چھوٹے فنون میں عظیم تبدیلیاں واقع ہوئیں اور نئے اسلوب نمودار ہوئے

جن میں دونوں کے اجزائے ترکیبی ایک دوسرے سے مل جل گئے۔ تیرھویں صدی میں جو عمل شروع ہوا تھا وہ پانچ سو سال تک قائم رہا۔

سولھویں صدی میں بابر نے افغانی نسل کے لودی خاندان کو اکھاڑ پھینکا۔ اس کے جانشینوں نے اپنے کو ہندوستان کے مفاد سے کلیتہً وابستہ کر لیا اور مجموعی طور پر ایسی پالیسیاں اختیار کیں جن سے سیاسی یک جہتی اور ثقافتی ہم آہنگی کی راہیں کھلیں۔ مغل حکومت کے ہندوستان کے بیشتر حصے پر پھیل جانے کے گہرے نتائج برآمد ہوئے۔ اس نے قدیم قبائلی چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور خود مختار حکومتوں کو روند کر برابر کر دیا اس نے پرانی سیاسی اکائیوں کی کثرت کو جن کی خود مختاری وقتاً فوقتاً موریہ، کشن یا گپتا سامراجوں کی بالادستی سے محدود ہو جایا کرتی تھیں ایک واحد سامراج کے تحت لے آئی تھی ان کو توڑ کر ایک ایسی سلطنت کی وحدت میں تبدیل کر دیا جس کا انتظام براہِ راست مرکز سے ہوتا تھا۔ صرف کنارے کنارے چند نیم آزاد چھوٹی چھوٹی ریاستیں یا تعلق داریاں اور ماتحت داریاں باقی رہ گئیں۔

شاہان مغلیہ اور ان کے عظیم عمال علم اور فن کے روشن خیال مربی تھے۔ موجودہ زمانہ کی ہندوستانی زبانیں مثلاً برج، اودھی، بنگالی، مرھٹی وغیرہ جو اصلاح شدہ ہندو مذہب کے اظہار خیال کا ذریعہ اور بھگتی کے مسلک (محبت اور خدمت کے مذہب) کا آلہ تھیں ان کے شاہانہ لطف وکرم سے متحرک ہوئیں۔ پہاڑی علاقوں، راجستھان، وسطی ہندوستان اور دکن کے ہندو راجاؤں نے ان اسلوب کی نقل کرنا شروع کی جو مغلوں کی کریمانہ سرپرستی میں نمودار ہوئے تھے۔

مغلوں کا سیاسی نظام اور ہندوستان کا ثقافتی نصب العین مشترک معاشرتی واقتصادی بنیادوں پر قائم تھا جن کی نوعیت سوائے جزئیات میں ترمیم کے تاریخ کے تمام قدیم ومتوسط عہد میں بدستور باقی رہیں۔ اس کی شروعات کا سلسلہ اس زمانہ تک لے جایا جاسکتا ہے جب آرین نے ہندوستان میں آکر اول بار مستقل قیام اختیار کیا۔ اس معاشرتی واقتصادی بنیادوں کا اشتراک ہندوستان کی تاریخ کی ایک ممتاز علامت ہے۔ ابنائے ہند کے گوناگوں کلچر میں جو یکسانیت پائی جاتی ہے وہ اسی سرچشمہ کی ایک چھوٹی شاخ ہے۔ اس لیے اگرچہ ہندوستان میں بہت سے مذاہب، بہت سی زبانیں، بہت سی نسل کے لوگ ہیں مگر زندگی کے بارے میں اس کے بنیادی نظریات صدیوں اور ہزاروں سال سے برقرار رہے

ہیں۔ ان تمام زمانوں میں یہ تعداد کثیر کلچروں میں ایک عجیب ہندوستانی خوشبو ہے۔ یہ ایک خاص بات ہے کہ ہندوستان کا سماجی، اقتصادی بنیاد کا وہ ڈھانچہ جس کی ابتدا اس وقت سے ہوئی جب کہ آریوں نے یہاں مستقل قیام اختیار کر لیا۔ اور آریوں کے آنے کے قبل آباد لوگوں میں وہ گھل مل کر سمو گئے اسی طرح بلا کسی غیر معمولی تبدیلی کے انیسویں صدی تک قائم رہا اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان کی نسلی شکل ایک مرتبہ آخر تک کے لیے مرتب ہو گئی اور آنے والے زمانہ نے اس میں کوئی الجھن نہیں پیدا کی۔ یہ اس وقت ہوا کہ جب باہر سے آنے والے آریہ قبیلے آئے اور غالباً مختلف لہروں میں آئے اور ملک کے مختلف حصوں پر قابض ہو گئے ہر حصہ کے اصلی باشندے مختلف طریقوں اور مختلف تعداد میں ان کے اندر ضم ہو گئے ان مختلف علاقوں میں مختلف سماجی نظام قائم ہوئے لیکن سب پر مختلف مقدار میں آریائی تہذیب کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ اور جو روایتیں ایک مرتبہ قائم ہو گئیں ان میں پھر کوئی الٹ پلٹ نسلوں کے اکھاڑ پچھاڑ یا مداخلتوں سے نہیں ہوئی۔ یہ روایتیں آریائی ڈریویڈین اور ہندوستان کے پراچین باشندوں کے متفرق خیالات کے نظم و ضبط پر مبنی سب کے نظریات کا مجموعہ تھیں۔ چوں کہ نہ تو عارضی حملوں نے نہ مستقل فتوحات نے کسی محسوس حد تک ہندوستان کے عام باشندوں پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا اس لیے روایات میں کوئی اکھاڑ پھینکنے والی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ جاٹ، گوجر، ساکس اور ہن جو بعد کو ہندوستان میں داخل ہوئے ان کا آنا ان چھوٹی چھوٹی ندیوں کے تموج سے زیادہ ثابت نہ ہوا جو آخرکار سمندر کی لمبائی چوڑائی میں گر کر غائب ہو جاتی ہیں۔

مغل فاتحوں نے اپنی شہنشاہیت جب تیرھویں صدی میں قائم کی تو ہندوستان میں ایک نیا کلچر داخل ہوا۔ یہاں قدیم و جدید ملے اور ایک دوسرے سے تبادلہ کیا اس تمدنی عمل میں ایک مرکب حالت پیدا ہوئی۔ سوسائٹی کی عقائدی اور اقتصادی بنیادوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اجتماعی زندگی بدستور رہی۔ گاؤں بدستور اجتماعی زندگی کی اکائی کا فرض اپنے رسائل کے اندر محدود رہ کر انجام دیتے رہے۔ صنعت اور تجارت کے کاروبار اسی طرح جاری ہے نہ ان کے ڈھانچہ میں فرق آیا اور نہ طریقہ کار میں۔ ہندو اور مسلمان دو گروہوں میں بدستور بٹے رہے اور دونوں میں ایک وہ تھے جو مالکان زمین حکمران اور مخصوص حقوق رکھتے تھے۔ دوسرے عوام تھے جن کو کچھ مراعات حاصل نہ تھے اور نہ ان کا حکومت کی کارروائیوں

میں کوئی حصہ تھا۔ سیاسی نظام میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ گرہ جو حکومت اور عوام کو ایک میں باندھتی تھی بہت معمولی اور کمزور تھی۔ کیوں کہ حکومت کے عمل کا دائرہ انتہائی محدود تھا یعنی صرف حفاظت کے لیے فوج کا قیام، بدامنیوں کی روک تھام اور فوج کے خرچ کے لیے محاصل جمع کرنا۔ قانون سازی ان کے دائرے سے خارج تھی۔ اور یہی حال عدالتی نظام کے بیشتر حصہ کا تھا۔ قانون بنانے کے لیے کوئی جماعت نہ تھی سول اور ذاتی تنازعات زیادہ تر غیر سرکاری ایجنسیوں کے ذریعہ طے ہوتے تھے۔

جہاں تک مذہب کا تعلق ہے اگرچہ نیچے کے لوگ اپنے توہمات میں ڈوبے رہے اور تعلیم یافتہ لوگوں پر بھی کوئی اثر نہیں تھا لیکن لین دین کافی ہوا۔ اسلام کے اثر سے ہندوؤں میں نئے نئے فرقے اور نئے نئے پنتھ ابھرے اور مسلمانوں میں روشن خیال صوفیوں اور دانش ور گروہوں نے ہندوؤں کے فلسفیانہ اصول اور باطن کی صفائی (تزکیہ نفس) کے لیے ہندو مذہب کے طریقوں کو اختیار کر لیا۔ علم اور ادب کے تخلیقی میدان میں ہندو مسلم اسلوب بہت حد تک ایک دوسرے سے مل جل گئے۔ لیکن قانون کے حلقہ میں ایک نے دوسرے سے کچھ بھی مستعار نہیں لیا۔

اس میں شک نہیں کہ کلچرل مفاہمت کا دروازہ کھلا لیکن اس سے قومی بیداری پیدا نہ ہو سکی کیوں کہ وہ سخت سانچے جن کے اندر گروہ اور فرقے بند تھے وہ ان کو ایک دوسرے سے مل جانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

حکومت نے اس بیداری کو پالنے پوسنے کی جانب توجہ نہیں کی ایک ہی ملک میں ساتھ رہنے کے نتیجہ میں باشندوں کے اندر ربط وضبط پیدا ہوا۔ الگ سے کوئی بالارادہ کوشش اتحاد کے جذبات پیدا کرنے کی نہیں کی گئی نہ اقتصادی اور سماجی ترقیوں نے حب الوطنی کے جذبات پیدا کیے نہ افراد کے اندر ملک کے تمام باشندوں کو اپنی شمولیت کے ساتھ ایک سمجھنے کا احساس بیدار ہوا۔

اٹھارھویں صدی کے شروع میں سلطنت مغلیہ کا ڈھانچہ ٹوٹنے لگا۔ اور جس طرح اس صدی کا زمانہ آگے بڑھتا گیا مغل حکومت کے زوال کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ مرکزی حکومت کی کمزوری کا اثر بطور ردعمل کے حکومت کی مالیاتی زندگی پر پڑا۔ اس کا خزانہ گھٹتا گیا۔ رسل و رسائل میں دقتیں واقع ہوئیں۔ صنعت، تجارت، زراعت مقامی طور پر محدود ہو گئے

مرکز گریز قوتوں نے غلبہ حاصل کرنا شروع کر دیا۔ قانون اور ضابطہ منتشر ہو گیا۔ اجتماعی اور نجی اخلاق بل گئے۔ شہنشاہیت ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی اور بیرونی حملہ آوروں اور اندرونی دشمنوں سے نپٹنے کی اس کی طاقت تباہ و برباد ہو گئی۔

یہی وہ موقع تھا جب یورپین اقوام کے ایجنٹوں نے ہندوستان کے معاملات میں مداخلت شروع کی۔

1498ء میں واسکوڈی گاما جب کالی کٹ کے بندرگاہ پر اُترا تو ایشیا اور یورپ کے درمیان ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ پندرھویں صدی میں جزیرہ نما یورپ سے مورس (حبشیوں) کا اخراج اور ممالک بلقان میں ترکوں کی ایک جدید یورش نے دونوں براعظموں کی قدیم رقابتوں کے ٹکراؤ اور کھنچاؤ کو ختم کر دیا۔ اسپینوں اور پرتگالیوں نے مسلمانوں کا پیچھا کرنے میں سمندروں میں چھلانگ لگائی۔ اور کوشش کی کہ مغرب کی عیسائی طاقتیں حبشہ کے پرسٹر جان کی افسانوی حکومت سے مل جائیں اور اس طرح درمیان میں گھس کر حملہ کر کے شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا کے مسلمانوں کو کچل ڈالیں۔ اپنی اس فوجی چال کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے افریقہ کے حلقہ سے بچ کر جہاز رانی کرتے ہوئے بحیرہ عرب کو عبور کیا اور ہندوستان کے مغربی ساحل پر نمودار ہوئے پرتگالیوں کے منصوبے کے دوررس نتائج برآمد ہوئے اول اس نے ترکوں اور عربوں کی جہاز رانی کو جو ہندوستانی سمندروں میں تھی باہر ڈھکیل دیا اس طرح اس پُرامن تجارتی رابطہ کو جو ہندوستان اور مغربی ایشیا کے درمیان خلفاء عباسیہ کے زمانے بلکہ اس کے پہلے سے قائم تھا ختم کر دیا۔ ہندوستان کا درآمدی اور برآمدی مال ہندوستان اور ایشیا کے جہازوں کے ذریعہ آتا جاتا تھا۔ اور اب یہ پرتگالیوں کے جہازوں کے حوالے ہو گیا جس سے ہندوستان کی جہاز رانی کی صنعت کو تباہ کن دھکا لگا۔ دوسرے ہندوستان کی بحری سرگرمیاں رکیں جن سے مشرقی ایشیا سے ہندوستان کے کلچرل تعلقات کٹ گئے اور دریائے گنگا کے حلقہ کے باہر کے تمام علاقے برما سے انڈونیشیا تک ہندوستان کے دائرہ اثر سے نکل گئے۔ ہندوستان کا کلچر جس نے تھائی لینڈ، انڈوچین اور انڈونیشیا میں روح پھونک کر وہاں شاندار اور عظیم الشان یادگاریں قائم کرائی تھیں جس نے ملایا۔ سماترا، جاوا اور جزائر Archipelago کی بادشاہتوں کو پلنے اور بڑھنے میں مدد دی تھی اور جوان تمام علاقوں میں ایک نیا مذہب اور ایک نئی تہذیب لایا تھا اچانک ختم ہو گیا۔

سب سے زیادہ یہ کہ پرتگالیوں کا ظہور ایک ہونے والے واقعہ کی نشانی تھی۔ ایک نیا جنم لینے والا خود اعتماد یورپ جس میں سائنس کی جدید ایجادات، انسان کی عظمت اور سوسائٹی کی عصبیت باہمی کے نئے آدرشوں اور مادی ترقی اور قومی طاقت کے نئے تصورات نے جوش بھر دیا تھا۔ ایشیا کے سب سے زیادہ دولتمند ملک کے پھاٹک پر دستک دے رہا تھا۔

لیکن ہندوستان اپنی افسانوی دولت، دور دور مشہور فنون اور جگمگاتے ہوئے کلچر کا اکبر اعظم اور شاہجہاں دارا شکوہ کا ہندوستان، اٹھارھویں صدی میں اپنی قوت متحرکہ کو کھو چکا تھا یہ اب بہت سے گاؤں، ذاتوں، قبیلوں، جتھوں اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا قرون وسطیٰ کے طرز کا ایک غیر متحرک مجموعہ رہ گیا تھا۔ یہ سب اجزا اس مغل شاہنشاہیت کی ماتحتی میں جو برائے نام رہ گئی تھی ایک ڈھیلے دھاگے میں بندھے ہوئے تھے۔ ہندوستان کی مالیات زراعت تک محدود تھی جس کا طریقہ کار قدیم جس کی تنظیم محدود اور جس کا مقصد صرف یہ رہ گیا تھا کہ جینے بھر کے لیے پیدا کر لیا جائے۔ ہندوستان کی صنعت ایک محدود پیمانہ پر ہی منظم تھی جس کا مقصد یا تو یہ تھا کہ امرا کے لیے تعیش کی چیزیں تیار کرے یا مقامی بازاروں کی سادہ ضروریات کو پورا کرے۔ دولت پیدا کرنے کا اس میں کوئی سوال نہ تھا۔ اس کے برعکس یورپ سمندر پار کے بازاروں کو ترقی دے رہا تھا۔ اور امریکہ چاندی اور سونا درآمد کر رہا تھا جس سے اس کی تجارت وصنعت کو فروغ مل رہا تھا۔ چونکہ سرمایہ تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ امتیازات نمایاں ہونے لگے تاجر اور بنک والے مالکان زمینداری امرا پر غالب آنے لگے۔ سائنس کی تنقیدی تحریک جو یورپ کے دماغ کو آزاد کر کے نئی نئی دریافت و ایجادات کے لیے اکسا رہی تھی اس نے ہندوستان کے ذہن کو متحرک نہیں کیا۔ ہندوستان کے سماجی وانفرادی طور طریقوں کو بھی ان شدید جذبات سے کوئی دھکا نہیں لگا جو یورپ کی جاگیر دارانہ لاتنظیمی سوسائٹیوں کو مضبوط رشتہ اتحاد میں مربوط و منظم قوموں میں تبدیل کر رہے تھے۔ یورپ میں مذہب کا زمانہ ختم ہو رہا تھا اور عقلیت کا عہد چوکھٹ تک آ گیا تھا۔ ہندوستان میں بہترین دماغوں کا نقطہ نظر اس دنیا سے ماورا تھا اور ان کا سب سے بڑا مقصد قادر مطلق سے اتصال تھا۔

سترھویں صدی ہندوستان کے عروج کی انتہا کا زمانہ ہے یعنی اس زمانہ میں اس کا قرون وسطیٰ کے طرز کا کلچر اپنے آخری کمال کو پہنچ گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد جیسے

جیسے ایک صدی دوسری صدی کے بعد آتی گئی یورپین تہذیب کا ستارۂ اقبال آسمان کی بلندیوں پر چڑھنے لگا اور ہندوستان کا آسمان تاریک ہونا شروع ہوا اور جلد ہی اس زمین پر مکمل تاریکی چھا گئی اخلاق میں بے راہ روی اور سیاست میں انتشار خیال کے سائے لمبے ہوتے گئے۔

ایک دُور دراز سلطنت کو قائم رکھنے کی کوشش میں پرتگال اپنی حد سے بہت زیادہ بڑھ گیا۔ اسی لیے جب 1580ء میں وہ تاج اسپین کا ماتحت دار ہوگیا تو مقابلہ کی دوڑ سے باہر نکل گیا۔ سترھویں صدی کے آغاز میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام دنیا اسپین کے قدموں کے نیچے ہے لیکن اس کی نکمی اقتصادیات اور اس کے تنگ نظرانہ مذہبی تعصب نے اسے پریشانیوں میں مبتلا کیا۔ چھوٹے اور نوجوان ملک جیسے ندرلینڈ، فرانس اور انگلستان نے اس کے غرور کو پست کر دیا۔ ان لوگوں نے اس کے جہازی بیڑوں کو سمندروں سے بھگا [illegible] [illegible] کے ہاتھ سے قیادت چھین لی۔ رفتہ رفتہ ندرلینڈ اس دوڑ سے الگ ہونے پر مجبور ہوا۔ اٹھا[illegible]ویں صدی کے وسط میں صرف فرانس اور انگلستان یہی دو میدان مقابلہ میں رہ گئے [illegible]ع زمانہ میں فرانس آگے نکلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی نئی اور دلیرانہ پالیسیوں نے دکن میں اس کے اثرات کو اقتدار بخش دیا لیکن جلد ہی اندرونی تصادم جو انقلاب کی شکل میں پھوٹ پڑا اس کے سائے سمندر پار پھیل گئے اور ہندوستان میں فرانسی ایجنٹ وطنی حکومت کی اس مستقل امداد سے محروم ہوگئے جس کے بغیر آخری کامیابی کا حاصل ہونا ناممکن تھا۔ سات سال کی لڑائی نے فیصلہ کن طور پر فرانس کے منصوبوں کو شکست دے دی اور میدان تنہا انگریزوں کے قبضہ میں آگیا۔

فرانسیسیوں نے جو طریقہ ایجاد کیا تھا انگریزوں نے سیکھ لیا تھا لیکن اس کے عمل درآمد میں وہ فرانسیسیوں سے آگے نکل گئے۔ انھوں نے ہندوستان کے راجاؤں کی کمزوریوں اور حماقتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور خود ہندوستانیوں کی مدد سے کل ہندوستان کے مالک ہوگئے۔ فرماں روائی میں ذمہ داریاں مضمر ہیں لیکن انگریز تو تجارت سے نفع حاصل کرنے آئے تھے چنانچہ حکومت کے خزانہ میں جو محاصل جمع ہوئے تھے انھیں وہ ہندوستانی اشیا کی پیداوار اور خرید میں صرف کرتے تھے اور پھر وہ ان اشیا کو بیرون ملک بھیج دیتے تھے۔ بڑے پیمانے کی سوداگری اور محاصل کی وصولی کی ضروریات نے ایک حکومتی نظام

کا قیام لازم ٹھہرایا۔ اس طرح یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوستان جس کا معاشرتی نظام اگرچہ جاں بلب تھا لیکن وہ فن ادب فلسفہ اور مذہب کے ایک عظیم ورثہ کا علمبردار تھا اب ایک فاتح مغرور اور ترقی پسند برطانیہ کے سامنے کھڑا تھا وہ برطانیہ جس کا اخلاقی و مادی روپ جدید (ماڈرن) تھا۔

مشرق و مغرب کے اس ملاپ کا جو نتیجہ نکلا وہ حیرت انگیز طور پر متضاد تھا۔ یعنی خیر و شر کا مجموعہ۔ پہلا نتیجہ تو یہ ہوا کہ ہندوستان میں ریاستی وسائل کے نظم و نسق میں کایا پلٹ ہو گئی اور اسے برطانیہ کی معیشت سے باندھ دیا گیا۔ اسی کے ساتھ مفلسی نے ترقی کی۔ آبادی میں اضافہ ہوا اور زمین پر دباؤ بڑھ گیا ایک عظیم مادی انقلاب کا دھوم دھام سے آغاز ہوا۔ دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے دماغ کو زبردست ٹھوکر لگی ایک طرف ان مسائل پر جو ابتک مسلم الثبوت مانے جاتے تھے پوچھ گچھ ہو... لی اور سائنس کے طریقوں کو اپنایا گیا دوسری طرف احیاء جدید کے رجحان کو طاقت حاصل ہوئی اور پراچین (قدامت) کی برتری کے جذبات محبت کے ساتھ دلوں میں پرورش پانے لگے۔ انجام یہ ہوا کہ قومی احساسات بیدار ہوئے اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر آزادی کی خواہش ایک آزاد ذمہ دارانہ جمہوری حکومت کے قیام کے لیے پیدا ہوئی۔ لیکن اس بیداری کے ساتھ ایک فرقہ وارانہ اور طبقاتی جذبات کی منحوس شورش بھی اُٹھ پڑی۔ زمانہ قدیم میں بیرونی حکمرانی سے آزادی تو ہندوستان کو عرصہ دراز تک حاصل رہی تھی۔ لیکن یہ آزادی تو ایک نیا خیال تھی۔ لیکن شاید یہ بالکل نیا خیال نہیں تھی کیوں کہ ہندوستان کا فلسفہ خواہ وہ ہندو ہو یا بدھی یا مسلم روح کی باطنی آزادی سے پوری طرح واقف تھا۔ درحقیقت آزادی تو ان کا مرکزی خیال تھا پھر بھی معاشرتی اور سیاسی میدانوں میں عمل پیرا آزادی ایک جدید دریافت تھی۔

یہ بات کہ یہ تبدیلی کن منزلوں سے گذر کر آئی اس کتاب کا موضوع ہے ہندوستان کے ہیئت کی تبدیلی اور قومی بیداری کا نشو و نما یورپ سے تصادم کا نتیجہ تھا لیکن خود یورپ میں نیشلزم (قومیت پرستی) ایک انوکھی اور عجیب و غریب چیز تھی۔ اٹھارھویں صدی میں یہ انوکھی چیز یورپ کے سب پچھم والے ملکوں تک محدود تھی اس کے بعد انیسویں صدی میں یہ پھیل کر وسطی اور مشرقی یورپ میں آئی اور اس کے بعد دنیا کے تمام ممالک کو اس نے اپنے دائرے میں لے لیا۔

یورپ میں نیشنل (قومی) سوسائیٹیوں کا ابھرنا۔ وہاں کی معاشرتی ترقیات کی بہت حال کی منزل ہے۔ یورپ نے جاگیردارانہ نظام سے آغاز کیا پھر سولھویں صدی میں وہ حرفتی نظام کے اندر داخل ہوا۔ اٹھارھویں صدی کے وسط میں صنعتی سرمایہ دارانہ نظام آیا پھر وہاں سے نیشلزم تک پہنچا۔ اس کے برخلاف ہندوستان نے اٹھارھویں صدی کے آخر تک اپنا قدیم نظام باقی رکھا جو یورپ کے جاگیردارانہ نظام سے مماثلت رکھتا ہوا کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد یورپ کے تصادم سے جو دھکا لگا اس نے پرانے ڈھانچے کو توڑ دیا، اور اسے تبدیلی کے اس راستہ پر چلنے کے لیے مجبور کیا جس کا آخری نتیجہ آزادی ہوا

ایسی عالمگیر تحریک اس واقعہ کی مظہر ہے کہ تاریخ کو کسی محدود حلقہ کی اہمیت پر مبنی نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کے مختلف گوشوں میں بسنے والے خواہ وہ ایک دوسرے سے بظاہر کتنے ہی الگ تھلگ ہوں لیکن وہ ان اثرات سے دوچار رہتے ہیں جو ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ دنیا کے دوسرے حصوں میں جو کچھ پیش آتا ہے ان سے قطع نظر کر کے کسی ایک ملک کی ارتقائی نشو و نما پر غور کیا جا سکے۔

تاریخ بنیادی طور پر دنیا کی تاریخ ہے اور جب سے اس زمین پر انسان نمودار ہوا انسان صرف اپنے طبعی ماحول ہی سے نہیں بلکہ اپنے بشری ماحول سے بھی متاثر ہوتا رہا۔

ان وجوہات سے یہ ضروری ہے کہ مغرب کی سوسائیٹیوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے اور غور کیا جائے کہ نیشلزم کس طرح پیدا ہوا اور کیسے اس نے نشو و نما پائی تاآنکہ وہ آخری منزل تک پہنچا۔ اسے ذہن نشین کیا جائے تاکہ ہندوستان میں نیشلزم کے ظہور اور حصول آزادی کو سمجھا جا سکے۔

یورپ میں نیشنلزم کا ارتقا

قدیم یورپ کا انتشار

نیشنلزم یورپ میں بدیر آیا لیکن اس کی جڑیں شروع کی تاریخ کی گہرائی میں ہیں بہت سے واقعات نے مل کر یورپ میں نیشنلزم کو جنم دیا۔ لیکن ان کا عمل دخل مختلف زمانوں میں ہوا۔ نسل اور کلچر دونوں کی تاریخ تو بہت ہی پرانی ہے۔ اگرچہ یورپ کے قوموں کی نسلوں کے اجزا ترکیبی ملک ملک مختلف ہیں لیکن ان کا خاص مادہ آرین ہے۔ ان لوگوں (یعنی آرین) نے ان ملکوں میں مستقل سکونت عہد مسیح سے ہزار سال قبل سے شروع کی تھی۔ ان میں سے بے شمار قبائل جیسے یونانیوں اور رومیوں نے عظیم الشان کامیابی اور عظمت حاصل کی۔ جس کلچر کو انھوں نے پروان چڑھایا اس نے وہ بنیاد تعمیر کی جس پر عہد نو کی یورپین زندگی کی عمارت تعمیر ہوئی ہے۔

آریوں میں یونانیوں اور رومیوں نے سب سے پہلے اقامت اختیار کی۔ اور بنیاد قائم کی۔ اور رومیوں نے خالص کلاسکی یونانی کلچر کو پوری شہنشاہیت میں جو اسکاٹ لینڈ سے ایران تک پھیلی ہوئی تھی اور کئی صدیوں تک قائم رہی پھیلایا اس مملکت کو آخر کار وحشیوں نے پارہ پارہ کر دیا جو اگرچہ خود آرین نسل سے تھے لیکن وہ دریائے رائن اور دریائے ڈینوب کے اس پار کے علاقہ میں بستے تھے۔ آرین کے انتقال مقامی کی جب دوسری لہر چلی تو اس سے بہت سنگین اور اہم نتائج مرتب ہوئے۔ صوبوں پر وحشی ٹیوٹن قبائل (یعنی

جرمن، ناروے، سویڈن اور اینگلوسیکسن) کے حملے بہت پہلے شروع ہوئے۔ کئی صدیوں تک سرحدیں محفوظ رہیں کیوں کہ رومن بادشاہوں نے ایسے طریقے ایجاد کیے تھے جن سے وحشی پیچھے رہنے پر مجبور تھے۔ پھر اندرونی دباؤ اور کشمکش نے شہنشاہیت کی طاقت چوس لی۔ اور 378ء بعد مسیح میں اس کی فوجوں کو ادرنہ کے مقام پر تباہ کن شکست کا سامنا ہوا جس میں شہنشاہ ویلنس قتل ہو گیا اور ایک سو سال کے اندر وحشی المانی Vandals (تہذیب سوز جرمانی) اور فرانسیسی (متحدہ اقوام جنہوں نے فرانس فتح کیا) اور دوسرے ٹیوٹن اقوام جم غفیر کی شکل میں آ گئے اور صوبوں پر قبضہ کر لیا۔

جس وقت ٹیوٹن قبائل روما کی مدافعتوں کو توڑنے میں مشغول تھے ایک دوسرا سنگین خطرہ نمودار ہوا۔ ایشیا کے میدانوں میں ہن آندھی کی طرح ٹوٹ پڑے۔ جنوبی روس میں آگے بڑھے مشرقی اور مغربی المانیوں کو زیر کیا اور اپنے اقتدار کو دریائے رائن تک کھینچ لے گئے۔ اس کے بعد اپنے عظیم لیڈر اٹیلا کی ماتحتی میں دریائے رائن کو عبور کر کے گال (موجودہ فرانس) میں داخل ہو گئے۔ لیکن 451 میں ماریہ کس کی لڑائی میں روم کی عزت بچ گئی اور ہن کا طوفان پیچھے ہٹا۔ افواج روما کی یہ آخری فتح تھی۔ کیوں ۔ س کے تھوڑے ہی دنوں بعد 476ء میں روم گاتھ (المانیوں) کے ہاتھ آ گیا اور روما کا قدیمی شہر خاک میں مل گیا۔ رومیوں کی طرز زندگی کی تعمیر کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا۔ نوآباد لوگ اپنے طور طریقے، طرز معاشرت، رسم ورواج اور ادارے لائے تھے۔ اگرچہ نوآباد لوگوں نے پرانے کلچر کو اپنے اندر ہضم کر لیا لیکن پھر بھی یورپ میں ایک بالکل نیا کلچر عالم وجود میں آیا۔

روم کے زوال کے بعد حملہ آور قبائل نے مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی اور نئی طرز حیات کی بنا ڈالنے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ فرینک (وہ جرمن قبائل جنہوں نے بعد کو فرانس فتح کیا) حکمران شارلیمن نے آٹھویں صدی میں رومن امپائر کو پھر سے زندہ کیا۔ لیکن نویں صدی میں شارلیمن اور دوسرے فرانسیسی بادشاہوں کا قائم کردہ نظام بھی منتشر ہو گیا اور مداخلت کی ایک تیسری لہر اٹھی۔ شمالی لوگ یعنی آٹھویں صدی کے بحر شمالی کے بحری ڈاکوں وکنگ کا جتھا جو اسکینڈی نیویا (ناروے، سویڈن و ڈنمارک) کی سرزمین سے اٹھا۔ ساحل بالٹک سے سلافی قوم مشرق سے تاتاری نسل ہنگری کے باشندے اور جنوب سے مشرقیین (اہل اسلام جن کو صلیبی جنگوں میں اس نام سے یاد کیا جاتا تھا) یورپ کی ٹیوٹن سوسائٹیوں

پر دباؤ ڈالنے لگے۔ وکنگ جتھا آگ اور تلوار سے برطانیہ، فرانس اور جرمنی میں داخل ہوا اور سلافی قوم نے جو عرصہ سے شاہی مملکتوں میں گھوم رہی تھی اب مشرقی یورپ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

عرب جنہوں نے اس درمیان میں شمالی افریقہ کو فتح کر لیا تھا اسپین میں داخل ہو گئے انھوں نے وحشی المانیوں (گاتھ) کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور یورش کر کے پہاڑ "پیرمی نیز" کے آگے نکل گئے اور فرانس کے اندر داخل ہوئے۔ لیکن فرینک کی (یعنی جرمانک متحدہ قوم جس نے چھٹی صدی میں فرانس فتح کیا تھا) سرحد پر ان کو رک جانا پڑا۔

اس طرح ہولناک قتل عام، شورش اور تشدد پر یورپین قوموں کی بنیاد رکھی گئی۔ وینو گریڈاف کے الفاظ میں "یورپین تاریخ کا وہ کل حصہ جو عام طور پر 476ء سے 1000ء تک کا ہے ایسا ہے کہ نگاہ اول میں یہ فساد اور شورش کا ایسا گڈمڈ زمانہ نظر آتا ہے جس میں بنیادی اصولوں اور مستقل نظاموں کا پتہ لگانا تقریباً ناممکن ہے"، قبائلیوں کے انتقال مکانی نے رومن امپائر کو الٹ دیا تھا لیکن گمیار (ہنگری کے اکثر باشندے جو تاتاری نسل سے ہیں) اور مورس (حبشی مسلمان) کے حملوں اور شمالیوں کی لوٹ کھسوٹ نے قبائلی سوسائیٹوں میں جو رومن امپائر کے بعد وراثتہً پیدا ہوئی تھیں انتشار پیدا کر دیا۔ جان اور مال کے قطعی غیر محفوظ ہونے کی کیفیت جاری تھی اور ان سب نے اس سانچے کو بنایا جس میں یورپین سوسائٹی ازمنہ وسطی میں تیار کی گئی۔ ہر جگہ مرکزی حکومت ناپید ہو چکی تھی۔ اور اسی کے ساتھ حکومت کے وصولی محاصل کا نظام بھی ختم ہو گیا تھا۔ اقتصادی ابتری کی وجہ سے بڑی معاشرتی جماعتیں اپنے کو قائم نہیں رکھ سکتی تھیں۔ پیداوار بہت گھٹ گئی تھی اور یورپ ایک سادہ اقتصادی پالیسی سے ابتدا کرنے پر مجبور ہوا۔ دو اہم انسانی مسائل تھے۔ تشدد سے محافظت اور زندگی کی ابتدائی ضروریات کا پورا کرنا۔ ان کے حل کے لیے ایک جدید معاشرتی نظام کے قیام کی ضرورت تھی۔ اس کے پالنے پوسنے میں رومن اور ٹیوٹن روایات اور تنظیمات نے امداد میں اپنی حد تک حصہ لیا اور نتیجہ کے طور پر جاگیر دارانہ نظام پیدا ہوا۔

جاگیردارانہ نظام کا طلوع

جاگیردارانہ سوسائٹی نے تیسرا یورپ تعمیر کیا۔ پہلے یورپ نے یونانی رومی شہروں

کی ریاستوں کے یورپ نے آٹھویں صدی قبل مسیح سے چوتھی صدی بعد مسیح تک تقریباً بارہ سو سال کی عمر پائی۔ دوسرا یورپ یا بالفاظ دیگر ٹیوٹانی یورپ جو قبائلی نظاموں کا مرکب تھا پانچویں صدی میں پہلے یورپ کی خاک سے اٹھا لیکن نویں صدی کے آخر تک ویران ہو چکا تھا۔ اس طرح یورپین سوسائٹی کا تسلسل دو مرتبہ ٹوٹا۔ تیسرا یعنی جاگیردارانہ نظام کے یورپ نے اپنا دور نویں صدی سے شروع کیا۔ رفتہ رفتہ ارتقائی منزلیں طے کر کے اس نے ایک مخصوص قسم کی تہذیب پیدا کی جس نے اپنا انتہائی عروج تیرھویں صدی میں حاصل کیا۔

تیرھویں صدی سے مغربی یورپ کے لوگوں نے جاگیردارانہ نظام سے نکلنا اور قومی حکومتوں کو نشوونما دینا شروع کیا۔ یہ کایا پلٹ کئی انقلابوں کا نتیجہ تھا جس نے اس خول کو توڑ دیا جس میں یورپ ازمنہ وسطیٰ میں بند ہو گیا تھا۔ اور اٹھارھویں صدی کے وسط میں یہ اپنی تکمیل کو پہنچا۔

روٹی انسان کے وجود کے لیے ضروری ہے لیکن انسان کی زندگی صرف روٹی تک تو محدود نہیں۔ اس پر روح کے مطالبات کا دباؤ پڑتا ہے جس کے تکمیل کی ضرورت کی شدت جسم کے مطالبات سے کہیں زیادہ ہو سکتی ہے۔ وہ امید اور خوف کے درمیان ہچکولے کھاتا رہتا ہے اور وہ کوشش کرتا ہے کہ یا تو وہ ان مطالبات کو پورا کرے یا ان کو بجھا دے ازمنہ وسطیٰ کے یورپ کا انسان ان بہت سے برائیوں سے فرار کی راہ اختیار کرنا چاہتا تھا جن میں ان ہولناک اوقات میں پڑ گیا تھا۔ اس کی روح زیادہ شریفانہ اور اخلاقی حیثیت سے زیادہ پاکیزہ کردار کے طور و طرز کے لیے بے چینی سے خواہش مند تھی۔ سوسائٹی کے اندر جو برائیاں آگئی تھیں ان سے وہ گھن محسوس کرتا تھا اسے رشوت خوری، ظلم اور تشدد سے نفرت محسوس ہوتی تھی۔ اس کا باطن اس امر پر سخت اصرار کر رہا تھا کہ دماغ کے بلند عزائم کی تکمیل ہو۔ اور یہ خواہش تھی کہ وہ بحیثیت انسان اپنے فوقیت کو ثابت کرے۔ اور ان بھاری بھاری معاشرتی و سیاسی بیڑیوں کو ڈھیلی کرے جن پر اس نے اپنی خاموش رضامندی دے رکھی ہے جو اس کی فطری آزادی کا گلا گھونٹ رہی تھیں۔

اس طرح تین لازمی اجزا یعنی فوج، اقتصادیات اور مذہب نے مل کر ازمنہ وسطیٰ کے یورپ کی معاشرتی، اقتصادی تنظیم کو ایک شکل میں ڈھال کر تیار کر دیا۔

اس نظام کی نشوونما میں تین سو سال لگ گئے۔ حتیٰ کہ تیرھویں صدی میں یہ اپنی

آخری ہیئت پر پہنچا۔ اس کے بعد اس میں بتدریج زوال شروع ہوا اور آخر کار جاگیر دارانہ مالیاتی نظام کی جگہ تاجرانہ سرمایہ داری نے لے لی۔ جو واقعہ پیش آیا وہ یہ تھا کہ سوسائٹی کی بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات کے لیے جاگیر دارانہ نظام کی پیداوار کا طریقہ ناکافی ثابت ہوا اور اس نے رابطہ کو توڑ دیا جو مزدور کو وسائل پیداوار کے مالکان سے جوڑتا تھا۔ آخری خاتمہ یورپ کے مختلف ملکوں میں مختلف اوقات میں پیش آیا۔ انگلستان سے جاگیر دارانہ نظام سترھویں صدی میں غائب ہوا۔ فرانس میں اٹھارھویں صدی کے آخر میں جرمنی اور روس اس کے بھی بعد۔

جاگیر دارانہ سوسائٹی کا مغز فوجی حکومت اور زمین کی کاشت کا مجموعہ تھی۔ اس کو انسان کو انسان کا ماتحت ودست نگر بنانے کے تعلق سے محفوظ کیا گیا تھا۔ جو اعلیٰ تھے انھوں نے اپنے ماتحتوں کی حفاظت کی ذمہ داری لی اور ان کو ضروریات زندگی مہیا کرنے کا یقین دلایا۔ ماتحت نے یہ عہد و پیمان کیا کہ اپنی خدمات پیش کرے گا۔ اور اپنی محنت سے جو پیدا کرے گا اس کا ایک حصہ دے گا۔ مددگار، احسان مند اور وفادار رہے گا۔ چونکہ ماتحت کی ضروریات زیادہ تھیں ترازو کا پلڑا اس کی جانب جھکا رہا۔ جس معاہدے کی رسی میں دونوں بندھے تھے وہ ذاتی تھا۔ اس نے دونوں کی باہمی ذمہ داریاں تسلیم بھی کیں اور عائد بھی کیں۔ اس طرح ایک بہ ترتیب مدارج سوسائٹی عالم وجود میں آئی۔

اس باترتیب مدارج نظام میں دو طبقے تھے۔ یعنی امرا یا اعلیٰ اقلیت جو زمین کے مالک تھے اور ان کے ماتحت عوام اور آزاد اور غلام دونوں جو مزدور فراہم کرتے تھے اور زمین جوتتے تھے۔ پھر مالکان زمین امرا دو حلقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ جنگ جو سورما اور پادری اس طرح تین جماعتیں تھیں۔ یعنی وہ جو محنت مزدوری کرتے تھے وہ جو لڑائیاں لڑتے تھے اور وہ جو دعا کرتے تھے اور جاگیر داری کے جسم کے یہی تین اعضا تھے۔

جاگیر داری کے گاؤں

جاگیر دارانہ سوسائٹی کی اکائی گاؤں تھے جس کا نام مختلف ملکوں میں مختلف تھا انگلستان میں اسے Manor (مینور یعنی تعلقہ) فرانس میں Seignieurie (سگنیئوری) اور جرمنی میں Grandherrshaft (گرانڈھر شیفٹ) کہتے تھے۔ موضع اور اس کا علاقہ عمارتوں، زراعت کے لیے پھیلے ہوئے کھیتوں، جانوروں کے چرانے کے لیے چراگاہوں

اور جلانے کے لیے اور دیگر ضروریات کی لکڑی کے واسطے جنگلات پر مشتمل تھا۔ گاؤں کی آبادی میں جھونپڑے اور کاشتکاروں کے رہنے کے مکان کے جھنڈ تھے۔ اور اگر اس گاؤں میں مالک رہتا تھا۔ تو اس کا محل اس کے متعلقات اور باغیچے ہوتے تھے۔ اور بعض حالات میں گرجا بھی ہوتا تھا گاؤں کی آبادی کے باہر کھیت پھیلے ہوئے تھے اور یہ دو نابرابر حصوں میں منقسم تھے چھوٹا حصہ گاؤں کے مالک کے لیے مخصوص تھا جسے لارڈ آف مینر یا لارڈ آف سگنیور کہا جاتا تھا۔ اور بڑا حصہ کاشتکاروں کے خاندان والے آپس میں بانٹے ہوئے تھے کاشتکار کی ہولڈنگ (آراضی) کو ورگیٹ (انگلستان میں زمین ناپنے کا پیمانہ جو عموماً ¼ ایکڑ کا ہوتا تھا) یا بارہ کہا جاتا تھا۔ اور اس کی عام مقدار 30 ایکڑ تھی۔ حصہ داروں کے ہر خاندان کا ایک مقررہ اور مسلسل قائم رہنے والا حصہ ہوتا تھا۔ جو چار ورگیٹ (ایک خاندان کی گذر اوقات کے لیے زمین مقررہ) سے ½ ورگیٹ ($\frac{1}{8}$ hide) کے درمیان مختلف مقداریں ہوتا تھا۔ لیکن ہر ایک حصہ نہ ایک ہی جگہ پیوستہ ہوتا تھا اور نہ ایک ہی رقبہ میں ہوتا تھا۔ بلکہ بہت سے لمبے اور پتلے ٹکڑوں کا مجموعہ ہوتا تھا۔ اور ہر ایک ٹکڑا عام طور پر ایک ایکڑ (220 گز لمبا اور 22 گز چوڑا) ہوتا تھا۔ جو ایک دن میں جوتا جا سکتا تھا۔ آراضی کے یہ لمبے پتلے ٹکڑے پھیلے ہوئے کھیتوں میں متفرق مقامات پر ہوتے تھے۔ دو ایسے ٹکڑوں کے درمیان جا بجا راستہ کے روڑے نیٹلڈ وغیرہ سوانغات یا غیر مزروعہ دوب کے تختے ہوتے تھے۔ اسی قسم کی تقسیم سے امداد باہمی کھیتی (کواپریٹو فارمنگ) کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ اس غرض کے لیے بڑے بڑے پہیوں والے ہل جنھیں آٹھ بیل کھینچتے تھے مل جل کر کام کرتے تھے۔ بلا پہیوں والے ہل بھی جو کسی مالک کاشتکار کی ملکیت ہوتے تھے استعمال ہوتے تھے۔

گاؤں والے وہ کل چیزیں پیدا کرتے تھے جو زندگی قائم رکھنے کے لیے ضروری تھیں یعنی کھانے کے لیے غلہ مثلاً گیہوں اور رائی (ایک قسم کا غلہ جو شمالی یورپ میں ہوتا ہے) پینے کے لیے فصل مثلاً جو اور انگور۔ مویشیوں کو کھلانے کے لیے فصل مثلاً Oats (جئی یا جو کی قسم کا ایک پودا) سیم اور مٹر۔ اور حرفت کے لیے فصل جیسے سن کے ریشے جن سے کپڑا بُنا جاتا تھا۔ فصل اگانے کا نظام ایک دو یا تین کھیتوں پر منحصر تھا۔ پیداوار بہت کم تھی کیونکہ جو ذرائع استعمال کیے جاتے تھے وہ ابتدائی زمانہ کے تھے اور انفرادی کاشتکار کو بہتر

طریقے استعمال کرنے کی طرف کسی قسم کی رغبت نہ تھی۔ اس طرح ایک بوشل (ایک پیمانہ جو 8 گیلن یا 29 سیر کا ہوتا تھا) غلہ بیج ڈال کر صرف چار یا پانچ بوشل پیدا ہوتا تھا۔ گاؤں میں بسنے والے یہ تھے (1) کاشتکار اور زمین پر کام کرنے والے۔ جو یا تو (فری مین) تھے یعنی ایسے تھے جو زمین سے بندھے ہوئے نہیں تھے۔ یا "سرف" یعنی ایسے جن کی خدمات زمین کے ساتھ منتقل ہو جاتی تھیں۔ یا گنوار دیہاتی تھے۔ (2) اہل حرفہ۔ جیسے بڑھئی، موچی، لوہار، جولاہے کاتنے والے یا تندور میں پکانے والے وغیرہ (3) مالک اراضی (لارڈ آف دی مینور) کے ملازمین یعنی محل دار، منتظم ریاست کارندے، یا داروغہ اور دوسرے عمال۔ مالک اراضی کی حیثیت کے مطابق (4) مالک اراضی کے خاندان کے لوگ اور اس کے ہمراہی یا اردلی اور (5) پادری، مقدم الذکر ایک سے تین غیر امرا طبقہ کے تھے اور آخری دو امرا طبقہ کے تھے۔

ان دونوں طبقوں کے عجیب تعلقات نے جاگیردارانہ سوسائٹی کو ایک مخصوص کیفیت عطا کی تھی۔ ان تعلقات نے ان کی زندگیوں کے ہر پہلو پر یعنی اقتصادی سماجی اور سیاسی۔ پر اثر ڈالا پیداوار کے انوکھے طریقوں سے ان تعلقات کا تعین ہوتا تھا اور یہ تعلقات اس وقت تک قائم رہے جب تک کہ ان کی جگہ سرمایہ داری نے نشوونما پاکر نہیں لے لی دسویں اور گیارہویں صدی میں دیہات کی آبادی "سرف" اور گنوار دیہاتیوں پر مشتمل تھی اس کے بعد "فری مین" نمودار ہوئے اور ان کی تعداد بڑھتی گئی حتیٰ کہ "سرف" کا وجود جن اصولوں پر قائم تھا ان کا خاتمہ کر دیا گیا۔ ہر "سرف" کے خاندان کو اپنے مالک سے ایک مکان اور ایک حصہ آراضی جو پھیلے ہوئے کھیتوں میں لمبے پتلے ٹکڑوں میں مختلف جگہوں پر تھا ملتا تھا۔ اس کے علاوہ ان کو سیراب زمینوں پر اگا ہوں اور جنگلات کے استعمال اور دریاؤں میں مچھلی مارنے کے حق میں بھی حصہ ملتا تھا۔ جوت کی اراضی پر پہلے بر بنا معاہدہ صرف زندگی تک حق رہتا تھا مگر جلد ہی اس میں وراثت کا حق بھی مل گیا۔ لیکن وہ شرائط جن کے ماتحت ان اراضیات پر قبضہ تھا بڑے ہی ظالمانہ تھے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ "سرف" کی (یعنی وہ جن کی خدمات زمین کے ساتھ منتقل ہو جاتی تھیں) حالت غلاموں سے بس ذرا ہی بہتر تھی۔ اس کو غلام کی طرح خریدا اور بیچا تو نہیں جا سکتا تھا لیکن وہ اپنے مالک (زمیندار) کو چھوڑ نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ زمین سے بندھا ہوا تھا۔ اگر وہ بھاگنے کی کوشش کرے تو جاگیردارانہ رسم و رواج زمیندار (لارڈ) کو حق دیتے تھے کہ وہ اس کا پیچھا کرے، اسے گرفتار کر لے اور اس پر جرمانہ کرے اور

نہ تو وہ اپنی زمین کو بلا اجازت بیچ سکتا تھا اور نہ علاحدہ کر سکتا تھا۔ پیداوار مہیا کرنے والے اور زمین کے مالک کے درمیان رشتہ جبر پر مبنی تھا جو قانون اور رواج سے اخذ کیے گئے تھے "سرف" کے فرائض کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا تھا۔ یعنی مقررہ اوقات میں خدمت انجام دینا۔ فاضل خدمت انجام دینا۔ اور زمین کو جو وہ استعمال کرتا تھا اس کے لیے نقد اور جنس میں معاوضہ ادا کرنا۔ پہلے حصہ کی سب سے ضروری خصوصیت ہفتہ کا کام تھا۔ اس پر لازم تھا کہ وہ عام طور پر ایک آدمی تین دن کے لیے مالک آراضی کی سیر پر کام کرنے کے لیے دے۔ اس کی خدمت میں اپنا ہل اور اپنے بیل جوتنے کے لیے اور گھوڑا اور گاڑی سواری کے لیے پیش کرنے۔

فاضل خدمات جن کو "بون ورک" (کارخیر) کہتے تھے یہ تھا کہ فصل پر وہ مالک کے کھیت کاٹے۔ غلّہ جمع کرے اور مالک کے محل تک پہنچائے۔ اس کو جھاڑیوں، مینڈوں، نہروں، خندقوں، سڑکوں، پلوں اور تالابوں پر کام کرنا ہوتا تھا اور اسے مالک کی بھیڑوں کی رکھوالی کرنا اور ان کو مونڈنا بھی ہوتا تھا۔ جنس میں ادائگی کھیت کی پیداوار پر مشتمل تھی کھیت جوتنے والے کو ہر سال غلّہ، جئی، گھاس، انڈہ، مچھلی، شراب، شہد اور موم میں سے ایک حصہ دینا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ جانوروں یعنی بیل، بھیڑ، سور اور بکروں پر بھی اسے ایک مقررہ مقدار میں نقد یا جنس ادا کرنی ہوتی تھی۔

بہت سی قانونی پابندیاں اور محاصل ایسے تھے جن سے نقدی دے کر ہی چھٹکارا ملتا تھا۔ سب سے پہلی قسم تو ان ٹیکسوں کی تھی جو ذاتی آزادی پر پابندی لگاتے تھے مثلاً ایک انفرادی ٹیکس جو ہر شخص پر لگایا جاتا تھا اور سالانہ ادا کرنا ہوتا تھا۔ شادی ٹیکس۔ یعنی لڑکی کی شادی کے لیے اجازت کا ٹیکس۔ تعلیمی ٹیکس۔ یعنی لڑکے کو اسکول بھیجنے کی اجازت کا ٹیکس۔ اور اگر کوئی "سرف" لاوارث مر جائے تو مالک اراضی کو اختیار تھا کہ وہ اس کی زمین پر قبضہ کرے اور وراثت کا ٹیکس وصول کرے جسے Heriot (وہ حق زمینداری مویشی روپیہ وغیرہ جو اسامی کے مرنے کے بعد زمین دار کو دیا جاتا ہے) کہتے تھے اور جس کا مطلب یہ تھا کہ جو زمین لینا چاہے وہ اپنا بہترین جانور نذر کرے۔ کاشتکار اپنے خاندان پر بھی ٹیکس دینے کا ذمہ دار تھا۔

دوسری قسم میں وہ محاصل تھے جن کا تعلق زمین پر حق کاشت سے تھا ان میں سے

ایک نقدی لگان تھا جو رسم ورواج نے قائم کیا تھا اور اگر اس کو نہ ادا کیا جائے تو تعلق دار اس کو بے دخل کر کے زمین پر قبضہ کر لیتا تھا۔ دوسرا "ریلیف" (نجات دہندگی) کہلاتا تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ کاشتکار کے مرنے پر اس کا وارث اراضی کو از سر نو حاصل کرنے کے لیے ایک سال کا لگان ادا کرے "تنخ" تیسرا تھا۔ اس کا منشا یہ تھا کہ فارم میں جو کچھ بھی پیدا ہو اس کا $\frac{1}{10}$ گرجا کو ادا کیا جائے۔ ان تینوں پر مستزاد دوسرے کئی محاصل تھے۔ مثلاً اپنی اراضی بیچنے کے لیے اجازت حاصل کرنے کی فیس سڑکوں پلوں بندرگاہوں اور دروں کے استعمال کے لیے فیس۔ غلہ، نمک، کھانے پینے کی چیزوں اور سوداگری کے مال کو بیچنے کے لیے محاصل اور عارضی دکانوں، بازار اور میلوں کے لیسنس کی فیس نقد اور جنس میں ادائیگی کے علاوہ تعلق دار کے معمولی کام بھی کرنے ہوتے تھے مثلاً مل میں اس کا غلہ پسوانا اور اس کے چمڑے کے کارخانے میں چمڑے کو کمانا وغیرہ۔ ان سب کے ماسوا وہ جنگل سے جلانے والی یا عمارت بنانے والی لکڑی کاٹنے اور چراگاہوں میں اپنے مویشی چرانے اور دریاؤں میں مچھلی مارنے پر بھی ٹیکس تھے۔

ان تمام محاصل کے بھاری بوجھ کے باوجود "سرف" کے کھیتی کی بنیادی خصوصیت اس کا غیر محفوظ ہونا تھا۔ کیوں کہ اس کو تعلق دار کے اختیار تمیزی کے خلاف کسی داد فریاد کی گنجائش نہ تھی۔ اپنے ہمسایوں کے خلاف وہ محل کی عدالت میں چارہ جوئی طلب کر سکتا تھا جس کی صدارت تعلق دار صاحب فرماتے تھے لیکن اس کو حکومت کی عدالتوں سے کوئی داد رسی نہیں مل سکتی تھی۔ اس کی حفاظت اگر کوئی کر سکتا تھا تو جاگیردارانہ رسم ورواج جس نے قانون کی حیثیت اختیار کر لی تھی یا پھر تعلق دار کی عملی ضروریات جس کا زرعی منافع اور اس کی سیر کا کام اس پر منحصر تھا کہ سرف "خوشی اور رضامندی سے خدمت انجام دے۔

لیکن "سرف" کی مصیبتوں کی داستان یہیں ختم نہیں ہو جاتی ہے اس کا کام ایسے تعلق دار کی ضیافت کرنا بھی تھا جو عام طور پر گاؤں میں نہیں رہتے تھے اور کبھی کبھی وہاں نگرانی کے لیے تشریف لاتے تھے۔ خود تعلق دار صاحب اور ان کے مصاحبوں کے گروہ، ان کے گھوڑوں، کتوں، باز وغیرہ سب کی شاندار دعوت کرنی پڑتی تھی۔ اور پھر غیر معمولی مواقع پر۔ مثلاً جب کوئی مکان بنایا جاتا تھا تو پتھر مہیا کرنا پڑتا تھا۔ اور بوجھ ڈھونے والے جانور اور گاڑیاں بھی دینی پڑتی تھیں پھر لڑائی کے زمانہ میں کسانوں کو تعلق دار کے محل کا پہرہ بھی

دینا پڑتا تھا۔ رکاوٹیں تعمیر کرنی پڑتی تھیں۔ استحکامات بنانے پڑتے تھے۔ خندقیں کھودنی پڑتی تھیں جنگلا اور کٹہرہ لگانا ہوتا تھا۔ اور مالک نے سا تھ ان ... مہم معرکوں کے سفر میں ساتھ بھی جانا پڑتا تھا۔

"سرف" اور "فری من" گاؤں کے محنت کش اور پیداوار پیدا کرنے والا طبقہ تھا۔ فری من کا حال "سرف" سے بہتر تھا۔ وہ ان سے اچھے مکانات میں رہتے تھے جن میں ایک صحن کے گرد متعدد کمرے ہوتے تھے اور ایک باغیچہ بھی ہوتا تھا۔ اراضیات میں ان کے حصے کی زمین بھی سرف ہی کی طرح گاؤں کے مختلف مقامات پر لمبے پتلے ٹکڑوں پر مشتمل تھی۔ اور رواج کے مطابق ہی ان کو بھی جوتا بویا جاتا تھا۔ لیکن حق قبضہ کے شرائط مختلف تھے۔ "فری من" زمین پر بحیثیت کاشتکار یا بٹائی دار دائمی حق کے ساتھ قابض تھے۔ ان کا لگان طے شدہ تھا۔ جس میں اضافہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اور نہ وہ بے دخل ہو سکتے تھے۔ وہ آزادی کے ساتھ اپنی اراضی بیچ سکتے تھے۔ اپنی مرضی سے اس کو جس طرح چاہتے استعمال کر سکتے تھے۔ اسے علاحدہ کر سکتے تھے یا اس کا بٹوارہ کر سکتے تھے۔ شرط صرف اس قدر تھی کہ وہ تعلق دار کے محاصل یعنی مقررہ لگان دیتے رہیں۔ اور از روئے معاہدہ باہمی جو خدمات طے تھے ان کو ادا کرتے رہیں۔ فری (آزاد) کاشت کاران بہت سی ان ذمہ داریوں سے بوجھل نہیں تھے جن سے کہ سرف بوجھل تھے۔ وہ اگر چاہیں تو گاؤں چھوڑ کر جا سکتے تھے۔ ان کو اپنے بچوں کی شادی کے لیے مالک کی رضامندی کی ضرورت نہیں تھی۔ ان پر کوئی پابندی موت پر یا گاؤں کے باہر سکونت اختیار کرنے پر کسی فیس کے ادا کرنے کی نہ تھی۔ اور نہ انفرادی ٹیکس تھا۔ اگرچہ "فری من" اپنے کاشت کی زمین معاہدے پر جوتتے تھے جس میں یہ طے تھا کہ ان کو کیا لگان دینا ہے اور کیا خدمات انجام دینی ہیں اور "سرف" کے برعکس ان کو یہ بھی حق تھا کہ اگر تعلق دار کے فیصلہ سے وہ ناراض ہوں تو بادشاہ سلامت کی عدالت میں اپیل کر سکتے تھے لیکن پھر بھی جہاں تک کاشت کاری کے سلسلہ کی کاروائیوں کا سوال ہے وہ "سرف" کے دوش بدوش تھے۔ وہ اپنے کھیتوں کے انتظام میں آزاد نہیں تھے۔ ان کی مجبوریاں بھی تھیں جہاں تک یہ سوال تھا کہ کب اور کہاں کس فصل کے بونے کی باری ہے یا گاؤں کی چراگاہ کے استعمال کا یا جھاڑیوں کے لگانے کا سوال تھا وہ پنچایت کے فیصلے کے پابند تھے فصل کے کاٹنے اور دانے کے وقت ان کو بھی ہلکے پھلکے کام بھی کرنے پڑتے

تھے۔

جو زمین تعلق دار کے لیے محفوظ ہوتی تھی اسے ان کی سیر کہتے تھے اور وہ صرف تعلق دار کے فائدے کے لیے جوتی جاتی تھی۔ وہ بھی دیہاتیوں اور فری من کے جوت کی طرح مختلف جگہوں پر بکھرے ہوتے تھے۔ یہ تمام ٹکڑے کسی ایک جگہ پیوستہ نہیں ہوتے تھے بلکہ پھیلے ہوئے کھیتوں میں دوسرے ٹکڑوں کی طرح ٹکڑوں میں بکھرے ہوئے ہوتے تھے۔ ان کے جوتنے اور کھیتی کرنے کا کام جزءً مزدور کرتے تھے جن کو جنس میں مزدوری دی جاتی تھی اور جزءً سرف کرتے تھے جن پر قانون اور رواج کے مطابق پابندی تھی کہ ہفتہ میں پابندی سے اور موسم کے اوقات میں بعض اوقات کار خیر (بون ورک) کے عنوان کے تحت کام کریں۔ اس طرح جوتنے، بونے، کاٹنے، داتنے اور غلّہ اکٹھا کرنے کے کام انجام دیے جاتے تھے غلّہ جو پیدا ہوتا تھا وہ زمیندار کی ملکیت تھا۔ [illegible] زمین اور [illegible] حالت میں رکھی جاتی تھیں اور ان کے مفاد کی بخوبی نگہداشت تھی۔

سب زمیندار گاؤں میں نہیں رہتے تھے اور جو گاؤں میں رہتے بھی تھے وہ گاؤں کے معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ زمیندار اپنے اختیارات کو افسران کی ایک جماعت کے سپرد کر دیتے تھے۔ وہ گاؤں کی آبادی میں ایک اہم عنصر تھے۔ وہ محل دار یا داروغہ محل، کارندے، گاؤں کے چودھری وغیرہ ملازمین ہوتے تھے۔ [illegible] جو کسی گاؤں کا انچارج ہوتا تھا اس کے سپرد معاملات کی عام نگرانی تھی اور وہ [illegible] قانون کا [illegible] تھا وہ مالک کے حقوق کی حفاظت کرتا تھا۔ گاؤں کے دورے کرتا تھا۔ اور اراضیات سیر کی نگرانی رکھتا تھا۔ وہ لگان کے حسابات اور خدمت گذاریوں پر بھی نگاہ رکھتا تھا۔ اور زمین دار کے عام مفاد کا محافظ ہوتا تھا۔ وہ زمین دار کے کارندوں اور دوسرے ملازمین اور عمال کی نگرانی کرتا تھا۔

کارندہ براہ راست سیر کے انتظام کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ وہ روزانہ کھیتوں اور چراگاہوں کا چکر اس غرض سے لگاتا تھا کہ دیکھے کہ کھیتی کے انتظام میں کسی قسم کا ڈھیلا پن تو نہیں ہے۔ اور ہر شخص اپنا وہ کام جو اس کے ذمہ ہے انجام دے رہا ہے۔ سیر کی اراضیات سے جو پیداوار ہوتی تھی اسے وہ فروخت بھی کرتا تھا۔

گاؤں کا طبقہ گاؤں کے چودھری کا انتخاب کرتی تھی اور وہ زمین دار اور کاشتکار کے

درمیانی کا کام کرتا تھا۔ وہ خود "سرف" ہوتا تھا اور اس کا حقیقی مفاد کاشتکاروں کے ساتھ تھا۔ منصب اور کام کے لحاظ سے اس کا رتبہ کارندے سے نیچے تھا۔ اس کی یہ ذمہ داری تھی کہ لگان وصول کرے اور آمدنی اور خرچ کا حساب رکھے۔ چودھری کو زمین دی جاتی تھی جس کا لگان جزوی یا کل معاف ہوتا تھا۔

ان کے علاوہ بہت سے نوکر ہوتے تھے جو اور ... سے کام کرتے تھے۔ وہ گاؤں کے باشندوں میں سے لیے جاتے تھے اور ان کو خدمات کا صلہ مختلف طریقوں سے دیا جاتا تھا۔ انہی میں چپراسی اور جمعدار تھے جو سمن اور احکام لے جاتے تھے آڈیٹر تھے جو حسابات کی جانچ کرتے اور استغاثوں کی شنوائی کرتے تھے۔ جنگلات کے پہرہ دار، بلواہے، گاڑی ہانکنے والے، گائے چرانے والے، سور چرانے والے گڈریئے تھے۔ اور دودھ اور پنیر کا بندوبست کرنے والی عورتیں تھیں۔ ان کے علاوہ کھانے کے میز کے مہتمم۔ تہ خانوں کے محافظ، اصطبل کے کانسٹیبل، کپڑوں اور اشیاء ضروری کے لیے حاجت، باورچی خانہ کے داروغہ، شکاری افسر جنگلات وغیرہ ہوتے تھے تعلق دار کی گھریلو ضروریات کے لیے کاریگر، درزی، اسلحہ ساز اور نانبائی وغیرہ کی خدمات درکار ہوتی تھیں۔ اور ہر کام پر ایک کارندہ نگراں ہوتا تھا۔

"سرف" اور فری مین" کے درمیان کارندے ایک خاص طبقہ کی حیثیت رکھتے تھے سرف کی طرح کارندے بھی بعض قانونی معذوریوں کے شکار تھے لیکن ان کو جوتنے کے لیے کھیت ملے ہوئے تھے۔ اور وہ تعلق دار کی ذات سے متعلق تھے۔

گاؤں کی اقتصادیات کے دو مقاصد یعنی گاؤں کے لوگوں کے جینے کے لیے سامان فراہم ہوتا اور تعلق دار کے لیے منافع کا حصول۔ یہ دونوں مقاصد گاؤں کی دو عملی مشین یعنی گاؤں کا طبقہ اور تعلق دار کی سیر کے افسران مہیا کر دیتے تھے۔ گاؤں کے طبقہ میں فری اور غیر آزاد کاشتکاران شامل تھے جن کو زمین کی جوت میں حصہ ملا تھا۔ اور جو گاؤں کے معاملات میں با اثر آواز رکھتے تھے۔

ہر کاشتکار کو ایک معین حصہ جوت کا دیا گیا تھا۔ جو متعدد ٹکڑوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ زمین باپ سے بیٹے کو وراثت میں ملتی تھی لیکن اس پر جوت کا حق صرف اس وقت شروع ہوتا تھا جب جوتنے کا آغاز ہوتا تھا اور جب فصل اکٹھا کر لی جاتی تھی ختم ہو جاتا تھا۔ درمیانی وقفہ میں

اراضیات گاؤں کے باشندوں کے اختیار میں رہتی تھیں کھیتی کے طریقوں اور زراعتی عمل کس وقت میں اور کیا کیا جائے ان کو پورا گاؤں طے کرتا تھا۔ قانوناً اُوسر زمین۔ چراگاہ اور سبزہ زار تعلق دار کی ملکیت تھے لیکن روزمرہ کا عمل دراصل اس طور پر تھا کہ گاؤں کا طبقہ ان کے انتظام کا حق ظاہر کرتا۔ اور گاؤں کے باشندوں کے ان کے استعمال کرنے کے حق کے بارے میں ضابطے مرتب کرتے تھے۔ جو ہر کاشت کار کے حصہ کی مقدار پر مبنی ہوتے تھے۔ عمارتی لکڑیوں کے لیے جنگلات جلانے کی لکڑیوں کے لیے جھاڑیوں Turf کے استعمال کے لیے بھی ضابطے تھے۔

زمین دار کی سیر کی اراضی کا گہرا تعلق گاؤں سے تھا۔ سیر کا منافع ایک تو اس زمین کے لگان سے حاصل ہوتا تھا جو کاشت کاروں کو جوتنے کے لیے دے دی جاتی تھی دوسرے جو کھیت باقی رہتے تھے ان کو کاشت کرنے سے ہوتی تھی۔ جن کے لیے سرف سے جبراً کام لیا جاتا تھا۔ اس کے ایک حصہ سے نوکروں کی تنخواہیں دی جاتی تھیں۔

گاؤں کی یہ دوعملی اقتصادی کیفیت جائداد کی ملکیت کے اصول کے تخیل کی مظہر تھی روما کے اصول کے مطابق جائداد کی اصل خصوصیت ایک اس کی ناقابل مصالحت اکائی ہے اس پر قبضہ تمام دوسرے آدمیوں کے حقوق کو کلیتاً ختم کر دیتا ہے۔ لیکن ازمنہ وسطیٰ کے جاگیر دارانہ نظام میں روما کے تخیلات میں انقلاب آگیا تھا۔ ملکیت جائداد دو حصوں میں منقسم ہو گئی تھی۔ ایک ہی زمین پر کئی جماعتوں کے مالکانہ حقوق تسلیم کیے جاتے تھے سب سے پہلے ملکیت کا اعلیٰ اور براہ راست حق تھا جسے ملکیت فرماں روا کہتے تھے۔ اور اس سے کمتر حق پیداوار سے نفع اٹھانے اور استعمال کرنے کا حق تھا جسے ملکیت نفع بخش کہا جاتا تھا۔ اس لیے نہ تو تعلق دار اور نہ کاشت کار زمین پر حقِ مالکانہ رکھنے کا دعویٰ کر سکتا تھا۔ جاگیر دارانہ اصول میں زمین بادشاہ کی ملکیت تھی۔ جو وہ زرعی امور میں اپنے مخصوص نائبین کو دیتا تھا اور وہ پھر بیرن (تعلق داروں) اور جاگیر داروں میں تقسیم کرتے تھے اور پھر انہی سے فری مین اور زرعی غلام زمین پاتے تھے۔

لیکن گاؤں کی اقتصادی زندگی میں جائداد کی ملکیت کی خواہ کچھ بھی نوعیت ہو تعلق دار یا زمین دار ایک مفت خور طفیلی تھا وہ کوئی ایسا کام نہ کرتا تھا جس کی اقتصادی اہمیت ہو۔ اور اس کے باوجود کل پھل (منافع) اس کو ملتا تھا۔ کاشت کار اپنی خورد و نوش کے لیے

زمین پر مشقت کرتا تھا لیکن اس کے وقت اور توانائی کا زیادہ حصہ زمیندار کی زمین پر صرف کرایا جاتا تھا۔

امرا اور فوجی نظام

اقتصادی نقطۂ نظر سے جاگیر دارانہ نظام ایک ایسا نظام تھا جس کی غرض غلہ کی پیداوار تھی۔ اس میں محنت کش طبقہ تھا۔ جو زمین جوتتا اور لگان ادا کرتا تھا۔ اور سال کے مقررہ وقتوں میں زمین دار کے یہاں کام کرتا تھا۔ زمین دار زمین کا مالک تھا اور تسلط رکھتا تھا۔ اسی کے ساتھ یہ ایک فوجی نظام بھی تھا حلقہ بگوش اسامیوں کا ایک طبقہ جن کو زمین دار کی طرف سے زمین ملتی تھی فوجی خدمت انجام دیتا تھا۔

یہ دونوں یعنی کاشت کار جو زمین پر محنت کرتا تھا اور حلقہ بگوش آسامی جو موضع کی حفاظت کرتے تھے۔ گاؤں کے اندر ایک ہی رشتہ میں جڑے ہوئے تھے۔ دونوں کو اپنے اپنے کام میں دخل اور کھیت ایک ہی طرح معاہدے کے تحت ملے تھے۔ دونوں کو رسوم آداب و تعظیم بجالانے پڑتے تھے۔ یعنی یہ تسلیم کرنا پڑتا تھا کہ وہ خدمت کریں گے دونوں کو حلف وفاداری و اطاعت لینی پڑتی تھی۔ دونوں کو زمین دینے کے وقت ایک سنجیدہ رسم منائی جاتی تھی اور زمین دینے کو اس طرح ظاہر کیا جاتا تھا کہ یا تو علم یا عصا یا دستاویز انتقال اراضی دیا جاتا تھا۔ البتہ فرق یہ تھا کہ کاشت کاروں کے معاملہ میں معاملہ کا شریک اعلیٰ یعنی تعلق دار کی نمائندگی ان کا داروغہ یا منتظم جائداد کرتا تھا۔ اور اس کے قبضہ میں جو کھیت رہتا تھا اسے Vileinage Socage یعنی زرعی غلام کا کھیت کہتے تھے اور لڑنے والے کو زمین ملتی تھی اور جسے Feudem یا Fief (جاگیر) کہتے تھے وہ اسے براہ راست تعلق دار سے ملتی تھی۔ جو رسم رذیل کاشت کاران کے بارے میں ہوتی تھی وہ سادہ ہوتی تھی۔ اور معزز کاشت کاران کی رسم زیادہ تفصیلات کی تکمیل کے ساتھ ہوتی تھی۔

کاشت کار کی جوت کی طرح جاگیر کے لیے (دیسل) وابستہ نظام جاگیرداری لگان دار کو متعدد فرائض اور محاصل ادا کرنے پڑتے تھے۔ دونوں رسوم آداب و تعظیم و اعلان وفاداری سے شروع کرتے۔ دونوں کی اولاد کو اس کے مرنے کے بعد جوت یا جاگیر

وراثتہً حاصل کرنے کے لیے معاوضہ دینا ہوتا تھا۔ لیکن یہاں بہر حال دونوں کی مماثلت ختم ہو جاتی ہے کیوں کہ جاگیرداری لگان دار (ویسل) اور کاشتکار کے مثبت و منفی ذمہ داریوں میں فرق تھا۔ حلف وفاداری لیتے وقت لگان دار وعدہ کرتا تھا کہ وہ زمین دار کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ اس کی ذات، جائداد، عزت یا اس کے خاندان پر کسی قسم کا حملہ نہیں کریگا لیکن اقرارجات دو رخے ہوتے تھے تعلق دار اور ان کے جاگیردارانہ لگان داران کے سورما (نائٹ) اور پشت پناہ ایک ساتھ رہتے تھے۔ ساتھ کھاتے تھے۔ معرکوں پر ایک ساتھ جاتے تھے اور محبت اور ایک دوسرے کے لحاظ کے رشتے میں یہ سب بندھے ہوئے تھے۔ ویسل کی ذمہ داری کا اظہار مدد اور مشوروں کے الفاظ سے ہوتا تھا۔ مدد میں فوجی خدمت شامل تھی۔ ویسل لوگوں پر یہ پابندی تھی کہ سال میں کم سے کم چالیس دن لڑائیوں میں یا قریب کی اراضیات پر معرکوں میں ساتھ جائیں۔ وہ لڑائی میں تعلقہ دار کے جسم کی حفاظت کرتا اور اس کی قلعہ بندیوں پر فوج کی حیثیت سے رہتا تھا۔ ان سے امید کی جاتی تھی کہ تعلق دار کی خدمت میں حاضر رہیں اور ذاتی خدمات انجام دیں۔ اس کے علاوہ اُسے تعلقدار کی امداد نقد اور جنس سے بھی کرنی پڑتی تھی۔ مثلاً تعلقدار کی گدی نشینی پر سوغات پیش کرتا تعلقدار کے بدل جانے پر راحت کی رقم دیتا اور جاگیر بیچنے کی اجازت کے لیے فیس دیتا غیر معمولی مواقع غیر معمولی امداد کا مطالبہ کرتے تھے مثلاً مجاہدین کے اخراجات ادا کرنا۔ اور اگر لڑائی میں تعلقدار گرفتار ہو جائے تو اس کی رہائی کے لیے فدیہ ادا کرتا۔ یا جب اس کی لڑکی کی شادی ہو یا ان کے بیٹے کو نائٹ بننے کا موقع ہو تو اس میں چندہ دیتا۔

فرائض کی دوسری قسم مشورہ دینا تھا۔ اس میں یہ شامل تھا کہ تعلقدار کی عدالت پر اور ویسل لوگوں کے ان خاص جلسوں کے مواقع پر جو جنگ یا صلح یا رواج کے ضابطوں میں تبدیلی پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوں حاضر باش رہے اور ویسل صاحبان کے باہمی تنازعوں پر عدالتی غور و فیصلہ کے لیے عدالتی فرائض انجام دے۔

جاگیردارانہ امرا بلحاظ ترتیب مدارج کئی طبقوں میں بٹے ہوئے تھے سب سے اونچے طبقہ میں تو شرفا تھے جن کے اعزازی خطابات مثلاً کنگ (بادشاہ) ڈیوک، ارل، مارکوئس کاونٹ تھے۔ یہ لوگ کئی گاؤں کے مالک ہوتے تھے۔ اور لڑائی کے اندر بہت سے سواروں کو لاتے تھے۔ دوسرے طبقہ میں وہ شرفا تھے جن کے پاس کوئی سرکاری خطاب نہیں تھا۔

یہ بھی کئی گاؤں رکھ سکتے تھے۔ اور سواروں کے ایک دستے کے کمانڈر ہوتے تھے۔ ان کو عام طور پر بیرون سیگنیور یا لارڈ کہتے تھے۔ نائٹ صرف ایک سیر کی اراضی رکھتا تھا یا ایک گاؤں یا گاؤں کا ایک جزو۔ وہ اپنے تعلقدار کا ملازم تھا۔ جس سے اس کو اراضیات سیر ملی تھیں سب سے نیچے کے طبقہ میں اسکوائر تھے۔ یہ لوگ اپنی زندگی نائٹ کے نوکر کی حیثیت سے شروع کرتے تھے۔ اس نظام میں پوزیشن (درجہ) کا تعین جاگیر میں اراضی کی مقدار اور اس بات پر ہوتا تھا کہ ان جنگ جو آدمیوں کی تعداد کیا ہے جن کی وہ کفالت کر سکتا ہے۔

پادری اور کلیسا

جاگیردارانہ سوسائٹی میں جنگ آزمودہ سپاہیوں اور کھیت پر مشقت کرنے والوں کے سوا ایک تیسرا طبقہ بھی تھا۔ یعنی پادری، راہب اور گرہست۔

ازمنہ وسطیٰ میں زندگی کے حالات انتہائی سخت تھے اور معیار زندگی انتہائی پست تھا۔ دولت کی پیداوار کم سے کم تھی کیوں کہ اصول و طریقہ کاشت قدیم ترین وضع کا تھا۔ جیسے ہی کاشت کار کھیت پر اپنے قدم رکھتا تھا اس کے انگوٹھے اس کے گھسے ہوئے جوتوں سے باہر نکل آتے تھے اور اس کے موزے اس کے گھوڑے کے پچھلے پاؤں کے گھٹنے کی ہڈی کے پاس ہر طرف لٹکتے تھے اور اس کی عورت کا یہ حال تھا کہ وہ ننگے پیر برف پر چلتی تھی تاآنکہ اس سے خون نکلنے لگتا تھا۔ ان کو بے رحمی سے اپنے مفاد کی خاطر استعمال کیا جاتا تھا۔ اور غلام جانوروں کی طرح خریدے اور بیچے جاتے تھے۔ اور لوہے کی چھڑی سے پیٹے جاتے تھے ان کو مشکل سے آرام کرنے یا سانس لینے کی اجازت ملتی تھی۔ تعلقدار کے کارندے کو اکثر "کھال ادھیڑنے والا" کا لائق رشک خطاب ملتا تھا۔ نہ ختم ہونے والی لڑائیاں، تشدد، خون ریزی اور غارت گری اس زمانہ کی نمایاں خصوصیت تھی تعلقدار کے عام مشاغل جنگ، شکار اور ٹورنامنٹ تھے۔

سوسائٹی کے تین طبقوں میں زندگی کی نفاستوں اور لطافتوں کے لیے کاشتکار کے پاس ذرائع نہیں تھے اور جنگجو قوم میں کوئی عزم وارادہ نہیں تھا۔ اس لیے لوگوں کی اخلاقی اور مذہبی ضروریات کو پورا کرنے کے کام کی ذمہ داری پادریوں پر عائد ہوتی تھی۔ وہ مذہبی اور ذہنی ضروریات پوری کرتے تھے اور اپنی پاکبازی اور علم کی وجہ سے بہت لائق

احترام سمجھے جاتے تھے۔

پادری یا گرجا کا نظام ایک کلیسیائی درجہ وار ترتیب کا نظام تھا جس کے سربراہ پاپائے مقدس تھے۔ اس نظام میں اوپر کے درجہ کے پادری میں بشپ پرے بسٹرین یا قیس اور ڈیکن (یعنی تیسرے درجہ کا پادری بشپ اور قیس کے بعد) ہوتے تھے بشپ (بطریق) ایک تعلقہ کا انچارج ہوتا تھا۔ جو ابتدائی زمانہ میں اس قطعہ ملک کے برابر ہوتا تھا جس پر صوبہ کا ایک گورنر فرماں روائی کرتا تھا وہ اپنی مملکت میں اصول کی پابندی ڈسپلن اور اپنے حدود میں نظم ونسق کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ وہ اوقاف کی آمدنی وصول کرتا اور اسے مستحقین کو دیتا تھا وہ پادریوں کی ٹرینگ کی اور ان کے معاش کا انتظام کرتا تھا۔

شروع میں پادریوں کو حکومت سے مالی امداد ملتی تھی اور مذہبی کام کے لیے وہ اس کے وزیر تصور کیے جاتے تھے۔ جس طرح جاگیر دارانہ نظام نشوونما پاتا گیا یہ لوگ شاہی افسران میں ضم ہو گئے۔ ان کو ایک علاقہ بطور گرانٹ (عطیہ) دیا جاتا تھا جن سے انتظامی فرائض وابستہ تھے۔ یہ جاگیریں جزء کلیسیائی اغراض کے لیے اور جزء تاج کی فوجی خدمات کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ ان عطیات کے شرائط اسی نمونہ کے ہوتے تھے جس نمونہ کے امرا کے عطیات کے شرائط تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ اصولاً تو یہ لوگ منتخب ہوتے تھے لیکن عملی حیثیت یہ تھی کہ ان کو دربار شاہی امرا میں سے نامزد کرتا تھا۔

قیس اور تیسرے درجہ کے پادری (ڈیکن) بشپ (بطریق) سے وابستہ ہوتے تھے اول الذکر مذہبی رسوم کی ادائیگی میں مدد کرتے تھے اور موخر الذکر انتظامات میں۔

نیچے درجہ کے پادری کسی ضلع کے ایک ایسے حصہ کے جہاں ایک گرجا یا پادری ہو ذمہ دار ہوتے تھے یا گاؤں یا چھوٹے چھوٹے قصبات یا چھوٹے چھوٹے گاؤں یا کسی دیہات کے ایک مکان کے گرجا کے انچارج ہوتے تھے۔ ان سب کی تقرری بانیان نظام کلیسا کی جانب سے ہوتی تھی۔ جو زیادہ تر تعلقوں کے فرماں روا ہوتے تھے اور ان کو زمین بطور وقف دیتے تھے۔ قدرتی بات ہے کہ اس کلیسیائی حلقہ کے یہ پادری جن کی آمدنی وقف سے تھی اور جو پارسن اور پریسٹ کہلاتے تھے اپنے محسنوں کے ماتحت ہوتے تھے اور بشپ کا ان پر کوئی اقتدار نہ تھا۔ اس طرح وقف کی زمین پادریوں کو جاگیر دارانہ گرہ میں باندھ

کر ان کو ایسے روسائے انگلستان سے وابستہ رکھتی تھی جو دارالامرا کے رکن تھے۔ مگر قانونی معاملات میں ان کو شرکت کا حق نہ تھا۔ دنیا دار لوگوں کی فیاضی اور کوشش سے رہبانیت کے لیے عمارتیں (خانقاہیں) اور تنظیمات کھڑی ہو گئیں۔ یہاں وہ لوگ پناہ لیتے تھے جو اپنے دنیوی ماحول سے متنفر ہو جاتے تھے۔ یہاں رہبانیت پر عمل کرتے تھے۔ اور مذہبی رسوم میں زندگی گزارتے تھے۔ ان خانقاہوں نے سوسائٹی کی عظیم خدمات انجام دیں۔

انھوں نے اطراف ملک میں ایمان کی روشنی پھیلائی۔ لوگوں کو کلیسائی عبادت اور دعا کے طریقے، قرب ربانی کے لیے ریاضتیں اور زندگی کے طور و طرز سکھائے۔ انھوں نے مجموعی مذہبی مقاصد اور ملک کی ضروریات کا اظہار کیا۔ کلیسائی نظام کے اراکین عام طور پر امرا کے طبقہ کے ہوتے تھے۔

اگرچہ شروع شروع میں یہ تینوں گروہ تقریباً ایک دوسرے سے الگ تھلگ تھے لیکن رفتہ رفتہ مل کر ایک نظام عالمی کلیسا کا بن گیا۔ جس کا مرکز روما تھا۔ یہ نظام جاگیردارانہ نظام کا جزو نہیں تھا لیکن اس سے جڑا ہوا ضرور تھا۔

ازمنہ وسطیٰ کی زندگی میں کلیسا کی خدمات کا ایک اہم حصہ ہے۔ جہاں تک افراد کا تعلق ہے کلیسا نے اس کے لیے اخلاقی معیار مرتب کیے۔ اس کے عقائد مدون کیے۔ جس سے اس کی زندگی پر مذہبی فضا طاری ہو گئی۔ وہ اہم منازل جن سے انسان پیدائش سے موت تک اپنی زندگی میں گذرتا ہے وہ سب ایسے مواقع ہوتے تھے جب پادری مذہبی رسوم ادا کرتے تھے۔ جو باطنی اور روحانی افضال الٰہی کی علامت مانے جاتے تھے روزمرہ کے اوقات پر ان کی نگرانی کرنے والی نگاہ اقبال جرائم اور تپشیا سے رہتی تھی۔

انسان کی تقسیم پادری اور دنیوی انسان میں کلیسا کے اس حق سے کہ وہ پادری کا متبرک منصب کسی کو تفویض کر سکے متعلق تھی۔ کلیسا نے ضبط نفس سکھایا اور پرامن کاموں کے لیے مواقع فراہم کیے اس نے اتوار کو تہوار کا دن قرار دیا۔ اور ہفتہ کے آخری دنوں کو خدا کے امن و صلح کا دن قرار دیا اس طرح مسلسل مشقت کو روکنے کی کوشش کی۔ پادری بے راہ رو سپاہیوں کے ضمیر کا محافظ تھا۔ جن کو بجز خدا کے عقبہ اور قیامت کے دن کے اور کسی چیز کا خوف نہ تھا۔ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے پرزور خطابت اور اس دھمکی سے کہ ان لوگوں پر جو نافرمانی کریں گے ابدی نجات کا دروازہ بند کر دیا جائے گا۔ انھوں نے نظم و ضبط

ملکی اور قانون کی پابندی کی زور دار تائید کی۔ اس طرح ان کو سیاسیات اور اقتصادی معاملات میں اثر حاصل ہو گیا۔

(اسقف اعظم یا صدر راہب) منصب کے لحاظ سے اونچے سے اونچے درجہ کے امرا کے برابر تھے بشپ (بطریق) اور اباٹ (راہبوں کی خانقاہ کا صدر) کے پاس وابستہ نظام جاگیرداری اسامیاں تھے۔ اور ان کے کارپردازوں کی ایک فوج تھی جو ان سے جاگیردارانہ نظام کی رسی میں بندھے ہوئے تھے۔ وہ حکومت کے معاملات میں مداخلت کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ لڑائیوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ بہت سے مشیر کار اور منتظم کا کام کرتے تھے۔ کلیسانے اقتصادی امور کو بھی باقاعدہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے چیزوں کے مناسب دام مقرر کیے اور سود در سود کی ممانعت کی۔

اپنی اصل اور نوعیت کے لحاظ سے جاگیردارانہ نظام کے اندر اختیارات کی لامرکزیت مضمر تھی۔ یعنی اقتدار اعلیٰ کی ٹکڑے ٹکڑے تقسیم "بیومانوائر" نے جو ازمنہ وسطیٰ کا ماہر قانون اور جاگیردارانہ قوانین اور رواج پر سند کی حیثیت رکھتا ہے فیصلہ دیا ہے کہ ہر بیرن (وہ امیر الامرا جس کو لارڈ کا خطاب ہو) اپنے تعلقہ کے اندر اقتدار اعلیٰ کا مالک ہے۔ ہر ویسل کو پرائیویٹ (ذاتی) لڑائی لڑنے کا حق ہے۔ بادشاہ کو بیرن کی رضامندی کے بغیر اس کے علاقہ میں کسی حکم کے مشتہر کرنے کا حق نہیں ہے۔ تمام قوانین جن کے اندر ٹیکسوں کا لگانا بھی شامل تھا ایک نظام مرتب کرتا تھا اور ویسل لوگوں کی رضامندی سے ان پر تعلقدار کے دربار میں غور خوض ہوتا تھا۔

انصاف دینے کے طریقے بھی لامرکزی تھے۔ صرف فوجداری کے وہ مقدمے جن کی سزا سر قلم کر دینا یا ہاتھ کاٹ دینا ہوتی وہ شاہی عدالت میں لائے جاتے تھے۔ چھوٹے مقدمات مقامی امرا کی عدالتوں سے فیصل کیے جاتے تھے تعلقہ اور موضع کے لوگ مقامی انصاف کی عدالتوں کے مرکز کے طور پر کام کرتے تھے تعلقدار کی عدالتیں تمام کاشتکاران پر مشتمل ہوتی تھیں یعنی کل فری من اور صرف ان کا حق اختیار سماعت نہ صرف چھوٹے فوجداری مقدمات میں حاصل تھا بلکہ زمین کی جوت کے سلسلے میں اور ویسل آزاد یا غیر آزاد لوگوں کی ذات کے بارے میں جو دیوانی مقدمات ہوتے تھے ان میں بھی حاصل تھا۔

صرف جہاں تک زرعی غلاموں کے ... تھے تعلقہ کی عدالت کا فیصلہ قطعی ہوتا

تھا۔ لیکن فری مین کا سوال آتا تھا تو تعلقدار زرعی معاملات میں مداخلت کر سکتا تھا۔ اور فوجداری کے مقدمات میں شاہی عدالت فیصلاوں پر نظر ثانی کر سکتی تھی۔

جاگیر دارانہ اقتصادی نظام محدود Closed System تھا اس کی بنیاد زراعت پر تھی جو قدیم ترین طرز کا تھا۔ کاشت کار کی پیداوار معمولی ہوتی تھی اس لیے بہت کم بچتا تھا۔ اس سے صرف زندہ رہنے تک کی ضروریات پوری ہوتی تھیں۔ گاؤں کے لوگ اس سے اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ اور جو باقی بچتا تھا وہ گاؤں کے لوگ Flax (اسی کے ریشے جس سے کپڑا بنا جاتا ہے) اون اور چمڑا بھی تیار کرتے تھے۔ گاؤں کو نمک، لوہا۔ مصالحہ، کپڑا اور دھات کی چیزوں Metalware کی درآمد اپنے غلہ Flax اون اور چمڑے کے بدلے میں کرتے تھے۔ بازار میں اشیا کی تعداد محدود اور مقدار معین ہوتی تھی۔

گاؤں کی جو عام اقتصادی کیفیت تھی اس میں روپیہ یا سرمایہ کسی طرح درکار ہی نہ تھا کام کو بانٹ کر کرنے یا کسی کام میں مہارت پیدا کرنے کی ذرا بھی گنجائش نہ تھی۔ جاگیر دارانہ نظام حرکت میں خواہ وہ اوپری سطح سے ہو یا بغل سے رکاوٹ تھا۔ دو فرقے امرا اور کاشتکاران نہ عبور ہونے والی خندق سے ایک دوسرے سے الگ تھے۔ انسان کے مرتبہ کی بنیاد یا تو پیدائش تھی یا دولت۔ مالیات کا آدمی جو مشقت کرتا اور پیدا کرتا تھا اور سیاسی آدمی جو لڑتا اور حکومت کرتا تھا ان دونوں کے درمیان نوکر او مالک کا رشتہ تھا۔ اس لیے زندگی میں اجتماعیت اور باہمی مفاہمت کی گنجائش نہیں تھی۔ سیاسی حیثیت سے جاگیر دارانہ کلیسائی حکومت کے اجزا آپس میں ایک ڈھیلے رشتہ میں بندھے ہوئے تھے ہر جزو مالی حیثیت سے خودکفیل تھا۔ اور انتظام (یعنی پولیس اور عدالت) کے معاملات میں اندرونی طور پر آزاد تھا۔ بادشاہ اور مرکزی حکومت کا اقتدار ویسل اور گاؤں پر بہت ہی ہلکا تھا۔ کیوں کہ درمیانی جاگیر دارانہ نظام کے امرا نے حکومت کے اندر حکومت قائم کر لی تھی البتہ انگلستان ایک استثنا کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں نارمن حکمرانوں نے جاگیرداری امرا کے کاشت کاروں پر براہِ راست اپنا دخل رکھا تھا۔ بقیہ یورپ میں فرماں روا رعایا پر جو امرا کے تعلقہ میں بستے تھے براہ راست حکم جاری نہیں کر سکتے تھے۔

ایسا کہنا کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ ازمنہ وسطےٰ کے یورپ کے ممالک گاؤں کی با اختیار ملکتوں کا ایک ڈھیر تھا اور گاؤں کی کل تحریک تعلقدار کے فوجی اغراض اور سیاسی مقاصد کی تابع

تھی۔ لیکن ہر چھوٹے سے چھوٹے گاؤں کی حکومت پوری طرح منظم تھی۔ اور جب تک یہ قائم
رہی یہ ایک کارگذار مشین تھی۔ اس کے رسم ورواج اور ضابطے جزئیات پر حاوی اور مکمل
تھے اور ان کا اعزاز تھا۔ اور ان پر عمل درآمد بلا کسی کم بیش کے ہوتا تھا۔ ان کی خلاف ورزی پر
باضابطہ عدالتیں سزائیں دیتی تھیں۔ قانون سازی گاؤں کے گروہ کے اجتماع یا تعلقدار
کے دربار کی جماعتوں میں ویسل اور فری من شامل ہوتے اور بلا کسی ہچکچاہٹ کے کام
کرتے تھے۔ اجرا احکام کے نظام میں محل دار اور کارندے وغیرہ اپنے فرائض وفاداری
سے انجام دیتے تھے۔ ان کی عدالتیں فوجداری (چھوٹے مقدمات) اور دیوانی کے معاملات
کا فیصلہ منظور شدہ رواج اور قانون کے مطابق بلا کسی ذاتی وجوہ سے بے جا تعصب
سے متاثر ہوئے کرتے تھے۔

مذہبی امور میں افراد اور سوسائٹی دونوں کلیسا کے گہرے اثر میں تھے لیکن ان کا
استعمال اہم حدود کے اندر ہوتا تھا۔ مسیحی مذہبی کتابیں جن میں کلیسا کے احکام اور ہدایات
درج تھے عام طور افادہ روحانی کی کتابیں تھیں۔ جو انسان کے ظاہری طور وطرز سے
زیادہ اس کی باطنی زندگی سے تعلق رکھتی تھیں۔ یعنی کردار کی تفصیلات کے بجائے دماغی فکر
اور روحانی لطافت سے متعلق تھیں۔ انھوں نے شادی، وراثت جائداد کے اقسام اور
انسانی مدارج کے لیے کوئی قواعد متعین نہیں کیے۔ وہ قواعد وضوابط جو قانون مسیحیت میں
مرتب کیے گئے تھے وہ کلیسا کے احکام پر مبنی تھے لیکن ان کے خلاف آواز اٹھائی جاسکتی
تھی۔ اور اس سلسلہ میں احکام الہیہ جو مذہبی کتابوں میں درج تھے ان کا بطور دلیل حوالہ
دیا جاسکتا تھا۔

جاگیردارانہ دور کی خاص کیفیت اس کی تخصیص پسندی تھی۔ لیکن عالمگیریت سے
مصالحت کی وجہ سے اعتدال بھی تھا۔ اس عالمگیر رومن امپائر کے خیالات اب بھی دماغوں
میں باقی رہ گئے تھے اور حوصلہ مند شہزادوں کو رغبت دلاتے تھے کہ قدیم روایات کو دوبارہ
زندہ کریں۔ یورپ کے تمام بسنے والوں میں مذہبی عقائد مشترک تھے۔ اور اس کی ریڑھ
کی ہڈی یہ تھی کہ عیسائیوں کی ایک معاشرتی وسیاسی جماعت ہو یا ملت ہو۔ کلیسائے روما
کے زیر نگرانی مغربی مسیحی تنظیم کی وحدت نے ایک مثال قائم کردی تھی۔ مشترک احکام و
ہدایات۔ مشترک رسم ورواج، مشترک تیوہار اتحاد کی جانب مضبوطی سے کھینچنے والے

تھے۔ ان میں مزید کمک اس سے پہونچتی تھی کہ تعلیمی نظام سب کے لیے یکساں تھا۔ زبان ایک ہی تھی۔ لاطینی تعلیم کے لیے ایک نصاب تھا۔ اور بین الاقوامی اسکول اور یونیورسٹیاں تھیں اس کے علاوہ اقتصادی حالات بھی یکساں تھے اور قومی تخصیص پسندی نائب تھی۔

دنیوی معاملہ میں اندرونی آزاد تعلقے اور جاگیریں بڑے لارڈ۔ کاونٹ ارل اور ڈیوک کے زیر اطاعت تھے۔ جن سے ان کو املاک وقف ملی تھیں۔ بڑے لارڈ اپنی جگہ مخصوص کانسٹلان تھے اور بادشاہ کے اطاعت گذار۔ بادشاہتیں مقدس رومن امپائر کی جاگیرداریاں متصور ہوتی تھیں۔ جن کو شارلیمین نے 880ء میں نئی زندگی عطا کی تھی۔ اور جن کی تعبیر تو جرمن بادشاہوں نے کی ان کا دعویٰ تو یہ تھا کہ ان کی حکمرانی تمام عالم پر ہے مگر ان کے احکام جرمنی اور اٹلی کے باہر کبھی نہیں چلے۔

مذہبی سطح پر کلیسائی مذہبی نظام پاپائے مقدس کو اپنا پیشوا تسلیم کرتا تھا اس کے بعد کارڈی نل۔ بشپ اور اوپر کے درجہ کے پادری تھے اور پھر نیچے طبقے کے پادری جاگیردارانہ نظام دو اعلیٰ افسران کو تسلیم کرتا تھا۔ ایک دنیوی حکومت کے لیے اور دوسرا مذہبی مدارج وار نظام کے لیے۔ ان دونوں میں کس کو فوقیت حاصل تھی۔ یہ ایک طویل نزاع کا معاملہ رہا تیرھویں صدی میں پاپائے مقدس اعلیٰ ترین حاکم سمجھے جاتے تھے۔ مگر جلد ہی حالت بدل گئی۔ اور بادشاہوں نے ان کی برتری تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

شہری زندگی

جاگیردارانہ سوسائٹی اصلاً دیہی تھی لیکن سوسائٹی کے اندر اور اس کے ایک عنصر کی حیثیت سے ایک دلچسپ چیز نشو و نما پا رہی تھی یعنی شہریت کا ارتقا۔ چونکہ آخر کار یہی ارتقا جاگیردارانہ نظم کی بربادی جاگیردارانہ سوسائٹی کی ہیئت کی تبدیلی اور قومی (نیشنل) سوسائٹیوں کے عود کرنے کا ذمہ دار ہوا اور چونکہ اسی طرح کا ارتقا ہندوستان میں انیسویں صدی کے شروع تک ظاہر نہیں ہوا اس لیے اس بات کا سمجھنا دلچسپ ہوگا کہ اس ارتقا کے اسباب کیا تھے۔ اور اس کے وہ منازل کیا تھے جن سے گذر کر یورپ کی سوسائٹیوں میں یہ عظیم تبدیلی پیدا ہوئی۔

وحشیوں کے حملے جنہوں نے رومن امپائر کا چراغ گل کر دیا ان روما کے شہروں کی

بربادی اور یورپ کے پھر قدیم قبائلی دیہی زندگی پر لوٹنے کی ذمہ داری ہے۔ لیکن جب ترک وطن اور تباہ کرنے کے عمل کا سیلاب تھا۔ اور تارکین اقامت پذیر ہوگئے تو نئی قوتوں نے شہری زندگی کو نئی بنیادوں پر تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ پہلے ایک گاؤں اور ایک شہر میں مشکل سے کوئی فرق تھا کیوں کہ دونوں تجارت صنعت اور زراعت کے تابع تھے اور گاؤں خود کفیل تھا اور گاؤں کے اہل حرفہ چند ضروری سادہ چیزیں جن کی گاؤں کو ضرورت تھی تیار کر لیتے تھے۔

لیکن نئی نئی ضرورتیں پیدا ہوئیں۔ جنہوں نے گاؤں کی خود کفالتی پر اثر ڈالا۔ ڈنمارک کا انگلستان پر حملہ اور شمالی آدمیوں کے یورپ کے شمالی ملکوں یورش میں کر کے گھس آنے نے لوگوں کو مجبور کیا کہ قلعوں اور محلوں میں پناہ لیں۔ جن کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں اور پانی سے لبریز خندقیں ہوں۔ اس طرح جنگ اور تشدد ایک ایسا عنصر تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ ایک جگہ زیادہ تعداد میں جمع ہوئے اور اسی سے شہر کی ہیئت بنی۔ دوسری وجہ بیسیوں خانقاہوں کی بنیاد قائم ہونا تھا چونکہ یہ خانقاہیں امن اور استحکام کی مظہر تھیں یہ فن اور حرفت کے مرکز بن گئیں اس کے علاوہ ان جگہوں نے اس وجہ سے اہمیت اختیار کر لی اور لوگوں کو یہاں آنے کی رغبت دلائی کہ یہ مقامات بڑے وقف کے موقوفہ تعلقوں دینوی اور کلیسائی دونوں کے مرکز تھے۔ پھر جغرافیائی پوزیشن تھی۔ یہ مقامات گھاٹ یا چوراہوں یا دریاؤں کے کناروں یا ساحل سمندر پر واقع تھے اس لیے تجارت اور کاروبار کے فروغ کے لیے سہولتیں فراہم کرتے تھے۔

شہروں کی زندگی ان کی صنعت اور تجارت پر قائم تھی۔ ان کا احیاء جدید اور نشوونما ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ میں سب سے زیادہ دھماکہ خیز واقعہ ثابت ہوا۔ گیارھویں صدی میں تجارت سے بے داری شروع ہوئی

انگلستان اور سسلی کو نارمن قوم کے فتح کر لینے پر تگال میں عیسائی طاقت کے ابھرنے اور اسپین کے موڑ پر فتح یابیوں نے سفر اور مہم جوئی کے جذبات ابھارے جن کا بیوپار (بڑے پیمانہ کی سوداگری) پر بہت اچھا اثر پڑا انگلستان، فرانس، اسپین اور علاقہ متوسط ایک دوسرے سے مل گئے اور تجار کپڑے، سلک، اون، دھات کے برتن لڑائی کے ہتھیار، بربری گھوڑے نارنگیاں، چکوترے اور شراب جیسی اشیا کو ان علاقوں میں ایک

جگہ سے دوسری جگہ حرکت دینے لگے۔

اس کے بعد صلیبی مجاہدین آئے۔ ان لوگوں نے یورپ کے غیر متمدن اور پسماندہ لوگوں کا مشرق کی اعلیٰ تہذیب سے ربط قائم کرایا۔ ان مذہبی لڑائیوں نے بھی تجارت کی رفتار کو تیز کر دیا۔ وینس، جینوا، پیسا، بارسیلونا، مارسیلیز کے تجار مشرق سامان تعیش لیوانٹ کے بندرگاہ پر خریدتے تھے۔ یہ سامان قافلے دمشق اور بغداد اور مصر اور ایران اور ہندوستان سے وہاں لاتے تھے اور پھر یہ تجار یورپ کے تمام ممالک میں پہنچاتے تھے۔ میلے لگتے تھے اور تجارتی قافلوں کے راستوں پر جہاں روشن خیال جاگیر دارانہ امیر الامرا کی فوجی طاقت سے یا خانقاہ کی پاکیزگی امن و امان کی ضمانت ہوتی تھی بازار بس اُگنے لگیں۔

تجارت میں اُبھار پیدا ہونے سے گاؤں اور شہروں کے درمیان آمد و رفت کی تحریک میں زور پیدا ہوا۔ شروع زمانہ میں گاؤں کی صنعت گاؤں کی زراعت سے متعلق انہی دیہی علاقہ میں گاؤں کا آدمی اپنے مکان بناتا، اپنا سوت کاتتا، کپڑے بنتا، اپنے جوتے بناتا اپنے اوزار ہل اور فرنیچر تیار کرتا تھا۔ بادشاہ کے وسیع تر علاقوں اور مخصوص امرا اور کلیسا کے معزز عہدہ داران کے تعلقوں میں پیداوار اور زیادہ دیدہ ریزی سے تمام تفصیلات سے مکمل تھی جس سے کاروبار میں محنت کی تقسیم اور فنون میں مہارت خصوصی کے زیادہ مواقع پیدا ہوئے۔ لیکن گیارہویں صدی کے بعد حالات میں تبدیلی پیدا ہوئی کاشتکاران پیداوار کی بچت سے استفادہ کرنے لگے۔ تجارت کی احیا جدید شہروں میں رقم لائی اور کاشت کاروں کی زمین سے وہ پیداوار جو ضرورت سے فاضل ہوتی تھی اس میں اور شہروں کے اہل حرفہ کے بنائے ہوئے سامان میں تبادلہ ہونے لگا۔

تجارت اور صنعت کے فروغ کے ساتھ شہری علاقوں میں دوررس تبدیلیاں ہوئیں۔ ازمنہ وسطیٰ کے ابتدائی زمانہ میں بہت سے شہر خندقوں سے گھرے ہوئے کیمپ یا مستحکم احاطے تھے۔ وائی کنگ (بحری ڈاکو) کے برباد کرنے والے حملوں سے کاشت کو بچانے کے لیے انگلستان میں اور براعظم یورپ کے دوسرے ملکوں میں ایسے قصبات قائم ہو گئے جن کو فرمان شاہی کے مطابق اپنے انتظام کا حق تھا اور وہ پارلیمنٹ کو نمائندے بھیجتے تھے۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا تجار اور اہل حرفہ کو یہ اپنی جانب کھینچتے گئے چنانچہ وہ دیوار کے باہر آکر مقیم ہو گئے اور تجارت اور مسکن کے مراکز قائم کیے یہاں سوداگر آکر جمع ہوتے گئے ان

کی تعداد برابر بڑھتی گئی وہ سرسبز ہوتے گئے انھوں نے اپنی حفاظت کے لیے دیواریں تعمیر کیں. عبادت کے لیے گرجے بنائے اور اپنے ضروری اداروں کی تنظیم کی۔

جب گیارھویں صدی میں تجارت نے نئی زندگی پائی تو یورپ کے اس پار سے اس پار تک دو دھارے چلے۔ ایک تو اسکینڈی نیویا کے ممالک سے شمال کی جانب قسطنطنیہ کی طرف اور دوسرا بحر متوسط کے حاشیہ کے ممالک اور مغربی یورپ میں. سوداگری کے نئے فروغ سے اٹلی کے شہروں نے سب سے پہلے نفع اٹھایا وہ دھنی ہو گئے۔ اور اقتصادی زندگی کے متحرک مرکز بن گئے۔ ایک لاکھ کی آبادی تک کے شہر قسطنطنیہ کو دعوت مقابلہ دینے والے پیدا ہو گئے۔ ان میں سرمایہ جمع ہوتا رہا۔ فن اور حرفہ نے تنوع اختیار کیا اور فنی مہارت تیزی سے دوڑنے لگی۔ ان لوگوں نے تجارتی نظام کے طور طریقوں اور سوداگری کے اصول وضوابط میں ترقیاں کیں۔ اٹلی کے تجار اکثر میلوں میں جاتے تھے اور اٹلی کے بنک والے شہزادگان یورپ کو مالیہ فراہم کرتے تھے۔ اس طرح اٹلی کے شہروں کا اقتصادی نظام شمال میں پھیلا۔ اٹلی کے سرمایہ دار یعنی "اسٹی" کے معمولی سود پر کام کرنے والوں سے لے کر لمبارڈی کے بڑے بڑے بنک چلانے والوں تک سب اپنا کاروبار پورے یورپ میں پھیلائے ہوئے تھے۔ اٹلی کے دارالسلطنت نے شمال میں شہریت کی روح پھونکی انگلستان میں جس کی آبادی 1370ء میں مشکل سے 15 لاکھ تھی سو سے زائد ایسے قصبات تھے۔ جو فرمان شاہی سے اپنا اندرونی انتظام کرتے تھے اور پارلیمنٹ میں اپنے نمائندے بھیجتے تھے، فنی مہارت میں بھی اتنی ترقی ہوئی کہ صرف ایک شہر پیرس میں ڈیڑھ سو سے زائد مختلف حرفتوں کے ماہر تھے۔

یہ صحیح ہے کہ شمال کے شہروں کی آبادی جنوب کے شہروں سے کم تھی اور وہ شمال کی بہ نسبت کم مالدار تھے مثلاً تیرھویں صدی میں لندن کی آبادی صرف 25 ہزار تھی اس کے علاوہ شہر اور دیہات میں کچھ نمایاں فرق نہ تھا۔ دونوں جاگیرداری نظام کے جزو تھے اور ایک ہی قسم کے دباؤ اور مزاحمتوں کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے خوش حالی کی فراوانی اور مال وزر کی گردش میں تیز رفتاری نے دونوں کے لیے جاگیردارانہ نظام کی بیڑیوں سے نجات کا سامان فراہم کیا۔ گاؤں آزاد لوگوں کے مسکن بن گئے جو اپنی زراعت پر جوت کے ایسے معاہدے کے تحت قابض تھے جو ان پر خدمات کی

ادائیگی کا فرض عائد نہیں کرتا اور نہ انھیں زمین سے پیوستہ ہی کرتا تھا۔ ان کی مقررہ حیثیت کی جگہ معاہدے نے لے لی۔ شہروں میں تاجر سرمایہ جمع کرتے تھے اور منافع حاصل کرنے میں ان کا جذبہ ترقی پذیر تھا وہ اپنا سرمایہ سود پر روپیہ چلانے یا بنک میں جمع کرنے یا دوسرے مالی نظاموں پر خاص کر سامان باہر بھیجنے پر اور زمین کے متعلق امور پر اور صنعت پر لگاتے تھے۔

لیکن تجارت کی نشوونما کا سب سے اہم نتیجہ یہ ہوا کہ شہروں میں آزادی کی تحریک نمودار ہوئی۔ انگلستان میں بلدیات اور یورپ کے ممالک میں سگنیور (بلدیہ) نے اپنے کو جاگیرداروں۔ خواہ وہ دنیوی ہوں یا کلیسائی۔ کے جوئے سے آزاد کر لیا۔ یہ آزادی ان کو بعض اوقات کشمکش اور مقابلہ پر اڑنے سے زیادہ تر کلیسائی علاقوں میں حاصل ہوئی اور بعض دوسرے اوقات میں ان کے شاہی یا تعلقداری فرماں رواوں کی نیک نیتی اور تعاون سے یا ان لوگوں کی مشکلات سے فائدہ اٹھا کر حاصل ہوئی۔

شروع میں وہ شہر جن میں تجار رہتے تھے اپنے نظم ونسق کے لحاظ سے جاگیردارانہ اور مقصداً فوجی تھے۔ ان کے قوانین اور رواج تحکمانہ اور ان کا انتظام تعلقدارانہ طرز کا تھا۔ وہ ذاتی آزادی اور ملکیت جائداد پر پابندیاں لگاتے تھے اور ان کے جاگیرداری طرز کے محاصل ظالمانہ اور تجارت کے فروغ میں رکاوٹ تھے۔ اسی طرح عدالتی نظام بھی تاجر فرقہ کی ضروریات کے لیے مناسب نہ تھا۔ اس لیے براعظم کے سوداگروں نے اپنے کاروبار کی ضروریات کے پیش نظر ہم پیشہ لوگوں کی انجمن اور ان کے جلسوں کے لیے ہال تعمیر کیے۔ وہ باہم جڑ گئے۔ اور سنجیدگی کے ساتھ حلف لیا کہ وہ تمام حملوں کا مقابلہ کرکے اپنی آزادی قائم رکھیں گے۔ اس طرح کمیون (ملکی انتظام کے چھوٹے چھوٹے مرکز) عالم وجود میں آئے کمیون کی اندرونی آزادی میں ایک ایسی جماعت کا وجود پنہاں تھا جس کو اپنے علاقہ کے لیے ملک کے عام قوانین سے مختلف بنانے ان کے انتظام کے لیے اپنی عدالتیں قائم کرنے اور اپنا خود دستور مرتب کرنے کا حق تھا۔ ہر کمیون اپنی ماہیت میں ایک شہری جمہوریہ (میونسپل ریپبلک) تھا۔

انگلستان کی میونسپلیٹیوں کی تاریخ براعظم کے ممالک کے میونسپلٹیوں کی نسبت کم شور وغل سے لبریز ہے لیکن بہرحال نتائج دونوں کے یکساں رہے۔ انگلستان کے

بادشاہوں نے نارمن فتح کے بعد ہی سے اپنے جاگیرداروں کے اختیارات پر پابندی لگانا شروع کردی تھی ان کے علاقوں میں جو میونسپلٹیاں تھیں ان کو وہ خوشی خوشی آزادی کا فرمان دے دیتے تھے وہ قصبات جو ان تعلقداروں کے حلقے میں تھے جن کو لارڈ کا خطاب نہیں تھا ان کو بھی اسی طرح کی مراعات حاصل کرنے میں زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا صرف وہ قصبات جن کا تعلق بطریق کے علاقوں یا راہبانہ بنگلوں سے تھا ان کو ایک مضبوط طے شدہ (ثابت قدم) اور محکم رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑا اور ان مراعات کو زبردستی چھین لینے کے لیے ایک طویل اور تلخ مقابلہ کرنا پڑا۔

آخرکار انگلستان کے شہروں نے اپنے بلاواسطہ تعلقداروں اور تاج کے مقامی نمائندوں کے جنھیں سرف کہتے تھے اقتدار سے نجات پائی۔ جو فرمان شاہی جاری کیا گیا اس نے ان کو بہت سے حقوق عطا کیے۔ مثلاً میونسپل بورڈ کے اندر تعلقدار یا شاہی افسر کی مداخلت کے بغیر وہ محاصل وصول کریں۔ بشرطیکہ اس کی ایک مقررہ مقدار خزانہ شاہی کو ادا کردی جائے۔ انصاف کے لیے بیرونی عدالتوں کے حق اختیار سماعت سے مخلصی ملی یہ بھی حق ملا کہ وہ خود اپنے مجسٹریٹ چنیں۔ اپنے حلقہ کا انتظام خود کریں اور اپنے تاجروں اور اہل حرفہ کی انجمنیں بنائیں۔

تیزی سے شہروں کے ابھرنے کا سوسائٹی پر عظیم اثر پڑا۔ یورپ کے ابتدائی اقتصادی نظام کی بنیاد گاؤں تھا۔ ازمنہ وسطیٰ میں معاشرتی زندگی پر اقتصادی نظام حاوی تھا۔ گاؤں اس وقت سیاسی نظام کا تقریباً ایک آزاد حصہ (اکائی) تھا۔ اب شہر اپنے حقوق کا اعلان کرتے اور اپنی اندرونی آزادی پر عمل کرتے ہوئے اقتدار اعلیٰ کی مالک جمہوری حکومت بن گئے۔ جن کو نظم ونسق کے کچھ قومی عہدے بھی دے دیے گئے، جن کی میونسپلٹیوں کے باہمی ربط سے حفاظت میں پورے اہتمام اور احتیاط کے ساتھ کمربستہ تھے جب کہ جاگیردارانہ مزاج گاؤں سے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ شہروں نے جاگیردارانہ دور کے علاقوں کی حیثیت اختیار کرلی۔ مثلاً اٹلی میں وہ اتنے طاقتور ہوگئے کہ انھوں نے ملکی سالمیت کو پرزے پرزے کردیا دوسرے ممالک میں مرکزی حکومت نے اپنے میونسپلٹی کے زرعی غلاموں (ویسل) کے ذریعے مختلف انداز میں اپنا اقتدار قائم رکھا۔

شہروں کا اندرونی معاشرتی نظام جاگیردارانہ علاقوں کے شہروں سے کہیں مختلف

تھا۔ شہر کی مالیات کا انحصار تاجروں کی انجمنوں پر تھا جنھیں گلڈ (تاجروں کی جماعت) کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ تجارت کلیتہً انہی گلڈ کے ہاتھ میں تھی اور ان کے حقوق کی ضمانت فرمان شاہی سے وابستہ تھی۔ تاجروں کی جماعت نے امداد باہمی اور اجتماعی سوداگری کو ترقی دی اور ایک رفاہ عام سوسائٹی کے فرائض انجام دیے اس کے خاص اقتصادی فرائض کے اندر صنعت اور تجارت پر کنٹرول قائم کرنا بھی تھا۔ اس نے چیزوں کے دام مقرر کرنے اور قانونی حیثیت قرار دینے کے لیے احکام مرتب کیے۔ یکساں ناپ تول کے قواعد بنائے اور بازار کو منضبط کیا۔

تاجروں کی انجمن کی کارروائیاں صرف اقتصادی امور تک محدود نہیں تھیں شروع میں سیاسی حقوق کے لیے کل شہریوں کی منظم جماعت کے رکن کی حیثیت سے وہ حصہ لیتے تھے۔ اور آخر میں وہ ایک مخصوص طبقہ بن گئے اور کل سیاسی طاقت پر اجارہ دارانہ قبضہ کر لیا۔ انھوں نے عوام اور غیر امرا دنی لوگوں اور مزدوروں کو انتظامی امور میں اپنے حصہ کے حقوق سے محروم کر دیا۔ یہ مخصوص حقوق رکھنے والی جماعت تاجروں اور متوسط طبقہ پر (یعنی وہ طبقہ جو کاشتکاران اور امرا کا درمیانی تھا) مشتمل تھی وہ میونسپلٹیوں میں اپنے اختیارات کا استعمال تاجروں کی جماعت کی جنرل اسمبلی (عام مجلس شوریٰ) کے جلسوں کے ذریعہ کرتی تھی۔ اس مجلس شوریٰ کا خاص کام پبلک افسران اور مجسٹریٹوں کا انتخاب کرنا تھا یہ افسران ہی حقیقی معنوں میں حکومت تھے۔ انگلستان کے قصبات اور ان شہروں کے جنھیں فرمان شاہی کے رو سے اپنا انتظام خود کرنے کا حق تھا اور جو پارلیمنٹ میں اپنے نمائندے بھیجتے تھے پبلک افسران کو "میئر یا آلڈرمن یا بیلف" کہتے تھے اور فرانس میں کونسلر جورریا سندکس کہتے تھے ــــ وہ صنعت پر حق اقتدار قائم رکھنے کے لیے میونسپلٹی کی مالیات کا انتظام کرتے تھے بے ترتیب فوج کی کمانڈ کرتے تھے۔ اور دفاع کے لیے ضروری تدابیر اختیار کرتے تھے سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ شہریوں کے درمیان عدالتی کارروائیاں انصاف کے لیے کرتے تھے اور دیوانی اور فوجداری دونوں قسم کے مقدمات میں فیصلے صادر کرتے تھے۔

شہروں کے انتظام کے دو بڑے مسائل تھے۔ یعنی خوراک مہیا کرنا اور دماغ دونوں میں خرچ ہوتا تھا۔ اس لیے مالیاتی نظام کے ایسے نشو و نما کی ضرورت تھی جو ان بھاری ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے قابل ہو۔ اس کا حل میونسپل ٹیکس لگا کر نکالا گیا یا تو سوداگروں

کی ملکیت پر براہ راست ٹیکس لگایا گیا یا بالواسطہ ٹیکس شہر کے اندر آنے والے سوداگری کے مال پر لگایا گیا۔ غذا کی درآمد اور استعمال کرنے والوں کے لیے خرید کی قیمت پر حدبندی بازار کو ضابطہ میں لاکر قائم کی گئی۔ دفاع کی فکر دیواریں اور خندقیں بناکر اور سامان حرب خرید کر کی گئی۔

تجارت کی نشوونما نے تجار کی انجمن کو جنم دیا تھا صنعت کی ترقی ماہر فن مزدوروں کی انجمن کی قائم کرنے کا موجب ہوئی۔ ان کا قیام از منہ وسطیٰ میں تاجرانہ تہذیب کا سب سے زیادہ دلچسپ اور انوکھا نتیجہ تھا اور ان کا از منہ وسطیٰ کی اقتصادیات پر بہت گہرا اثر پڑا۔

اہل حرفہ کی انجمن میں تین قسم کے لوگ شریک تھے یعنی ماہر فن پیادے اور امیدوار۔ ہر حرفہ کے لیے الگ انجمن تھی اور کوئی بھی شخص جو کوئی پیشہ اختیار کرنا چاہے انجمن کی اجازت کے بغیر ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ جو بھی کوئی اہل حرفہ بننے کا منصوبہ بنائے اسے پہلے بطور امیدوار اس میں شریک ہونا پڑتا تھا۔ اور یہ ممکن نہ تھا کہ بلا امیدوار بنے کوئی ماسٹر (ماہر فن) بن جائے۔ کسی شخص کا امیدوار کی حیثیت سے انجمن میں شریک ہونا ایک پبلک اور سنجیدہ معاہدہ تصور کیا جاتا تھا۔ جو فریقین پر ایک دوسرے کے بالمقابل فرائض عاید کرتا تھا۔ امیدواروں کی تعداد بہت سختی سے محدود رکھی جاتی تھی۔ کیوں کہ نگاہ اس پر رہتی تھی کہ آئندہ چل کر کتنے ماسٹر (ماہر فن) ہو جائیں گے۔ اور اس وجہ سے بھی کہ حرفت ان لوگوں کی تنہا اجارہ داری تھی جو اسے کرتے تھے۔ بہر حال تعداد کی حدبندی پر جو زور دیا گیا تھا وہ اتنا سخت نہیں تھا کہ ذات کی شکل اختیار کر لیتا۔ کیوں کہ سوائے ماہر فن کے لڑکوں کے جہاں وراثت کا عمل دخل تھا داخلہ تمام طبقوں کے لیے کھلا ہوا تھا۔

امیدواری کی میعاد عموماً لمبی ہوتی تھی یعنی تین سال سے بارہ سال تک ماسٹر کا فرض تھا کہ وہ ٹریننگ حاصل کرنے والوں (یعنی امیدواروں) کو کھانا اور مکان فراہم کرے تکنکی طریقوں کی ٹریننگ دے اور جو کچھ بھی امیدواروں کی ٹریننگ کے لیے ضروری ہو اسے فراہم کرے۔ ماسٹر امیدواروں کے عام چال چلن اور ان کی اچھی اور اہلیت آمیز کارگزاری کا ذمہ دار تھا۔ اگر وہ غلط روی اختیار کریں تو وہ ان کو سزا دے سکتا تھا۔ امیدوار کا فرض تھا کہ وہ ماسٹر کی فرماں برداری کرے۔ اور ان کا وفادار رہے۔ اس سے گھر کے اندر

نوکر کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ اور کبھی کبھی پیشہ سیکھنے کی فیس بھی دینی پڑتی تھی۔
ٹریننگ کی میعاد ختم ہونے کے بعد اپرنٹس پیادہ (کاریگر یا مزدور جو دوسرے کی دکان پر اجرت پر کام کرتا ہو) یعنی اجرت پر کام کرنے والا مزدور یا ہر کارہ Valeh ہو جاتا تھا۔

پیادہ اس امر میں آزاد تھا کہ جہاں چاہے سفر کرے اور دوسرے ماسٹر کے ورکشاپ میں خواہ وہ دوسرے شہر میں ہو شامل ہو جائے۔ پروبیشن (اوقات آزمائش) کے زمانہ میں جس کی میعاد ایک سال سے تین سال تک ہوتی وہ ماسٹر سے اپنے کام کی مزدوری پاتا تھا لیکن اس کے کام کے اوقات لمبے تھے یعنی دن نکلنے سے سورج ڈوبنے تک۔
امیدوار یا ہر کارہ ماسٹر کے دلکش حلقہ میں ایک امتحان کے نتیجہ میں اور اپنی مہارت اور جان کاری کے ثبوت میں کوئی اعلیٰ نمونہ پیش کرنے کے بعد ہی داخل ہوتا تھا اس کو زمانہ پروبیشن میں جو آمدنی ہوتی تھی اس سے وہ اتنا سرمایہ اکٹھا کر لیتا تھا کہ وہ خود اپنا آزاد کارخانہ کھول سکتا تھا۔ ماسٹر ہونے کا اعلان ایک سنجیدہ رسم میں ہوتا تھا جہاں قوانین وضوابط متعلق سوسائٹی اسے پڑھ کر سنائے جاتے تھے اور وہ ان پر عمل کرنے کا حلف لیتا تھا۔
انجمن تجار میں اہل حرفہ کی تین طبقوں میں حقیقی بھائی چارے کا جذبہ تھا۔ ماسٹر پیادوں یا ہر کاروں کو اسی ٹریننگ اور ڈسپلن (تادیب) سے گذرنا پڑتا تھا جس سے امیدوار گذرتے تھے وہ اپنے چھوٹے ورکشاپ (کارخانہ) میں مل جل کر کام کرتے زندگی کی نعمتوں میں برابر کے حصہ دار ہوتے اور اپنے اچھے اور برے دنوں میں متفق ہو کر کھڑے ہونے پر مجبور تھے۔ انجمن تجار اپنے ممبروں کی اقتصادی مفاد کی محافظت کرتی تھی یہ محنت کے اوقات مقرر کرتی۔ اجرت طے کرتی۔ اور اشیا کی قیمت کا تعین کرتی تھی۔ یہ مذہبی مفاد کی بھی نگراں ہوتی تھی۔ یہ عبادت کے انتظامات کرتی۔ اور شاندار جلوس نکالتی۔ مذہبی تہوار مناتی تھی یہ اپنے غریب ممبروں کی اور ان کی جو پریشانی میں مبتلا ہوتے تھے مدد کرتی تھی۔ انجمن تجار تمام تنازعات میں پنچایت عدالت کا کام کرتی اور عدالت میں مقدمہ بازی کو روکتی تھی۔
انجمن تجار کی حکمرانی ممبران کے ہاتھ میں تھی۔ انجمن کی اپنی مجلس مشاورت ہوتی تھی جس کی نشست مقررہ وقفوں کے بعد ہوا کرتی تھی اور اپنی جملہ کارروائیوں کو Regulate میں لانے کے لیے احکام مرتب کرتی تھی کچھ انجمنوں میں کونسل بھی ہوتی تھی جو کوتاہیوں

پر فیصلے کرتی اور ریگولیشن بناتی تھی۔ انتظامی اختیارات وارڈن (نگران) کو حاصل ہوتے تھے جن کو عام طور پر اسمبلی چنتی تھی۔ یہ ممبروں کے کام کی نگرانی کرتے اور اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ جو چیز تیار ہو وہ عمدہ قسم کی ہو۔ یہ لوگ آرڈیننس اور ریگولیشن پر عمل درآمد کراتے تھے۔

ابتدا میں انجمن تجار کے اہل حرفہ کو ان سوداگروں کی مخالفت کا سامنا کر کے اپنی پوزیشن بنانی پڑی جو میونسپل اقتدار کے اجزائے ترکیبی تھے لیکن بعد کو انھیں عوامی جماعتوں کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔ ان کو محدود اختیارات دے دیے گئے وہ شہری انتظامی محکمہ کے تحت کھلے متصور ہوتے تھے۔ جیسے جیسے انجمن تجار کے تعلقات میونسپل حکام سے قریب تر ہوتے گئے ان کی اہمیت اس رفتار سے بڑھتی گئی آخر کار اہل حرفہ کی جماعت کی ممبری وہ مخصوص دروازہ بن گئی جس سے گذر کر شہریت اور میونسپل عہدوں کی تقرری تک رسائی ہوتی تھی مثلاً صدر بلدیہ کا عہدہ ان کی خصوصیت بن گیا۔ اہل حرفہ کی انجمن نے انجمن تجار کو اکھاڑ کر اس کی جگہ لے لی۔

جاگیردارانہ نظام نے عام جماعتی انفرادی اور اجتماعی نظام میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی معاشرتی۔ اقتصادی بنیاد محکم طور پر انفرادی تھی اور اس کی جڑیں مقامی زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔ معاشرتی اور سیاسی تعلقات میں اجتماعیت کی مطلق گنجائش نہ تھی۔ اس کے اجزائے ترکیبی میں اندرونی اتحاد اور استحکام تھا اور ان اجزا کا عظیم ترکل سے رشتہ نہایت ڈھیلا ڈھالا اور انتہائی کمزور تھا۔

اگرچہ ازمنہ وسطیٰ کی ابتدائی زندگی بکھرے ہوئے ناقابلِ تقسیم ذروں کی مانند اندرونی طور پر آزاد مواضعات کے گرد گردش کرتی تھی لیکن اس کے عزائم کی پرواز پوری عیسائی دنیا کی وحدت کے حصول تک تھی۔ یہ عزائم معاشرتی زندگی کے تمام پہلوؤں میں اپنے کو ظاہر کرتے تھے۔ انھی سے ایک عالم گیر سوسائٹی کا تخیل پیدا ہوا۔ جو آب و ہوا نسل اور جغرافیائی اختلافات کے ماورا ہو، اور تمام دنیا پر پھیلی ہوئی ایسی سلطنت ہو جو سیاسی تنظیم کی آخری حد ہونے کا دعویٰ کرے۔ تمام دنیا پر پھیلا ہوا ایک کلیسیائی نظام ہو جو لوگوں کے اعمال کی فرمان الٰہیہ کے مطابق رہنمائی کرے۔ ایک عالمگیر قانون ہو جو روما کے فلسفہ قانون پر مبنی ہو ایک عالمگیر ضابطۂ جنگ بنایا جائے ایک عالمگیر زبان ہو۔ لاطینی۔ ان تخیلات کا اظہار فنون لطیفہ، ادب، فلسفہ اور مذہب میں بھی ظاہر ہوا۔

جاگیردارانہ نظام کا زوال

تخصیص پسندی کے تنگ نظرانہ۔ اگرچہ مستحکم نظریئے اور ایک وسیع لیکن سطحی عالمگیریت کے مابین قومی سوسائٹی اور قومی حکومت کے درمیان تخیل کی کوئی جگہ نہ تھی۔ اس کے ظہور کو جاگیردارانہ دور کے (خصوصیت پسندی اور عالمگیریت دونوں پہلوؤں کے ساتھ) مکمل خاتمہ کا انتظار کرنا پڑا۔

اس کے اجزا کے بکھرنے کا سلسلہ اس وقت کے بعد فوراً ہی شروع ہو گیا تھا جب تیرھویں صدی میں اس نے اپنی نشو و نما کا آخری عروج حاصل کیا۔ وہ واقعات جو جاگیردارانہ سوسائٹی کی ماہیت بدلنے کے ذمہ دار تھے بہت سے تھے جن میں آبادی اور دولت کے تغیرات زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

یورپ کی آبادی گیارھویں صدی سے تیرھویں صدی تک بڑھتی چلی گئی اس کا بڑھنا بند ہو گیا بلکہ درحقیقت چودھویں صدی میں مسلسل جنگی تباہ کاریوں طاعون اور گلٹی والی بیماریوں کی وجہ سے کم ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زراعتی فارموں پر مزدور کی فراہمی اور گاؤں کی زرعی ضروریات کے درمیان جو توازن تھا وہ بگڑ گیا۔ بہت سی قابل زراعت زمین کی جو خاص کر امرا کے تعلقوں میں ان کی سیر کے طور پر تھی کاشت نہ ہو سکی مزدوریاں بڑھ گئیں سرف سے جو جبراً کام لیا جاتا تھا وہ پریشان کن ہو گیا اور جو کام ہوتا بھی تھا وہ معیاری نہ تھا۔ تعلقدار اور کاشتکار کے تعلقات رُوبہ زوال ہو گئے۔

ہجوم زر نے ان رجحانات کے لیے قوت محرکہ کا کام کیا۔ تعلقدار کو یہ بات زیادہ نفع بخش معلوم ہوئی کہ اپنے کاشتکاروں کو جاگیرداری خدمات سے آزاد کریں۔ اپنے کھیت پٹہ داروں کو لگان پر اٹھا دیں۔ یا اپنے کھیتوں کی کاشت کے لیے نقد اجرت کی ادائیگی پر مزدور رکھیں۔ زرعی غلام جب تعلقداروں کے کھیت پر کام کرنے کی ذمہ داری سے آزاد ہو گئے تو وہ خود اپنے کھیتوں کو جوتنے لگے اس نے ان کو اس قابل کر دیا کہ کچھ غلہ بچا کر بازار میں بیچیں اور اشیائے ضروری شہر سے خریدیں۔

تیرھویں صدی میں ہنگامی افراط زر اور طلائی سکے کے دوبارہ ظہور سے کاشتکاروں کی حالت بہتر ہو گئی۔ اشیا کی قیمتیں بڑھ گئیں جن تعلقداروں نے اپنا لگان جنس سے نقد میں

بدل دیا تھا ان کو سخت دھکا لگا مگر کاشتکار کا فائدہ ہوا۔ محاصل کے نقصان اور خرچ کی زیادتی نے تعلقداروں کے قرضوں میں اضافہ کر دیا اور ان کو مجبور کیا کہ وہ اپنی زمین بیچیں وہی زمین جن میں سے بیشتر انھوں نے شہر کے تجار سے خریدی تھیں۔

نتائج انقلاب آفریں تھے گاؤں میں زرعی غلامی کی جگہ آزاد کاشتکاری نے لے لی اور ایک ایسا آزاد مزدور طبقہ عالم وجود میں آگیا جو زمین سے بندھا نہ تھا گاؤں کے اہل حرفہ نے مجبوراً اپنا کام بند کر دیا کیوں کہ گاؤں والوں نے اپنی ضروریات کے لیے شہر کے اہل فن کی بنائی چیزوں پر انحصار کرنا شروع کر دیا کیونکہ یہ بہتر ہنر اور بہتر تکنیک رکھتے تھے۔ گاؤں کی سوسائٹی ابتک اس پر قائم تھی کہ کھیت جوتنے والے جن کی حیثیت متعین تھی۔ خدمات انجام دیں۔ اب اس کے بجائے ایک ایسی سوسائٹی بن گئی جو آزاد معاہدے پر مبنی تھی۔ جزؤ پابند لوگ پورے آزاد افراد ہو گئے۔ نقدی لین دین نے رواجی حقوق و فرائض کی جگہ لے لی۔ مالکان اراضی کی نشو ونما نے ایسا وسیلہ فراہم بھی کر دیا۔ دوسرا ذریعہ حکومت کے سول اور فوجی محکموں کی ملازمت میں اضافہ نے پیدا کیا جو لوگ زمین ہی پر جمے رہ گئے انھوں نے اپنے جوت کی چک بندی شروع کر دی اور ان کو گھیر لیا تاکہ بازار میں بھیجنے کے قابل چیزیں پیدا کی جا سکیں اور بھیڑوں کو پالا پوسا جا سکے جاگیرداری گاؤں کا کل جاگیردارانہ مالیاتی نظام بدل گیا۔

از منہ وسطیٰ کے شہروں کی بھی ہیئت بدل لی شہر کی صنعت کا مخصوص طریقہ دستکاری سے اشیا تیار کرنا تھا۔ اس کے کام کرنے والوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ شروع میں انجمن تجار، صنعت پر عام ضبط رکھتی تھی لیکن طاقت کے غلط استعمال۔ سرمایہ کی بدنظمی اور عدالتی فیصلوں میں جانب داری نے ان کو (انجمن ہائے تجار) کمزور اور تباہ و برباد کر دیا۔ ان کی جگہ اہل حرفہ کی انجمن نے لے لی۔ ان لوگوں نے اجارہ داریاں قائم کیں اور بلا شرکت غیرے نظام بنائے اور میونسپل حکومت پر اقتدار حاصل کر لیا۔

مگر سولھویں صدی میں اہل حرفہ کی انجمن پر بھی زوال آیا۔ سب سے زیادہ نمایاں ارتقائی شکل یہ ظاہر ہوئی کہ مالدار اہل حرفہ تاجر، مالک یا ایسے کارندے بن گئے جو اشیا کی پیداوار شہر کے حدود کے باہر کے ایسے مزدوروں کے حوالے کرتے تھے جن پر انجمن اہل حرفہ کے قواعد و ضوابط لاگو نہیں تھے۔ اس طرح یہ کارندے یا تجارتی مہم باز کرایہ کے اہل حرفہ طبقہ سے الگ ہو گئے۔ اس مہم باز طبقہ نے پیشہ وروں کی جماعتی کمپنیاں بنائیں تاکہ اہل حرفہ

کو قابو میں رکھ سکیں جس جوڑ توڑ سے اہل حرفہ کرایہ کے مزدور بن گئے جو اپنی محنت کی مزدوری پاتے تھے، اور تاجر سرمایہ دار بن گئے، اس کا نام Domestic Economy (گھریلو نظام مالیات) ہے۔ کمپنیوں کے عالم وجود میں آنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر کی تخصیص پسندی ختم ہوگئی انجمن اہل حرفہ کی اجارہ داری کی بنیاد کھوکھلی ہوگئی۔ اور سرمایہ، پابندی لگانے والی اجارہ داری کی بیڑیوں سے آزاد ہوگیا۔

ان ترقیات نے اس علاحدگی پسندی کو ختم کر دیا جس کے اندر جاگیرداری مواضعات اور قصبات سرگرم عمل تھے۔ کاروباری مہم میں شہر اور دیہات ایک دوسرے کے شریک دار ہوگئے۔ اور دونوں ایک مشترک معاشرتی نظام میں منسلک ہوگئے۔ خود کفالتی غائب ہوگئی اور ایک، دوسرے پر اثر انداز ہونے لگا جس سے مہم جوئی متحرک ہوئی۔

جمہوری ریاست کا ظہور

جب جاگیرداری مالیات کی ماہیت میں تبدیلی ایک نئے معاشرہ کی بنیاد رکھ رہی تھی جس کے اجزاء ترکیبی، گاؤں اور قصبات، ایک دوسرے میں مل کر ایک عظیم تر معاشرتی نظام بنا رہے تھے تو اسی وقت اس کے طریق عمل میں تیز رفتاری اور قوت، مرکزی اقتدار کے ابھرنے اور بادشاہ کے ہاتھ میں طاقت کے مجتمع ہو جانے سے پیدا ہوئی اور مرکزیت ایک سرے سے دوسرے سرے کے کل معاملات پر بالعموم لیکن عام نظم ونسق نظام عدلیہ اور فوجی تنظیم کے حلقوں پر بالخصوص حاوی ہوئی۔

جاگیرداریت اپنے سیاسی انداز فکر میں نراجی تھی۔ حکومت کی طاقت محدود تھی۔ جاگیردارانہ نظام کے تعلقداران اور اہل کلیسا کا حلقہ اختیار بہت وسیع تھا اور بہت سی رعایا پر بادشاہ کا براہ راست اقتدار نہ ہونے کے برابر تھا۔ صرف انگلستان میں نارمن فاتحین نے بلاواسطہ اپنی مرضی تمام مفتوح لوگوں پر جبراً عائد کر دی تھی۔ اس طرح کے معاشرے میں قانون سازی کی کارروائیوں کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ رسم ورواج مکمل طور پر سرایت کیے ہوئے تھے۔ عدلیہ زیادہ تر ذاتی تھا۔ کیوں کہ بہت سی عدالتیں یا تو فرقہ وارانہ یا جاگیردارانہ یا کلیسائی تھیں۔ بادشاہ کی عدالت کا دائرۂ اختیار سماعت نہایت محدود تھا۔ مرکزی نظم ونسق کی ساخت قدیم وضع کی تھی۔ بادشاہ کے افسران اس کے گھر کے کارکن تھے۔ فوج میں جاگیرداری

طرز سے لڑائی کے لیے بھرتی ہوتی تھی۔ جن کو جاگیر دار افسران اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کرتے تھے۔ جاگیر دارانہ رسم ورواج کے مطابق یہ لوگ فوجی خدمت انجام دینے پر مجبور تھے۔ فوجی خدمت کی عام میعاد سال میں چالیس دن تھی۔ اور وہ علاقہ کے باہر خدمات بجا لانے پر مجبور نہ تھے۔

ان وحشیانہ زمانوں میں جب فن جنگ میں کوئی ترقی نہیں ہوئی تھی ایک امیرالامرا اپنے قلعہ میں بیٹھ کر آسانی سے بادشاہ کو دعوت مقابلہ دے سکتا تھا کیوں کہ محاصرے کیا بلحاظ وقت اور کیا بلحاظ صرف زر بڑے قیمتی تھے۔ اس لیے بادشاہ میں جو اپنے اختیارات کو بڑھانے کا خواہشمند تھا اور بڑے بڑے امرا میں جو اپنی قوت محفوظ رکھنے کے لیے چوکس رہتے تھے قدرتی طور پر تنفر رہتا تھا۔ اور صالح حلف اطاعت ووفاداری، جو احکام مذہبی سے پشتہ بند ہوتا تھا بار بار رسہ کشی اور بغاوت کے ابھرنے کو روک نہیں پاتا تھا۔

ان دونوں میں برتری حاصل کرنے کی کشمکش صدیوں تک جاری رہی قسمت کا پاسہ بدلتا رہا۔ کبھی بادشاہ کامیاب ہوتا تھا اور پھر ہار جاتا تھا۔ آخر کار پندرھویں صدی کے آخر میں ترازو کا پلڑا واضح طور پر مرکزی اقتدار کی طرف جھک گیا۔

اس مناقشہ میں شہر اور دیہات دونوں مبتلا تھے۔ شہر مرکزی حکومت کی امداد کرتے تھے کیوں کہ ان کے مفاد کا مطالبہ امن اور قانون کے قیام میں تھا جس کو امرا اپنی بغاوتوں سے برابر خطرے میں ڈالتے رہتے تھے۔ شہر طاقت کی شہ رگ دو طریقوں سے مہیا کرتے تھے یعنی کسٹم اور ٹیکسوں اور قرضوں کے ذریعے جو روپیہ بادشاہ کو ملتا تھا، وہ اسے جاگیر داری محاصل اور خدمت گذاری سے بے نیاز کر دیتا تھا۔ اور اس کو کرایے کے فوجی رکھنے کے قابل بناتا تھا۔ شہروں کی اقتصادیات نے جو متوسط طبقہ پیدا کیا تھا وہ بادشاہت کو مضبوط کرنے میں مددگار تھا شہر قدرتاً جاگیر دارانہ نظام کے امرا کے مخالف تھے۔ تجارت کی ترقی کا تقاضا یہ تھا کہ سڑکیں محفوظ اور بازار پر امن ہوں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ بادشاہوں کے اختیارات کی حمایت کرتے تھے دولت جو جمع ہوئی اس نے نہ صرف معیار زندگی کو بلند کیا بلکہ تہذیب کے حسن ذوق کی بھی نشوونما کی۔ ان لوگوں نے اسکول قائم کیے جو دنیوی وظائف کے مرکز بن گئے جو کلیسا کے نادریانہ اقتدار سے آزاد تھے۔ جو لوگ ان اسکولوں سے نکلے انھوں نے شاہی انتظامیہ کے محکموں میں نوکری کرلی اور بادشاہ کے اختیارات کے نقطہ نظر کو تقویت دی۔

براعظم (داویورپ) میں متوسط طبقہ کے ایک حصہ نے رومن لا کا مطالعہ کیا اور قانون اور نظم اور ایک اعلیٰ مرکزی طاقت کے رومن تخیلات کو ازمنہ وسطیٰ کی سیاست میں اس نے داخل کیا۔

لڑائی کی تکنیک میں تبدیلی نے مثلاً بارود کے استعمال نے بادشاہوں کی طاقت میں اضافہ کر دیا اور قلعہ بند ہو کر لڑنے کا طرز بیکار ہو گیا جب کہ بادشاہوں کے اختیارات بڑھ رہے تھے امرا کا طبقہ ان اقتصادی تبدیلیوں کی بنا پر جو گاؤں کے نظام پر اثرانداز ہو رہے تھے کمزور ہو رہا تھا۔ انجام اس کا یہ ہوا کہ بادشاہ کی مطلق العنانی قائم ہو گئی اور جاگیردارانہ اندرونی آزادی تباہ و برباد ہو گئی۔

نظم و نسق کے دائرے میں حکومت کے بڑے بڑے محکمے قائم ہوئے جن کے انچارج بلند پایہ افسران تھے۔ وزرا اور ملازمین اور کلرکوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ اور متوسط طبقہ کا جہاں سے یہ لوگ بھرتی ہوتے تھے اثر بڑھا۔ انگلستان میں بادشاہ نظم و نسق کا افسر اعلیٰ تھا اور بالواسطہ یا اپنے نمائندوں کے ذریعہ قانون سازی، عدالت گستری مالیاتی اور انتظامی کارروائیوں میں دخیل رہتا تھا بادشاہ کے بعد دوسرے درجہ کے با اختیار لوگوں میں بڑے بڑے افسران تھے یعنی چیف جسٹس جو قانون اور مالیات کا انچارج تھا۔ اور جب یہ عہدہ توڑ دیا گیا تو چانسلر، ٹریژرز، کانسٹبل اور مارشل دوسرے معزز عہدیداران تھے۔

تیرھویں صدی میں قانون سازی اور ٹیکس لگانا پارلیمنٹ کی ذمہ داری ہو گیا۔ پارلیمنٹ امرا کے نمائندوں پادریوں اور متوسط طبقہ سے مرکب تھی اور اس نے اپنے ایوان بالا کے لیے (ہاوس آف لارڈس) چند قسم کے مقدمات کا حق سماعت بھی باقی رکھا تھا۔ پارلیمنٹ قانون سازی اور حکومت کے لیے محاصل کی فراہمی کی مرکزی آلہ کار بن گئی۔ اس کی کارروائیوں نے مستحکم طور پر معاشرہ میں اتحاد کی نشوونما کی اور اس کے اعمال نے سلطنت کی تمام رعایا کو براہ راست متاثر کیا۔ اس طرح ارتقاپذیر کارروائیوں نے جاگیرداری اجزا کی تخصیص پسندی اور خودکفالتی کو ختم کرنے میں مدد کی۔

عدل گستری بھی جاگیرداری یا فرقہ وارانہ عدالتوں کی پرائیویٹ کارروائی نہیں رہ گئی بادشاہ کی مرکزی عدالت نے اپنا دائرہ اختیار وسیع کیا۔ اس کا عمل دخل بادشاہ کی بنچ Court of Common Plea (عام معاملات کی عدالت) اور اکسچیر (خزانہ) کے ذریعہ تھا۔ بادشاہ کی بنچ اپنے اختیارات

فوجداری کے مقدمات میں اور ان کل معاملات میں جہاں بادشاہ کے قائم کردہ امن میں خلل ہو یا طاقت کا ناجائز استعمال ہو۔ برتتی تھی۔ عام معاملات کی عدالت رعایا کے مابین دیوانی کے کل مقدمات کی سماعت کرتی تھی۔ اور اکسچیر (عدالت خزانہ) کا تعلق شاہی محاصل۔ محاصل کی وصولی اور ان کے خرچ سے تھا۔ بادشاہ کی کونسل اور پارلیمنٹ بھی نظام عدلیہ کے اجزا تھے۔

بادشاہ اور اس کی عدالتوں کی طاقت نے مضبوطی کے ساتھ جاگیرداری عدالتوں کے اختیارات کا جنازہ نکال دیا۔ کیوں کہ عملاً یہ ہوا کہ وہ کل مقدمات جو گاؤں یا تعلقہ کی عدالتوں کے سامنے آتے تھے وہ سب ان عدالتوں کے احاطہ اختیار سماعت میں آ گئے جن کے حاکم شاہی افسران ہوتے تھے۔

اس بات پر غور کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اتحاد قومی کی نشوونما اور بادشاہ کے جاگیرداری محاصل کی دست نگری سے نجات پانے کے واقعات ساتھ ساتھ پیش آئے جاگیرداری محاصل کے بجائے Relief and Tallege (ایک قسم کا محصول) نئے وسائل آمدنی وجود میں آئے مثلاً زمین کے تمام قابضان پر ٹیکس لگایا گیا خواہ ان کی نوعیت کاشت کسی قسم کی ہو۔ آمدنی اور ذاتی جائداد پر بھی ٹیکس لگا۔ درآمد و برآمد پر کسٹم ڈیوٹی لگائی گئی۔ کورٹ فیس اور جرمانے مراعات اور عہدوں کی فروخت بھی وسائل آمدنی بنے۔ جب یہ سب فضول خرچ حوصلہ مند اور جنگ جو بادشاہوں کے لیے کافی نہیں ہوئے تو متوسط طبقہ کے سرمایہ داروں اور مالکان بنک سے قرض لیے گئے۔

اسی طرح ایک واقعہ نے فوج کو بھی متاثر کیا۔ جاگیرداری نظام میں بادشاہ کی فوج میں وہ کاشتکار ہوتے تھے جو کسی نائٹ کی ماتحتی میں اس بات پر مجبور تھے کہ سال میں چالیس دن فوجی خدمت انجام دیں اور جو سمندر پار جانے پر اپنی برہمی ظاہر کر سکتے تھے۔ بارھویں صدی کے اس طریقہ کار کے نقائص کے پیش نظر اس کے بجائے فوجی خدمت کے لیے نقد معاوضہ مقرر کر دیا گیا۔ اس کے بعد قانون بنا کہ کل فری من کو ان کی آمدنی کی حیثیت کے مطابق مسلح کیا جائے۔ اس فوج کا کام یہ تھا کہ امن قائم کرے اور بدکرداروں کو گرفتار کرے۔ اس کے بعد بادشاہ کمیشن یافتہ افسران فوج کی بھرتی کرتے تھے۔ جو مسلح کی جاتی تھیں اور بادشاہ خود ان کو نقد معاوضہ (تنخواہ) دیتا تھا۔ بادشاہ کے محاصل میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ ایسا کر سکا۔ معاوضہ پر لڑنے والے سپاہیوں نے اور بارود نے جاگیرداری قلعہ

کو اُڑا دیا۔

چودھویں سے سولھویں صدی کے اندر جاگیرداری زمانہ کے۔ اقتصادی معاشرتی اور سیاسی نظام کے رشتے بکھر گئے۔ جاگیرداری کی بنیاد، ذاتی تعلقات جو کاشتکار اور زمین دار، خدمت گذار طبقے اور فری مین، نائٹ اور ان کے افسر اور بادشاہ، ماہر فن اہل حرفہ اور ہرکاروں کے درمیان کے تعلقات پر خواہ وہ معاہدے کی بنا پر قائم ہوئے ہوں یا جبراً۔ اثر انداز تھی۔ وہ اور کلیسا کا نظام مراتب سب ریزہ ریزہ ہوگئے اس کے بدلے میں ایک ایسا نظام عالم وجود میں آیا جس میں معاہدے اور جبر دونوں کی بنیاد پر جو رشتے قائم ہوئے وہ زیادہ مضبوط تھے اور ذاتی پابندیاں کمزور ہوگئیں۔ یہ نظام اٹھارھویں صدی تک قائم رہا

تجارتی نظریہ زر کا نظام

دو صدیاں یعنی سولھویں سے اٹھارھویں تک جو جاگیرداری نظام کے شکست و ریخت کے بعد آئیں ازمنہ وسطیٰ کی اور موجودہ (ماڈرن) یورپ کے تغیر پذیر تاریخ کے درمیان ایک تغیر پذیر وقفہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اقتصادی میدان میں ازمنہ وسطیٰ کی تجارت کی جگہ جود شکاری پر مبنی تھی تجارتی نظریہ زر کے نظام نے لے لی اور سیاسیات میں تعلقداروں کے اندرونی طور پر نیم آزاد تعلقوں کے ڈھیلے ڈھالے وفاق کی جگہ ایک مرکزی اور مضبوط مطلق العنان بادشاہت نے لے لی۔ ذہنی اور روحانی میدان میں ایک وسیع حجم کا انقلاب رُونما ہوا جس نے ذہنی نظریات دماغی طرز فکر اور طریقہ عمل میں عظیم انقلاب بپا کیا انسان کے معتقدات کی جڑوں کو گہرائی تک ہلا دیا اس طرح سہ رخی تحریک نے سوسائٹی کی کایا پلٹ کردی اور دورِ حاضر میں آزاد اور کامل الاختیار حکومتوں کو یورپ کی مقامی سیکولر (نامذہبی) قومی اور خود آگاہ سوسائٹیوں کی بنیاد پر اعزاز کے ساتھ داخل کردیا۔ ان سوسائٹیوں کے ممبر فرداً فرداً اور جماعتی طور پر بھی قومی، جذبات اور حب الوطنی کے بندھن میں ایک دوسرے سے بندھے ہونے کی وجہ سے آپس میں متحد تھے۔

اقتصادیات کے میدان میں جاگیرداری تنظیم کی جگہ تجارتی نظریہ زر نے لے لی۔ تجارتی نظریہ زر نے نئی صنعتوں کے قائم کرنے کی ہمت افزائی کی اور جزوی عطیات تجارت پر اجارہ داری کے عطایا ٹیکس سے استثنا کچے مال کی درآمد اور تیار شدہ اشیا کی برآمد پر

محصول میں جوڑ توڑ کر کے اور اشیا کے معیار قائم رکھنے پر کنٹرول قائم کر کے اس کو نشو و نما دی لیکن اس کی (صنعت) کی ترقی میں بہت سے اور معاملات نے مدد کی۔ مثلاً انفرادیت کی ترقی جو خود وسطیٰ زمانہ کے نظام کی رخصتی کا ایک نتیجہ تھا۔ اقتصادی زندگی میں دیہی جماعتوں اور انجمن تجار کا فنا ہو جانا افراد کا تعلقداروں اور ماہرینِ فن کے اقتدار سے آزاد ہو جانا اور انسان کے دماغ اور روح پر سے بیڑیوں کا ٹوٹ جانا۔ وہ عوامل جو تاجرانہ مالیات (تجارتی نظریۂ زر کی مالیات) کو عالم وجود میں لانے کے باعث ہوئے ان میں سرمایہ کا اکٹھا ہو جانا سب سے زیادہ اہم تھا۔ زراعت میں فارموں کی چک بندی اور بھیڑوں کے پالنے کے لیے چاروں طرف سے گھرے ہوئے احاطوں کے قیام نے پیداوار بڑھانے میں مدد کی اور صنعت کے لیے مزدور فراہم کیے تجارتی رخ پر اہم تبدیلیاں یہ تھیں کہ پیشہ وروں کی جماعتی کمپنیاں ابھریں۔ نئے راستوں اور نئے ملکوں۔ ہندوستان اور امریکہ کے دریافت سے بازاروں کا پھیلاؤ بڑھا اور یورپ کا اقتصادی مرکز نقل بحرِ متوسط کے ساحلوں کے بجائے بحرِ اٹلانٹک کے سمندری ساحلوں پر منتقل ہو گیا۔

ہندوستان اور امریکہ کی دریافت کے عظیم الشان نتائج ہوئے تجارت اور صنعت تیزی سے آگے بڑھی۔ سترھویں صدی کے آخر تک سمندر پار سے انگلستان کا حاصل کیا ہوا سرمایہ اس سے تین گنا تھا جتنا کہ یورپ سے تھا۔ تجارت نے جہاز رانی اور جہازوں کی تعمیر کو بڑا فروغ دیا امریکہ سے سونا اور چاندی یورپ میں برسنا شروع ہوا۔ اس نے اچانک اصل پونجی میں اضافہ کر دیا اس لیے درمیانی مہم بازیوں کو آگے بڑھنے کے لیے ایک مضبوط دھکا دیا۔ تجارت اور صنعت کی نئی ٹکنیک نے تاجروں اور مالکانِ صنعت کو نفع بخشا

تجارتی نظریۂ زر کے نظام کے وجود میں آنے سے اقتصادی اتحاد کو بھی ترقی ملی کیونکہ اس نے سکّے، وزن اور پیمانے کی تفریق کو مٹا دیا۔ کسٹم نے جو دیوار کھڑی کر رکھی تھی اس نے اور شہروں کی چنگی کی رسم کو توڑ دیا مقامی دستوروں کو مٹا کر ایک عام پالیسی قائم کی اور ایک مربوط نظم اقتصادیات قائم کیا۔ اس نے حکومت کے اختیارات کو بڑھا وادیا اس کے اقتدار کا پھیلاؤ اتنا بڑھا کہ اس کے تمام رقیب یعنی کلیسا شہر اور جاگیردارانہ تعلقے اس کے آگے سرنگوں ہو گئے۔ اس کے علاوہ تجارتی نظریۂ زر کی پالیسیوں سے حکومت کو دولت اور طاقت بیش از بیش ملی جن کا استعمال اس نے نوآبادیات کے حاصل کرنے فوجوں کے

اخراجات ادا کرنے اور اپنے رقیبوں پر جنگ کرنے میں کیا۔

تجارتی نظریۂ زر کی اقتصادیات کی بنیاد اشیا کی پیداوار کے طریقوں پر تھی جسے گھریلو نظام کہا گیا۔ اس کے مطابق اہل حرفہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ اپنے گھر پر کام کرتے تھے۔ اور اپنے اوزار کے مالک ہوتے تھے لیکن درمیانی لوگ (بانچولیے) کچا مال فراہم کرتے اور اس سے بنا ہوا سامان لیتے تھے۔ اور اسے بازار میں بیچتے تھے۔ اس طرح تاجروں نے خریداروں سے براہ راست رابطہ پیدا کیا۔ اور سامان بنانے والوں کی کارروائیوں پر کنٹرول رکھا تجارتی نفع زر کا نظام درمیانی طبقہ اور متوسط شہری حلقہ کی کامیابی کا نشان تھا۔ تجارتی نفع زر کی پالیسی اس سیاسی سلسلۂ عمل کا تکمیلی جزو تھا۔ جس سے حکومت روز بروز طاقت اثر اور اقتدار اپنے ہاتھ میں سمیٹ رہی تھی۔ سولھویں صدی میں تعلقہ دارانہ حکمرانی نے حکومت کے اختیارات سے بھڑنا اور اس کو محدود کرنے کی کوشش کرنا بند کر دیا تھا۔ لیکن کلیسا اب تک عوام الناس کے ذہن اور معتقدات پر اثر انداز تھا۔ وہ تحریکیں جس نے انسان کے دماغ کو آزاد کیا اور رومن کیتھولک چرچ کی تادیبی کارروائیوں کو اور اس کے نظام کو اُلٹ دیا نشاۃ ثانیہ یا Reformation اور اصلاح تھیں۔

نشاۃ ثانیہ جو اٹلی سے شروع ہوا ایک مکمل فلسفہ تھا۔ شروع شروع میں تو یہ قدیم یونان کے تمدنی ورثہ کی بازیافت تھا۔ لیکن یونانی تمدن ایک عقلی نکتہ سنجی اور سائنسی روح کا اظہار تھا۔ یہ کلچر انسانیت نوازی میں ڈوبا ہوا تھا اور فطرت کی زندگی ہی میں باغ باغ رہتا تھا اور ماوراُ الفطرت کے عمل دخل کا حصہ اس میں غیر اہم تھا۔

اس کے برخلاف مذہب جاگیردارانہ یورپ پر ایک ہمہ گیر اثر رکھتا تھا۔ حتیٰ کہ سیاسی اور اقتصادی زندگی بھی اس کی ہدایت اور اقتدار کے احاطہ سے کلیتہً باہر نہ تھی۔ کلیسا نے ہی عقل کے عمل دخل کے حدود مقرر کر رکھے تھے۔ ہر شعبۂ حیات میں یہ مسیحیوں کی زندگی اور ان کے عام کردار پر قیود عائد کرتا اور ان کے طور طرز کے لیے اپنے معیار مقرر کرتا تھا۔

نشاۃ ثانیہ نے ازمنۂ وسطیٰ کے مذہبی نظام پر مہلک ضرب لگائی۔ اب لوگوں نے اپنے اعمال کی صحت پر یقین رکھنے کے لیے اپنی عقل کی جانب رجوع کرنا شروع کر دیا۔ مذہبی احکام اور روایات جن بنیادوں پر قائم تھے ان کا انھوں نے تجزیہ کیا لوگ نیچر اور سائنس، انسان، اور اس کی خوشیوں اور غم اور مہم بازیوں اور خوبصورتی میں دلچسپی لینے لگے۔ افراد

نے اس تنگ فرقہ وارانہ زندگی کے ڈھانچے کو توڑ ڈالا جس میں وہ بند تھا۔

اس طرح جو آزادی حاصل ہوئی وہ جلد مذہب کے احاطہ میں بھی پھیل گئی۔ لوتھر کی طرح کے لوگوں نے رومن کیتھولک نظام کلیسا کے مقررہ عقائد اور مذہبی نظریات کا جائزہ لیا۔ اور بجائے اس کے کہ اپنے ضمیر کے جہاز کو پطرس کے چٹان پر لنگر انداز کریں اپنے ذاتی معتقدات میں اپنی زندگی کو مبنی برحق قرار دینے لگے۔ کلیسا کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی انگلستان کے بادشاہوں نے پارلیمنٹ کی رضامندی سے روما سے اپنی وفاداری ختم کر دی اور انگلستان کے نظام کلیسا میں اقتدار اعلیٰ کا منصب اختیار کر لیا۔ جرمنی میں کئی حکمرانوں نے یورپ کی اعلیٰ ترین برتری اور رومن کیتھولک عقائد کو رد کر دیا۔ کالون نے سوئٹزرلینڈ میں اسی طرح کی ایک تحریک چلائی۔ یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی پروٹسٹنٹ مذہب پھیل گیا۔ ریفارمیشن (تحریک اصلاح) نے یورپ کے ہر ملک کو دو بالمقابل گروہ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ میں تقسیم کر دیا۔ ان میں سے ہر ایک مذہبی طریقہ نہ صرف انسان کی تنگ مذہبی زندگی پر احتساب قائم کرتا تھا۔ بلکہ اس کی سیاسی اقتصادی اور معاشرتی چال چلن کا بھی نگراں تھا۔ اس قسم کے حالات میں جنگ ناگزیر تھی کیوں کہ جب اختلافات ایک ایسی منزل پر پہنچ جاتے ہیں جہاں صلح ممکن ہی نہ ہو تو تلوار ہی فیصلہ کرنے والی بن جاتی ہے۔

سو سال تک یعنی سولہویں صدی کے وسط سے سترھویں صدی کے وسط تک یورپ مذہبی لڑائیوں میں ڈوب گیا۔ خوفناک قتل عام اور تباکن فوجی حملوں کے بعد آخرکار یورپ نے یہ سبق سیکھا کہ یہ ممکن ہے کہ اچھے رومن کیتھولک اور اچھے پروٹسٹنٹ رہتے ہوئے بھی اپنے اپنے ملکوں کے فرماں بردار اور وفادار رعایا بن کر رہا جا سکے۔

اسی طرح سیاسیات کو سیکولر لباس پہنایا گیا اور انسان کے دنیوی مفادات کی اصل جن معاملات میں تھی ان کو مذہب کے عمل دخل سے پاک کر دیا گیا۔ حضرت عیسیٰ کی یہ نصیحت کہ جو اشیا قیصر کی ہیں وہ قیصر کو دو اور جو اشیا خدا کی ہیں وہ خدا کو دو" آخرکار رائج ہو کر رہی۔ اور امن کے حالات قائم ہوئے جس میں مذہبی گروہوں اور فرقوں نے اپنے اختلافات بھلا دیے۔ اور مشترک اغراض کے حصول کے لیے سب ایک واحد قوم کے ممبر کی حیثیت سے ایک دوسرے سے مل کر عمل پیرا ہوئے۔

یورپ کی موجودہ نیشنل (قومی) حکومتوں کی تعمیر میں تین انقلابات نے مشترک طور

پر کام کیا۔ تجارتی نظریہ سازوں نے قومی وحدت اور قومی طاقت کی اقتصادی بنیاد کا مسالہ دیا۔ نشاۃ ثانیہ نے قومی زبانوں اور قومی تہذیبوں کی نشوونما کو فروغ دیا۔ ریفارمیشن (اصلاحِ کلیسا) نے قومی کلیسائی نظاموں کے قائم ہونے کے اسباب مہیا کیے۔ ازمنہ وسطیٰ کی جامعیت کی جگہ سیکولر اور جغرافیائی حدود سے پابند رقبہ کی سوسائٹیوں کے قیام کی انفرادیت نے لے لی

صنعتی انقلاب اور نیشنلزم

بادشاہوں کے سیاسی اقتدار کی مرکزیت نے باشندگان یورپ میں قومی یک جہتی کا جذبہ بیدار کیا۔ اس بیداری کے جذبے کے دو عنصر تھے۔ ایک خاص ملک کے رہنے والوں میں باہمی یکسانیت کا احساس اور دوسرے ملکوں کے رہنے والوں سے اختلاف کا احساس۔

انگلستان وہ پہلا ملک تھا جہاں یہ قومی جذبہ سب سے پہلے نمودار ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ 1688ء میں انگلستان میں جو انقلاب رونما ہوا اس میں طاقت بادشاہ کے بجائے عوام کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ وفاداری بادشاہ کے بجائے خود عوام کو منتقل ہوگئی۔ اور افراد اور جماعتوں نے یکساں طور پر پارلیمنٹ میں اپنے ایک ہونے کو محسوس کیا۔ پہلا عوامی قومی ترانہ "برطانیہ حکومت کر" 1740ء میں لکھا گیا تھا۔

1789ء میں فرانس کا پرانا نظام ایک خونی انقلاب کی آگ میں تہس نہس ہوگیا۔ اس شعلہ فشانی میں یہ عقیدہ کہ سلطان کے اختیارات منجانب خدا ہیں جل کر خاک ہوگیا۔ لوئی چہاردہم کی یہ ڈینگ کہ "مملکت؟ میں مملکت ہوں" اور ان کے پوتے لوئی پانزدہم کا مغرورانہ اعلان کہ "یہ صرف میری ذات ہے جس کے اندر اقتدار اعلیٰ مرکوز ہے۔ میری رعایا کا وجود صرف اس میں ہے کہ وہ میرے ساتھ متحد رہیں" گلدستہ طاق نسیاں ہوگئے انقلاب سے فرانس ایک نیشن (قوم) بن کر نکلا اور نپولین کی فتوحات نے اس کو افتخار سے بھر دیا۔

نپولین کی فتوحات نے یورپ میں نیشنلزم کی مشعل روشن کی اور انیسویں صدی میں ایک ملک کے بعد دوسرے ملک میں اس کی روشنی پھیلتی گئی۔ یونان، بلجیم، جرمنی اور اٹلی، پولینڈ اور ہنگری میں نیشنلزم کا جذبہ ابھرا اور وہ آزادی اور یک جہتی کے حصول کی کوشش میں لگ گئے۔ اس کے بعد ایشیا پر اس کا جادو چلنے لگا۔ جاپان سب سے پہلے آگے بڑھا۔ ترکی، ایران، چین اور ہندوستان

سب نے شورش اور جذباتیت کو محسوس کیا۔ آج نیشنلزم (وطن پرستی) تمام عالم میں پھیلا ہوا نظارہ ہے یہ حرکت کرتا ہے اور بر اعظموں کے لوگوں کو حیات بخشتا ہے۔

یورپ کو جاگیردارانہ مزاج سے نکل کر قومی سالمیت میں داخل ہونے میں سات صدیاں لگیں لیکن جب ایک مرتبہ نیشنلزم قائم ہوگیا تو رفتار ترقی تیز ہو گئی۔

چونکہ متوسط طبقہ نیشنلزم کے قالب میں جان ڈالنے والا تھا اس لیے قدرتاً سب سے پہلے وہی اس سے نفع حاصل کرنے والا بھی ہوا۔ سیاسی طاقت اس کے ہاتھ میں منتقل ہو گئی اور ملک کی مالیات اس کے ہی مفادات کے زیر اثر رہے۔ جب سیاسی طاقت بادشاہ اور ایک محدود مطلق العنانی سے نکل کر تجار کے ہاتھوں میں گئی تو اس کے نتیجہ کے طور پر آزاد سوسائٹیاں وجود میں آئیں۔ یہ سوسائٹیاں آزاد ہیں۔ نہ صرف اس لیے کہ ان پر کوئی بیرونی دباؤ یا مداخلت نہیں ہے نہ صرف اس لیے کہ وہ اپنے اختیارات کے استعمال میں مختار کل ہیں بلکہ وہ آزاد اس لیے ہیں کہ وہ صرف اس حکم کو مانتی ہیں جو ان کی مرضی کے اندر یعنی قوم کی مرضی کے اندر مضمر ہے۔ ان سوسائٹیوں میں سیاسی طاقت کا استعمال قوم کے نمائندے کرتے ہیں جن کو قوم ووٹ کے حق کے ذریعہ منتخب کرتی ہے۔ اقتصادی آزادی اس طرح حاصل ہے کہ افراد کو معاہدوں کی آزادی حاصل ہے اور صنعت میں آزاد مقابلہ ہے۔ کلچرل آزادی اس طرح حاصل ہے کہ افراد پر خیالات، اظہار مذہب اور پیشہ کے انتخاب کے بارے میں پابندیاں ہٹا لی گئی ہیں متوسط طبقہ کی سربراہی میں سرمایہ دارانہ نظام کی نشوونما سے پیداوار نے بڑے قدم بڑھائے اور دولت ناقابل مثال پیمانہ پر ترقی کر گئی جن لوگوں کو فارغ البالی اور طاقت میں حصہ ملا ان کی طاقت روز بروز بڑھتی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست یا مملکت کی سوسائٹیوں کی اجتماعیت سے ہم آہنگی نے آگے بڑھ کر مکمل مساوات، آزادی اور جمہوریت کی منزل کو پالیا۔ اس ارتقا میں افراد، سوسائٹی اور مملکت کی اہمیت اور پوزیشن میں انقلاب آگیا اور انسانی قدریں اور مقاصد حیات مکمل طور پر بدل گئے۔

یورپ کی توسیع

سرمایہ دارانہ یورپین سوسائٹی کا اپنی فطرت ہی کی منطق سے یہ تقاضا ہوا کہ وہ دنیا میں پھیلے تاکہ وہاں سے اپنی صنعت کے لیے کچا مال فراہم کرے اور اپنی مصنوعات کے لیے نئے نئے بازاروں کا پتہ لگائے۔ اسی تلاش میں ہندوستان تک رسائی ہوئی، تب انگلستان نے جو

یورپ کے سرمایہ دارانہ نظام کا سب سے ترقی یافتہ مبصر تھا اس ملک پر اقتدار قائم کیا اور ان قوتوں کو حرکت میں لایا جنہوں نے اس کی کایا پلٹ کر دی۔ اس طرح متحرک ہو کر ہندوستان نے نیشنلزم کے راستہ پر سفر کیا اور باشندگان ہند قومی اتحاد کے جذبہ کے ظہور سے بیدار ہو کر اور اس سے توانائی حاصل کر کے حصول آزادی کے لیے جدوجہد کرنے لگے۔

جو روشنی یورپ کے معاشرتی انقلاب کی تاریخ سے ملتی ہے وہ ہندوستان کے ماضی کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ یورپین اقوام کے یہاں گھس آنے سے پہلے کے دور میں تاریخی تبدیلی کی رفتار اور اس کا سوز ایسے طریقہ کا تھا جو ہندوستان کے لیے مخصوص تھا۔ اس تبدیلی کا جوش مدہم تھا کیوں کہ سوسائٹی ساکن تھی آبادی یا تو رکی ہوئی تھی یا اگر کوئی دباؤ ہوتا تو اس کا دفعیہ اس سے ہو جاتا تھا کہ ملک کے اندر بڑے بڑے رقبے غیر آباد پڑے تھے۔ پیداوار کے طریقے متعین تھے اور بس اتنے تھے کہ باشندوں کی بہت معمولی ضروریات کے لیے کافی ہو سکیں۔ معاشرتی نظام طبق در طبق جما ہوا مقرر تھا۔ اور معاشرت کے میدان میں حرکت ناپید تھی اس کے بعد اٹھارھویں صدی کے وسط میں باشندگان ہند کا ایک قوت عمل رکھنے والی مغربی سوسائٹی سے تصادم ہوا جس کی تہذیب کا ہر پہلو اس سے مختلف تھا نتیجہ میں مغربی اثرات زبردست قوت کے ساتھ عمل دخل کرنے لگے۔ انھوں نے معاشرتی تبدیلیوں کی رفتار کو تیز کر دیا اور ایسے نتائج پیدا کیے جو انہی کے مثل تھے جو یورپ میں پیدا ہوئے تھے۔

ہندوستان میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد تیزی سے زوال شروع ہوا اٹھارھویں صدی کے وسط میں مرکزی حکومت مطلقاً برباد ہو چکی تھی اور اس کی جگہ انتشار اور مزاج لے لی تھی۔ بدقسمتی سے نہ کوئی فرد اور نہ کوئی گروہ ہی اٹھا کہ ملک کی سالمیت کو برقرار رکھنے کے لیے مغلوں کی شہنشاہیت کی جگہ لے سکے۔ اس طرح جو سیاسی خلا پیدا ہوا اس نے بیرونی طاقتوں کو گھس آنے کی دعوت دی ماضی کے اسی طرح کے حالات میں وسط ایشیا کے حملہ آوروں نے خلا کو پُر کیا تھا۔ اٹھارھویں صدی میں ہندوستان کے شمالی مغربی ہمسائے اندرونی خانہ جنگی کی لپیٹ میں تھے۔ اگرچہ 1730ء میں نادر شاہ اور 1748ء اور 1773ء کے درمیان احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان پر جنگ جویانہ حملے نے دلی کی سلطنت کے ٹوٹتے ہوئے تاروں پر مہلک ضربیں لگائیں لیکن پھر بھی ایران افغانستان اور وسط ایشیا کے حالات محمود غزنوی، محمد غوری اور بابر کی فتوحات کو دُہرانے کے لیے سازگار نہ تھے۔

حالات نے اس طرح سمندر پار کے بیرونی لوگوں کی ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرنے کی موافقت کی۔ ان میں کئی مقابلے میں تھے آخر کار انگریزوں نے یورپ کے اپنے تمام رقیبوں کو شکست دے دی اور باشندگان ہند کو اپنی حکومت کے ماتحت کر لیا۔ 1751 کی جنگ پلاسی کے بعد پردہ اُٹھ جاتا ہے اس کے بعد انسانی دلچسپی کا ایک قابل دید ڈراما شروع ہوتا ہے جس کے آخری منظر کا کھیل 15 اگست 1947ء کو کھیلا گیا۔ یہ ڈرامہ واقعی عصری تھا۔ اس نے اپنی لپیٹ میں دو صدیاں لے لیں جیسا کہ کل ڈراموں میں ہوتا ہے۔ اخلاقی اور مادی طاقتوں کا ٹکراؤ اس کے پلاٹ کا ماحصل تھا۔ اس کی تمہید تو قدیم زمانہ تک جاتی ہے لیکن ڈرامائی عصر کے واقعات کی تاریخ اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں شروع ہوتی ہے۔ جب ہندوستان غائب ہونا شروع ہوا تھا اور نئی طاقتوں نے اپنا غلبہ قائم کرنا شروع کر دیا تھا۔

اس ڈرامے کا جب پردہ اٹھتا ہے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے تین ایکٹ ہیں اس کے پہلے ایکٹ میں وہ ہندوستان ہے جس کی خوبیوں نے رفتہ رفتہ گھٹتے گھٹتے اسے آزادی کھو دینے تک پہونچا دیا۔ دوسرے ایکٹ میں ایک قطعی اجنبی تہذیب کا دھکا ایک نیا جذبہ پیدا کرتا ہے جو پرانی بچی کچی توانائی کو زندگی کے ایک نئے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اور آخری ایکٹ میں ہندوستان دوبارہ پیدا ہو کر خود شناسی اور آزادی کی جانب مضبوط قدموں سے آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

پہلا باب

سلطنتِ مغلیہ کا زوال اور خاتمہ

اورنگ زیب اور ان کے جانشین

پچاس سال تک اورنگ زیب کے ہاتھ میں ایک ایسی مملکت کی باگ رہی جس کی ہمسری کا دعویٰ کیا باعتبار رقبہ، کیا باعتبار آبادی اور کیا باعتبار دولت اس عصر کی پوری دنیا کی مملکتوں میں سے کوئی بھی نہ کر سکتی تھی۔ اپنے انتہائی پیچیدہ فرائض کے ادا کرنے میں اس نے جس لگن، محنت، ہمت اور استقلال کا اظہار کیا وہ اس کو تاریخ کے ایک عدیم المثال حکمران کی حیثیت سے ممتاز کرتا ہے۔ اس کی ذاتی زندگی ایک نیک انسان کا نمونہ تھی وہ ان تمام برائیوں سے بری تھا جو ایشیا کے بادشاہوں اور شہزادوں میں عام طور سے پائی جاتی تھیں۔ وہ سادگی کی زندگی بسر کرتا تھا نہیں نہیں بلکہ وہ زندگی کی ضروریات کا بھی تارک تھا۔ وہ کھانے پینے میں لباس اور زندگی کی تمام ضروریات میں ازحد پھیکے موٹے بھدے پر قناعت کرتا تھا۔ بادشاہت کے نظم و نسق کے بھاری کاموں میں مشغول ہونے کے باوجود وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے قرآن کی نقل کرنے اور ٹوپیاں سینے کے لیے وقت نکال لیتا تھا۔ اپنی آخری وصیت میں اپنے تجہیز و تکفین کے اخراجات کے متعلق اس کی ہدایت یہ تھی کہ "چار روپے اور دو آنے ٹوپیوں کی قیمت میں سے بچ رہے ہیں جو میری سی ہوئی آیا بیگ محلدار کے پاس ہیں اس کو لے لو اور اس بے کس مخلوق کے کفن پر خرچ کرو۔ تین سو پانچ روپے اس اجرت سے بچے ہیں جو قرآن کی نقل کرنے کے صلہ میں مجھ کو ملے ہیں وہ میرے ذاتی اخراجات کے لیے میرے بٹوے میں ہیں اسے میری موت کے دن فقرا میں تقسیم کرو"(۱) اس کے روزمرہ کے اوقات اپنے اوپر سخت گیری پر مبنی تھے اور چوبیس گھنٹے میں صرف تین

لعنت سونے کے لیے دیتا تھا (2) وہ جس طرح اپنے اوپر سخت تھا اسی طرح دوسروں سے بھی کام لینے میں سخت گیر تھا۔ اپنے وسیع نظم و نسق کے جزئیات تک کی وہ نگرانی کرتا تھا اور ہر فوجی مہم کی وہ بذات خود رہبری کرتا تھا۔ اس کے پاس نہ ختم ہونے والی توانائی اور کبھی نہ مغلوب ہونے والی قوتِ ارادی تھی۔

لیکن بے پناہ محنت، راتوں کی نیند حرام کر کے خبردار رہنے کی جفاکشی اپنی خشک زاہدانہ پاکبازی بحیثیت منتظم اپنی شک سے بالاتر اہلیت اور ممتاز مدبر اور جنرل ہونے کے باوجود اس کی حکومت ناکامیاب رہی وہ اس کو جانتا تھا۔ اپنے دوسرے بیٹے اعظم کو جو اس نے آخری خط لکھا ہے اس میں اس نے اس کا اقبال کیا ہے کہ "میں نے اپنے عہد میں کوئی صحیح حکومت نہیں کی نہ کاشتکاروں کی صحیح پرورش و پرداخت کر سکا زندگی جو اس درجہ قیمتی ہے بلا کسی نتیجہ کے ضائع ہوگئی (3)

مرنے سے کچھ ہی پہلے اورنگ زیب نے اپنی حکومت اپنے تین لڑکوں معظم، اعظم اور کام بخش تقسیم کردی تھی۔ لیکن ابھی اس کی آنکھ پوری طرح بند بھی نہ ہوئی تھی کہ تخت کی وراثت کے لیے ان میں اختلافات رونما ہوگئے۔ بھائیوں کی باہمی کشمکش میں معظم نے اپنے کو کامیاب ثابت کیا اور وہ تخت حکومت پر "بہادر شاہ" کے لقب کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ اس کی حکومت مختصر تھی چار سال حکومت کر کے وہ 1712ء میں مر گیا۔ اس کے بعد دوبارہ تخت کی جانشینی کے لیے جنگ شروع ہوگئی۔

بہادر شاہ کے چاروں لڑکے ایسی نازیبا جلدی میں تھے کہ بوڑھے کی لاش ایک ماہ تک دفن نہ ہو سکی یہ جنگ آخر میں دو کے درمیان مقابلہ ہوگئی ایک طرف "عظیم الشان" دوسرے صاحب زادے تھے جو کل بیٹوں میں سب سے زیادہ لائق تھے اور دوسری طرف "جہاندار شاہ" تھا جو ایک عیاش نفس پرست انسان تھا۔ لیکن جنگی کارروائیوں میں عظیم الشان کی حماقت اور تساہلی اور ذوالفقار علی خاں کی جو ایرانی پارٹی کا لیڈر تھا اور شاہی فوج کے میر بخشی کی ماہرانہ سپہ سالاری نے جہاندار شاہ کے لیے تخت کو جیت لیا۔

---

(1) سرکار جدوناتھ۔ ہسٹری آف اورنگ زیب جلد 5 صفحہ 264

(2) " " ۔ اسٹڈیز ان اورنگ زیبس رین صفحہ 28

(3) " " ۔ ہسٹری آف اورنگ زیب صفحہ 259

جہاں دار شاہ کے تخت نشین ہونے کے بعد ایک نیا لیکن ناپاک عنصر مملکت کی سیاست میں داخل ہوا۔ اب تک تخت کی جانشینی کی کشمکش میں شہزادگان بذات خود بالمقابل ہوتے تھے لیکن اب وہ پس پردہ چلے گئے۔ اس کے بجائے حوصلہ مند امرا اور بڑے بڑے عہدیدار اور گروہوں کے سرغنہ طاقت کے حصول میں اصل مقابلہ کرنے والے ہوگئے۔ وہ شہزادوں کو برائے نام سربراہ کی حیثیت سے محض اس لیے ظاہر کرتے اور ان کا نام دکھاوے کے لیے بطور اصل حریف اس لیے استعمال کرتے تھے کہ ان کے نام سے اعزاز وابستہ تھا اور شاہی مہر احکام اور فیصلوں کو قانونی حیثیت دیتی تھی یہ طاقتور عہدیداران "سلطان گری" کا کام کرتے۔ اختیارات اور سرپرستانہ اقتدار کو خود برتتے اور خوب دولت جمع کرتے تھے۔ اس اندرونی جنگ کا سیلاب شہنشاہیت کے عظیم قصر کو بہالے گیا۔

جہاندار ناعاقبت اندیش اوباش اور فضول خرچ تھا۔ ایک پاگل، بھنگ کھانے والا۔ اس نے ایک عیاش اور زنانہ شاہی درباری زندگی کی مثال پیش کی اور حکمران جماعت کے اخلاق کو برباد کردیا۔ اس کے اثرات نے نہ صرف پرانی شہنشاہانہ عظمت کا پھر واپس آنا ناممکن بنادیا بلکہ ایک معمولی رقبہ کی آزاد حکومت کی بقا کے تمام امکانات کو بھی ختم کردیا۔

بادشاہ کی حیثیت گھٹ کر محض ایک کھلونہ کی بن گئی اور کل اختیارات وزیر اور وزرا کے ہاتھ میں چلے گئے۔ ان لوگوں نے اپنے اختیارات اپنے نائبوں کو تفویض کردیئے اس طرح ذمہ داری بٹ گئی اور وزیر با اختیار کے ارادے و خیال کے مطابق عہدے ایک شخص سے دوسرے شخص کو منتقل ہوتے رہتے تھے۔ جن لوگوں کو یہ عارضی عہدے ملتے تھے وہ ان مواقع سے فائدہ اُٹھاکر تیزی سے نفع خوری کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نظم ونسق نظر انداز کردیا گیا۔ اور لاقانونیت پھیل گئی۔ تخت کے بہت سے حقداروں کے ظاہر ہونے اور بادشاہوں کی پے درپے تبدیلیوں سے شاہی اقتدار کا پورا تخیل ہی معدوم ہوکر رہ گیا۔

اپنی گیارہ ماہ کی حکومت میں جہاندار شاہ نے اس خزانہ کا بیشتر حصہ جو اس کے پیش روؤں نے جمع کیا تھا فضول خرچ کردیا۔ سونا چاندی اور دوسری بیش بہا چیزیں جو بابر کے زمانہ سے جمع کی گئی تھیں ادھر ادھر کردی گئیں۔

اس کے بعد بارہہ کے سیدوں نے فرخ سیر کو بادشاہ کے خلاف کھڑا کیا بادشاہ فوج کو چھوڑ چھاڑ کر اپنی منظورِ نظر مدخولہ لال کنور کے ساتھ میدان سے بھاگ نکلا۔

بدقسمتی سے فرخ سیر ایک قابلِ نفرت کردار ثابت ہوا۔ وہ وعدوں کے پورا کرنے میں بدعہد، اپنے محسنوں کا ناشکر گذار، سازشوں میں سفاک، متلونِ مزاج بزدل اور ظالم تھا وہ اپنے خاص منظور نظر میر جملہ اور خاں دوراں خاں کے کہنے پر چلتا تھا۔ اس نے سید برادران سے جھگڑا شروع کر دیا اور حقیقی طاقت کے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ سید برادران جنہوں نے اپنی شک و شبہ سے بالاتر اہلیتیں اور عظیم وسائل اس کو دیئے تھے قدرتاً گورنمنٹ پر اور بالخصوص تقرریوں کے معاملات اور مالِ غنیمت پر مکمل اقتدار کا مطالبہ کرتے تھے۔

روز بروز یہ تصادم تلخ ہوتا گیا سید برادران کے اقتدار کو اُتار پھینکنے کے لیے فرخ سیر نے دھوکہ دہی اور حد سے زیادہ نفرت انگیز قسم کی سازش شروع کی۔ راجپوتانہ کی بغاوت فرو کرنے کے لیے حسین علی شاہی افواج کا سردار مقرر کیا گیا۔ اسی وقت جودھ پور کے باغی راجہ جیت سنگھ راٹھور کو خفیہ خطوط لکھے گئے کہ اگر وہ حسین علی کو ٹھکانے لگا دے تو اُسے بیش بہا انعامات دیئے جائیں گے۔ اس کے بعد دوسری سازش کی گئی دکن کے وائسرائے نظام الملک کو واپس بلالیا گیا اور یہ صوبہ حسین علی کے چارج میں دیا گیا۔ جب وہ دکن کے راستہ میں تھا تو دکن کے ڈپٹی گورنر داد وخاں کو خفیہ طور پر اُکسایا گیا کہ وہ ان کا راستہ روکے۔ یہ سازش ناکام ہوئی داؤد خاں کو شکست ہوئی اور وہ قتل ہوگیا۔

تین سال اسی قسم کی خفیہ تدبیروں اور جوابی تدبیروں میں گذر گئے۔ بادشاہ نے پے درپے امیر الامرا پر کوشش صرف کی جب کہ عبداللہ کا بھائی دکن میں تھا کہ وہ اس پر ہاتھ ڈالیں مگر کسی کو اس کے اس ناپاک ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ان کے خسر راجہ اجیت سنگھ سے مدد بھی طلب کئے گئے لیکن یہ پُرانے اور ذہین حکمران اپنے داماد کے کردار سے واقف تھے وہ دلّی آئے ضرور لیکن سید عبداللہ کے طرف دار ہوگئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ نظام الملک اور ان کے چچازاد بھائی محمد امین خاں جیسے مغل امرا کی جماعت اور تورانی پارٹی کے لیڈران متلون مزاج اور ناقابل اعتماد بادشاہ کے خلاف ہوگئے۔

جب ان سازشوں کی سن گن حسین علی کو ملی تو وہ بعجلت تمام شمال کو لوٹا وہ ۱۷۱۹ء میں دلّی اس عزم کے ساتھ پہونچا کہ ان افسوسناک واقعات کا فوراً اور کلیۃً خاتمہ کر دے۔ حسین علی کی فوج میں گیارہ ہزار مرہٹے تھے جس کی کمان پیشوا بالاجی وشوا ناتھ، سیناپتی کھانڈے راؤ دبھادے ستاجی اور بھونسلہ وغیرہ کر رہے تھے۔ دلّی کا قلعہ اور شاہی محل فرخ سیر کے طرفداروں

سے صاف کر دیا گیا۔ بادشاہ جس نے بزدلانہ انداز میں عورتوں کے کمرے میں پناہ لی تھی کھینچ کر باہر لایا گیا۔ اندھا کر دیا گیا۔ اور ایک تنگ کال کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ چند دن کے بعد اور اس دوران میں ہر قسم کی ذلت اس پر لادی گئی اُسے بھوکا رکھا گیا مارا پیٹا گیا بتدریج اثر کرنے والا زہر دیا گیا آخر کار، اُسے بدترین اور شرمناک طریقہ سے قتل کر دیا گیا۔

فرخ سیر کی حکومت کے چند برسوں کے اندر مملکت نے زوال کی جانب بڑی تیزی سے قدم بڑھائے۔ ہر جگہ بدامنی نے اپنا گھنونا سر اٹھایا۔ افسران تعلقداروں اور قبائلی جماعتوں کے سربراہوں نے گورنمنٹ کے احکام کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ امرا کے دستوں میں دلّی کی سڑکوں پر مسلح تصادم ہونے لگے بازار اور سڑکیں چوروں اور ڈاکوؤں سے بھر گئیں فرخ سیر نے یہ نئی مثال قائم کی تھی کہ صوبوں کے محاصل جب خزانہ شاہی کو روانہ کیے جاتے تھے تو وہ راستہ ہی سے ان کو اپنے تغلب و تصرف بے جا میں لے آتا تھا یہ ایک ایسی مثال تھی جو اُن حوصلہ مند مہم بازوں پر اثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی جو اپنے لیے آزاد ریاستیں بنانے کے لیے مضطرب تھے۔ چنانچہ شاہی احکام کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہوتی اور عہدیداران بلا اجازت اپنی جگہیں چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ قواعد وضوابط جن پر اورنگ زیب کے زمانہ میں سختی سے عمل درآمد ہوتا تھا پس پشت کر دیے گئے تھے۔ رشوت خوری اور تساہلی کا رواج تھا۔ چونکہ آمدنی کم ہوتی گئی تھی اور جمع شدہ دولت بھی ختم ہو گئی تھی اس لیے تو تنخواہیں چڑھتی گئیں جن فوجیوں کو تنخواہیں نہیں ملیں ان کا انداز باغیانہ ہو گیا۔

سب سے زیادہ قابلِ نفرت منظر ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے امرا کی رقابت اور ان کا باہمی جذبہ حسد تھا۔ ان گروہوں میں چار اہم تھے تورانی۔ ایرانی۔ افغان اور ہندوستانی۔ اول الذکر تین ان بیرونی لوگوں کی اولاد تھے جو وسط ایشیا ایران اور افغانستان سے ہندوستان آئے تھے اور سول اور ملٹری محکموں میں ان کو ملازمتیں دی گئی تھیں یہ بیشتر خاندان اورنگ زیب کے زمانے میں اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان کی جانب آئے تھے جن کو اعلیٰ عہدے دیئے گئے تھے۔ تورانی جو ماوراء دریائے آکسس Oxlane سے آئے سنّی مذہب رکھتے تھے۔ ایرانی ایران کے کے مشرقی اور مغربی صوبوں۔ خراسان اور فارس سے آئے تھے یہ شیعہ تھے۔ افغانی دریائے سندھ کے اس پار کے پہاڑی سرحدی علاقے سے آئے تھے ان میں بہت سے روہیلہ قبیلے سے تھے۔ یہ زیادہ تر سنّی تھے ان لوگوں نے متعدد مقامات پر اور خاص کر بریلی اور فرخ آباد میں مستقل سکونت

اختیار کر لی تھی۔ ہندوستانی امرا میں وہ مسلمان خاندان تھے جو اس ملک میں کئی پشتوں سے مستقل طور پر رہتے چلے آرہے تھے اور فطرۃً نئے آنے والوں سے بغض و حسد رکھتے تھے۔

جب تک مرکزی طاقت مضبوط تھی یہ تمام گروہ قابو سے باہر نہیں ہو پائے لیکن بہادر شاہ کی موت کے بعد ان کی اہمیت اور ان کا اثر اس لیے بڑھ گیا کہ تخت کے حریف دعویداروں نے ان سے مدد طلب کرنی شروع کی۔ اٹھارھویں صدی کی تاریخ ان کی سازشوں اور ایسی کہانیوں سے بھری ہوئی ہے کہ کس طرح وہ حیران کن سرعت کے ساتھ وفاداری بدلتے رہتے تھے۔

بادشاہ کی ذات پر تسلط جما کر کے ہی ہر گروہ اپنے مقصد کے حصول کی کوشش کرتا تھا۔ اس غرض کے لیے ہر گروہ کسی بھی ذریعے کو استعمال کرنے اور جہاں کہیں سے مدد مل سکے اس کو فراہم کرنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ مثلاً جب حسین علی نے فرخ سیر کو معزول کرنے کا فیصلہ کیا تو وہ مرہٹوں کو لے آیا اور بادشاہ کو بے بس کر کے صرف سوراجیہ پر مہر تصدیق ثبت کرا دی جس کا مطالبہ مرہٹے شیواجی کی فتوحات کی بنا پر کرتے تھے۔ بلکہ ان کو چوتھ اور دکن کی سردیش بھی لکھی (یعنی صوبہ کے کل محاصل کا 35 فی صدی جو اندازاً 18 کروڑ کی گراں قدر رقم ہوتی تھی) عطا کی۔ اگرچہ اس معاملہ کی وجہ سے مرہٹہ ریاست کا حکمران اس وقت سے شہنشاہ معظم کا حلقہ بگوش اور ان کا ایک وفادار خادم بن گیا پھر بھی یہ تو ہوا ہی کہ ان کو ان محاصل تک دسترس حاصل ہو گئی اور مملکت کے معاملات میں دخل اندازی کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔

سید برادران زیادہ مدت تک اپنی فتح کا لطف نہ اٹھا سکے۔ محمد شاہ جس کو ان لوگوں نے تخت پر بٹھایا تھا ان کی سرپرستی کو ناپسند کرتا تھا۔ تورانی جماعت کے لیڈر نظام الملک گورنر دکن اور ان کے نسبتی بھائی عبدالصمد خاں گورنر لاہور نیز ایرانی گروہ کے سربراہ بھی سیدوں کے غلبہ سے تنگ آ چکے تھے ان سب نے فیصلہ کیا کہ ان کو ختم کر دیا جائے۔ سیدوں کو جب یہ رپورٹیں ملیں تو انھوں نے ان سب کو ان کے عہدوں سے ہٹا دینے کے لیے قدم اٹھایا لیکن نظام الملک کے خلاف جو فوج انھوں نے بھیجی وہ ہار گئی اور ان کا سپہ سالار قتل ہو گیا۔ تب حسین علی محمد شاہ کو اپنے ہمراہ لے کر نظام الملک کو دبانے کے لیے بذات خود روانہ ہوا محمد امین خاں نے جو سید حسین علی کے ہمراہ اس کے نائب بخشی کی حیثیت سے تھا سید کو قتل کر دینے کا منصوبہ تیار کیا۔ اور فتح پور سیکری سے فوج کے روانہ ہونے کے بعد اس پر عمل ہو گیا اور حسین علی قتل کر دیا گیا (1720)

عبداللہ غصہ سے پاگل ہو گیا اور اپنے بھائی کی موت کا بدلہ لینے کے لیے اس نے محمد شاہ کو معزول

کردے کا تہیہ کرلیا اس نے بادشاہ کے خلاف ہلہ بول دیا لیکن وہ شکست کھا کر قید ہو گیا دو سال کے بعد اس کو جیل خانہ ہی میں زہر دے دیا گیا۔ اس طرح فرخ سیر کی معزولی کے اکیس ماہ کے اندر ہی یہ دونوں «بادشاہ گر» اپنے کیفر کردار کو پہونچ چکے تھے۔

نوعمر محمد شاہ کو حکومت میں کوئی دلچسپی نہ تھی ذلیل قسم کے مصاحبوں میں گھرا وہ اپنے اوقات فضول کاموں میں صرف کرتا تھا اس نے سلطنت کا ہر کام اپنے وزیر قمرالدین خاں پر جو محمد امین خاں کا فرزند تھا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن وزیر صاحب کاہل الوجود سست رو اور عیش پسند آدمی ثابت ہوئے۔ دلی میں کوئی حکومت ہی نہ رہی اسی لیے جب نادر شاہ سے افغانستان کو خطرہ لاحق ہوا اور کابل کے گورنر نے فوجی کمک اور بقایا ادا کرنے کے لیے روپیہ مانگا تو اس کی درخواست پر کوئی توجہ نہ دی گئی۔

قمرالدین کے اختیارات سے حسد کی بنا پر امرا کے قائدین مملکت کے مفاد کے خلاف اس کے دشمنوں سے غدارانہ سازشیں کرنے لگے۔ یہ لوگ اس درجہ بزدل ہو گئے تھے کہ اگر ان کے سپرد کوئی فوجی کام کر دیا جاتا جس میں ذرا بھی خطرہ ہو تو وہ اس سے بھاگتے ان میں کوئی بھی مرہٹوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہ تھا اور جودھ پور کے باغی راجہ کے خلاف مہم پر جانے کا جب حکم ہوا تو ان لوگوں نے بہانے تراشے بادشاہ اور ان کے امرا جو مثال پیش کر رہے تھے اس سے ہر چہار جانب دون ہمتی اور پست اخلاقی پھیل رہی تھی۔

نتیجہ تباہی خیز برآمد ہوا مملکت کا ریشہ ریشہ الگ ہونے لگا بہت سے صوبے عملاً آزاد ہو گئے بہار، بنگال اور اوڑیسہ میں مرشد قلی خاں کی اور اودھ میں سعادت خاں کی دلی سے وفاداری بس برائے نام رہ گئی۔ کابل اور لاہور کے گورنران کو اپنے ہی وسائل پر بھروسہ کرنا پڑ رہا تھا۔ مرہٹوں نے گجرات مالوہ اور بندیلکھنڈ کا ایک حصہ قبضہ میں کر لیا۔ دوآبہ میں روہیلے خودمختار ریاستیں قائم کرنے لگے۔

راجپوتانہ میں تین سربراہ خاندان تھے ان میں میواڑ کے راجہ سیسودیہ مغل سیاست میں بہت کم دلچسپی لیتے تھے اگرچہ وہ مغل بادشاہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے تھے۔ جودھ پور کے راٹھور جو جسونت سنگھ کے انتقال کے بعد سے اورنگ زیب کے مخالف تھے لیکن ان کے مرنے کے بعد راضی ہو گئے تھے تخت دلی سے ان کی وفاداری غیر مستقل سی رہی اگرچہ وہ اعلیٰ عہدے قبول کرتے رہے۔ جے پور کے کچھواہہ بھی جن کی وفاداری کا ریکارڈ مربوط و مسلسل رہا ہے عام

تخریب اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ راجہ جے سنگھ کو جنھوں نے جاٹوں کے حملے کو جو چورامن کی قیادت میں کیا گیا تھا پسپا کر دیا تھا صوبہ دار اس لیے مقرر کیا گیا کہ وہ مرہٹوں کے سالانہ حملوں کے سیلاب کو روک سکیں۔ لیکن شاہی مفاد کی محافظت کرنے کے بجائے وہ ہی مرہٹوں سے جا ملے جس کا انجام یہ ہوا کہ یہ صوبہ ہی ہاتھ سے نکل گیا۔

نوبت یہاں تک آگئی کہ دلی کے گرد و نواح بھی خطرات سے معمور رہنے لگے سکھ، جاٹ، روہیلہ اور مرہٹہ چاروں طرف منڈلاتے رہتے تھے۔ 1737ء میں باجی راؤ اپنے گھوڑے پر سوار دارالسلطنت دلی میں بلا مدافعت داخل ہو گیا اور مملکت کی بے بسی بے نقاب ہو گئی دارالسلطنت کے اندر اور اس کے باہر ہر جگہ بدامنی کا دور دورہ تھا۔

نادرشاہ

لیکن مملکت کو اس سے کہیں بڑی بدقسمتی کا سامنا کرنا پڑا۔ باجی راؤ کے دلی پر حملہ کرنے کے ایک سال بعد بادشاہ ایران نادرشاہ نے شمالی افغانستان میں اپنی فوجوں کو حرکت دی عدم تیاری اور لاپرواہی کی عام فضا نے اس کا کابل میں داخلہ آسان کر دیا۔ اس کے بعد اس نے درۂ خیبر کو پار کیا اور سرعت کے ساتھ لاہور تک پہنچ گیا راستہ میں کسی قسم کی مزاحمت نہیں ہوئی دلی کو خطرہ لاحق ہونے سے مغلوں میں حرکت کا جذبہ پیدا ہوا اور محمد شاہ اور ان کی فوج کرنال پہونچی اور وہاں خندقیں کھود کر جم گئی جرنیلوں کی نااہلیت اور جذبۂ تعاون کے فقدان کی وجہ سے شکست فاش ہوئی۔ شکست سے پست ہمتی پیدا ہوئی۔ شبہات خوف اور اضطراب نے مل جل کر ایک ایسا طاقتور جذبہ پیدا کر دیا جس کی بدولت کمان دار خود اپنی حفاظت کے لیے ایک دوسرے کے خلاف کام کرنے لگے۔ اس کے نتیجہ میں غداری نمودار ہوئی۔ اودھ کے گورنر سعادت خاں نے جو اس لڑائی میں گرفتار ہو گئے تھے ایرانی تھے اور تورانیوں سے خاص کر نظام الملک سے جو بادشاہ کے مشیر خاص مقرر کر دیئے گئے تھے رقیبانہ بغض رکھتے تھے انتقام کے جذبہ سے اندھے ہو کر نادرشاہ کی حرص کو ابھارا اور ترغیب دی کہ وہ دلی پہونچیں جہاں ان کو اتنی دولت ملے گی جس کا انھوں نے کبھی خواب بھی نہ دیکھا ہوگا۔

نادر کی حرص میں اُبال آگیا اس نے بادشاہ کو قید کر کے دلی کی جانب کوچ کر دیا جامع مسجد کے منبر سے اس کے شہنشاہ ہندوستان ہونے کا اعلان ہوا اور اس کے نام کا سکہ

جاری ہوگیا۔ ساکنان دلّی اس قبضہ کی وجہ سے خوف سے کانپ رہے تھے جب نادر اور اس کے افسران مختار اور دولت مند لوگوں کو لوٹتا اور باشندوں پر ذلت اور ظلم برسا کر زبردستی روپیہ چھیننا شروع کیا تو بڑا غصہ پیدا ہوا۔ ایک معمولی واقعہ طوفان بن گیا جس پر نادر نے قتل عام کا حکم دے دیا سڑکوں پر خون کا دریا بہنے لگا اور آتش زنی کوچہ و بازار میں پھیل گئی۔ پورا بازار جل اُٹھا۔ نادر نے بے شمار دولت بطور تاوان جنگ حاصل کی سونے اور چاندی کی اینٹیں، زیورات، تخت طاؤس اور قیمتی خزانے جو بادشاہوں نے کئی پشتوں سے جمع کئے تھے سب کو زبردستی لے لیا بے شمار ہاتھی، گھوڑے اور اونٹ اور لگ بھگ پندرہ کروڑ روپیہ نقد لوٹ لیے گئے۔

فاتح کا کوئی منصوبہ ہندوستان میں قیام کرنے کا نہ تھا اس نے محمد شاہ کو تاج عطا کر دیا۔ اور لوٹ کا بے شمار مال لے کر چل دیا۔ نادر شاہ کے حملے نے مملکت کو ایسا دھکا مارا جس سے وہ کبھی سنبھل نہ سکی۔ کابل کا صوبہ ہاتھ سے نکل گیا اور ہندوستان کی سرحد درہ خیبر اور پشاور دشمن کے قبضہ میں چھوڑ کر دریائے سندھ تک پیچھے ڈھکیل دی گئی۔

پنجاب تاراج اور حملوں کا شکار بن گیا۔ جب نادر نے پنجاب فتح کیا تو ذکریا خاں وہاں کا گورنر تھا۔ وہ 1745ء میں مر گیا گورنری کے لیے ان کے بیٹوں میں جنگ چھڑ گئی ان میں سے ایک نے احمد شاہ ابدالی کو جو کابل کے تخت پر نادر شاہ کے بعد متمکن ہوا تھا ہندوستان آنے کی دعوت دی اس وقت سے اپنی وفات تک جو 1773ء میں واقع ہوئی ابدالی پنجاب کو تاخت و تاراج کرتا اور لوٹتا رہا۔

اٹھارھویں صدی کے دوسرے نصف کا ہندوستان مشہور سیاسی مفکر ہابسن کے فلسفۂ فطرت کی مکمل تصویر پیش کرتا ہے یہ ایک جنگل کے مانند تھا جس میں خوفناک اور حیوان صفت انسان چاروں طرف گھومتے تھے اور جن کے لیے محرک جذبات صرف گہری خود غرضی اور طاقت کے لیے غیر معمولی تنگ نظرانہ حرص تھی۔ ان کی روک کے لیے نہ کوئی اخلاقی نقطہ نظر تھا اور نہ ان کے پاس کوئی دور اندیشانہ مقاصد تھے۔ ان لوگوں نے اپنے فوری مقاصد کے حصول کے لیے جس طرح سازشیں اور کمینی تدبیریں کیں اور جس طرح طاقت اور دغابازی کو برملا استعمال کیا یہ سب دلّی کو بھی شرمندہ کر دے گا۔ اس احمقانہ اور زہرآلود تصادم کے دوران جو آپس میں لڑنے والی شخصیتوں اور جماعتوں میں ہو رہا تھا، تکان سے چور چور اور برباد ہندوستان کوئی ایسا لیڈر میدان میں نہ لا سکا جو ایسی حکمانہ طاقت کا حامل ہوتا جو ملک کو اس تاراج سے نکال کر امن و

قانون کے دائرے میں لاسکتی۔

اس سیاسی اور اخلاقی زوال کے باوجود اٹھارھویں صدی ایسے باہمت شجاع اور باحوصلہ اشخاص سے خالی نہیں تھی جو توانائی اور وسائل سے معمور تھے بہت سے ایسے فضول خرچ حریص اور نتائج سے لاپروا اشخاص موجود تھے جو اپنی جان کو ایسی بیدردی سے داؤں پر لگا دیتے تھے کہ بے ساختہ زبان سے واہ واہ نکلتی لیکن جس چیز کی ان کے اندر کمی تھی وہ ایک قابل قدر مقصد تھا جو ان کی سرگرمیوں کو مفید راستوں پر ڈال سکتا اور ان کی زندگیوں کو بامعنی بنا سکتا یہ لوگ بلا پتوار کی کشتی کے مانند تھے جو طوفان میں ڈوبے ہوئے سمندر میں اِدھر اُدھر ہچکولے کھا رہی تھی۔ ان کی بے لگام حرص وہوس نے ملوکیت کو نزاع میں تبدیل کر دیا۔ روہیلکھنڈ میں روہیلوں نے شاہی افسران کو مار بھگایا ان کی جاگیریں ضبط کرلیں اور خود مختار ریاستیں قائم کرلیں روہیلکھنڈ کے باہر اودھ، بہار، بنگال اور اوڑیسہ نے اس کے پہلے ہی عملی طور آزادانہ رویہ اختیار کر لیا تھا۔ جمنا کے دکھن پچھم جانب راجپوتانہ تک اور دکھن جانب چمبل ندی تک جاٹوں کا اقتدار تھا۔ اس کے ماورا مرہٹے راجپوتانہ دوآبہ اور ہندوستان کے مشرقی صوبوں پر اپنی مرضی نافذ کیے ہوئے تھے گجرات اور مالوہ پر بھی ان کا اقتدار تھا۔ راجپوت ریاستیں ان کے رحم وکرم پر تھیں اور دکن ان کو خراج ادا کرتا تھا۔

مغل شاہنشاہ کی بااثر حکومت اب گھٹ کر صرف مضافات دلی و آگرہ تک رہ گئی تھی اگرچہ وہ اب بھی ہندوستان کے بیشتر حصہ پر حکمرانی کے دعویدار تھے اور برابر خطابات دیتے اور عہدوں پر تقرری کی تصدیق کرتے تھے۔

نظم ونسق کے ڈھیلے پن نے ملوکیت کی اندرونی طاقت کو چوس لیا جاگیروں کی تقسیم میں بے محابا فیاضی نے تاج کی ملوکہ زمین کی مقدار کو جو شہنشاہ کے ذاتی خرچ کے لیے محفوظ تھی بے حد گھٹا دیا تھا۔ خزانہ خالی ہو گیا اور محاصل میں کمی آنے سے یہ ناممکن ہو گیا کہ باضابطہ فوج کے اخراجات کا انتظام ہو سکے یا ان کو مسلح کیا جا سکے اونچے اور نیچے طبقہ کے امرا میں باہمی خانہ جنگی سے اتنی کثیر تعداد میں موتیں ہوئیں کہ اب سول اور ملٹری عہدوں کے لیے مناسب اشخاص کا ملنا مشکل ہو گیا ایک معقول فوج کے بغیر بادشاہ قطعی بے کس ہو کر رہ گیا تھا اس طرح کرنال کے مقام پر محمد شاہ کی شکست کے بعد دلی ایک متحدہ مملکت کا مرکز نہیں رہ سکی۔

احمد شاہ ابدالی کا حملہ

جب دلّی کی جامع مسجد میں جمعہ کے خطبہ کے اندر نادر شاہ شہنشاہ ہندوستان کے خطاب سے یاد کیا گیا تو ایسا معلوم ہوا کہ تاریخ اپنے کو دہرا رہی ہے۔ اس سے پہلے دو مرتبہ بھی بارہویں صدی کے آخری چوتھائی حصہ میں اور پھر سولھویں صدی کے پہلے چوتھائی حصہ میں اسی قسم کے حالات کے اندر ایک بیرونی طاقت ہندوستان کو اپنے زیر اقتدار لائی تھی ہندوستان پر فاتحین زمینی طاقت کے مالک تھے جو زمین ہی کے راستہ سے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔

لیکن سولھویں صدی میں ایک مختلف قسم کی طاقت جو سمندر پار سے نمودار ہوئی تھی سمندر کی فوجوں پر جہاں رانی کرتی ہوئی ہندوستان کے ساحلوں پر اپنا وجود محسوس کرانے لگی۔ اس وقت امر کی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی تھی کہ مغلیہ سلطنت کے خاتمہ کے بعد جو خلا پیدا ہوگا اسے یہیں کے لوگ بھر دیں گے یا شمال و مغرب سے کوئی زمینی طاقت ابھرے گی یا ایک نئے طریقہ سے ایک غیر متوقع جنگی طاقت اسے پُر کرے گی لیکن بہت جلد تقدیر ایک متعین شکل اختیار کرنے لگی اور اٹھارھویں صدی کے آخر تک اس کے بارے میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا کہ مستقبل کیا ہوگا۔

۱۷۳۹ء میں کرنال کے مقام پر نادر شاہ کی فتح اور ۱۸۰۳ء میں لیک کے دلّی پر قابض ہونے کے درمیانی وقفہ میں ہندوستان اپنی تمام تاریخ کے ایک انتہائی ذلیل اور ناخوشگوار دور سے گذرا۔ دلّی اپنی تمام تاریخی عظمت اور شہنشاہانہ طاقت سے محروم کر دی گئی۔ لیکن اس کا سحر آفریں نام اب بھی انسانوں کے دماغوں پر اثر رکھتا تھا مختلف النوع لڑائیاں نسلی طاقت کو تاخت و تاراج کر رہی تھیں لیکن ہمیشہ ان لڑائیوں کا مرکز دلّی رہتی جس کے گرد تمام منصوبہ باز گھومتے تھے البتہ وہ شخص جس کے سر پر شاہانہ تاج رکھا ہوا تھا وہ دُکان میں دکھائے جانے والے کپڑے کے ایک ٹکڑے کی مانند ہوتا جو ان تمام معاملات میں بہت پست اور انتہائی شرمناک عمل ادا کرتا تھا۔

ان کاہل عیش پرستوں کی تاریخ جو دلی کے تخت پر قابض تھے مختصر اً بیان کی جا سکتی ہے۔ نادر شاہ آیا اور چلا گیا لیکن شاہی امرا نے اس ہولناک بدنصیبی سے کوئی سبق نہیں لیا تورانیوں اور ایرانیوں کی باہمی رقابت اور مڈبھیڑ میں کوئی کمی نہیں ہوئی وہ برابر لڑتے رہے ۱۷۳۹ء میں قمرالدین خاں اور ان کے چچازاد بھائی نظام الملک بالترتیب وزیر (یعنی وزیر اعظم)

اور میر بخشی (اعلیٰ افسر خزانہ) تھے۔ ایرانی صفدر جنگ (گورنر اودھ) کی قیادت میں اور ہندوستانی پارٹی کی مدد سے ان کے مخالف تھے چونکہ تورانیوں میں بھی کوئی باہمی اتحاد نہ تھا محمد شاہ کے مقربان بارگاہ تورانیوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ نظام الملک نے دربار کے رویّے اور وزیر کے برتاؤ سے حد درجہ بیزار ہو کر 1740ء میں دلی چھوڑ دیا اور دکن واپس چلا گیا قمرالدین بدستور وزیر رہے لیکن اصل طاقت صفدر جنگ اور ان کے حمایتیوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔

1748ء میں احمد شاہ ابدالی کا پہلا حملہ ہوا جسے نادر شاہ کے قتل کے بعد ہرات قندہار اور کابل کے صوبے وراثتہً حاصل ہوئے تھے۔ لاہور اور ملتان کے گورنر ذکریا خاں کے دو بیٹوں کی خانہ جنگی اور ان کے چھوٹے بھائی شاہنواز خاں کی غدارانہ درخواستوں نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کرنے کا بہانہ فراہم کر دیا لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد وہ کوچ کرتے ہوئے سرہند پہنچا اور شاہی فوج کو گھیر لیا۔ جو شہر کے قریب ایک گاؤں کے کنارے خندقیں کھود کر پڑی تھی لڑائی ہوئی جس میں اگرچہ قمرالدین قتل ہو گیا لیکن مغل افواج نے ابدالی فوجوں کو میدانِ جنگ سے مار بھگایا اور ان کو مجبور کیا کہ اپنے ملک واپس جائیں۔

اس غیر متوقع فتح کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے باپ محمد شاہ کے 26 اپریل 1748ء کو انتقال کر جانے کے بعد احمد شاہ اس کے وارث کی حیثیت سے پرامن طریقہ پر تخت نشین ہوا۔ نیا بادشاہ ایک نیک فطرت احمق تھا جس کو جنگ یا نظم و نسق کی کوئی تربیت نہیں ملی تھی۔ اپنے بچپن سے 21 سال کی عمر تک اس کی پرورش و پرداخت حرم کی عورتوں میں ہوئی تھی۔ اس کی تربیت پر کوئی توجہ نہیں ہوئی تھی وہ مفلسی میں پلا اور ہمیشہ اپنے باپ کی گھڑکیوں اور دھمکیوں کا شکار رہا۔ اس لیے بالکل فطری تھا کہ حکومت کے معاملات کی باگ منہ چڑھے مصاحبوں، بادشاہ کے دوستوں، خواجہ سراؤں اور عورتوں کے جتھے کی قائد مادر ملکہ ادھم بائی کے ہاتھ میں چلی گئی جو محمد شاہ سے نکاح کے قبل ایک ناچنے والی طوائف تھی۔ اس نے نالائق آدمیوں کو اونچی اونچی جگہوں پر ترقی دی اور ہر تقرری کے لیے روپیہ کی شکل میں کثیر تعداد میں نذرانہ حاصل کیا کوئی بھی نظم حکومت کی پروا نہیں کرتا تھا۔ اور گورنر اور امرا شاہی محاصل کو ناجائز طور پر غبن کر لیتے تھے۔ اس کی تقلید طاقتور زمین داروں نے کی۔ اور اپنے کمزور ہمسایوں کی زمین زبردستی چھین لی۔

ایرانی گروہ جس کے لیڈر اودھ کے گورنر صفدر جنگ وزیر تھے اب اوپر چڑھ گیا لیکن اس

کا سامنا کرنا بہت مشکل تھا۔ تورانی وزرا اُن کے خلاف تھے بادشاہ کے منظور نظر لوگوں نے ان کی پالیسیوں کو ناکام بنادیا اور کمزور احمد شاہ کو ان کے خلاف کر دیا۔ اس کے علاوہ وزیر دلی کے معاملات پر کامل توجہ نہیں دے سکتے تھے کیوں کہ خود ان کا صوبہ ان سے بہت بڑی خبر گیری کا مطالبہ کرتا تھا روہیلہ ان کی دشمنی کا گویا حلف لیے ہوئے تھے اور صوبہ کے اندرونی انتظام میں ڈھیلا پن پھیلا ہوا تھا۔

ان حالات میں احمد شاہ ابدالی اور ان کے افغانوں کا خطرہ شمال سے اور مرہٹوں کا خطرہ جنوب سے نمودار ہوا۔ جن دردناک واقعات کی بنا پر بالآخر ہندوستان اپنی آزادی سے محروم ہوگیا ان کے خاص اداکار انہی دو جماعتوں کے لیڈران تھے مغل شہنشاہ اور ان کے امرا محض شطرنج کے مہرے تھے اور دیگر سربراہ کاران نے گھٹیا اور شرمناک عمل کا مظاہرہ کیا

1748ء کی ناکامی کے بعد احمد شاہ ابدالی نے 1749ء کے موسم خزاں میں پنجاب پر پھر حملہ کیا۔ یہاں کا گورنر معین الملک سابق وزیر قمر الدین کا بیٹا تھا۔ لیکن دلی کی پارٹی میں وہ نامقبول تھا اس لیے اسے کوئی امداد نہیں ملی مجبور ہو کر اس نے صوبہ کا ایک حصہ دے دیا اور ایک کثیر رقم ابدالی کے افسروں کو بطور تاوان ادا کی اس طرح کے آسان شکار نے ابدالی کی بھوک کو تیز کر دیا اور 1751ء میں وہ تیسری مرتبہ ہندوستان میں داخل ہوا معین الملک نے مرکزی حکومت کی مدد کے بغیر جس حد تک مقابلہ ممکن تھا وہ کیا اور آخر کار مجبوراً ہتھیار ڈال دیے پنجاب اور ملتان کے صوبے افغانی حکمران کے ہاتھ میں چلے گئے اور اب دلی کو فوری خطرے کا سامنا تھا۔

ادھر پنجاب کو افغان روندرہے تھے ادھر وزیر صفدر جنگ روہیلوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں مصروف تھا جنھیں وہ "مجھے دلی لے جانے والی سڑکوں پر پھیلے ہوئے سانپ" کہتا تھا لیکن روہیلہ سردار احمد خاں بنگش معاملات سے باخبر بھی تھا اور باتدبیر بھی اس نے عیش پسند ایرانی اُمرا پر شکست اور ذلت تھوپ دی صفدر جنگ مجبور ہوا کہ مرہٹوں سے امدادی فوج بالمعاوضہ حاصل کرنے کا معاہدہ کرے اور جاٹوں کی امداد بھی خریدے تاکہ روہیلہ خطرے سے اپنے کو بچا سکے اس نے ملہر راؤ ہولکر اور جیاپا سندھیا کو 25 ہزار روپیہ یومیہ اور سورج مل جاٹ کو پندرہ ہزار روپیہ دینے کا وعدہ کیا جنھوں نے روہیلوں سے دوآبہ کو صاف کر دیا اور ہمالیہ کے قدموں تک ان کو دھکیل لے گئے تب صفدر جنگ اور روہیلوں کی صلح ہوئی جس کے نتیجے میں اس مہم کے تمام اخراجات صفدر جنگ سے منتقل ہو کر روہیلوں کے ذمہ میں ہوگئے۔

مرہٹہ سردار اس سے پہلے مالوہ پر قبضہ کر چکا تھا گجرات کو بھی روند چکا تھا اس نے بہار بنگال اور اڑیسہ پر بھی حملہ کیا اور انھیں لوٹا تھا۔ راجپوتانہ میں بھی گھس چکا تھا اور اب (1752ء میں) اس کو دوآبہ میں فوجی چھاونیاں مل گئیں جو مملکت کے قلب میں جا گزینش کے مصداق تھی، جو بالمعاوضہ صلح نامہ مارچ 1752ء میں ہوا تھا اس کے مطابق مرہٹہ مملکت کے محافظ ہونے کے دعویدار ہوئے اور دلی کی سیاست میں دخل دینے کا ان کو موقع ملا۔ اس طرح اقتدار اعلیٰ کے دو دعویداروں افغان اور مرہٹوں کو حالات نے آمنے سامنے کھڑا کر دیا۔

لازمی تھا کہ ان دونوں حریفوں میں زبردست ٹکراؤ جلد ہی ہو لیکن قبل اس کے کہ پیش آئے دلی اور اس کے شاہانہ دربار کو ناقابل بیان بدبختی اور ذلت برداشت کرنی پڑی صفدر جنگ کی حرص اور غرور نے امرا کو مخالف اور بادشاہ کو ناراض کر دیا تھا۔ مادر ملکہ نے ان کو علاحدہ کرنے کی ایک سازش کھڑی کی ان کے ایجنٹ قلعہ سے نکال دیے گئے اور ان کا وہ استعفیٰ منظور کر لیا گیا ان کا خیال تھا کہ اس طرح بادشاہ خوف زدہ ہو کر ان کا مطیع ہو جائے گا۔ اس پر ناراض وزیر نے کھلم کھلا اپنے آقا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور ان کے حلیف جاٹوں نے دلی کو لوٹ لیا۔

اس درمیان میں تورانی امرا نے بھی اپنی پوری طاقت ایرانیوں کے تسلط کے خلاف لگا دی۔ اعتماد الدولہ جو قمر الدین کے ایک بیٹے تھے وزیر مقرر ہوئے اور نظام الملک آصف جاہ اوّل کے پوتے عماد الدولہ میر بخشی ہو گئے۔ انھوں نے روہیلوں کو جو نجیب خاں کی سرداری میں تھے (جن کا خطاب نجیب الدولہ ہے) اور مرہٹوں کو اناجی مینکیشور کے زیر کمان اپنی مدد کے لیے طلب کیا صفدر جنگ کی یہ کوشش کہ دلی کے قلعہ پر قبضہ کر لیں ناکام ہو گئی لیکن سرمایہ ختم ہو جانے اور فوج کی تنخواہیں ادا نہ ہونے اور وزیر اور میر بخشی کے اختلافات نے بادشاہ کو صلح کے لیے مجبور کر دیا۔ صفدر جنگ اپنے صوبہ اودھ کو واپس گئے (1753ء)

اس خانہ جنگی نے گورنمنٹ کو عظیم مالی دشواریوں میں مبتلا کر دیا تھا فوج بقایا تنخواہ کے لیے شور مچا رہی تھی۔ دلی کی سڑکیں روزمرہ بلوہ اور فساد سے بھری رہتی تھیں۔ باغی فوجیں روہیلہ اور مرہٹہ ڈاکوؤں سے جان مال کی کوئی حفاظت ممکن نہ تھی صفدر جنگ کے ریٹائر ہو جانے نے وزیر اور میر بخشی کے اختلافات میں تیزی پیدا کر دی چونکہ بادشاہ وزیر کے طرفدار تھے

میربخشی اور مرہٹوں نے فیصلہ کیا کہ بادشاہ سے نجات حاصل کرلی جائے۔ بانئی میربخشی اور ان کے حلیفوں نے بادشاہ کو مجبور کیا کہ وہ اعتمادالدولہ کو برخاست کردیں ان کی جگہ عمادالدولہ وزیر مقرر ہوئے۔ عمادالدولہ کی پہلی کارروائی بہ حیثیت وزیر یہ تھی کہ انھوں نے غریب اور بے کس احمد شاہ کو معزول کردیا اور پچپن سالہ شہزادہ عزیزالدین کو عالم گیر ثانی کے خطاب کے ساتھ تخت پر بٹھایا اس کے پانچ سال کے بعد (1759ء) جب انھوں نے جکڑبندیوں سے نجات کی کوشش کی تو انھیں بے رحمی کے ساتھ قتل کردیا۔

اس نالائق مگر حریص اور بے اصول وزیر کی پانچ سال کی حکمرانی کا دور شدید بدامنی دیوالیہ پن اور تکالیف کا دور تھا بادشاہ وزرا اور قوم کی قسمت میں صرف شرم اور ذلت رہ گئی تھی۔

عماد اور صفدرجنگ دونوں نے مرہٹوں کو مدد کے لیے بلایا تھا مرہٹہ لیڈر پیشوا نے رگھوناتھ راؤ کو شمال کی جانب بھیجا لیکن جب تک وہ وہاں پہنچے دونوں نے اپنے جھگڑے باہم طے کر لیے۔ اپنی لوٹ سے محروم ہوکر مرہٹوں نے جاٹوں اور راجپوتوں کی جانب اپنا رُخ موڑ دیا۔ تاکہ ان کو آگرہ اور اجمیر کے صوبوں پر قبضہ کرنے میں جو انھیں 1752ء کے بالمعاوضہ صلح نامہ کی رو سے ملے تھے رکاوٹ ڈالیں۔ اس پیچھا کرنے میں رگھوناتھ راؤ اور ملہر راؤ ہولکر نے دوآبہ کو خوب پامال کیا اور لوٹ لیا اور جیا پا سندھیا اور ان کے بھائی دُتا جی نے راجپوتانہ کو روند ڈالا اس کے بعد اپنے لوٹ کے مال کو بٹور کر یہ افسران پُونا واپس گئے اور دوسال کی طویل مہم (1753ء 1755ء) بلا کسی خاص کامرانی کے ختم ہوگئی۔

رگھوناتھ راؤ کے کردار نے اپنے پیچھے شمال کے تمام لوگوں میں خوف وغصہ اور نفرت کی وراثت چھوڑی جس کے تباہ کن نتائج ہوئے۔

1752ء میں پنجاب افغانیوں کی حلقہ بگوشی میں جاچکا تھا لیکن احمد شاہ نے اس کا انتظام معین الملک کے ہاتھ میں چھوڑ دیا تھا 1753ء میں ان کے انتقال کے بعد حالات تیزی سے زوال پذیر ہوئے اور بزاج پھیل گیا۔ اس مصیبت کبریٰ میں مغلانی بیگم (معین کی بیوہ) نے احمد شاہ اور عمادالملک سے امن قائم کرنے کی درخواست کی قبل اس کے کہ احمد شاہ کوئی کارروائی کرے عماد کوچ کرتا ہوا لاہور پہنچا اور خود اپنا گورنر اور ڈپٹی گورنر وہاں مقرر کردیا یہ ایک ایسی مداخلت بے جا تھی جسے افغان بادشاہ برداشت نہیں کرسکتا تھا اس نے اپنے جنرل کو بہ طور ہراوّل روانہ کیا جس نے لاہور پر قبضہ کرلیا اس کے بعد وہ بذات خود ایک

عظیم لشکر لے کر 1757ء میں آیا۔

اس وقت شمالی ہند کے باشندگان پر گویا جہنم کھول دی گئی پنجاب تشدد اور لاقانونیت کا اڈا بن گیا۔ جس میں سکھوں مغلوں اور افغانیوں میں ٹکریں ہوئیں۔ حملہ آور افغان نے لاہور اور سرہند پر قبضہ کر لیا اور اس کے بعد دلّی کی طرف کوچ کیا۔ جو اس کے مقابلے کے لیے بالکل تیار نہ تھی۔ روہیلہ سردار نجیب الدولہ نے بے وفائی کی اور اپنے مالک کا ساتھ چھوڑ دیا وہ افغانوں سے جا ملا۔ عماد نے جاٹوں مرہٹوں اور راجپوتوں کو آمادہ کرنے کی جان توڑ کوشش کی کہ اس کی مدد کو آجائیں لیکن ناکامیاب رہا۔ بلا کسی قسم کی مدافعت کیے کم ظرف وزیر نے دارالسلطنت کو حملہ آور کے قدموں میں ڈال دیا اس طرح استحصال بالجبر اور ظلم کی ایک ایسی حکمرانی قائم ہو گئی جس نے دلّی کی کھال کھینچ لی دولت مند اور غریب امرا اور عوام اور عورتیں سب کو اندھا دھند بلا امتیاز ظلم اور ذلت کا شکار ہونا پڑا۔

لیکن متھرا گوکل اور بندرابن کے مقدس مقامات پر جو واقعات پیش آئے ان کے مقابلہ میں دلّی والوں کی مصیبت ناقابل لحاظ معلوم ہوگی۔ افغان فوج دلّی کو لوٹنے کے بعد دلّی کے باہر کوچ کر گئی اور اپنے پیچھے جلتے ہوئے مواضعات سڑتی ہوئی لاشوں اور بربادی کا ایک سلسلہ چھوڑتی گئی۔ راستہ میں جاٹوں کو کچلنے کے بعد افغان متھرا بندرابن اور گوکل پہنچے جو آتش زنی اور بربادکاری ان مقدس شہروں پر نازل ہوئی وہ ناقابل بیان ہے متھرا کا ایک مسلمان جوہری جس کا سب کچھ لوٹ لیا گیا تھا اور کئی دنوں سے فاقہ کر رہا تھا تصدیق کرتا ہے کہ قتل عام کے بعد سات دن تک دریائے جمنا کا پانی خون کی طرح سرخ رنگ کا تھا۔ مندروں کی بے حرمتی کی گئی سادھوؤں کو تلوار کے دھار پر رکھ دیا گیا عورتیں بے عزت کی گئیں اور بچوں کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا کوئی ایسا ظلم نہیں تھا جو نہ کیا گیا ہو۔

لیکن ان دردناک واقعات کا سب سے زیادہ شرمناک پہلو اُن لوگوں کی بے توجہی ہے جو ان مقامات کے سرپرست اور محافظ فرض کیے جاتے تھے۔ مرہٹے جنہوں نے ہندوئی سوراجیہ کا جھنڈا بلند کیا تھا اور اس بات کا مغرورانہ دعویٰ کیا تھا کہ یہ جھنڈا کنیا کماری سے اٹک تک لہرائے گا جنھوں نے یہ پیش کش کی تھی کہ مملکت کو بیرونی حملوں سے بچائیں گے اور جنھوں نے ابھی حال میں آگرہ صوبہ کی گورنری لی تھی اور جو مذہب کے نام پر ہندوؤں کے یاترا کے مقدس جگہوں پر اقتدار کے دعویدار تھے اور اس لیے اپنی عزت کے نام پر وہ (وراج منڈل) کی

حفاظت کے ذمہ دار تھے وہ جب ہندوازم پر مصیبت نازل ہوئی تو اس ذمہ داری کا حق ادا کرنے میں شرمناک طریقہ پر قائم رہے۔ جاٹوں نے ضرور کچھ مقابلہ کیا کیوں کہ افغان ان کے وطن کو برباد کر رہے تھے۔ لیکن ایک ابتدائی لڑائی میں شکست کے بعد وہ اپنے زخموں پر مرہم پٹی کرنے کے لیے پیچھے ہٹ گئے اور عوام الناس کو ان کی ظالم قسمت کے حوالے کر دیا۔ راجپوت اپنے چھوٹے چھوٹے جھگڑوں میں پھنس کر یہ قطعی بھول ہی گئے تھے کہ بقیہ ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے۔ شہنشاہ دلی جو ہندوستان کا قانونی حکمران اور اقوام ہند کا محافظ تھا وہ خاک چاٹ رہا تھا۔ بیرونی فاتح کے ہاتھوں میں قیدی تھا۔

اس لیے درد و کرب کی جو دل خراش صدائیں دلی متھرا آگرہ اور شمالی ہند کے ہزاروں قصبوں اور مواضعات سے اٹھیں انہیں کسی نے نہیں سنا۔ لیکن جسے انسان نہ کر سکا وہ قدرت نے پورا کیا۔ افغان فوج کی خوفناک رفتار ہیضہ پھیل جانے سے رک گئی سپاہیوں نے گھر واپس جانے کے لیے شور مچانا شروع کیا۔ ابدالی واپس ہونے پر مجبور ہوا مگر لوٹ سے تین لغایتہ بارہ کروڑ تک جمع کرنے اور خاندان تیمور پر ناقابل بیان ذلت لادنے سے قبل نہیں بادشاہ نے مجبور ہو کر محمد شاہ کی سولہ سالہ لڑکی کو اس خوفناک افغان کی شادی میں دیدیا جو اس کے دادا کی عمر کا تھا اور جس کے دونوں کان کٹے ہوئے تھے اور جس کی ناک کوڑھ کے سبب زہریلے پھوڑے سے سڑ رہی تھی ؏1 یہ ایک تلخ قیمت تھی جو ادا کی گئی۔ لیکن سیاست رحم کو نہیں جانتی اور بے گناہ آدمیوں کو اپنے حکمرانوں کی حماقت نااہلی اور معصیت کی وجہ سے مصیبت اٹھانی ہی پڑتی ہے۔

احمد شاہ نجیب الدولہ کو دلی میں اپنا ایجنٹ بنا کر قندھار واپس گیا نجیب الدولہ کو میر بخشی کا عہدہ دیا گیا اور اسے حکومت کے مکمل اختیارات عطا کیے گئے پرانے وزیر عماد کو اختیارات سے محروم کر دیا گیا البتہ وکیل المطلق کا معزز عہدہ جس کے ساتھ کوئی ذمہ داری وابستہ نہ تھی ان کو دی گئی۔

احمد شاہ کے سدھارتے ہی وہی پرانا کھیل پھر کھیلا جانے لگا عماد نے نجیب کو اکھاڑ پھینکنے

سرکار جدو ناتھ فال آف دی مغل امپائر جلد دوم صفحہ 126 (سرکار نے دادا کا لفظ شاید غلط استعمال کیا ہے کیوں کہ اس وقت 1757ء میں اس کی عمر 35 سال تھی)

کی سازش شروع کردی احمد شاہ کے طوفان گذر جانے کے بعد مرہٹے بھی پھر شمال میں نمودار ہوئے۔ انھوں نے تیزی سے اپنی جاگیریں قلعے اور عہدے غاصبوں سے واپس لے لیے دوآبہ پر اپنا اقتدار پھر قائم کیا اور اپنے لگائے ہوئے محاصل وصول کرنے لگے۔

نجیب کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے بادشاہ اور عماد نے مرہٹوں سے میل کر لیا مقدم الذکر نے ان سے لڑنا چاہا لیکن اپنے رقیبوں سے دھکا کھانے کے بعد عماد کے گھر والوں پر اپنا غصہ نکالا اور پھر مقابلہ کو مایوس کن سمجھ کر بلا شرط ہتھیار ڈال دیے اب مرہٹوں کے لیے دلی اور پوری مملکت کے مالک کامل بننے کے لیے راستہ صاف ہوگیا۔

دلی سے مرہٹہ فوجیں رگھوناتھ راؤ اور ملہر راؤ ہولکر کی قیادت میں کوچ کرتی ہوئی پنجاب میں داخل ہوئیں اور اپریل 1758ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا۔ انھوں نے احمد شاہ کے ایجنٹوں کو نکال باہر کیا اور ادینا بیگ کو اپنا گورنر مقرر کیا۔

نجیب نے جو دلی سے نکال دیے جانے کے بعد وقت کا انتظار کر رہا تھا ابدالی سے خط وکتابت شروع کی اور ان کو ترغیب دی کہ وہ اپنی مملکت کو واپس لینے کے لیے ہندوستان آئیں مرہٹوں نے دتا جی سندھیا کی سپہ سالاری میں نجیب کو سزا دینے کے لیے کوچ کیا، جس نے ان کی پیش قدمی کو مظفر نگر کے قریب ایک خندقوں سے گھری ہوئی محصور چوکی کے پیچھے سے روک رکھا تھا۔ یہاں روہیلہ سردار محصوری کی حالت میں مہینوں مرہٹوں سے مقابلہ کرتا رہا یہاں تک کہ اس کو اس ہندو فوج کی کمک مل گئی جو نواب اودھ نے گوسائیں کی سرکردگی میں بھیجی تھی۔ نجیب کی کوششیں دوسری سمت بھی پھل لائیں۔ ابدالی کابل سے نکلا دریائے سندھ کو عبور کر لیا مرہٹی فوجی ٹکڑیوں کو جو اس کے سامنے آئیں بھگاتا وہ تیزی کے ساتھ پنجاب سے گذر کر دلی کی طرف بڑھا۔ دتا جی نے تھانیسر کے مقام پر اس کو روکنے کی ایک بے کار کوشش کی۔ یہاں ناکام ہونے کے بعد وہ پیچھے ہٹا تاکہ وہ ابدالی کو جمنا عبور نہ کر دینے کی کوشش کو بیکار کر سکے لیکن یہاں بھی ان کی فوج کو بڑی طرح شکست ہوئی اور دتا جی خود قتل ہوگیا ملہر راؤ کو جس نے ابدالی کو پریشان کرنا چاہا تھا شکست پر شکست کا سامنا ہوا اور مجبوراً وہ راجپوتانہ تک پیچھے ہٹ گیا۔

شمال میں ان شکستوں کی خبر نے پونا میں بدحواسی پیدا کر دی اور ایک مضبوط فوج پیشوا کے خاندان کے کسی فرد کی قیادت میں حالات کو درست کرنے کے لیے بھیجنے کا فیصلہ

کیا گیا یلغار کی۔ باجی راؤ کا چچازاد بھائی سداشیو راؤ بھاؤ کا انتخاب فوج کے کمانڈ کرنے کے لیے کیا گیا اور پیشوا کے بیٹے وشوناتھ راؤ برائے نام فوج کے افسر اعلیٰ کا کام کرتے تھے بائیس ہزار مرہٹہ اور 8 ہزار تربیت یافتہ سپاہیوں پر مشتمل فوج نے ابراہیم خاں گاردی کی کمان میں جس نے توپوں کے سلسلہ کی تربیت فرانسیسی جنرل بوسی کی ماتحتی میں حاصل کی تھی کوچ کیا۔ شمال میں موجود مرہٹہ فوج یعنی ہولکر سندھیا اور دوسرے کپتانوں کی فوجی ٹکڑیاں اور قرب وجوار دلی میں قلعہ بند مورچوں میں موجود فوجیں سب آکر بھاؤ سے مل گئیں۔

مرہٹوں کو امید تھی کہ ان کے پرانے حلیف نواب اودھ کو اپنے مقصد سے وابستہ کرلیں گے اور یہ بھی امید کرتے تھے کہ راجپوت اور جاٹ پوری طاقت سے ان کی مدد کریں گے لیکن باوجود اس کے کہ روہیلوں اور نواب میں طویل المدت اور کڑی دشمنی چلی آرہی تھی موخرالذکر نے اگرچہ کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ اپنی قسمت ابدالی سے وابستہ کرنے کا فیصلہ کرلیا جو چیز ان کو وزن میں بھاری معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ نجیب اور ابدالی پہلے سے اپنی فوجوں کے ساتھ دوآبہ میں موجود تھے اور بہت آسانی سے اس کی قلمرو کو روند سکتے تھے برھتے دریائے جمنا کے اس پار ان کی مملکت سے دور تھے روہیلوں اور ابدالی کی مشترکہ فوجوں کو تاخت و تاراج کرکے ہی ان تک پہنچ سکتے تھے۔ مرہٹوں کی کامیابی کا مطلب ان کی مستقل تابعداری تھی اور ابدالی کے متعلق تو معلوم تھا کہ اس کی کوئی خواہش ہندوستان میں مستقل قیام کی نہیں ہے۔ مرہٹوں نے ان کے باپ کو دغا دی تھی اب ان کے وعدوں پر کوئی اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ راجپوت ان سفاکیوں کو بھولے نہیں تھے جو مرہٹوں نے ان کے ملک پر روا رکھی تھیں وہ کسی طرف رہنے کا ارادہ نہیں کرتے تھے البتہ جو آخر میں کامیاب ہو اسی کے ساتھ ہوجانے جاٹ حکمران سورج مل مرہٹوں پر شک کرتا تھا اس کو بھی ان کے وعدوں پر کوئی اعتبار نہ تھا۔ اس کو اپنے رویہ کا اور بھی یقین واثق اس وجہ سے ہوگیا تھا کہ اس علاقہ کا مرہٹہ گورنر گوبندیلا جاٹوں کے نئے تعمیر شدہ علی گڑھ کے قلعہ پر حریصانہ نگاہ رکھتا تھا اور اس پر حملے کے منصوبے بنایا کرتا تھا اگرچہ وہ ناکام رہے تھے (1)

ظاہر ہے کہ مرہٹوں کا کوئی ایک بھی دوست یا ساتھی شمال میں نہیں تھا اور ابدالی کے

---

(1) سرکار جادوناتھ، فال آف دی مغل امپائر جلد دوم (ایڈیشن 1934) صفحہ 256

خلاف فوجی تدابیر اختیار کرنے کے معاملہ میں خود ان کی صف کے اندر اختلافات تھے۔ ان کو صرف یہ کامیابی حاصل ہوئی کہ وہ دلّی کے اندر داخل ہو گئے کیوں کہ احمد شاہ دوآبہ میں خیمہ زن تھا اور دلّی میں صرف مختصر سی قلعہ کی محافظ فوج تھی جو مرہٹوں کی طاقتور اور عظیم فوج کا مقابلہ قلعہ بند ہو کر بھی نہیں کر سکتی تھی۔

لیکن دلّی ایک جال ثابت ہوئی پیشوا کے پاس کوئی رقم نہ تھی جسے وہ بچا سکتا۔ جاگیروں اور ریاستوں سے محاصل کا جمع کرنا اس وقت کی بدامنی کی حالت میں ممکن نہ تھا۔ اور لوٹ سے بہت کم نفع حاصل ہوتا تھا۔ انسانوں اور گھوڑوں کے لیے غذا کی کمی تھی فوج کی ضروریات کا مجموعی ذخیرہ ختم ہو رہا تھا اور دشمن چاروں طرف گھوم رہے تھے حالات کی نزاکت نے بھاؤ کو مجبور کیا کہ وہ دلّی سے باہر نکلے۔ ابدالی کی پوزیشن بھی بھاؤ سے غالباً ذرا ہی سی بہتر تھی کیونکہ وہ بھی سرمایہ کی کمی کی تکلیف محسوس کر رہا تھا اور گھر واپس جانے کے لیے بے چین تھا لیکن نجیب کی مالی اور مادی امداد اور بھاؤ کا ناقابل مصالحت رویہ اس امر کے زبردست دلائل تھے کہ وہ ڈٹا رہے اور معاملہ کی جدوجہد تلخ نتیجہ تک جاری رکھے۔

دونوں مخالف طاقتیں پانی پت میں آمنے سامنے آئیں لڑائی میں مرہٹہ کمانڈر نے دو تباہ کن غلطیاں کیں۔ اپنی راہ خبر رسانی کو کٹ جانے دیا اور مرہٹوں کے روایتی طریقہ جنگ کو ترک کر دیا۔ اپنے تربیت یافتہ فوجی حلقہ کی توپوں پر بھروسہ کر کے اس نے اپنے کثیر التعداد سپاہیوں اور بے پر ساتھیوں کو ایک چوڑی اور گہری خندق کے پیچھے غیر متحرک کر دیا۔ افغان فوج سڑک کے اس پار جو دکن کو جاتی تھی پڑی ہوئی تھی ابدالی نے اپنے محافظ دستے چاروں طرف بکھیر دیے اور مرہٹوں کے خبر رساں راستوں اور فوجی سامان کی فراہمی کو کاٹ دیا پہاڑی طرف کا علاقہ مرہٹوں کا مخالف تھا اور انھوں نے جو خوفناک مظالم کیے تھے ان کا بدلہ لینے کے لیے کھول رہا تھا (۱) اس لیے بھاؤ کے کیمپ میں کوئی مدد نہیں پہنچی اور مکمل فاقہ کشی سامنے آ کھڑی ہوئی۔ فاقہ کشی کے آنکس سے ناامیدانہ دلاوری تک پہنچ کر بھاؤ نے لڑائی کا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کیا 14 جنوری 1761ء کو اس نے چھاونی سے کوچ کیا اور فریقین ہلاکت آمیز مقابلہ میں ڈٹ گئے۔

---

(۱) سار دیسائی۔ جی۔ ایس "نیو ہسٹری آف دی مرہٹاز" جلد دوم صفحہ 430

ہندوستان کی لڑائیوں میں نتیجہ زیادہ تر لیڈر کی اہلیت پر منحصر رہا ہے پانی پت کے مقام پر مقابلہ تھا ایک باوسائل اور آزمودہ کار جنرل کا جس کو وسط ایشیا اور ہندوستان کے اندر کی جنگوں کا تجربہ تھا ایک نسبتاً کم عمر کمانڈر سے جس کو اگر کوئی تجربہ تھا تو صرف یہ کہ اس نے کرنانک کے مقام پر جنوبی ہند کی فوجوں کے خلاف جنگی مہم کی قیادت کی تھی۔ ابدالی کو مرہٹوں پر مقدار آتش باری کی طاقت جسمانی اسلحہ اور سواری کی نوعیت کے اعتبار سے فوقیت حاصل تھی افغان جنرل کی اور ان کے کپتانوں کی مرہٹوں پر برتری، اور افغان فوج کی بہتر ہمت اور ڈسپلن نے دن بھر میں میدان مار لیا مرہٹوں نے خوفناک حملے کیے اور ایسے استقلال اور بہادری سے لڑے جو ایک عظیم قوم کے شایان شان ہے لیکن بھوک نے ان کو کمزور کر دیا تھا اور سہ پہر تک وہ تھک چکے تھے ان کی فوج کا قلب ابتدائی کے بند وقچیوں نے چھلنی کر دیا تھا انتشار کی حالت میں لوگ ایک بھیڑ کی طرح بھاگ کھڑے ہوئے۔ بائیں بازو نے جو ابراہیم خاں گاردی کے کمان میں تھا روہیلوں پر حملہ کر دیا جو ابدالی کی فوج کے داہنے بازو تھے لیکن ایک سخت اور خون ریز مقابلہ کے بعد جس میں 80 فی صدی بندوقچی ذبح ہو گئے ان کو مجبوراً میدان خالی کر دینا پڑا مرہٹوں کا داہنا بازو سندھیا اور ہولکر کی قیادت میں ابدالی اور شجاع الدولہ کے آمنے سامنے تھے لیکن ان لوگوں نے لڑائی میں بہت کم حصہ لیا اور جب انھوں نے دیکھا کہ فوج کا قلب اور بایاں بازو ٹوٹ چکا تو ہولکر بھاگ کھڑا ہوا سندھیا کی فوج نے بھی ان کی تقلید کی۔ شکست بھگدڑ میں تبدیل ہو گئی۔ اور خوفناک قتل عام اس کا نتیجہ ہوا میدان میں اٹھائیس ہزار مقتولین کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں افسران کی اکثریت قتل ہو گئی۔ وشواس راؤ اور بھاؤ دونوں بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے قتل ہوئے۔

پانی پت کی شکست اوّل درجہ کا سانحہ تھا لیکن کسی معنی میں یہ فیصلہ کن شکست نہیں تھی ابدالی کے لیے یہ ایک خالی خولی فتح تھی جوں ہی اس نے پیٹھ پھیری اس کی فتوحات کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے وہ اور ان کے جانشیناں اپنے وطن میں بغاوتوں سے پریشان کیے جا رہے تھے اور اوزبک اور ایرانیوں نے شمال اور مغرب سے ان کے لیے خطرہ پیدا کر دیا تھا وہ اپنے ایجنٹوں کو ہندوستان میں کافی امداد نہ دے سکے۔ سکھ کثیر تعداد میں اپنے قلعوں سے باہر نکلے افغانی افسران کو بھگا دیا اور چاروں طرف غارت گرانہ حملے کیے چند سالوں کے اندر سندھ کے اس پار ابدالی کی فتوحات کا ایک بھی نشان باقی نہیں رہا۔ مرہٹوں کو ایک سخت ضرب

لگی تھی لیکن دس سال کے اندر مغل بادشاہ شاہ عالم کے محافظ کی حیثیت سے جنھیں وہ 1771ء میں الہ آباد سے دلی لائے تھے پھر شمال میں آپہنچے۔

یہ امر مشکوک ہے کہ اگر پانی پت میں مرہٹوں کو فتح ہوئی ہوتی تو ہندوستان کی بعد کی تاریخ کچھ زیادہ مختلف ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ مرہٹوں کی سیاست 1761ء کے پہلے سے ٹوٹنے کے ایسے یقینی آثار پیدا ہو چکے تھے جن میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہوسکتا۔ ان کے وطن کی حکومت کی بنیاد کمزور تھی۔ مرہٹہ سوراج کا علاقہ غریب تھا ان کے پاس ایک بادشاہت کا خرچ اٹھانے کے لیے معقول ذرائع حاصل نہ تھے اس لیے پیشوا نے اپنی فوجوں کے خرچ کے لیے استحصال بالجبر اور لوٹ کی پالیسی ایجاد کی تھی۔ "سوراج" یعنی مرہٹوں کے وطن کے باہر کا ہندوستان بڑے بڑے سرداروں میں تقسیم کر دیا گیا تھا جن سے یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ اپنے اخراجات کے لیے اور مرکزی حکومت کے اخراجات کے لیے ان مقامات پر اپنے حصہ کے مطابق مال گذاری لگائیں۔ لیکن مرکز کے پاس جو فوج تھی وہ اتنی کافی نہ تھی کہ سرداروں کی بغاوتوں کا منہ توڑ سکتی اور نہ کوئی وابستہ رکھنے والا اصول ہی ایسا ایجاد کیا گیا تھا جو سب کو متحد رکھتا بادشاہ یعنی خاندان شیواجی کے ساتھ وفاداری کا گلا اس طرح گھونٹ دیا گیا تھا کہ اب اس وفاداری کو پیشوا کی طرف منتقل کر دیا گیا تھا۔ پیشوا میدان میں بدیر آیا تھا وزراء اور فوجی افسران جو ابھی حال تک اس کے ہمسر تھے اس کے اختیارات سے حسد رکھتے تھے نتیجہ میں عدم اتحاد اور اندرونی کشمکش لازمی تھے بہت پہلے 1738ء ہی میں جب راگھوجی بھونسلہ مغل سلطنت کے مشرقی حصہ میں چوتھ لگا رہا تھا وہ پیشوا باجی راؤ اول سے متصادم ہو گیا معاملہ یہاں تک بڑھ گیا کہ اس کے بعد پیشوا بالجی راؤ نے مغل بادشاہ کی درخواست پر 1743ء میں بھونسلہ کو مار بھگانے میں نواب بنگال اللہ وردی خاں کے ساتھ شریک ہونے پر رضامندی دے دی۔ ایسا نظر آتا تھا کہ ہولکر اور بھونسلہ کی باہمی رقابت کا کوئی مصالحانہ حل ہی نہیں ہے۔ داماجی گائیکواد نے پیشوا کے حکم کی خلاف ورزی کی تھی اور ہولکر کا رویہ پوشیدہ مخالفت کا تھا۔ پانی پت کی لڑائی کے بعد کے زمانہ میں پیشوا کی گدی کی جانشینی دعویداروں کے درمیان جنگ کے خطرے سے خالی نہ تھی۔

مرہٹہ سیاست نے ایسی شکل اختیار کر لی تھی کہ بڑے بڑے جاگیرداروں اور افسروں کے خاندان آزاد ریاستیں قائم کرنے کی تلاش میں تھے سیاسی معاملات میں عوام یا جماعتوں

کا نہ کوئی عمل تھا اور نہ کوئی حصہ نیز مرہٹہ لیڈروں نے اعلیٰ تدبر کی کوئی نشانی بھی نہیں پیش کی یہ لوگ حریص اور غاصب تھے وہ کاشتکاروں کو پیس ڈالتے تھے اور اپنی رعایا اور اپنے ماتحت حلیفوں کی نیک خواہشات کو حاصل کرنے کی کوئی کوشش نہ کرتے تھے ان لوگوں نے اپنی قوم کی بھلائی اور اس کی ثقافتی ترقی میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کیا۔

پانی پت کی شکست فیصلہ کن نہ تھی جو لڑائی واقعی فیصلہ کن تھی اور جس سے انقلابی نتائج یہ نکلے وہ پانی پت سے چار سال پہلے ہی پلاسی کے آم کے باغ کے کھیتوں میں لڑی جا چکی تھی۔

احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان چھوڑنے سے پہلے گوہر کو شاہ عالم ثانی کے لقب کے ساتھ شہنشاہ نامزد کر دیا تھا لیکن چونکہ شاہ عالم اس وقت دلی سے باہر تھا اس لیے نجیب الدولہ ناظم خاص اور قائم مقام بادشاہ کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور ان کے ساتھ شہزادہ جواں بخت بحیثیت ولی عہد شہزادہ تھے اس طرح نجیب الدولہ 1761ء سے 1770ء تک کل معاملات کا افسر اعلیٰ رہا وہ نہ صرف بادشاہ کا قائم مقام تھا بلکہ احمد شاہ ابدالی کا نائب بھی تھا۔ اس کا کام یہ تھا کہ دلی کے ارد گرد مغل علاقوں میں امن و امان قائم رکھے اور جاٹوں اور سکھوں کو مداخلت بے جا سے روکے وہ جاٹوں کے خلاف کامیاب رہا اس نے میدانِ جنگ میں سورج مل کو قتل کر دیا اور اس کے بیٹے کو ایسا کر دیا کہ وہ کبھی مقابلہ میں آنے کے قابل ہی نہیں رہا لیکن وہ سکھوں کے مقابلہ میں ناکام رہا جن کو وہ دبا نہیں سکا لیکن بہرحال پھلکین سکھ ماوراء ستلج کے حکمرانوں سے جدا ہو گئے۔

مرہٹوں میں خانہ جنگی اور دلّی کا عزل

1770ء تک مرہٹوں نے پانی پت کی شکست کے صدمہ سے اتنی کافی حد تک نجات حاصل کر لی تھی کہ وہ پھر شمال میں نمودار ہوں اور اپنا اقتدار جمائیں۔ اس نازک موقع پر نجیب کے انتقال نے شاہ عالم کو مجبور کر دیا کہ وہ ان دو باتوں میں سے ایک کا انتخاب کریں یا تو انگریزوں کے سایۂ عاطفت میں چلے جائیں اور الٰہ آباد میں مستقل قیام پسند کریں یا مرہٹوں کی مدد سے تخت دلی کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ بادشاہ کی اس دماغی کشمکش اور اضطراب کا کہ وہ دارالسلطنت واپس آئیں مرہٹہ سرداران نے پورا فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے بادشاہ سے ایک مفاہمت کی اور وعدہ کیا کہ وہ ان کو دلی

ے چلیں گے اور تخت انھیں دوبارہ واپس دلا دیں گے اس طرح بارہ سال کی جلا وطنی
کے بعد شاہ عالم دارالسلطنت کو واپس آئے جو شاہنشاہانہ اقتدار کا مقام بھی تھا اور اس کی
نشانی بھی۔

اس دربہ دری کے باوجود بھی شاہ عالم نے بہار اور بنگال پر اپنا اقتدار از سر نو قائم
کرنے کی کئی کوششیں کی تھیں لیکن نواب بنگال نے ایسی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔ یہ
خاصی تعجب کی بات ہے کہ پانی پت کی لڑائی کے دوسرے ہی دن شاہ عالم اپنی سلطنت کی
تقدیر سے لاپروا ہو کر بہار کے قصبہ کے قریب انگریزوں کی ایک فوج سے ایک لڑائی لڑا تھا۔
اس کو شکست ہوئی اور اسے صلح کی درخواست کرنی پڑی پھر تین سال کے بعد جب
شہنشاہ اور نواب اودھ نے معزول شدہ نواب قاسم علی (میر قاسم) کے معاملہ کی حمایت
کی تو ان کی مشترکہ فوج کو بکسر کے مقام پر تباہ کن شکست کا منہ دیکھنا پڑا انگریزوں کا پنشن
خوار اور شجاع الدولہ ان کا نائب ہو گیا۔ اس طرح شاہ عالم ایک بیرونی طاقت کی اس شرمناک
تابعداری کو ختم کرنے ہی کے لیے شاہ عالم نے مرہٹوں کی محافظت منظور کی تھی اور ان کی
ہمراہی میں الہ آباد کو ترک کیا تھا۔

مرہٹے اب اس حالت میں تھے کہ دلی کے معاملات پر اپنا اقتدار استعمال کر سکیں لیکن
چوتھے پیشوا مادھو راؤ کے 1772ء میں انتقال کے بعد پونا جانشینی کے ان فسادات میں
ڈوب گیا جن کا ہونا لازمی تھا۔ پیشوا کے چچا رگھوناتھ راؤ نرائن راؤ کو گدی سے اتارنے کے
لیے سازشیں کرنے لگا۔ بہت آسانی سے اس نے غیر مطمئن عناصر کی حمایت جمع کر لی۔ پیشوا
کے مشیر کار واں، اپنے آقا کی قسمت کے بارے میں تقریباً بے تعلق سے تھے۔ پہرہ داران جو
محل کی پاسبانی کرتے تھے ان کو رشوت دے کر اپنے فرض سے غافل کر دیا گیا۔ پیشوا نے
کوئی احتیاط نہیں برتی اور اپنے عہدے پر فائز ہونے کے نو ماہ کے اندر وہ بے رحمی کے
ساتھ قتل کر دیا گیا۔

خانہ جنگی کا آغاز ہوا اور رگھوناتھ راؤ (رگھوبا) نے انگریزوں سے مسلح امداد حاصل
کرنے کے شرائط پر گفتگو شروع کی۔ اب بر تن چولہے تک پہنچ گیا تھا، تمام مرہٹہ سردار اس نزاع
میں شریک تھے۔ ان کے دکن کے ہمسایے نظام حیدر آباد اور حیدر علی کسی نہ کسی طرفداری
جیسا ان کے مفاد کا تقاضا ہوتا کرتے رہتے تھے حتیٰ کہ فرانسیسی بھی اس نزاع میں کھنچ کر

آگئے آخر کار صلح سبائی نے اس طویل جنگ کا خاتمہ کیا۔

اس تمام ہلچل اور ہنگاموں کے دوران میں مرہٹوں کو شمال کے معاملات پر نظر ڈالنے کی مہلت نہیں ملی۔ دلی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ نجف خاں جس نے فنون جنگ انگریزوں کی صحبت میں بنگال میں سیکھا تھا اور جس پر ان کا لطف و کرم بھی تھا اور جس کو ان کی حمایت بھی حاصل تھی دلی کا حقیقی معنوں میں حکمران ہوگیا۔ اگرچہ اس میں سول انتظامات کو چلانے کی ضروری اہلیت نہ تھی پھر بھی اس نے اتنا کیا کہ مملکت کے جو اجزا باقی رہ گئے تھے ان کو دشمنوں کے ان حملوں کے خلاف جو سیلاب کی طرح چاروں طرف سے امڈ رہے تھے محفوظ اور یکجا رکھ سکا۔

1782ء میں نجف خاں کا انتقال ہوگیا اس کے نائبوں نے ایجنٹ ہونے کے لیے کتوں کی سی لڑائی لڑنا شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب باہر نکل گئے اور مرہٹوں کے لیے میدان کھلا چھوڑ دیا۔ ان کا افسر اعلیٰ مادھوجی سندھیا دکن کی لڑائیوں سے آزاد ہو کر اب اس پوزیشن میں تھا کہ شمال کے معاملات پر توجہ دے سکے جانشینی کی لڑائی نے مرہٹی نظام کی جڑیں ہلا دی تھیں۔ پیشوا کا اقتدار جو وفاقی جماعتوں کے ایک گروہ کو ایک مرکزی رشتہ میں جوڑے ہوئے تھا کمزور ہوگیا تھا اور سندھیا، ہولکر، گائیکواد اور بھونسلے جیسے سردار اسی طرح خود مختار صوبائی حکمران بن گئے تھے جس طرح دکن بنگال اور اودھ کے مغل صوبہ داران تھے مہادجی کا منصوبہ تھا کہ وہ دلی ذی شان مغل امیرالامرا کا کردار ادا کرے۔ نجف خاں کے نائبوں کی سازشوں اور روز روز کے جھگڑوں سے بادشاہ پریشان تھا اس نے مہادجی کو دعوت دی کہ وہ دلی آکر نظم و نسق کا چارج لے لے۔

انگریز جو دلی کے حالات کا بغور مطالعہ کر رہے تھے اور جو اپنے خود منصوبے رکھتے تھے وہ اس طوفانی سمندر میں پھاندنے کے لیے تیار نہ تھے لیکن بادشاہ کو کون قابو میں رکھے اس بارے میں مرہٹوں اور انگریزوں کا تصادم تو ناگزیر تھا مرہٹوں سے زیادہ موقع شناس اور پُر وسائل برطانوی اس وقت تک حرکت کرنے کے لیے تیار نہ تھے جب تک اپنے منصوبے کی کامیابی کا مالی فوجی اور سیاسی ہر پہلو سے پورا اطمینان نہ ہو جائے۔ دوسری جانب مرہٹے بس دلی کے طوفان خیز حالات میں کود ہی پڑے اور اس کی کچھ فکر ہی نہ کی کہ کتنے اخراجات کی ضرورت ہوگی۔ جو فوجیں مل سکیں گی وہ کافی بھی ہوں گی یا نہیں

اور جو ساتھی ہیں ان پر بھروسہ بھی کیا جاسکتا ہے یا نہیں جو تمغہ ان کو دیا گیا تھا بس اس کی چمک ہی نے ان کو اپنا گرویدہ کرلیا۔

اس لیے ایسا ہوا کہ مہادجی نے بادشاہ کی دعوت قبول کرلی وہ بادشاہ کے سامنے فتح پور سیکری کے پاس ان کے کیمپ میں حاضر ہوا۔ اپنا سر بادشاہ کے پیروں پر رکھ دیا اور 101 طلائی مہر (اشرفی) نذر پیش کی بادشاہ نے ان کو ایجنٹ (وکیل المطلق) کا عہدہ عطا کیا جس میں وزیر اعظم (وزیر) اور سپہ سالار اعظم (میر بخشی) کے دونوں عہدے شامل تھے (۱) پیشوا کی بالاتری کا حق نظر انداز کر دیا گیا۔ مہادجی کا حوصلہ پورا ہوگیا انھوں نے سلطنت مغلیہ کے سب سے اونچے عہدے پر قبضہ جمالیا اب یہ ان کے اختیارات میں تھا کہ صوبے کے گورنروں اونچے سے اونچے افسران کو مقرر اور برخاست کرسکیں جاگیریں عطا کریں وہ بادشاہ کا نائب اور معزز عہدیدار تھا۔ لیکن دراصل مہادجی نے بہت اونچی قیمت ادا کرکے ایک سستا نمائشی زیور خریدا تھا ایک بہت بڑی فوج دس لاکھ روپے ماہوار کے خرچ سے رکھنی پڑتی تھی اور ان کو اس کے لیے سرمایہ ایک ایسی بوسیدہ مملکت سے حاصل کرنا تھا جو کئی بار روندی اور لوٹی جاچکی تھی۔ شاہی فرمان دلی اور آگرہ کے اضلاع کے باہر مشکل ہی سے جاتے تھے اور یہاں بھی شاہی قلمرو یا تو کسی کو دے دی گئی تھی یا ان لوگوں نے چھین لی تھی جو شاہی محاصل طاقت کے استعمال کے بغیر دینے سے انکار کرتے تھے مغل امرا ان کے خلاف سازشیں اور بغاوت کرتے تھے متلون مزاج اور بے وفا بادشاہ مسلسل ساتھ نہیں دیتا تھا۔ پیشوا کے دربار میں نانا فرنویس کے اثرات ان کے خلاف کام کررہے تھے اور وطن کی حکومت جس کا فرض تھا کہ وہ میدان جنگ میں اپنے جنرلوں کی پوری پوری کفالت کرے، اس میں اس کے لیے نہ تو کوئی خواہش ہی تھی اور نہ اتنا پیسہ تھا کہ وہ مہادجی کی اس مشکل وقت میں پشت پناہی کرتے (۲) جے پور کے راجہ نے مقررہ خراج ادا کرنے سے انکار کردیا اور اپنا ایک نمائندہ انگریزوں سے مدد مانگنے کے لیے لکھنؤ بھیجا۔ مہادجی مجبور ہوا کہ فوجی کارروائی کرے لیکن تنخواہ کے بقایا اور

---

(۱) پیشوا کے دربار میں اس پر اس وقت بہت غصہ کا اظہار کیا گیا تھا جب سندھیا نے اس کی یہ تشریح کی تھی کہ وہ محض پیشوا کے نائب کی حیثیت سے یہ کام کررہا ہے۔

(۲) سرکار جدو ناتھ فال آف دی مغل امپائر جلد سوم صفحہ 282

فاقہ کشی کے ڈر کی وجہ سے مغل فوجوں میں جو غداری پیدا ہو گئی تھی اس نے ایک پریشان کن
پوزیشن میں اُسے ڈال دیا وہ راجہ کو اطاعت پر مجبور کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔
مغل امرا نے غلام قادر رُہیلہ کی قیادت میں مہادجی کی پریشانیوں سے فائدہ اٹھایا۔
متلون مزاج شاہ عالم معزول کر دیا گیا اس کو سخت اذیت دی گئی اور پھر وہ اندھا کر دیا گیا۔
لیکن اس درمیان میں مہادجی لال ساٹ کی شکست سے سنبھل گیا تھا اور اس نے پھر دلی پر
قبضہ کر لیا۔ اندھے بادشاہ کو اس نے پھر تخت پر بٹھایا اور عزم کیا کہ حکومت کی انتظامی مشنری کی
از سر نو تعمیر کرے اور نافرمان تعلقداروں اور زمینداروں کو زیر کرے تاکہ محاصل اور سرمائے کے
جمع کرنے کا کام منظم ہو سکے اس طرح فوج اور پیشوا کی گورنمنٹ کے مسلسل مطالبات کو پورا
کیا جا سکے۔ لیکن مہادجی کے بہت سے دشمن تھے جو رکاوٹ ڈالتے تھے۔ یعنی افغان
روہیلہ مغل امرا راجستھان کے رجواڑے اور کرائے کی سرکش فوج جو ہمیشہ طوفان خیز لہروں
میں ہی شکار ماہی میں مسرت محسوس کرتی تھی۔ مرہٹہ سرداروں میں ہولکر ان کے رقیب تھے اور
نانافرنویس اُن کے بڑھتے ہوئے اقتدار اور اثر سے حسد رکھتے تھے نانافرنویس
نے سیکھے ولی طرز کا ایک پلان بنایا۔ انھوں نے شمالی ملکتوں کو سندھیا ہولکر اور پیشوا کے
نمائندے علی بہادر میں محاصل کی وصولی کے لیے تقسیم کر دیا۔ محاصل کی رقم جو ہر ایک کو ادا
کرنے کے لیے مقرر کی گئی تھی وہ عمداً اتنی زیادہ رکھی گئی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی اپنا پورا
حصہ جمع نہ کر سکتا تھا۔ اور اس لیے تینوں مستقل طور پر تُو تُو میں میں (جھگڑا) کرتے رہتے تھے
اپنے دشمنوں اور ان کی سازشوں کے خلاف مہادجی کا ردعمل یہ تھا کہ ایک ایسی کثیر
فوج تیار کی جائے جو امن و نظم قائم رکھ سکے۔ اور خراج اور مالگذاری وصول کر سکے۔ یہ
فوج ڈی بوائن نے مہیا کی جو 1784ء میں ان سے آکر مل گیا تھا اس نے ایک ایسی فوج
بھرتی کی جس کی تعداد ایک وقت میں 39 ہزار تک ہو گئی تھی۔ یہ صرف پیدل فوج تھی جس کی
تربیت فرانس کے طرز پر کی گئی تھی اور جس کو توپوں کے دستوں سے طاقتور بنایا گیا تھا اور
اسے توپوں اور بندوقوں سے جو یورپ کے باشندوں کی نگرانی میں اسلحہ خانوں کے اندر تیار
کی گئی تھی مسلح کیا گیا تھا۔

اس نئی فوجی طاقت سے مہادجی نے میدان صاف کر دیا اور اپنے تمام دشمنوں پر جن
میں ہولکر بھی شامل تھے فیصلہ کن فتح حاصل کی 1793ء تک وہ اپنی طاقت کے آخری عروج

تک پہنچ گیا۔ مرہٹوں میں اس کا نام اور اس کی شہرت ایسی ہو گئی تھی جس سے آگے آج
تک کوئی نہ جا سکا تھا لیکن ان کی فتح کا زمانہ ختم ہو گیا۔ ان کی موت سے مرہٹے اپنے آخری
اس شخص سے محروم ہو گئے جو فنِ سپہگری کا عظیم ماہر ہوتے ہوئے ایک عظیم مدبر بھی تھا۔

اس کے بعد کا زمانہ مکمل انتشار کا زمانہ ہے چاروں طرف لڑائیاں اٹھ کھڑی ہوئیں۔
مہادجی کا فرزند متبنیٰ دولت راؤ اور ان کی سوتیلی ماں آپس میں جھگڑنے لگے سندھیا سے سول
اور ملٹری افسران جو برہمن ذات کی مختلف شاخوں۔ دے شاستا اور شنوی کے تھے ایک
دوسرے کے خلاف سازش کرنے لگے۔ توکوجی ہولکر کے بیٹے اپنے باپ کی جائداد کے لیے
برادر کشی کی جنگ میں مصروف ہو گئے۔ نوجوان پیشوا مادھورام دوم کی موت نے ان کی جانشینی
کے جھگڑے کھڑے کئے جس میں مرہٹہ سرداروں نے ایک دوسرے کے خلاف محاذ بنایا۔

جو خانہ جنگی شروع ہوئی اس میں بشونت راؤ ہولکر اور جسونت راؤ سندھیا مخصوص
ہستیاں تھیں نانا فرنویس بہت پس و پیش اور اپنی اعلانیہ دشمنی رگھوبا کے لڑکے کو جنگ سے
باز رکھنے کی ناکام کوششوں کے بعد آخر کار انہی کے طرفدار ہو گئے۔ کولھاپور کے راجہ چتر وپتی
شیواجی اور بٹوردھن کے افسر اعلیٰ پرشوتم رام بابو میں ایک خوں ریز جنگ نے مزید پیچیدگیاں
پیدا کر دیں۔ دونوں لڑنے والوں کی فوجی کارروائیوں نے ملک کو خاکستر کر دیا۔ گاؤں گھوڑوں
کی ٹاپوں کے نیچے روندے گئے۔ قصبات لوٹ کر تباہ کر دیئے گئے۔ دولت مندوں کو ایک پر
ایک اذیت دی گئی اور غریب ناقابل بیان مصیبتوں میں گرفتار ہوئے مرہٹوں کے وطن میں
نراج پھیل گیا۔

یہ لڑائی جو سب کی اور سب کے خلاف تھی انگریزوں کے لیے رحمتِ خداوندی تھی۔ انگریز
نپولین سے ٹکراؤ میں حیات و موت کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ نپولین بڑی پھرتی سے بحر متوسط
کو پار کر کے ترکوں کو اہرام کے نیچے شکست دے کر آگے بڑھ کر شام کے حدود میں داخل
ہو چکا تھا۔ اس کے ایجنٹ روس اور مشرقی ممالک کو انگریزوں کے خلاف اکسا رہے تھے۔ اور
یہ سب کو معلوم تھا کہ ٹیپو سلطان اس سے خط و کتابت کر رہے ہیں۔ ایسے نازک موقع پر حکومت
برطانیہ نے ولزلی برادران کو اپنے مفاد کی حفاظت کے لیے ہندوستان بھیجا۔

کلکتہ میں اپنے عہدے کا چارج لینے کے فوراً بعد ولزلی نے مرہٹوں سے گفت و شنید اس
غرض سے شروع کی کہ ان کو خراج ادا کرنے والے حلیف بننے کے جال میں پھانس لے شروع

میں پیشوا نے اس قسم کی پیش کش پر کوئی توجہ نہیں دی لیکن جب یشونت راؤ ہولکر نے ان کو 1802ء میں شکست دی اور پونا سے باہر ڈھکیل دیا تو مجبوراً انھوں نے انگریزی سرپرستی کو قبول کر لیا وہ بھاگ کر بسین پہونچا اور وہاں ایک ایسے صلح نامہ پر دستخط کر دیے جس سے وہ برطانیہ کا تابع ہو گیا۔

اس طرح مرہٹوں کی مرکزی حکومت کا وجود ختم ہو گیا لیکن مرہٹہ سردار اب بھی طاقتور تھے لیکن یہ برطانیہ کی خوش قسمتی تھی کہ اس کی انتہائی سخت مصیبت کے زمانہ میں بھی مرہٹے اپنی بچی کچھی مملکت کو محفوظ کرنے کے لیے متحد نہ ہو سکے۔ نوشتہ تقدیر نے ان کی اسی حماقت کو نہیں بخشا ہولکر اور سندھیا الگ الگ انگریزوں سے لڑے اور دونوں کو کچل ڈالنے والی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

مہادجی سندھیا نے دکھن کی جانب روانہ ہونے سے پہلے بادشاہت کے نظم ونسق کا معقول انتظام کر دیا تھا۔ انھوں نے شاہ نظام الدین کو جو چشتیہ خاندان کے سب سے بڑے پیر تھے ایجنٹ مقرر کیا اور دلّی کے علاقے کو وصولی مالگذاری کے لیے چھ ضلعوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ بدقسمتی سے دلّی سے سندھیا کی طویل غیر حاضری مرہٹہ افسران کی رقابت، یوروپین کی کمانڈروں کی بے وفائی ایجنٹ کی سخت گیری اور حرص اور مہم بازوں کی لوٹ اور غارت گری نے بادشاہ اور قوم کی زندگی کو ناقابل بیان حد تک مصیبت زدہ بنا دیا۔

جب ولزلی نے دولت راؤ کے خلاف اعلان جنگ کیا تو برطانوی افواج نے نہایت تیزی سے شمال اور دکھن دونوں جگہ مرہٹہ افواج کا محاصرہ کر لیا۔ شمال افواج کا کمانڈر لیک کوچ کرتا ہوا علی گڑھ پہنچا اور سندھیا کی فوجوں کو جو پیران کی کمانڈ میں تھیں تہس نہس کر دیا اس کے بعد وہ دلی کو کوچ کر گیا جس میں وہ 16؍ستمبر 1803ء کو داخل ہوا۔ شہنشاہ شاہ عالم برطانیہ کی سرپرستی میں آگیا اور عملاً مغل حکومت کا وجود ختم ہو گیا۔

دکن میں آرتھر ولزلی نے (جو بعد کو ڈیوک آف ولنگٹن ہوا) سندھیا اور بھونسلہ کی فوجوں کو بالترتیب آسے اور آرگاؤں کے مقامات پر برباد کر دیا اور اس کے بعد گوالی گڑھ کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ دیوگاؤں اور سرجی۔ انجے گاؤں کے معاہدات صلح کے مطابق سندھیا اور بھونسلے نے اپنی آزادی سے دست برداری پر دستخط ثبت کر دیے اس طرح شیواجی کا ہندو پد بادشاہی کا خواب معدوم ہو گیا۔

دوسرا باب

اٹھارویں صدی میں سماجی نظام

ہندوستان کی تاریخ کی خصوصیات

سولھویں صدی کے اوائل میں بابر نے سلطنت مغلیہ کی بنیاد رکھی ان کے ذہین اور طاقتور وارثوں نے اسے اتنے بڑے رقبہ پر پھیلا دیا کہ اورنگ زیب کی موت کے وقت اس کی شمالی سرحد قراقرم پہاڑ اور آکس (Oxus) دریا کے ساحلوں کو چھو رہی تھی اور نیچے دکن میں دریائے کاویری تک پہنچ گئی تھی، پچھم سے پورب سلطنت مملکت ایران اور برما کے درمیان تھی اس طرح مغلوں نے ایک ایسی ریاست پر حکومت کی جس کا رقبہ ان تمام سلطنتوں کے رقبہ سے جو اُن سے پہلے تھیں یا جو بعد میں آئیں کہیں زیادہ تھا۔

یہ وسیع مملکت اپنی شان و شوکت اور چمک دمک اپنی دولت اور کلچر کے لیے ایسی شہرت رکھتی تھی جس کی کوئی مثال اس زمانہ میں نہ تھی۔ اس کی حکومت کا طرز اور نظم و نسق ایسا تھا جو ایک وسیع رقبہ پر امن اور قانون کا ضمانت دار تھا اور علم و فن کی ترقی کے نادر مواقع فراہم کرتا تھا۔ دنیا کی تہذیب کی تاریخ میں اس کے کارنامے ایک درخشاں باب کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن اس عجیب و غریب عمارت کی زندگی کو کوئی طویل مدت نہ مل سکی 1526ء میں پانی پت کے میدان میں اس کی بنیاد کے قیام سے 1739ء میں نادر شاہ کے تباہ کن حملے تک 213 سال کا زمانہ ایسا گذرا جب یہ سلطنت قائم رہی۔ مغل سلطنت کا دور زیادہ نہیں رہا لیکن ہندوستان میں سلطنتیں قلیل العمر ہی رہی ہیں۔ موریا ڈیڑھ صدی سے کم ہی رہے ستواہانس نے اپنی سلطنت قبل مسیح پہلی صدی کے وسط میں قائم کی اور اپنے اقتدار کو دکن میں سندر

سے سمندر تک پھیلا دیا لیکن ان کی حکومت کا مجموعی عہد تین صدیوں سے کم ہے۔ گپتا نے دو صدی تک حکومت کی۔ کچھ محدود مقامی سلطنتیں مثلاً دکن میں چولاس اور بنگال میں پالاس غالباً اپنی جگہوں کے محفوظ ہونے کی وجہ سے زیادہ عرصہ تک قائم رہیں ورنہ عام طور پر ہندوستان میں سلطنتیں اور شہنشاہیاں کیا زمانہ قدیم میں اور کیا زمانہ وسطیٰ میں تھوڑی ہی مدت زندہ رہا کیں

مقدس ویدوں کے عہد سے اٹھارھویں صدی کے آخر تک پھیلے ہوئے زمانہ میں ہندوستان مسلسل سیاسی وحدت سے بیک وقت دو صدیوں سے زائد تک محظوظ نہیں ہوا۔ اشوک کی کل ہند مملکت ان کی موت کے بعد ہی پارہ پارہ ہو گئی چوتھی صدی میں سمودرا گپتا نے جو رقبے اپنی مملکت میں شامل کر لیے تھے وہ سب پانچویں صدی میں اس وقت نکل گئے جب گپتا کے زمانہ میں "ہن" حملہ آوروں نے شمال مغرب سے آکر گپتا اقتدار کے پرخچے اُڑا دیئے خلجیوں کی حکومت مشکل سے تیس برس تک رہ سکی (1290: 1302ء) تغلقوں کے اختیارات بنگال اور دکن میں محمد تغلق کی موت کے پہلے ہی جو 1351ء میں واقع ہوئی مسترد کر دیئے گئے تھے مغلوں کی سلطنت کا عظیم قصر اورنگ زیب کے انتقال کے بعد نصف صدی کے اندر کھنڈر ہو گیا تھا۔ اس طرح ہندوستان کی تاریخ سلطنتوں کے عروج و زوال اور ایک سلطنت کے زوال اور دوسرے کے عروج کی درمیانی وقفہ میں تاراج کی تاریخ ہے۔

ہندوستان کی تاریخ کی دوسری اہم چیز یہ ہے کہ سلطنتوں کے جائے وقوع اور سیاسی تنظیموں کے مرکز نقل کبھی متعین نہیں رہے موریا اور گپت کی سلطنتوں کے مرکز مشرقی ہندوستان میں تھے ستوا ہانہ نے دکن سے حکومت کی گورجارا، پرتی ہراس' کا دالسلطنت قنوج تھا چولا' جنوبی ہند کے تھے اور ازمنہ وسطیٰ کے سلاطین اور مغل اپنا حکم دلّی اور آگرہ سے چلاتے تھے مرکزیت کا یہ فقدان یورپ کے حالات سے نمایاں طور پر مختلف ہے مثلاً انگلستان، فرانس اور اٹلی میں سلطنتوں کے مراکز قدیم اور متعین تھے مثلاً لندن، پیرس اور روم۔

اگرچہ ہندوستان کے کسی حصہ نے کبھی با اقتدار مرکز کے عمل کا کام پیش نہیں کیا پھر بھی یہ بات صحیح رہ جاتی ہے کہ ہندوستان کا وسطیٰ حصہ (دھرو امدھ دیش) یعنی دریائے سرسوتی اور دریائے سدانا ریہ اور ہمالیہ اور بندھیاچل پہاڑوں کے درمیان کے علاقے زمانہ دراز تک سیاسی اور کلچرل زندگی کے لیے ایک ممتاز حیثیت کی شہرت رکھتے تھے کیوں کہ یہ علاقے زمانۂ

قدیم میں سورج بنسی اور چندر بنسی خاندانوں رام بھرت اور جنک کے وطن تھے۔ ترکوں اور مغلوں کی وسطی زمانہ کی شہنشاہیتوں کے بھی مرکز تھے۔ یہ مقدس دریاؤں کی سرزمین تھی۔ گنگا، جمنا اور سرسوتی اور اس میں یاترا کے مقامات تھے۔ ہردوار، متھرا، اجودھیا، پریاگ اور کاشی یہیں ہندوستان کی چند عظیم زبانوں نے نشوونما پائی اور پھلیں پھولیں سنسکرت، پالی، برج اور اردو اور یہاں بدھ اور مہابیر کے مذاہب پوری قوت سے بڑھے بھگتی اور تصوف کی تحریکات سرسبز ہوئیں۔

یہ درمیانی علاقہ وہ تھا جہاں سے ثقافتی اثرات کی شعاعیں ہندوستان کے تمام علاقوں میں پھیلتی تھیں۔ لیکن ثقافت کا یہ شعاعی مرکزی نقطہ باشندگان ہندوستان کو ایک معاشرتی سیاسی اتحاد کے نظام میں منسلک کرنے میں ناکامیاب رہا۔

کیوں ہندوستان ترقی کر کے واحد سماجی اجتماعی ہیئت نہ اختیار کر سکا کیوں اس کی سیاسی بنیادیں غیر مستقل رہیں یہ ایسے مسائل ہیں جو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں بلاان کو سمجھے اٹھارھویں صدی میں برطانیہ کے ہندوستان فتح کر لینے اور اس کے تقریباً دوسوسال کے بعد ہندوستان کے آزادی حاصل کرنے کی تشریح ہو نہیں سکتی اس لیے یہ ضروری ہے کہ فتح کے وقت کے ان مخصوص حالات کا جائزہ لیا جائے جو ہندوستان پر چھائے ہوئے تھے اور جنھوں نے برطانوی مملکت کے قیام میں سہولت پیدا کر دی۔

دیکھیے ایک تہذیب کی تعمیر کرنا یا اسے مسمار کرنا دونوں صورتوں میں انسان اور فطرت کا ایک ایک عمل ہوتا ہے لیکن بہر حال دونوں کے درمیان فطرت کا عمل انسان کے عمل سے کمتر درجہ کا ہوتا ہے فطرت مواقع فراہم کرتی ہے اور انسان کا کام ہے کہ ان سے فائدہ اٹھائے یہ مقابلوں کی دعوت دیتی ہے جن کے لیے مناسب رد عمل کی تلاش ضروری ہوتی ہے۔ جب انسان فطرت کے عطیات کا استعمال کرتا ہے تو وہ آگے بڑھ جاتا ہے اور ایک منزل سے دوسری منزل تک چڑھتا چلا جاتا ہے اس کے برخلاف کرنے پر یا تو وہ جامد حالت میں رہ جاتا ہے یا جس نظام کو اس نے بڑی محنت سے تاریخ کے ایک دور میں تعمیر کیا تھا وہ ٹوٹنے لگتا ہے اور آخر کار پرزے پرزے ہو جاتا ہے لیکن سوسائٹیوں اور تہذیبوں کا عروج وزوال ضرورت کے کسی آہنی قانون کے تابع نہیں ہے۔ باوجود اس کے کہ چاہے جس حد تک فطرت کے مظاہر انسان کی طاقت پر روک لگاتے رہے ہوں پھر بھی جہاں تک نظر جا سکتی ہے

انسان خود اپنی تقدیر کا معمار ہے کیوں کہ فطرت کے فراہم کردہ وسائل کو انسان کی تخلیقی صلاحیتیں جس طرح استعمال کرتی ہیں انہی کی پیداوار معاشرتی اقتصادی اور سیاسی نظام ہیں اگرچہ یہ ممکن نہیں ہے کہ زمانہ حاضرہ میں جو معلومات ہمیں میسر ہیں ان کی مدد سے ہم علمی طرز پر مختلف النوع اسباب کے پیچیدہ جال کا پردہ چاک کرسکیں لیکن یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ صرف ماضی کی داستان سرائی پر قناعت کرکے ان میں باہمی ربط اور ایک دوسرے سے سبب اور نتیجہ کا جو تعلق ہے اسے یکسر نظر انداز کردیں تاریخ کو سمجھنے کی ابتدا کرنے کے لیے ان واقعات کے اثرات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

اگر ہندوستان کی تاریخ تمام دوسری تاریخوں کی طرح انسان کے دماغ اور فطرت کے ایک دوسرے پر عمل کا نتیجہ ہے تو یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ ان مختلف واقعات کو تولا جائے جنہوں نے اٹھارھویں صدی میں حالات کو ایک سانچے میں ڈھالا اس لیے سب سے پہلے طبعیاتی ماحول سے ابتدا کیا جائے جس نے انسان کی کوششوں میں جوش بھی پیدا کیا اور ان میں رکاوٹ بھی ڈالی۔

سرزمین

ہندوستان انیسویں صدی میں جغرافیہ کی اصطلاحی زبان میں ملک نہ تھا۔ رقبہ کے لحاظ سے اس کو اسی صف میں رکھا جائے گا جس میں روس، چین، کناڈا اور ممالک متحدہ امریکہ ہیں آبادی کے لحاظ سے یہ چین کے بعد دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔ اس کے جغرافیائی خط و خال اسے خلاصۂ عالم ظاہر کرتے ہیں کیوں کہ ہر قسم کی آب و ہوا تقریباً ہر طرح کی زمین ہر طرح کے دریا جانوروں اور پودوں کی تقریباً ہر قسم و ہر صنف بہت سے اقسام کے جمادات اور کئی انسانی نسلیں اس کے حدود کے اندر پائی جاتی ہیں۔

یہ ملک قدرتی طور پر چار خطوں میں منقسم ہے۔ ایک ہمالیہ کا خطہ دوسرے شمالی ہند کے ناہموار میدانوں کا خطہ تیسرے وسطی بلند حصہ اور چوتھے دکن جو پورب پچھم اور دکھن سمندری ساحلوں سے گھرا ہوا ہے۔

خطہ ہمالیہ مستقل طور پر برف کا دیس ہے اس کے دامن میں سحر آفریں وادی کشمیر ہے

جس کو مغل "فردوس بر روئے زمین" کہتے تھے اور بے شمار پہاڑی ریاستیں ہیں جن میں کچھ بہت چھوٹی اور دلکش ہیں اور دوسری سکم، بھوٹان اور نیپال کی طرح طاقتور اور جنگ جو نسلوں سے آباد ہیں جن میں پہاڑیوں کو آزادی سے جو محبت ہوتی ہے وہ بھری ہوئی ہے۔

شمالی میدانوں کا خطہ جو بحر عرب سے خلیج بنگال تک پھیلا ہوا ہے ان عظیم دریاؤں کا عطیہ ہے جن کا منبع برفیلی ہمالیہ کے اندر ہے۔ زرخیز پنجاب کی آبپاشی دریائے سندھ کا جو نظم ہے اس سے ہوتی ہے۔ سردیوں میں سرد اور گرمیوں میں گرم اس کی خشک اور جاں فزا آب وہوا اس میں بہت کم یا اوسط درجہ کی بارش ان سب نے مل کر یہاں کے بسنے والوں کو محنت کش کسان اور اس سرزمین کو وافر پیداوار کا مرکز بنا دیا ہے۔ راجستھان کا ایک بڑا حصہ خاکستان ہے جو ابلتے ہوئے پیلے بالو کا ایک ایسا سمندر ہے جہاں پانی بہت ہی کم ہے اور جہاں زندگی گذارنے کے لیے سامان فراہم کرنا دشوار ہے۔ لیکن راجستھان کی گود میں وہ خوددار راجپوت نسلیں ہیں جو اپنی ذات اور قبیلہ کی عزت کی حفاظت بڑے ہی مستعدی سے نگہبان، قابلِ گرفت حد تک مہمان نواز اور فیاض اپنے سربراہوں کے وفادار ناعاقبت اندیشی کی حد تک بہادر لیکن کاہل اور متفقہ کام کرنے کے نااہل۔

وسطی علاقہ ایک دریائی ملک ہے جو اراولی اور راج محل کی پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے۔ یہ ایک برتن ہے جس میں شمال سے ہمالیہ پہاڑ کا اور جنوب سے وندھیا چل کا فاضل پانی آکر گرتا ہے یہ پانی اپنے ساتھ سیلاب کے بعد کی جمع کی ہوئی زرخیز مٹی لاتے ہیں جنھوں نے وسطی زمین کے طشت کو بھر دیا ہے۔ اور اس کو کئی ہزار فیٹ گہری مٹی عطا کی ہے۔ برق رفتار گنگا ہمالیہ کے دامن سے نکلنے کے بعد بڑی شان سے موٹی زرخیز زمین سے گذرتی اپنی معاون دریاؤں کو آغوش میں لیتے آگے بڑھتی ہے تاآنکہ وہ دکن کی جانب موڑنے کر خلیج بنگال کی زبردست وسعت سے ہم آغوش ہو جاتی ہے یہ ایک گرم ملک ہے اگرچہ سردی کڑی نہیں ہوتی لیکن گرمیوں میں سورج کی کرنیں پیاسی زمین پر بے رحمی کے ساتھ ضرب لگاتی ہیں پھر جون میں دکھن پورب اور دکھن پچھم سے کالے کالے بادل جمع ہونا شروع ہوتے ہیں اور زمین کی پیاس بجھانے اور زمین کو دلکش سبزہ زار بنانے کے لیے بارش ہوتی ہے۔

وسطی علاقہ قدیم اور وسطی دونوں زمانوں میں ہندوستان کی تہذیب کا مرکز رہا ہے۔ اسی کی زبانوں کو زیادہ سے زیادہ شرف قبولیت حاصل ہوا۔ یہ علم وفن کے لیے مشہور رہا

ہے اس کے بادشاہوں کے بہادرانہ جنگی کارنامے اور اس کے پاکیزہ نفس انسانوں کے درویشانہ اعمال پرانی کہانیوں، افسانوں، راگوں اور گیتوں میں محفوظ ہیں جو کل ہندوستان کے لیے ایک قیمتی خزانہ ہے دریاؤں کے کنارے شہر ابھرے جو اقتدار اور گوشۂ عافیت کے مرکز بنے اور جنھوں نے علم اور حق کے متلاشیوں کو امن و حفاظت عطا کی۔

جب گنگا کے دھارے راج محل کے پہاڑوں کے اردگرد پہنچتے ہیں تو وہ بنگال کے ڈیلٹا (یعنی دریا کے دہانے کی مثلث نما زمین) کے میدانوں میں داخل ہوتی ہے گنگا، برہم پتر اور میگھنا جو اس سرزمین میں آہستہ آہستہ بہتی ہیں اس میں کثرت سے ریگ اور کنکر، کوڑا کرکٹ بھرے ہوتے ہیں۔ جن کو وہ اپنے ساتھ گھسیٹتی لیے چلے جاتی ہیں یہ سب ساحل کی کثیر مقدار مٹی میں جاکر جمع ہو جاتے ہیں۔ اور دریا پنکھے کی شکل پھیل جاتی ہے اس کی شاخیں اس کی پسلیاں بن جاتی ہیں۔ بنگال دریاؤں والا ایک ایسا میدان ہے گرم اور مرطوب جہاں کثرت سے بارش ہوتی ہے اور جہاں بے شمار ندیاں چشمے اور پانی کے ذخیرے ہیں۔ زمین میں قوت نُمو بہ افراط اور زندگی بآسان ہے "سونار بنگال" کو قدرت کی فیاضیاں ہندوستان کے بیشتر حصوں سے زیادہ عطا ہوئی ہیں۔

گنگا کے آبریز کے دکھنی کونے سے زمین اونچی ہونی شروع ہوتی ہے حتیٰ کہ یہ کمایوں اور وندھیاچل پہاڑوں کے ڈھال تک پہنچ جاتی ہے یہ اونچا خطہ وسط ایشیا کا بلند حصہ ہے اور اس میں پچھم سے پورب تک مالوہ، بندیلکھنڈ اور بگھیل کھنڈ کے علاقے ہیں پورب میں کیمور اور میکال کی پہاڑیوں کا سلسلہ اس علاقہ کو چھوٹا ناگپور اور اڑیسہ سے الگ کرتا ہے اور پچھم میں چنبل دریا اور اراولی کی پہاڑیاں اسے راجپوتانہ اور گجرات سے علاحدہ کرتی ہیں۔

وندھیا جو دریائے گنگا کے میدانوں سے بہت آہستہ ڈھال کے ساتھ بہتی ہوئی اپنے دہانے کی طرف جاتی ہے دکھن کے سامنے تیزی کے ساتھ سر کے بل گرتی ہے۔ سیدھی ڈھلان سے ملی ہوئی دریائے نربدا کی تنگ رتہ ہے۔ اس دریا کا پیٹ امرکرنانگ کے معاون چشمے بھرتے ہیں۔ یہ امرکرنانگ کے سنگ مرمر پہاڑوں کے فصیل کے پچھلے دروازے سے تیزی سے رواں ہوتی ہے۔ پھر جنگلوں اور پہاڑوں سے آہستہ خرام کرتی سمندر تک چلی جاتی ہے دریائے نربدا کی گذرگاہ اب نہایت دلکش مناظر کے لیے ممتاز ہے۔ اور اس کے کناروں پر زمانہ قدیم میں بہت سے مٹھ، مندر اور روحنے تھے۔ وہ مسافر جو پچھم کے سمندری ساحل کی بندرگاہوں کو

جانا چاہتے تھے وہ پاٹلی پتر سے بھر دچ تک چترکوٹ، بلسا اور اُجین سے گذرتے ہوئے وندھیا سے گذرتے رہتے ہیں وہ لوگ جو دکن جانا چاہتے ہیں ان کو درّوں سے گذر کر دریا کو عبور کرنا ہوتا ہے۔ نربدا کی فیاضیوں نے اس کو تقدس کا ایک ایسا جامہ پہنا دیا ہے جو تقریباً اتنا ہی عظیم الشان ہے جیسے کہ مقدس گنگا کا۔

نربدا دکن کے میدانی حصہ کی آخری حد ہے جو گاؤدُم مثلث کی شکل میں بہت دور دکن تک پھیلی ہوئی ہے اس کے پورب اور پچھم گھاٹ پھیلے ہوئے ہیں۔ پوربی گھاٹ میں نیچی اور پھیلی ہوئی متعدد پہاڑیاں ہیں جن میں ایک دوسرے کے اندر کافی خلا ہے۔ وہ چوڑا میدان جو اُن گھاٹوں اور خلیج بنگال کے درمیان ہے وہ اڑیسہ آندھرا اور تامل ناڈ کے سمندر کے سامنے کا حصہ ہے ساحل آدم کش دلدلوں اور بالو کے انبار سے بھرا ہوا ہے ان کے بیچ ڈیلٹا (وہ مثلث زمین جو دریا کے دہانے پر بن جاتی ہے) بکھرے ہوئے ہیں جو ان دریاؤں کے بہتے ہوئے پانی نے بنائے ہیں جو ریگ اور کوڑا کرکٹ لادے ان گھاٹوں کے درمیان اپنا راستہ بناتے رہے ہیں ان میں اہم مہاندی، گوداوری، کرشنا اور کاویری کے ڈیلٹا ہیں ان ڈیلٹاؤں میں کہیں کہیں معاون دریاؤں نے کاٹ کر تنگ گھاٹیاں بنا دی ہیں ورنہ ساحل مانسوں اور طوفانی ہوا (سائیکلون) کے تھپیڑوں کے لیے کھلا ہوا ہے۔ چونکہ سمندر کا کنارا چھچھلا ہے اس لیے سمندر پر چلنے والے بڑے جہازوں کے لنگر انداز ہونے اور ان کی حفاظت کرنے کا انتظام معقول نہیں ہے۔ لیکن ساحل کے میدان زرخیز ہیں۔ اور بارش اور دریا دونوں سے اتنا پانی بالخصوص اُتر اڑیسہ اور آندھرا کے شمالی اضلاع میں فراہم ہو جاتا ہے کہ یہ دھان کی زرخیز پیداوار کا علاقہ بن جاتا ہے

دکن کی جانب مانسون دیر میں پہنچتا ہے۔ اور اس کی مقدار کم ہوتی جاتی ہے تالاب نالے اور چشمے آبپاشی کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ریتیلی زمین اور نمکین سمندر کی ہوا میں بنکھیا کھجور اور کھجوا اور کیز درینا Casuarinas خوب نشو و نما پاتے ہیں۔

جب کہ اڑیسہ صدیوں تک ہندوستان کے ماضی کے دھارے سے الگ تھلگ رہا ہے آندھرا اور تاملناڈ ملک کی تاریخ کی بیدار کن تحریکوں اور ملک کے ہنگاموں میں شریک رہے ہیں یہ علاقے ستواہن، چالکیہ، ککینا والوں کی جیانگر شہنشاہیت اور برہمنی حکومت کے عمل دخل کے مقامات رہے ہیں۔ ساحل کے دکھنی حصہ نے تجارتی منڈی مہیا کر کے مابین مشرق

وسغرب عالمی تجارت کا موقع دیا۔ جہاں رومن، عرب، ایرانی اور ملایا اور چین کے تجار ایک سمت سے دوسری سمت سفر کرکے آتے اور ایک دوسرے سے ملتے تھے۔

مغربی (ساحلی خطہ) بہت تنگ ہے پہاڑوں کا سلسلہ جو اس کی ریڑھ کی ہڈی کی صفت رکھتا ہے تقریباً تسلسل کے ساتھ سہیدری، نیلگری اور اس کے آگے تک پھیلا ہوا ہے اس کی چوٹیاں پانچ ہزار فیٹ تک اونچی ہیں اور نیلگری پہاڑ کی دودابیتا چوٹی تو 8700 فیٹ تک پہنچتی ہے مغربی ساحلی خطہ میں متعدد علاقے ہیں کچھ کاٹھیاواڑ، گجرات، کونکن، کنارا اور کرالا۔ کچھ تو دریا سے گھرا ہوا جزیرہ ہے اور کاٹھیاوار جزیرہ نما ہے جو اصل سرزمین سے ایک باریک سی بیچ میں گھسی ہوئی اراضی سے جڑا ہوا ہے۔ کونکن ساحل کا ایک نشیبی قطعہ اراضی ہے تیس میل سے پچاس میل تک چوڑا ہے اور خاندیش سے گوا تک چلا گیا ہے اس میں پہاڑیاں شگاف ڈالتی ہیں۔ اور ان میں کثرت سے مغربی گھاٹ کی ڈھلوان پہاڑیاں ہیں۔ گھاٹ چوڑے سرے والے پہاڑیوں کے ایک طرف نکلے ہوئے حصہ کا ایک بے ڈھنگا سلسلہ ہیں جن کے بیچ بیچ میں پہاڑی نالے مداخلت کرتے ہیں۔ یہ پہاڑیوں کے سلسلے کے ایک طرف نکلے ہوئے حصے قدرتی قلعے ہیں اور مرہٹوں نے مغلوں کے خلاف آویزش میں ان کو اس کام کے لیے استعمال کیا تھا۔

کونکن اور کرالا کے بیچ میں کا حصہ کنارا کا ایک چھوٹا پتلا سا ساحلی علاقہ ہے یہ تیز بہنے والی ندیوں سے جو گھاٹ کے نیچے سے سمندر تک بہتی ہیں الگ تھلگ سا ہو گیا ہے ان کی وادیاں زراعت کے مواقع فراہم کرتی ہیں ورنہ ان کے جنگلات جو پہاڑوں کو ڈھانپے ہوئے ہیں وہاں تو کثرت سے بارش ہوتی ہے اور ان میں ملیریا کے جراثیم پھیلتے ہیں لیکن جنگلات ٹیک اور سال کی لکڑیوں کی کثرت کی وجہ سے بیش قیمت ہیں۔

کرالا مغربی ساحل کا سب سے جنوبی حصہ ہے۔ کوہ نیلگری شمال میں اور انبی مالا اور کارڈے نام پہاڑیاں جنوب میں اس کی ایسی حدبندی کرتی ہیں کہ بقیہ ہندوستان سے علاحدہ کر دیتی ہیں۔ ان میں شگاف پالگھاٹ سے پیدا ہوتا ہے جو نیلگری اور انبی مالا کے درمیان واقع ہے۔ پہاڑیوں سے ندیاں نکلی ہیں جو سمندر کو جاتے ہوئے چھوٹے چھوٹے ڈیلٹا دہانوں پر بنائی گئی ہیں جن کو سمندری سامان اتارنے کے لیے ساحل سے ذرا کنارے پر جہاز کو لنگر انداز کرنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے ورنہ کنارے کے پانی کا وہ قطعہ جیسے ریت کا بچا کرارا

سمندر سے جدا کرتا ہے اور پانی کے نیچے کا بہاؤ چھوٹے چھوٹے ذروں سے ساحل کو بھر دیتا ہے اور جہازرانی صرف ذریعہ رسل و رسائل رہ جاتی ہے۔

مغربی ساحل بالخصوص گھاٹ آسام کے بعد سب سے زیادہ بارش کا مقام ہے اس کے اندر اس کی لمبائی میں بے شمار جہاز کے لنگر انداز ہونے کے مقامات اور بندرگاہیں ہیں اور مغرب کی طرف اس کا رُخ بحر فارس اور بحیرۂ احمر کے قدیمی تہذیبی مرکزوں کی طرف اور زیادہ قریبی زمانہ میں افریقہ کے دکھنی کونے کی جانب یورپ کی طرف ہے۔

مشرقی اور مغربی گھاٹوں کے درمیان اور ست پڑا میکال اور ہزاری باغ کی پہاڑیوں کے سلسلے کے دکھن جزیرہ نمائے ہند کا ارضیاتی حیثیت سے قدیم وہ وسیع رقبہ ہے جسے دکن کہتے ہیں۔ جزیرہ نما مثلث شکل کا ہے اس کی بنیاد وہ چوڑا شمالی میدان ہے جو ایک لمبی لکیر سے مغرب میں مرہٹی بولنے والے لوگوں کو وسط میں ہندی بولنے والے لوگوں سے اور پورب میں ٹیلگو بولنے والوں سے جدا کرتا ہے نیچے وسطی میدان ہے اس میں کناری تامل ٹیلگو بولنے والے بستے ہیں۔ جنوبی حصہ کے بھی دو حصے ہیں پچھم والوں کی زبان ملیالم ہے اور پورب والوں کی زبان تامل ہے۔

مرہٹوں کا ملک دکھن کے بلند سطح زمین مغربی گھاٹوں اور کون کان کے سمندری ساحل پر مشتمل ہے ان میں ہر ایک کی زمین کی مٹی ہر ایک کی آب و ہوا اور ہر ایک کی پیداوار ایک خصوصیت رکھتی ہے سطح بلند کی زمین غیر سیلابی ہے مانسون کے بادل زیادہ تر گھاٹوں پر برس برس کر اپنے کو خالی کر دیتے ہیں اور صرف بیس یا تیس انچ سالانہ اوسط سے دکن کے حصہ میں آتا ہے پیداوار صرف باجرہ اور کودوں وغیرہ ہے کفایت شعار اور محنت کش مرہٹہ کسانوں کی اصل غذا زیادہ تر جوار اور باجرہ ہے۔

اندھرا اور تلنگانہ کا میدان کا حصہ بالکل مختلف ہے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ پانی سے صاف کیا ہوا چوڑا چکلا میدان ہے جس میں کھلی ہوئی وادیاں پتھروں کے ڈھیر اور گھسے پسے چٹان ہیں یہ ایک کم پیداوار دینے والی بالو کی زمین ہے جہاں صرف معمولی بارش ہوتی ہے مرہٹہ واد کے برخلاف یہاں زمین کی مٹی میں قوت نمو بہت کم ہے درخت بس چند ہیں اور گھاس پتلی اور بھدی ہوتی ہے۔

اتر دکھن کا ہندی بولنے والا حصہ یعنی قدیم دکشن کوشل اور گونڈوانا پر مشتمل ہے یعنی

جنوں خیز پہاڑیاں اور جنگلات کا علاقہ جو اڑیسہ کی سرحد تک چلا گیا ہے۔

دکن کی سطح وسطی پیٹی میسور پلیٹو، جنوبی آندھرا اور شمالی تامل ناڈو پر مشتمل ہے میسور پلیٹو پندرہ سو سے چار ہزار فیٹ تک سطح سمندر سے اونچا ہے اور اس میں تنگ بھدرا اور کاویری دریاؤں اور ان کے بہت سے معاون ندیوں کے دہانے کا پانی بہتا ہے بارش معمولی ہوتی ہے سال میں صرف 25 سے 35 انچ تک اور زراعت کا انحصار تالابوں سے آبپاشی پر ہے

اس کے نیچے میسور جو اس مثلث جزیرہ نما کا آخری نوکیلا سرا ہے تیزی سے تنگ ہوتا جاتا ہے اس کے دو طرف کرالا اور تامل لینڈ کا سیلابی میدان ہے درمیان میں وہ اونچی سطح کی زمین ہے جو نیلگری اپنی مالی گاردم اور پلنی پہاڑیوں سے گھری ہوئی ہے۔ پہاڑیوں پر بارش بہت کثرت سے ہوتی ہے ان پہاڑیوں پر گرم ملکوں کے جنگلات قدرتی طور پر چھائے ہوئے ہیں اور خاص کر نیلے رنگ کے یوکلپٹس کے درخت بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے اس پہاڑی کا نام پڑا ہے۔

دکن کا مرتفع خطہ شمال کے زرخیز نشیبی زمین اور مشرقی و مغربی ساحلوں سے بہت مختلف ہے اس خطہ کا کوہستانی مزاج اس کی ناقص زمین بارش کا آخری حد تک ہی ہوتا ہے، کچھ حصوں میں جنگلات کی کثرت اور دوسرے حصوں کی مٹی میں قوتِ نمو کی کمی اس کے ناپسندیدہ خط و خال ہیں یہ وجوہات زندگی کو آسان اور خوش حال بنانے میں مانع ہیں اس لیے ہندوستان کی سنسکرتی (تہذیب) دکن کے اردگرد کے نشیبی علاقوں میں ہندوستان کے اندر گنگا کے میدانوں میں ان دریاؤں کے ڈیلٹاؤں میں جو خلیج بنگال اور خلیج کا بے میں گرتی ہیں اور مالابار اور ٹیڑھے میڑھے ساحلی علاقوں میں ہی سرسبز و شاداب ہوئی ہے۔ کلچر کے ان خانہ بائے زیتور سے لوگ دکن کے مرتفع خطے میں داخل ہوئے ہیں اور اس میں سے کچھ حصہ کو اپنے مخصوص کلچر کے دائرہ میں لے آئے ہیں انھوں نے یہاں کے اصلی باشندوں کو جنگلات کی زمینوں اور پہاڑوں کے اندر کی پناہ گاہوں میں بھگا دیا جہاں اب بھی وہ رہتے ہیں۔

ہندوستان کے جغرافیائی رنگ وروپ کی یہ مختلف شکل جاذب توجہ ہے ملک مختلف حلقوں میں بٹا ہوا ہے جن میں آب و ہوا زمین کی مٹی بارش کی مقدار درجۂ حرارت اور خشکی اور تری کی ہیئت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اس علاقہ کی زبردست وسعت، رسل و رسائل اور نقل و حمل کے غیر مہذب طریقے اور نسبتاً آبادی کی کمی یہ تھے اسباب جنہوں نے ماضی

میں اسے دوسرے علاقوں سے جدا رکھا۔ جب تک یہ حالات قائم تھے کسی سماجی یکسانیت کے احساس کا پیدا ہونا مشکل تھا۔

لیکن ان اختلافات کی جڑ میں یکرنگی ہے یکرنگی کی یہ شکلیں پہاڑوں اور سمندروں کی عطا کی ہوئی ہیں جو ملک کو گھیرے ہوئے ہیں ہمالیہ کا پہاڑ اس سلسلہ کی ایک ٹھوس حقیقت ہے کیوں کہ وہ تمام ہندوستان کو ایک نیم گرم منطقہ کی مانسونی آب وہوا اور موسموں کے مقررہ وقت کے تبادلے (سردی، گرمی، برسات جو بالکل اپنے وقت پر واقع ہوتے ہیں اور جن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے) عطا کرتا ہے۔ سمندر اور شمال میں پہاڑوں کے نیم دائرہ کی دیوار ایک ایسا چوکھٹا ہے جس میں زندگی بیرونی حملے کی کسی مداخلت کے اندیشے کے بغیر گذرتی ہے نتیجہ یہ تھا کہ اگرچہ نہ تو ریاست اور نہ سوسائٹی نے ایک جسم کی مانند وحدت حاصل کی لیکن کلچر میں مشترک طور طریقوں کا ارتقا ہوا اور مشترک خط وخال نشو ونما پائے۔

جغرافیائی حالات نے جو مشکلات پیدا کی تھیں ان کا حل فطرت کی سائنس پر فتح اور ایجادات سے نکل آیا ہے۔ انسان اب اس قابل ہے کہ طبعی رکاوٹوں کو جن میں ناقابل عبور خلا بھی شامل ہے دور کر سکے۔ فطرت کے علم کے حصول نے فطرت کی طاقتوں کو اپنے بس میں کر کے انسان کے مفاد کے استعمال میں لانے میں مدد کی ہے پہاڑ، دریا، جنگل اور آب وہوا جو رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں ان پر قابو پالیا گیا ہے اور جغرافیہ کے پیدا کیے ہوئے اختلافات نے وحدت کی شکل اختیار کرنے میں انسان کی مرضی کے سامنے سر جھکا دیا ہے۔

مگر یہ سب ترقیاں زمانہ حال کی ہیں ہندوستان ان سے صرف انیسویں صدی میں ہی فائدہ حاصل کر سکا اس سے قبل جغرافیائی تنوع باشندوں پر ایسے حالات عائد کرتا تھا جن میں اشتراک واجتماع مشکل تھا اور مرکز سے گریز کرنے والی طاقتیں بلا رکاوٹ اپنا اقتدار جمائے ہوئے تھیں۔

آج سائنس نے انسان کے ہاتھ میں عظیم طاقتیں دے دی ہیں لیکن اٹھارھویں صدی کے آخر تک جو طاقت حاصل تھی وہ صرف وہ تھی جو انسان اور حیوان خود اپنے اندر رکھتے تھے چنانچہ زراعت اور صنعت میں پیداوار انہی پر منحصر تھی مملکتوں کے منقسم علاقوں میں باہمی میل جول اور مراسلت اور مرکز کا ان پر انتظامی اقتدار محدود تھا اس لیے فرقہ بندی کے خیالات اور محدود مقامی اور جواری جذبات اجتماعیت اور قومیت پر غالب رہتے تھے اگرچہ فطرت نے

گھوڑے اور کبھی خطا نہ کرنے والی تیر اندازی اپنے سامنے سب کچھ بہالے گئی۔ انھوں نے کوہ کارپیتھین کو عبور کیا اور وسط جرمنی اور شمالی اٹلی کو روند ڈالا۔ آخر میں شمالی اور جنوبی ایک ایسا طبعی سانچہ عطا کیا تھا جس میں نہ صرف ایک مختص کلچر اور ایک متحدہ معاشرتی نظام ایک جسم بن کر سما سکتا تھا بلکہ وہ سانچہ اسی جانب رہنمائی بھی کرتا تھا لیکن منفرق کرنے والی جغرافیائی طاقتوں پر قابو پانے کے لیے تکنیکی علم کے فقدان نے سماجی و سیاسی وحدت کے ارتقا کو روکے رکھا۔ عظیم الشان قدرتی حد بندیاں جو ہندوستان کو اپنے ہمسایوں سے جدا کرتی ہیں ایسے طاقتور مظاہر تھے جنھوں نے ایک علاحدگی پسند انفرادیت کی نشوونما کی اور اس نے ہندوستان کے کلچر میں نمایاں فرق کر دیا۔ لیکن اسی کے ساتھ علاقائی اختلافات نے باہمی اشتراک کی کارروائیوں کو بھی روک دیا جو کل ہند کلچرل وحدت اور سماجی سالمیت کے لیے ضروری تھا۔

باشندے

ہر قوم کی تاریخ میں جغرافیائی حالات کے اثرات اہم ہیں لیکن انسانوں کے حالات اس سے بھی زیادہ اہم ہیں۔ ذہنی کیفیت خیالات جذبات کردار طور طریقے اداروں کا روپ تیار کرتے ہیں اور وقت کے ساتھ قوم کے آگے بڑھنے کے لیے راستہ بناتے رہتے ہیں ہندوستان کے لوگ جو زبانیں آج بولتے ہیں ان کے جو آج مذہبی عقائد ہیں اور ان کی عبادت کے جو طور طریقے ہیں ان کے جو جمالیاتی مظاہر ہیں ان سب پر ان کے روایات کی مہر لگی ہوئی ہے۔ مثلاً ساتویں صدی قبل مسیح میں اپنشد کی تلقینات سے شروع ہو کر بیسویں صدی کی گاندھی جی کی تعلیمات تک ذہنی کیفیت اور روحانی قوتِ عمل کا ایک غیر منقطع سلسلہ ہے لیکن اس وحدت اور یکسانیت کے اوپر تنوع کی بھی ایک تہہ جمی ہوئی ہے کیوں کہ ہندوستان میں زبانوں نسلوں مذہبوں اور رسم و رواج کی گوناگونی ہے کلچر کے بعض خصائص میں تنوع اسی طرح پیشنٹ اور جاذب توجہ ہے جس طرح یکسانیت۔ تنوع کے جو ماخذ ہیں ان میں سے ایک ہندوستان کی آبادی کا مخلوط ہونا ہے۔

ہندوستان کے بسنے والے مختلف نسلوں کا مرکب ہیں کچھ تو اتنے دنوں سے ہندوستان میں رہ رہے ہیں کہ ان کو یہاں کا اصلی باشندہ ہی تصور کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے مختلف تاریخی زمانوں میں اپنا وطن ترک کر کے آئے ہیں یہ مل جل گئے ہیں اور مختلف طرز کی متعدد نسلوں کو عالم وجود میں لائے ہیں۔ نسلوں کے ترک وطن کر کے ہندوستان آنے کے

واقعات اور تبدیلِ وطن کے واقعات میں سبق آموز اختلاف ہے یورپ میں اس ترکِ وطن کی تین لہریں آئیں پہلی لہر میں تارکین وطن نے بلقان، اٹلی، مغربی وسطی اور مشرقی علاقوں میں یا تو وہاں کے باشندوں کو اجاڑ کر یا اپنے میں ضم کرکے مستقل طور پر سکونت اختیار کرلی۔ پانچویں صدی میں تارکین وطن کی ایک دوسری لہر سلطنت روما کے حدود کے باہر سے اس پر دباؤ ڈالنے لگی۔ اور وسی گاتھ، ٹیوٹن، ونڈال، فرینک اور دوسرے جنگجو قبائل روما کی قلعہ بند سرحدوں سے ٹکرائے تا آنکہ ان کو پاش پاش کردیا اور وحشیوں کے سیلاب نے اس عظیم مملکت پر اپنا قبضہ جما لیا۔

یورپ کے مختلف علاقوں میں ان قبائل کے بس جانے سے نئی سماجی تنظیمات وجود میں آئیں جو ان حلقوں میں قائم ہوئیں جہاں پہلے آرین قبائل کا عمل دخل تھا۔ انھوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کیں جن پر وہ اپنے ہم نسل ساتھیوں کی مدد سے حکومت کرتے تھے جو ان کے ساتھ ذاتی طور پر وفاداری کے جذبات سے وابستہ تھے۔ جس نوعیت کا نظام انھوں نے بنایا تھا اس کا تقاضا ہی یہ تھا کہ اس کا میلان جنگ فتح اور توسیع مملکت کی جانب ہو۔

اس تحریک نے ہر علاقہ کو متاثر کیا۔ انگلستان، میں انگلس اور سیکسن فرانس میں فرینک اسپین میں وسی گاتھ، شمالی اٹلی میں لمبارڈ، نیدرلینڈ میں بنگلے اور علاقہ ہائے بلقان میں آسٹروگاتھ کے مستقل طور پر آباد ہو جانے سے ایک نیا یورپ عالم وجود میں آیا۔ یعنی ایک ایسا یورپ جس میں مملکۃ الکبریٰ روما کی مانع جنگ سلطنت کی جگہ مسلسل قبائلی جنگوں نے لے لی۔

لیکن چھٹی صدی سے امن کا رقبہ وسیع ہونا شروع ہوا۔ قبائل مستقل طور پر آباد ہو گئے اور اپنی قوت کو مضبوط کرنے پر جم گئے۔ عیسائی مذہب اور لاطینی کلچر پھیلا۔ آٹھویں صدی میں چارلس اعظم نے ایک عظیم سلطنت قائم کی جس سے سلطنت روما کی یادیں تازہ ہوگئیں اور مشرق میں قسطنطنیہ ایک دوسری سلطنت کا مرکز بن گیا جس کا اقتدار ایشیائے کوچک کے زیادہ تر رقبہ پر پھیلا ہوا تھا۔ پھر اس دوسرے یورپ کو ایک حادثہ نما انقلاب کا سامنا ہوا وحشی اور خوفناک منکر خدا نارتھ من ممالک اسکینڈی نیویا سے جنگجو گمیار خانہ بدوش مشرق سے اور مہذب مسلمان شمالی افریقہ سے اس کے منظر پر نمودار ہوئے

نارتھ من (یعنی ناروی جین۔ سویڈ اور ڈین) نے برطانیہ اور فرینک کی مملکت پر فاتحانہ حملے کیے وہ بڑے جیوٹ والے اور ماہر فن بحری سپاہی تھے۔ وہ بڑے دریاؤں کے دہانوں میں داخل ہوتے اور چشموں کی موجوں پر سواری کرتے مملکت کے قلب میں پہونچ گئے۔ گمیار کے تیز رفتار

سلاو بین بچر ٹھونک کر وہ ہنگری میں مستقلاً آباد ہو گئے۔

مسلمان جو شمالی افریقہ کا کل حصہ خلیفہ کی مملکت میں لے آئے تھے آٹھویں صدی کے اوائل میں اسپین میں گھس گئے اور تمام جزیرہ نما کو فتح کر کے جنوبی فرانس میں داخل ہوئے وہ بازنطینی مملکت کی سرزمین پر بھی دباؤ ڈالنے لگے۔ نویں اور دسویں صدی کے اچانک حملوں اور ترک وطن کے واقعات کا یورپ پر بہت گہرا اثر ہوا۔ حکومت کے ادھیڑپن سے (یعنی برطانیہ میں اینگلو سیکسن کی حکومت اور یورپ میں کرلاونجی حکومت کی اُلٹ پلٹ سے) جان و مال کی حفاظت کے مسائل میں اور دشواری پیدا ہو گئی ایک دُہری سوسائٹی حفاظت کرنے والوں اور حفاظت کیے جانے والوں کی تعدادوں اور ان زرعی غلاموں کی جن کو باہم ایک فوجی زراعتی نظام میں منسلک کیا گیا تھا اس دوسرے یورپ کی خاک سے اُبھری اور جاگیردارانہ اقرارنامے اور فرائض بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی کے طور پر عالم وجود میں آئے۔ گیارھویں صدی تک تیسرا یورپ عالم وجود میں آگیا اس میں بلا رکاوٹ مسلسل ارتقا ہوتا گیا تا آنکہ یہ سرسبز و شاداب ہو کر آج کے قومی حکومتوں کا یورپ بن گیا ہے۔

ہندوستان کی تاریخ اس سے مختلف ہے قبل اس کے آرین ہندوستان میں پہنچنے لگیں ملک کی آبادی بہت مختصر تھی شمالی میدانوں اور پلیٹو پر گھنے جنگل چھائے ہوئے تھے ان علاقوں میں بسنے والے مختلف زبانیں بولتے تھے اور ان کے جسمانی خط و خال بھی مختلف تھے ان کی زبانیں سنگول آسٹرالائڈ اور ڈریلوی ڈین خاندانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔

آریوں کا ترک وطن کرنا حضرت مسیح سے قبل کے دوسرے عہد ہزار سالہ میں شروع ہوا۔ یہ قطعی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ آرین ابتداً کہاں کے رہنے والے تھے ان کی بہت سی جماعتیں یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ دریائے ڈینوب کے نچلے حصہ اور دریائے آکسس کے مرتفع قطعات کے مابین ان کا اصلی وطن تھا۔ نہ یہی یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اپنی صحرا نوردی میں انھوں نے کون سا راستہ اختیار کیا۔

ہندوستان میں یہ لوگ ان دریاؤں کی وادیوں سے آئے جو پچھم سے بہہ کر دریائے سندھ میں گرتی ہیں ایک عرصہ تک وہ دریائے سرسوتی کے کنارے مقیم رہے جس کو ان کے مذہبی ادب میں خاص تقدس حاصل ہے جب وہ شمال مغرب اور مغربی علاقوں سے حرکت کر کے باہر نکلے تو ان کے قبائل اور فرقوں نے ہند گنگا میدانوں میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں

قائم کر دیں لیکن جب اپنے اصلی وطن سے وہ اور آگے بڑھے تو ان کی تعداد کم ہوتی گئی اور بجومی ترک وطن گھٹ کر فوجی مہموں کی شکل اختیار کر گیا اور ہر مہم کی سرداری ایک چھوٹی سی جماعت کرتی تھی آخر میں آرین کلچر کی عظمت تمام ہندوستان پر قائم ہو گئی۔

ہر حلقہ میں آرین اور دیسی کلچر کے ایک دوسرے سے میل جول سے ایک مخصوص طرز کا کلچر وجود میں آیا۔ ہند گنگا کے میدانوں میں پنجاب اور راجستھان ایسے لوگوں کے وطن بن گئے جو جسمانی خط و خال میں یکساں تھے اور جو پنجابی اور راجستھانی زبانیں بولتے تھے۔

وسطی حصہ اور بہار میں جو لوگ رہتے ہیں ان دونوں کی اونچی ذات والوں کی جسمانی ساخت یکساں ہے لیکن نیچی ذات والے مختلف ہیں زبانیں جو ان علاقوں میں بولی جاتی ہیں وہ ہندی زبان کی مختلف بولیاں ہیں۔

(مغربی اور مشرقی بنگال) بنگال میں عوام کی جسمانی ساخت منگولین نسل سے مخلوط ہے لیکن ان کی زبان۔ بنگالی۔ آرین خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

وسطی مرتفع حصہ۔ یعنی گجرات، مالوہ، بندیلکھنڈ اور بگھیل کھنڈ میں بسنے والوں کے سر اوسط درجہ کے اور جسم چھوٹا ہے۔ گجرات کی زبان راجستھان سے ملتی جلتی ہے لیکن وسطی حصے میں مالوی، بندیلی اور بگھیلی جو ہندی کی بولیاں ہیں بولی جاتی ہیں۔ چھوٹا ناگپور ایک غیر مسلسل پہاڑوں کا دیس ہے جس میں جابجا پہاڑی نالے بکھرے ہوئے ہیں اور جو جنگلات سے بھرا ہوا ہے یہاں کے بسنے والوں میں ایک کثیر تعداد غیر آرین لوگوں کی ہے جن کے اپنے خود قبائلی نظام اور قبائلی زبانیں ہیں ان میں سنتھالی، منڈرس، اوروں سے ممتاز ہیں کچھ زبانیں ڈریوڈین اور دوسری آسٹرالائڈ یا منڈا بول چال کی زبانیں ہیں۔ قبائلی لوگوں کے جسمانی خدوخال میں ایک اوسط درجہ کا سر اور ایک چوڑی ناک نمایاں ہے۔

دکن میں مشرقی حصہ تین طبقوں میں بٹا ہوا ہے یعنی اڑیسہ۔ آندھرا اور تامل ناڈ۔ اڑیسہ کے لوگوں کی زبان بنگالی سے ملتی جلتی ہے۔ آندھرا کے لوگ تیلگو بولتے ہیں جو ایک ڈریوڈین بول چال کی زبان ہے۔ تامل ناڈ والے جو جزیرہ نما کے دکھنی حصہ میں آباد ہیں دو واضح قسموں میں بٹے ہوئے ہیں اور شکل و شباہت، سر کی جسامت اور چہرے کے خط و خال میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن دونوں تامل زبان بولتے ہیں۔

دکن کا مغربی حصہ مہاراشٹر، کرناٹک (یعنی کرگ میسور اور کنارا) اور مالا بار ساحل پر

مشتمل ہے۔ مہاراشٹر والوں کی زبان آرین ہے لیکن اپنی جسمانی شکل وصورت میں وہ پنجاب اور راجستھان کے باشندوں سے مختلف ہیں۔

کناڈا بولنے والے لوگ مہاراشٹر والوں سے مشابہت رکھتے ہیں البتہ ان میں اونچی ذات اور نیچی ذات والوں میں فرق ہے کناڈا زبان ڈریوڈین زبان ہے لیکن اس میں کثرت سے آرین الفاظ شامل ہو گئے ہیں۔

مالابار کے بسنے والوں کے سر لمبے ہوتے ہیں جسمانی خصوصیات میں تامل ناڈ کے باشندوں کے مثل ہیں اونچی ذات والے یعنی نمبودری برہمن اور نائر نیچی ذات والوں اور قبائیلیوں سے زیادہ لمبے اور زیادہ صاف رنگ چہرے والے ہوتے ہیں۔ تیلگو، تامل، کناڈا اور ملیالم زبانیں ڈریوڈین زبان کے خاندان کی شاخیں ہیں۔ ان کے بولنے والوں کی تعداد آرین زبان بولنے والوں کے بعد کثرت تعداد کے لحاظ سے دویم درجہ پر ہے۔

ہندوستان میں آبادی کی تقسیم دو باتیں ظاہر کرتی ہے۔ اول تو یہ کہ جغرافیائی وجوہ سے منقسم حصے نسلی نمونوں سے مطابقت رکھتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم باشندوں اور نئے بسنے والوں کے امتزاج نے اس وقت کی کم وبیش علاحدگی پسندی کے حالات میں ایسے مخصوص اصناف پیدا کیے جس میں ہر صنف نے اپنی ایک خاص زبان کو نشوونما دی مدت مدید سے ہر خطے نے اپنی مخصوص زبان کے ساتھ اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے۔

بہت پہلے، تیرھویں صدی میں، امیر خسرو ان زبانوں کے الگ الگ خطوں کی زبانوں کی جانکاری کا اظہار کرتا ہے۔ وہ گیارہ زبانوں کا ذکر کرتا ہے ان میں سے تین ڈریوڈین یعنی دُھر، سمودری (کناری) تلنگی (تیلگو) اور مہاری (تامل) اور سات شمال کی آرین یعنی سندھی کشمیری، گجراتی، گوری (مغربی بنگال)، بنگلہ (مشرقی بنگال)، اودھی (مشرقی ہندی) دہلوی (مغربی ہندی) اور کوبیری (لامعلوم) ہیں۔

ابوالفضل نے دس ہندوستانی زبانوں کا ذکر کیا ہے یعنی کشمیری، سندھی، ملتانی (مغربی پنجابی) دہلوی (ہندی) بنگالی، مارواڑی (راجستھانی) گجراتی، مرہٹی، تیلگو اور کناڈا۔

سولھویں صدی میں اکبر نے اپنی سلطنت کے صوبوں کو نئے طرز پر منظم کیا جس کی بنیاد ان کے نزدیک غالباً قدرتی حدود رہے ہوں گے۔ سندھ کا میدان ملتان اور ٹھاٹا میں تقسیم کیا گیا لاہور کو دارالسلطنت قرار دے کر پنجاب ایک صوبہ بنایا گیا۔ راجستھان کے لیے اجمیر صوبہ قرار

پایا۔ اور وسطی حصّہ دلّی، آگرہ، اودھ اور الٰہ آباد صوبوں پر مشتمل تھا۔ مشرقی کونے کے میدان کو بنگال کا صوبہ قرار دیا گیا جس میں بہار بھی شامل تھا۔ وسطی علاقہ کے بلند خطہ کا جو حصّہ سلطنت میں شامل کیا گیا وہ صرف مالوہ تھا کیوں کہ بندیلکھنڈ اور بگھیل کھنڈ آزاد باقی رہے تھے دکن کا مغربی بلند ہموار میدان اور اس کی ساحلی زمینیں احمد آباد (گجرات) اور خاندیش اور برار کے صوبوں میں تقسیم کردی گئیں۔

اورنگ زیب نے صوبوں کی از سر نو تشکیل کی اور پوری سلطنت کو 21 انتظامی حلقوں میں بانٹ دیا۔ وہ ہندوستان کے قدرتی اور لسانی تقسیموں سے قریبی مطابقت رکھتے تھے ملتان اور لاہور کے صوبے جو پنجابی کی دو قسم کی بولیاں بولنے والے تھے پنجاب کے دو حصّے قرار دیئے گئے۔ دوسرے لسانی صوبے یہ تھے۔ ٹھٹ، سندھی بولنے والا اجمیر، راجستھانی بولنے والا آگرہ الٰہ آباد اور اودھ ہندی بولنے والے۔ بہار، بنگال اور اُڑیسہ۔ بہاری، بنگالی اور اُڑیہ بولنے والے مالوہ اور وسطی ارض مرتفع مالوی بولنے والے، گجرات، گجراتی بولنے والے اور خاندیش، برار، بیدر اور بیجاپور مرہٹی بولنے والے۔

اس طرح تاریخ کے ہر دور میں ہر علاقہ کے بسنے والوں کی امتیازی خصوصیات اور ان کی زبانوں کو برابر تسلیم کیا جاتا رہا۔

لیکن بہر حال ان تمام تقسیموں کے پس پردہ وحدت کا ایک غیر محسوس ادراک واقرار بھی تھا یہ صحیح ہے کہ مختلف خطّوں کے بسنے والے بہت سے عناصر سے مرکب تھے لیکن ایک عنصر تقریباً سب میں مشترک تھا اور وہ یہ تھا کہ آرین تھے آریائی خاندان قبیلے اور فرقے مختلف تعدادوں میں ملک کے مختلف حصوں میں آباد ہوگئے تھے اور انھوں نے وہاں کے اصلی باشندوں پر اپنی امتیازی خصوصیات کی مہر ثبت کردی تھی۔

آریوں کی زبان تمام دیگر زبانوں کی بنیاد تھی۔ سوائے ڈراویڈین اور چھوٹی بولیوں مثل منڈا کے۔ لیکن غیر آرین زبانیں بھی آریائی ادب کے ابتدائی اصولوں سے لبریز تھیں اس سے بھی زیادہ یہ کہ تمام بہت سی زبانوں کے ادب کا مواد بڑی حد تک یکساں تھا کیوں کہ وہ سب سنسکرت کے ادب سے فیضان حاصل کرتے تھے۔ اور مذہبی معتقدات مذہبی طریقہ عمل اور سماجی نظام پر کل علاقوں میں آرین اثرات کے ناقابل تردید اثرات نمایاں تھے۔

ایک مرتبہ جب "ہند آرین" ہندوستان میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہوگئے اور اپنی

زبان اپنے مذہب اور اپنے سماجی طور و طرز کو ملک میں پھیلا دیا تو ملک کے ہر حصہ میں وہاں کی مشترک آبادی کے اپنے مخصوص امتیازی طریقہ کے زیر اثر مختلف قسم کے کلچر ابھر آئے۔ ایک دوسرے سے اختلافات کے باوجود ان مختلف اقسام میں بہت سے خصائص مشترک بھی تھے۔

یورپ کے برعکس یہاں بعدۂ قبائیلیوں کی کسی بڑے پیمانہ کی نقل و حرکت نے ان لوگوں کے قیام کو جو کسی حصہ میں آباد ہو گئے تھے یا ان کے کردار کو یا ان کے کلچر کو مداخلت بیجا سے اتھل پتھل نہیں کیا۔ یہ نہیں کہ بعد کے زمانوں میں باہر کے رہنے والے یہاں بسنے کے لیے آئے ہی نہ ہوں مگر یہ بعد کے آنے والے اتنی کثیر تعداد میں نہیں تھے کہ وہ علاقائی آبادی کی بناوٹ پر کوئی بنیادی اثر ڈال سکیں۔

آریوں کے داخل ہونے کے بعد شاکاس (اس کے تھین) یوچس اور ہُن ہندوستان میں آئے۔ کچھ مورخین یہ یقین کرتے ہیں کہ جاٹ اور گوجر جو ہند گنگا میدانوں کے جنوبی مغربی علاقوں میں کثرت سے بکھرے ہوئے ہیں انہی کی اولاد ہیں کچھ مصنفین کی یہ بھی رائے ہے کہ راجپوت کا سلسلہ نسب بھی اصلاً انہی قبائل سے ملتا ہے۔ چھٹی صدی سے قبل یعنی ہن سلطنت کے ہندوستان میں قیام سے پہلے تاریخ کو ان قبائل کا نام معلوم نہیں تھا اور اچانک چھٹی صدی میں ان کا امتیاز ترقی اس کی موافقت میں قیاس غالب پیدا کرتا ہے۔

بہرحال ان قبائل کے بیرونی نژاد ہونے کے بارے میں جو اصول مرتب ہوئے ہیں وہ صحیح ہوں یا نہ ہوں یہ امر ناقابل انکار ہے کہ ان کی تعداد اتنی زیادہ نہ تھی کہ وہ مقامی باشندوں کو کسی بڑے پیمانہ پر اکھاڑ پھینکتے یا کسی علاقہ میں وہاں کے کلچرل نظام یا معاشرتی اقتصادی تعمیر میں کوئی بڑی تبدیلی لے آتے۔

انیسویں صدی کے آخر میں جو مردم شماری ہوئی (ملاحظہ ہو سنس آف انڈیا رپورٹ 1901ء) وہ ہمارے لیے ان کی تعداد کے بارے میں کچھ نشانات فراہم کرتی ہے راجپوتانہ میں راجپوت کل آبادی کے 6.4 فی صدی جاٹ 8.7 فی صدی اور گوجر 4.8 فی صدی تھے پنجاب میں راجپوت 7.4 فی صدی جاٹ 19.4 فی صدی (اس تعداد میں ہندو مسلم اور سکھ جاٹ سب شامل ہیں) اور گوجر 1.5 فی صدی تھے۔ اُترپردیش میں جو ان قبائل کا ایک اور اہم مرکز ہے آبادی کی تقسیم اس طرح تھی کہ راجپوت 8.3 فی صدی جاٹ 1.9 فی صدی اور گوجر 69. فی صد۔

اسی رپورٹ کے مطابق ان صوبوں میں راجپوت، جاٹ اور گوجروں کی کل صحیح تعداد حسب ذیل ہے۔

منجملہ کل آبادی کے	راجپوت	جاٹ	گوجر
راجپوتانہ۔ میں 9.7 ملین تھی	62 ملین	8.5 ملین	4.6 ملین
پنجاب۔ میں 24.8 ملین تھی	1.9 ملین	5 ملین	7.4 ملین
اتر پردیش۔ میں 46.67 ملین تھی	3.4 ملین		7 8 ملین

ان تینوں گروہوں کی نسلی حالت کے متعلق ماہرین کا اتفاق ہے کہ یہ سب اصلاً و نسلاً اسی آرین گروہ سے ہیں گوجروں نے گو پنجاب اتر پردیش اور مغربی ہندوستان کے متعدد مقامات میں اپنا نام روشن کیا لیکن ان کی پہلی سلطنت جودھ پور ریاست میں قائم ہوئی یہاں سے وہ اتر پردیش تک پھیل گئے اور انھوں نے Gujara Pratihara شہنشاہیت قائم کی لفظوں کا یہ اشتراک کہ گوجرا اور پری تیہارا راجپوت کی یکسانیت کو ظاہر کرتا ہے۔ گوجروں کے بعض قبیلوں کے وہی نام ہیں جو راجپوتوں کے ہیں اور ان کے جسمانی خدوخال بھی وہی ہیں

جہاں تک جاٹوں کا سوال ہے وہ راجپوتوں کے زمانہ قدیم کے 36 قبیلوں میں شامل کیے گئے ہیں جاٹ خود دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ یادوس کی اولاد ہیں جو ایک راجپوت تھا۔ ابیسٹن کہتا ہے کہ "ان دونوں کے جسم کی ظاہری ساخت اور چہرے کے طرز کی یکسانیت اور ان دونوں میں جو قریبی تعلقات ہمیشہ رہے ہیں ان دونوں باتوں سے کم از کم یہ حد سے زیادہ اغلب معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی نسل سے ہیں۔[1]

یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ یہ تینوں گروہ ابتدا میں ایک ہی نسل کے تھے جیسا کہ تحریرات سے پتہ چلتا ہے راجپوتوں کا نیچے گر کر جاٹوں کے نچلے طبقے میں آجانا اور جاٹوں کا اوپر اٹھ کر راجپوت بن جانا ان دونوں کا خونی تعلق ظاہر کرتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ ذات کا نظام پہلے اتنا جامد نہیں تھا جتنا کہ آج کل ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان تینوں گروہوں کی تعداد دوسرے گروہوں کے ان میں ضم ہوجانے سے بہت بڑھ گئی ہو۔

لہٰذا یہ ظاہر ہوتا ہے کہ راجپوت گوجر اور جاٹ نسلاً ایک ہیں اور ان کے اندر جو افتراق

---

(1) ایبٹسن ڈی پنجاب کاسٹس لاہور 1916ء (پارٹ 3 دی جاٹ راجپوت اینڈ الائیڈ کاسٹس صفحہ 100۔

پایا جاتا ہے وہ نسلی سے زیادہ سماجی ہے ان کی تعداد اور کل آبادی میں فی صد نسبت اس قیاس کی جانب رہنمائی کرتی ہے کہ وہ ہندوستان کے اندر چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں داخل ہوئے اور اس لیے وہ اپنی اولاد کو اپنی مخصوص جسمانی شکل و صورت وراثت میں نہ دے سکے۔

لیکن بہر حال اس نظریہ کے خلاف قوی دلائل موجود ہیں کہ وہ ان باہر سے آنے والوں کی نسل سے ہیں جو سیتھین (یعنی کشن جنھوں نے پہلی اور دوسری صدی بعد مسیح میں اپنے لیے ایک سلطنت تعمیر کی) ہیچل کے زمانہ میں ہندوستان میں داخل ہوئے یا ہن کی اولاد ہیں جنہوں نے پانچویں صدی میں ہندوستان پر حملہ کیا۔

جہاں تک "کشن" کا تعلق ہے ان کا وطن دریائے سندھ کے اس پار اس علاقہ میں تھا جو دریائے کابل کی وادی سے دریائے آکسس تک ہے ان کے بادشاہوں نے اپنی حکومت کشمیر اور شمالی مغربی ہندوستان پر قائم کی لیکن ان کی کثیر تعداد کا ملک کے حصہ میں مستقل آباد ہو جانے کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا ہے درحقیقت "سیتھین" کا اصلی گروہ اپنی جگہ چھوڑ کر پچھم کی طرف چلا گیا یعنی ایران اور اس کے آگے تک اور صرف ایک گروہ (کشن) افغانستان میں رہ گیا جہاں کے سردار اس وقت بھی حکومت کرتے رہے جب کہ انھیں گپت لوگوں نے ہندوستان سے مار بھگایا تھا۔

ہن یا سفید ہیتھالیٹز EPthalites کی ہندوستان میں صرف چند روزہ حکومت تھی ان کے دو بادشاہ "تورامان" اور "مہرا گول" نے ہندوستان پر حملے کیے لیکن آخر کار یشودہرمان، شاہ مالوہ اور گپت خاندان کے شاہ "بالادیتا" نے انھیں مار بھگایا اور ان کی طاقت اس وقت یکسر مسمار ہو گئی جب ایرانیوں اور ترکوں نے دریائے Oxus پر ان کو تہس نہس کر دینے والی شکست دی۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ کیا ان کی طاقت اس تیزی سے غائب ہو جاتی اگر ان کے خاندان کا ایک بڑا قافلہ پنجاب یا راجستھان کے علاقوں پر قبضہ جمائے ہوتا۔

پنجاب اور راجستھان کے علاقوں میں بسنے والوں کی جسمانی بناوٹ اس نظریہ کی تائید نہیں کرتی کہ کسی بیرونی نسل کا قبیلہ یہاں آکر آباد ہو گیا تھا۔ پنجاب راجستھان اور مغربی یو۔پی کی اونچی ذات کے لوگوں کی جسمانی ساخت باہم اس درجہ یکساں ہے کہ یہاں کسی بڑے پیمانہ پر نسل کے مخلوط ہونے کے سوال کو خارج از امکان قرار دیتا ہے "گھورے" بیان کرتا ہے

کہ یہ مفروضہ کہ راجپوت سفید ہن کے ہم رشتہ ہیں مانا نہیں جا سکتا کیوں کہ راجپوت ملبوتری یا بیضوی کھوپڑی رکھنے والی نسل کے تھے جبکہ ہن چھوٹے سر والے تھے (۱)

ہن کے اخراج کے بعد کے چھ سو سال کی مدت میں کوئی اہم بیرونی حملہ نہیں ہوا اس کے بعد گیارھویں صدی میں افغان اور ترک محمود غزنوی کی قیادت میں زبردستی ہندوستان کا دروازہ توڑ کر گھس آئے اس فوجی نقل و حرکت کا آخری نتیجہ ہندوستان پر مسلم راج کا قیام ہوا بارھویں صدی کے آخر سے اٹھارھویں صدی کے آخر تک مسلمان بادشاہوں نے ہندوستان کے زیادہ سے زیادہ رقبہ پر حکومت کی۔

اسلام کے اثرات نے ہندوستان کی کلچرل زندگی میں تبدیلیاں پیدا کیں اس نے مذہب خیالات، زبان، ادب اور فنون لطیفہ، فن تعمیر مصوری اور موسیقی سب کو متاثر کیا بھارتی سنسکرتی (ہندوستانی کلچر) پر اس کا اثر گہرا اور دور رس تھا لیکن جہاں تک سماجی، اقتصادی عمارت کا سوال ہے اس میں کوئی ترمیم نہیں ہوئی۔ ہندوؤں میں قبیلوں اور ذاتوں کا جو نظام قائم تھا اور خاندان اور ذاتوں کے بنیادی تعلقات کے بارے میں جو ہندو لا رائج تھا۔ ان سب میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی بلکہ اس کے برعکس مسلمان خود ہندو مذہب میں جذب ہو گئے۔ ذاتوں کی تقسیم شادی کے رسم و رواج اور وراثت کے قوانین جو ہندوؤں میں رائج تھے وہی ان کے اندران کے اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی رائج رہے۔

ان چھ صدیوں میں جتنے مسلمان ہندوستان کے اندر داخل ہوئے ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے فاتحین کی فوج اور ان کے کرایے کے سپاہیوں کے علاوہ علما، شعرا، تجار، مہم باز اور ستائے ہوئے افسران اور امرا ہلکے دھارے میں بہتے ہوئے لوند بوند کر کے یہاں پہونچے۔ وسطی اور مغربی ایشیا کے مسلمان ہندوستان کے شمال و مغرب کے باشندوں سے نسلاً شکل سے مختلف تھے وہ اتنے کثیر تعداد میں بھی نہ تھے کہ وہ ملک کی نسلی اقتصادی یا سماجی زندگی میں

I گھورے جی ایس کاسٹ اینڈ کلاس ان انڈیا (نیو ایڈیشن 1957) صفحہ 129-128

(۲) چینیوں کے قول کے مطابق کشن ان پانچ سلطنتوں میں سے ایک تھی جن کو "یوچس" اپنے قبضہ و اقتدار میں لایا تھا۔ بعد کے مورخین نے ان پانچوں کو یوچس نے کے صوبے قرار دیتے ہیں۔ کشن غالبا ساکا زبان بولتے ساکا لباس پہنے اور ساکا رسم و رواج کے پابند تھے لیکن مورخین اس پر متفق نہیں ہیں کہ ان کو یوچس کہا جائے یا ساکا اس Scythians ثبوت کا پلڑا اس طرف بھاری معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ (شاکیہ) Scythian قبیلے کا ایک جزو تھے یہ بھی ممکن ہے کہ یوچس اور سیتھین دونوں ایک ہی نسل کے ہوں،

کوئی بڑی تبدیلی لا سکتے۔ اس طرح جب سے آریوں نے ترک وطن کرکے یہاں اقامت اختیار کی جو دوسرے دس ہزار سالہ عہد قبل مسیح کا واقعہ ہے سماج کا تحتی نسلی ڈھانچہ کسی شدید یا انتہا پسندانہ تغیر یا ترمیم سے دوچار نہیں ہوا ثقافتی روایات کے دریا کو باہر سے بہت سے معاون دریا ملے لیکن دریا بلا اپنی بنیادی انفرادیت کو زائل کیے اسی طرح بہتا رہا۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ وقت رک گیا تھا تبدیلی تو ناگزیر تھی لیکن ہندوستان میں تبدیلی آہستہ آہستہ اور محدود پیمانے پر آئی اس نے مشکل سے پانی کی گہرائی میں کوئی حرکت پیدا کی اور تاریخ کے نشیب و فراز کے کل زمانوں میں اٹھارہویں صدی کے آخر تک زندگی کی سماجی اقتصادی بنیادیں مضبوطی سے قائم رہیں۔

ہندوستان کے کلچر کی مسلسل یکسانیت کا ثبوت انتہائی قوی ہے وسطی زمانہ میں زندگی کا ایک "ہندوستانی طریقہ" تمام ہندوستان میں رائج تھا جس کی بابر نے تصدیق کی ہے جغرافیائی خطوں میں اس ہندوستانی طریقے کے تحتی نمونے نشوونما پا رہے تھے لیکن یہ سب اصل کلچر کی بنیادی خصوصیات کی مختلف قسمیں اور ہندوستانی طریقہ کی شاخیں تھیں۔

لیکن بہر حال ہندوستان میں جس چیز کی کمی تھی وہ ایک ہونے کا احساس تھا یعنی سماجی اور سیاسی وحدت۔ حتیٰ کہ اس زمانہ میں بھی جب ایک سیاسی نظام کا اقتدار پورے ملک پر پھیلا ہوا تھا ایک سماجی جماعت میں بھائی چارہ کا تصور یا ایک سیاسی اقتدار اعلیٰ کی رضامندانہ اطاعت کا فقدان تھا نہ تو ثقافتی یک رنگی اور نہ سیاسی غلبہ ان رکاوٹوں کو توڑ سکا جو گروہوں سوسائٹیوں اور باشندگان ہند کو ایک دوسرے سے جدا کیے ہوئے تھا برابر متحد ہونے کے راستہ کی ناقابل تسخیر رکاوٹ جو امور بنے رہے وہ تھے ذات اور گاؤں۔

ذات

سماجی بے حرکتی، تقسیم ورزی اور خود کفالتی ذات اور گاؤں کی اصل خصوصیات ہیں انہی کے ذریعہ فرقہ بندی اس مضبوطی سے خندقیں کھود کر محصور ہو گئی کہ سیاسی اتھل پتھل خاندانوں کی تبدیلیوں، فاتح فوجوں کی نقل و حرکت حتیٰ کہ قدرتی آفات بھی اس نظام پر کسی قسم کا کوئی اثر نہ ڈال سکے۔

ذات سماج کی ایک انتہائی پیچیدہ اور نت نئی صورت بدلنے والی انوکھی چیز ہے اگرچہ

اس پر کثرت سے لکھا گیا ہے پھر بھی اس کے بہت سے پہلو ابھی تک تاریکی میں ہیں اس کی متعین توضیح کرنا مشکل ہے جو کچھ بھی اس کے بارے میں کہا جائے گا اُسے چیلنج کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ مکروہ تضاد کے تیروں سے چھلنی ہے لیکن یہ عجیب وغریب چیز جس کی تہذیب کی تاریخ میں کوئی اور نظیر نہیں موجود ہے، اور بغیر اس بات کا اندازہ کیے کہ اس نے واقعات پر کتنا عظیم اثر ڈالا ہے اور بغیر اس کی مخصوص نوعیت اور اس کے بدحواس کر دینے والے شاخ در شاخ سلسلے کے علم کے ہندوستان کے ماضی کو سمجھنا یا اس کے مستقبل کے بارے میں قیاس آرائی کرنا ممکن نہیں ہے۔

ذات کے بارے میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس کی دُہری حیثیت ہے ایک طرف تو اس کا ایک اصولی یا نظریاتی نظام ہے جس کی تعلیم ہندو مذہب کے مذہبی قانونی لٹریچر میں دی گئی ہے یعنی سمرتی اور دھرم شاستر اور ان کے حاشیوں اور شرحوں میں۔ دوسری طرف واقعی طور پر فرقوں اور ان کی شاخوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے جن کو مختلف ذرائع سے جو علم ادب سے بھی متعلق ہیں اور اس کے ماسوا بھی جمع کیا جا سکتا ہے لیکن کافی تعجب کی بات ہے کہ اس پیچیدہ اور الجھے ہوئے جھنڈ کا پتہ صرف اس وقت چلا جب انیسویں صدی سے مردم شماری کی کارروائیوں کا آغاز ہوا۔

ذات ایک قدیم ادارہ ہے کیوں کہ اس کے تمام عناصر ویدوں میں پائے جاتے ہیں نسل قبیلہ، فرقہ، پیشہ، مذہبی عقیدہ اور رسم ورواج۔ یہ ہیں وہ عناصر جن سے مل کر اس کی تعمیر ہوئی ہے جیسا کہ رگ وید میں اظہار کیا گیا ہے ان آریوں کا جن کی ناک ذرا اونچی اور چہرہ صاف ہوتا تھا اور غیر آریہ لوگوں کا جو دوسا یا دوسیا کہلاتے تھے اور جن کا چہرہ کالا اور ناک چپٹی تھی ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے میں آریائی سوسائٹی میں نسل کے احساس کا پتہ چلتا ہے ویدوں میں بہت سے ایسے آریہ اور چند غیر آریہ قبیلوں کا پتہ چلتا ہے۔ جو بعد کے زمانہ میں ذات کے اندر ضم ہو گئے فرائض منصبی کی تین حصوں میں تقسیم تسلیم کی گئی ہے یعنی برہمن دھرم کی سیوا کی۔ چھتری۔ فوجی طاقت کی۔ اور ویش۔ پیدا وار اور اقتصادی تحریکات کی علامت تسلیم کیے گئے ہیں۔ یہ تقسیم بالکل ویسے ہی ہے جیسے کہ ایران کے آریوں میں تھی ۔

Shyant یعنی سورما Rathaestura یعنی امام مذہب Atharvan Huiti یعنی کاشت کار چوتھی ذات شودر کی وہی ہے جو ایران میں حتیٰ Vastrya

تھے ان تینوں ذاتوں میں آداب ورسوم کا فرق تھا چھتری شاہانہ انداز میں بھینٹ چڑھاتا تھا جس کی تمنا یہ تھی کہ وہ اس مذہبی رسم کے ذریعہ اصل ذات 'الوہیت' سے ایک ہوجائے برہمن مذہبی سربراہ ہوتا تھا جو مذہبی مراسم کی کارروائیوں کا ماہر ہوتا اور بلاکسی غلطی کے ان کو کراسکتا تھا۔ ویش بادشاہ کا کفیل تھا جو حکومت کے خاص مراسم میں حصہ لیتا تھا اور زمین کی پیداوار اور اپنے مویشیوں سے بھینٹ کے لیے غذا فراہم کرتا تھا۔

لیکن بہت شروع کے زمانوں میں یہ تقسیمیں جامد ہوکر ذات نہیں بن گئی تھیں ان چار بزرگوں کے علاوہ رگ وید میں بہت سے پیشہ والوں اور روزگار کرنے والوں کا ذکر ہے مثلاً حجام، بڑھئی، دواوالے، لوہار، چمڑا کمانے والے اور مراسم مذہبی کی بنیاد پر بھی باہمی تفریق کا ذکر ہے۔ آریہ بھینٹ چڑھانے والا ہے۔ داسا Aurata (قانون شکن) ہے Akratu بلاکسی مذہبی رسم کا اور Mridhravacah (بدزبان) ہے۔

جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا تقسیموں کی گرہیں سخت ہوتی گئیں۔ شروع زمانہ میں وراثت کے اصول کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی تب برہمن چھتری اور چھتری برہمن بن سکتا تھا۔ دیواپی ایک چھتری بادشاہ کا بیٹا تھا اس نے ایک پروہت کا پیشہ اختیار کرلیا۔ بعد کے لٹریچر میں اس طرح کی تبدیلیوں کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں برہمنوں کے حکمران اور جنگ آزما بننے کی بھی مثالیں بہت ہیں درونا چاریہ اشوتھاماں کرپاچاریہ جنگ جو سورما تھے۔ سنگاس جو موریہ کے بعد آئے اور کنو اس حکمران تھے شستر ہن دعویٰ کرتے تھے کہ وہ "انوکھے برہمن" "چھتریوں کا غرور وتکبر ناش کرنے والے ہیں"

لیکن رگ وید نے اس بات پر زور دے کر کہ ذات پیدائش پر مبنی ہے ذات کے ناقابل تغیر ہونے کے خیال کو خود ہی پیش کیا کیونکہ رگ وید نے ہر ذات کی ابتدا پہلے انسان (پرش) کے ایک ایک عضو سے بتلائی ہے۔ جب ایک مرتبہ یہ اصول بنادیا گیا کہ ذات کی بنیاد پیدائش ہے تو پھر دھیرے دھیرے اس نے ہندوستان کے مقاصدِ حیات اور عمل میں پوری طرح اپنے پنجے گڑو دیئے بعد کی تاریخ کے دور میں سوسائٹی پر اس کا تباہ کن زہر اپاس Upas درخت کی طرح پھیلتا گیا۔

خالص علمی نظریات کے ماہرین نے ذاتوں کی کثرت کی وجہ معلوم کرنے کی آرزو میں طرز پیدائش کے واقعہ کو پکڑلیا۔ اور اسی کو بنیاد بناکر کل مسئلہ کی بہ خیال خویش گویا شرح کردی ایک

ذات کے لوگوں کی آپس ہی میں شادی کرنے سے جو اولاد ہوئی اس نے ذات کو جنم دیا اور اس کو خالص بنائے رکھا۔ مشترک شادیوں سے جہاں باپ اونچی ذات کا تھا اور ماں نیچے ذات کی ہوتی جو اولاد ہوئی وہ کسی طرح باپ سے کم حیثیت نہ تھی لیکن ایسی شادیاں جو نیچی ذات کے مردوں کے اونچی ذات کی عورتوں سے ہوئیں ان کی اولاد ماں باپ دونوں سے کمتر نکلی

چونکہ اس قسم کی شادیوں میں بہت سی تبدیلیاں اور ملاوٹیں ہوئیں اس لیے ذاتوں اور ذاتوں کے اندر ذاتوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ اس وجہ سے واضعانِ قانون نے سمجھی کہ ذاتیں اسی طرح عالم وجود میں آئی ہیں اور انھوں نے ہر ذات کو ایک خاص پیشہ یا روزگار سے مستقلاً وابستہ کر دیا۔ اس طرح سوسائٹی اور اس کے اجزاءِ ترکیبی کا ایک ناقابل ترمیم ڈھانچہ تیار ہو گیا یہ نظریاتی نظام تمام قوم کے دماغ میں جم گیا اور ان حقائق کے لیے خواہ وہ کتنے ہی ہوں اس نظام میں جگہ نکالنا ہی پڑی

یہ نظریہ جس کی تفصیل منو اور دوسرے مصنفین نے دھرم شاستر میں بیان کی ہے میدان میں جما رہا حتیٰ کہ بہت بعد سترہویں صدی میں بھی Shudraka Jati Vivaka- malka-a. جیسی کتابیں جو ذات کے نظام کے آغاز اور اس کے ڈھانچے کے بارے میں لکھی گئیں ان میں یہی روایاتی انداز اختیار کیا گیا۔ ان کتابوں نے یہ قرار دیا ہے کہ ذات کے اندر ذات اور ذات سے خارج شدوں کی زیادتی۔ ذاتوں کی کثرت کی وجہ سے تھی۔ اور اس وجہ سے کہ ہر ذات کے لیے ایک معین پیشہ تھا اگرچہ پریشانیوں کے زمانہ میں دوسرے پیشے اختیار کر لینا جائز تھا اور اس وجہ سے بھی ذات کھانے اور پینے پر پابندی لگاتی تھی اور سماجی نظام میں ایک جامد معاشرتی ترتیب تھی جس میں ہر ذات یا ذات کے اندر ذات کی پوزیشن اور اس کا درجہ متعین تھا۔

لیکن نظریات سے قطع نظر اگر واقعات پر نظر ڈال جائے تو لوگوں کی گروہوں اور فرقوں کی تقسیم اس سے زیادہ پیچیدہ معلوم ہوگی جو مذہبی کتابوں میں درج ہے

" وی پی۔ کور" کے مطابق مذہبی کتابوں میں جن ذاتوں کا تذکرہ ہے ان کی تعداد 72 ہوتی ہے (1) لیکن مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان کے ہر لسانی علاقہ

---

(1) ملاحظہ ہو کین پی۔ وی۔ [illegible] شاستر جلد 2 باب [illegible] صفحہ 71 ایف ایف

ہیں قریب 200 ذاتیں اوران ذاتوں کے اندر دو ہزار ذاتیں ہیں اور پورے ہندوستان میں تین سو سے زیادہ اصل ذاتیں ہیں اوران کے اندر پانچ ہزار چھوٹی چھوٹی جماعتیں ہیں اورپھر ایک عجیب حقیقت جسے مذہبی کتابوں نے نظرانداز کر دیا ہے یہ ہے کہ باشندوں میں ذاتیں جن عناصر سے مرکب ہیں وہ علاقے علاقے ایک دوسرے سے مختلف ہیں صرف ایک ذات برہمنوں کی ہے جو تمام ہندوستان میں یکساں پائی جاتی ہے۔ راجپوت جن کو قانون کی کتابوں کے مطابق چھتری ورن کا نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے وہ اصلاً پنجاب، راجستھان، اترپردیش اور وسطی ارض مرتفع تک محدود ہیں۔ البتہ مٹھی بھر مشرقی یو۔پی اور دکن میں بھی بکھرے ہوئے ہیں۔ اور پھر وہ ذاتیں جو صنعتی زراعتی یا تاجرانہ پیشوں میں لگی ہوئی ہیں ان کے نام اوران کی حیثیت صوبہ صوبہ ایک دوسرے سے الگ ہے نیچے کے درجوں میں بعض ذاتیں ایک ہی طرح کی ہیں لیکن بہت سی ایسی بھی ہیں جو بالکل مختلف ہیں۔

جو چیز اور بھی زیادہ عجیب ہے وہ ان ذاتوں میں اونچی ذات اور نیچی ذات کی تقسیم ہے حق یافتہ ذاتیں (برہمن اور چھتری) یا پوتر ذات (تمام وہ لوگ جن کے ہاتھ کا پانی حق یافتہ ذاتیں قبول کر سکتی ہیں) اور نجس ذات (اچھوت یا ذات سے خارج) 2 ان سب کی آبادی میں تناسب صوبہ صوبہ ایک دوسرے سے مختلف ہے جیسا کہ نیچے دی ہوئی فہرست سے واضح ہوگا۔ 3

صوبہ	ہندو	برہمن	راجپوت	دیگر
	ملین	فی صد	فی صد	فی صد
آسام	3.06	3.9	3	95.8
بنگال	45.45	6	3	91
بمبئی	17.83	5.6	2.5	92
مدھیہ پردیش	8.7	4.1	2.6	93.3

1۔ ملاحظہ ہو کین پی۔ وی۔ ہسٹری آف دھرم شاستر جلد دوم پارٹ 1 صفحہ 71

2 سنس آف انڈیا 1931ء جلد 1 پارٹ 1 صفحہ 471

3 سنس آف انڈیا جلد 11 اسٹکس آف پوپلیشن صفحہ 41-340

4 سنس آف انڈیا رپورٹ 1931ء پارٹ 1 صفحہ 494

مدراس	28.5	4	.05	95.95
پنجاب	9.25	3	4	93
صوبہ سرحد	38.55	12	8	80
وسطی ہندوستان	7.8	12	10.4	77.6
راجپوتانہ	9.2	9.8	5.2	85
ہندوستان	188	7	3.8	89.2

جہاں تک اچھوتوں کا سوال ہے 1931ء کے اعداد وشمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کی کل آبادی کے 14 فی صدی اور ہندوؤں کی آبادی کے 21 فی صدی پر مشتمل ہے بمبئی میں ان کا تناسب سب سے کم تھا 11 فی صدی اور آسام میں سب سے زیادہ تھا یعنی 37 فی صدی اس کے علاوہ ہر علاقہ میں اس علاقہ سے متعلق اچھوتوں کی مخصوص ذاتیں تھیں البتہ چمار تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے۔

5۔ ان چار برنوں کے علاوہ پیشہ کی بنیاد پر بھی جماعتوں کا وجود ابتدا سے چلا آتا ہے، ان کا رجحان گوت بیاہ (ذات یا اپنے قبیلہ کے اندر ہی شادی کرنے) اور ذات کے اندر ذات کی شادی کا رہا۔ اس طرح پیشہ کا انحصار پیدائش پر ہوگیا۔ پیشہ کی بنیاد پر جو ذاتیں اور ذاتوں کی تحتی ذاتیں بنیں ان کی تعداد بہت ہے۔ حیرت میں ڈالنے والی بات یہ ہے کہ کام اور کام کے ڈھنگ کے معمولی سے فرق نے ان ذاتوں کو پھاڑ پھاڑ کر اور زیادہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ دیا جو شادی کے معاملہ میں ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں۔

مثال کے لیے ان چماروں کو لیجیے جو چمڑے کا کام کرنے والے ہیں ان کی تعداد کثیر ہے لیکن ان کے اندر بہت سی تحتی شاخیں ہیں کچھ تو علاقائی اور مقامی ہیں مگر بہت سی شاخیں چمڑے پر کام کرنے کے مخصوص عمل سے تعلق رکھتی ہیں جیسے ایک وہ ہیں جو تیل رکھنے کے لیے چمڑے کے کپّے بناتے ہیں دوسرے وہ جو زین ساز ہیں پھر وہ جو کچا چمڑا کاٹتے ہیں۔ اسی طرح ماہی گیروں میں وہ دونوں قسم کے ماہی گیر شامل ہیں جو بانس کے ڈنڈوں سے مچھلی مارتے ہیں اور جو رسی لگی ہوئی ترکیب استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح باغبان پھول مالیوں میں یعنی جو

---

(1) سنسس آف انڈیا رپورٹ 1931، جلد اول پارٹ 1 صفحہ 494

پھول تیار کرتے ہیں اور زیرہ مالیوں میں یعنی وہ مالی جو زیرہ کا بیج بوتے ہیں اور ہلدی مالیوں میں یعنی جو ہلدی کا پودا لگاتے ہیں بٹ گئے ہیں۔ اسی طرح دھر پاس یا بھنے ہوئے چنے بیچنے والوں کی بھی شاخیں ہیں ان کے علاوہ کھیراس کتھ بنانے والوں لون ہارس یعنی نمک صاف کرنے والوں منڈھاس بھیڑ پالنے والوں مسکار یعنی بھینس پالنے والوں وجنترس گانے والوں اور مانگ گرودس یعنی سپیروں میں بھی تحتی ذاتیں ہیں۔

2 ہندوستان کے کچھ حصوں میں مثلاً مدراس میں غیر برہمن دو طبقوں میں بٹے ہوئے تھے "دست راست" و "دست چپ" موخر الذکر کو یہ حق نہیں تھا کہ وہ جلوس میں گھوڑے پر چڑھ کر چلیں یا جھنڈا خاص ترکیب سے اپنے ہاتھ میں لیں اور اپنے بیاہ کی عارضی جگھوں کو بارہ کھمبوں پر سجائیں۔ (1)

باوجود علاقائی اختلافات کے ذات کے بعض ایسے خصائص بھی ہیں جو ہر جگہ یکساں طور پر پائے جاتے ہیں ان میں سب سے اہم گوت بیاہ ہے۔ ذات اس بات کو طے کرتی ہے کہ سماجی دائرے کے وہ کیا حدود ہیں جن کے اندر ہی شادی ہو سکتی ہے اور جس کے باہر شادی منع ہے لیکن بہت سی تحتی ذاتیں بے شمار مزید شاخوں میں بٹی ہوئی ہیں چونکہ ہند ذہنیت ذروں میں تحلیل کرنے کے نظریے میں مخصوص مسرت محسوس کرتی تھی اس لیے کوئی بھی عذر اس بات کے لیے کافی ہو سکتا تھا کہ ایک گروہ کو توڑ کر مختلف گروہوں میں کر دیا جائے۔

تحتی ذاتیں نسلی قبائلی اقتصادی سیاسی فرقہ وارانہ اور علاقائی بنیادوں پر عالم وجود میں آئی تھیں ایک حرفے میں صرف معمولی تکنیک کا فرق یا پیشے یا مقام رہائش میں تبدیلی اس بات کی معقول وجہ سمجھی جاتی تھی کہ ایک جدید تحتی ذات قائم کر دی جائے۔ مختلف نسلوں کی آمیزش کے نتیجے میں ہونے والی اولاد میں ذاتوں کی تعداد میں اکثر اضافہ کرتی رہتی تھیں۔ رسم و رواج کے انوکھے پن اور عادات و اطوار کی بوالعجبی بھی شاخ در شاخ ہو جانے کا مواد پیدا کرتی رہتی تھی۔

(3) بہت سے بیرونی لوگ ذاتوں کے نظام میں داخل کر لیے گئے۔ شکل دیپی برہمنوں کے متعلق یہ خیال ہے کہ یہ لوگ سیتھین نسل سے ہیں۔ سیگھ، ناگر، کرہٹا اور باوک برہمن غالباً

---

(1) گھوریے جی۔ ایس کاسٹس اینڈ کلاس ان انڈیا 13

کسی بیرونی نسل سے ہیں۔ یہ اعداد و شمار بلا شبہ بہت بعد کے زمانہ کے ہیں کیوں کہ اٹھارھویں صدی کے اعداد و شمار مل نہیں سکتے ہیں پھر بھی سرسری طور پر اُسے ہندو سوسائٹی کی حالت کی آئینہ دار مانا جاسکتا ہے۔ قطعی تعداد تو آبادی میں ہونے والی بالعموم کمی یا بیشی کے مطابق گھٹتی بڑھتی رہی لیکن جب تک ایسے اسباب معلوم نہ ہوں جن سے ان کی تشریح ہو سکے تب تک ان کے فی صدی تناسب کی اٹکل لگانا مناسب نہیں ہے۔

علاقے علاقے اور بھی مخصوص باتیں تھیں کیوں کہ سماج میں ذاتوں کی برتری کا نظام ہر جگہ یکساں نہیں تھا مثلاً دکن میں Kammlan برہمنوں کو اپنے سے برتر تسلیم نہیں کرتے تھے۔ بنگال میں کایستھ شودروں میں شمار ہوتے تھے لیکن بہار اور اتر پردیش میں ان کو Dwigas سمجھا جاتا تھا مہاراشٹر میں کایستھ Prabhns اپنے متعلق یہ خیال رکھتے ہیں کہ وہ چھتری کی نسل سے ہیں اس قسم کے فرق اور ذاتوں میں بھی کار فرما تھے۔ پھر کتنی پشتوں تک باہمی شادی ممنوع ہے اس پر رسم ورواج ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ کسی کسی علاقے میں تو کامتا کشترا قانون رائج تھا اور دوسرے علاقوں دیا بھاگا یا Gimu قانون تسلیم کیا جاتا تھا ملک کے ہر حصہ میں سماجی پابندیاں اور قانونی مجبوریاں یکساں نہیں تھیں۔ شمال میں یہ بات کہ صرف چھو لینے سے انسان ناپاک ہو جاتا ہے اتنی ترقی یافتہ نہ تھی جتنی کی دکن میں دکن میں یہ تصور تھا کہ اچھوت نجاست پھیلاتا ہے اس لیے اس کے سایہ سے بھی بچا جاتا تھا تامل ناڈ اور ملیبار میں تو وہ فاصلے معین کر دیئے گئے تھے جو نجس ذاتوں اور اونچی ذات والوں میں رہنا لازم تھے۔ کنوؤں، تالابوں بلکہ دریاؤں تک کے نجس ہو جانے کا تصور پھیلا ہوا تھا۔ مندروں میں داخلہ ممنوع تھا ملک کے بیشتر حصّوں میں ان نجس ذاتوں کے مکانات دوسروں سے علاحدہ رکھے جاتے تھے لیکن بعض علاقوں میں گاؤں اور قصبوں میں ہر ذات کے لیے ایک علاحدہ جگہ مقرر تھی پکا ہوا کھانا ایک ذات کے ہاتھ سے دوسری ذات کا لے لینا ایک دوسرا معاملہ تھا جو علاقوں سے تعلق رکھتا تھا مشرقی بنگال گجرات اور جنوبی ہند میں کچے (یعنی بلا گھی کے پکے ہوئے کھانے) اور پکے (یعنی گھی میں پکے کھانے میں کوئی فرق نہ تھا لیکن دوسرے علاقوں میں پکا کھانا نیچی ذات سے اونچی ذات کا قبول کرنا ممنوع نہ تھا Dravida برہمن بھی اپنی اصل میں ممکن ہے کوئی نسلی خصوصیت رکھتے ہوں۔ مہاراشٹر کے Chitpauan برہمن اپنے سر کی ساخت جسم اور آنکھوں کے رنگ میں پنجاب اور اتر پردیش کے برہمنوں سے مختلف ہیں۔

Craons - Santhals - Mandas وغیرہ جو غالباً غیر آریہ ملک کے ابتدائی باشندے
تھے اب ان کی بھی ذاتیں بن گئی ہیں۔

قبائلی ناموں کی بنیاد پر ذاتوں اور ذاتوں کے اندر ذاتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے مثال
کے طور پر اہیر، گوجر، جاٹ، مرہٹہ، بھیل، ڈوم، گونڈ، کرن، کایستھ اور اور راجپوت لازمی طور
پر سیاسی ذاتیں ہیں۔ اول الذکر دو چھوٹے موٹے افسروں کی حیثیت سے حکم چلاتے تھے اور
راجپوت حکمرانی کرتے تھے۔ فرقہ پرستانہ اختلافات نے رگ وید، اتھروید، یجروید، سام وید، Ekn-
athi Smanta Vaishnavas برہمن کو جنم دیا اور ایسی ذاتیں وجود میں آئیں جن
سے Vishnois-Lingayats کبیر پنتھی، شات نامی اور Shaktas وغیرہ۔ علاقوں
میں ملک کا تقسیم ہونا بے شمار تحتی ذاتوں کی بنیاد تھا مثلاً برہمنوں میں قنوجی، سرور یا سورستی
کنکا تاستھا، دیشستھا، ناگر، اوسوال، شریمالی سورتھیا، راہی اور بندرا ولناڈ، وانگی ناڈو، کنلا
کما ویدکا وغیرہ اور ویشوں اور شودروں میں بے شمار تحتی ذاتیں شہروں مواضعات اور ضلعوں
وغیرہ کے نام پر ہیں۔

ہر علاقے میں ایک خاص قسم کے رسم و رواج کی خصوصیت اور طور وطرز اور پیشہ کا
نرالاپن Jutkias & Puranias کے بننے کا ذمہ دار ہے جو کہ اہیر دائیوں سے
Basons کی اولاد ہیں۔ چانگیاچار جو پتیوں کی پائپ بناکر تمباکو پیتے ہیں۔ سورہاس جو
Dhimars کی ماتحتی شاخ ہیں اور سور پالتے ہیں۔ اور Vatalias گجرات کے
Kumbhars کی حرامی اولاد ہیں۔

موساہارس (چوہے کھانے والے) ایک نیچ ابتدائی باشندوں کی تحتی ذات بھولیاس
(بھول جانے والے) جو جولاہوں کی ایک تحتی ذات ہے دیلاس (کمزور) جو گجرات کے ابتدائی
باشندوں کی ایک شاخ ہے کلار (چور) تیان (دکن والے) اور پیریا (طبل بجانے والے)
تحتی ذاتیں ہیں جن کے نام ہی سے ان کی مختلف خصوصیات ظاہر ہیں۔ ذات اور تحتی ذات کی
تشکیل میں پیشہ، دوسرا اہم عنصر ہے بعض ماہرین فن حیوانات کے قول کے مطابق ہندوستان
کی ذاتوں کے نظام کی بنیاد پیشہ ہے چار ویدک ورن تو کام کرنے کے لیے ہیں۔ برہمن کا کام
عبادت ہے (برہم) اور جو کچھ بھی اس کے متعلق ہو۔ چھتری اپنی سلطنت پر حکمرانی میں مشغول
ہے (شترا) ویش ملک کی پیداوار کا ذمہ دار ہے اور شودر کا پیشہ خدمت ہے لیکن ذات

کی واحد بنیاد پیشہ وارانہ تقسیم کو تصور کر لینا غلط ہوگا کیوں کہ بہت سی مختلف ذاتوں کا پیشہ ایک ہی تھا اور ایک ذات کے لوگ مختلف پیشے اختیار کرتے تھے۔ عام طور پر کہنے کے لیے جو بات صحیح ہے وہ صرف یہ کہ پیشوں کا میلان موروثی ہونے کی جانب تھا۔

ذات کے نظام کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ ذاتوں اور تحتی ذاتوں کی درجہ بندی کرتا ہے اس طرح فرد کا مقام اور اس کے حقوق و فرائض طے ہو جاتے ہیں۔ مذہبی کتابوں میں پوری آبادی کو چار ذاتوں میں تقسیم کرنے کا اصل منشا یہ ہے کہ افراد اور جماعتوں کی درجہ بندی کر دی جائے اور ان کے مدارج ترتیب دیے جائیں لیکن یہ معیاری اسکیم پورے طور پر حقائق سے مطابقت نہیں رکھتی تھی سوائے اس کے کہ کل ہندوستان میں برہمن سب سے اونچی اور اچھوت سب سے نیچی ذات ہر جگہ تسلیم کیے جاتے ہیں لیکن درمیانی ذاتوں اور ان کی تحتی ذاتوں کی تعداد اور ایک دوسرے سے نسبتاً ان کی پوزیشن کے بارے میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں کسی قسم کی یکسانیت نہیں پائی جاتی ہے۔

ذات نے ایک شخص کی صرف حیثیت عرفی ہی متعین نہیں کی بلکہ اس نے مذہبی عقائد و اعمال کو بھی متاثر کیا۔ برہمن Smartas Shaivas اور Shaktas میں داہنے اور بائیں راستوں کے ماننے والوں میں منقسم تھے۔ چھتریوں میں بھی اسی طرح کی تقسیم تھی لیکن ایسے امور میں خاندانی روایات اور انفرادی رجحان پر ہی اختلافات کا انحصار ہوتا تھا Nondwija ذاتوں میں البتہ دیوتا اور دیویاں (جیسے کہ Devatas Gram) اور مذہبی رسوم ہر گروہ کے لیے الگ الگ مخصوص تھے۔ پوجا کے طریقوں کے اختلافات نے ذاتوں اور ان کے اندر کی تحتی ذاتوں کے اختلافات کو تیز کر دیا اس طرح ذاتوں اور ذاتوں کے اندر تحتی ذاتوں کے وجود نے سول (شہری) اور مذہبی حیثیت پیشہ معاشرتی شادی کھانے پینے سب کو متعین کر دیا۔ قواعد و ضوابط جزاً مذہبی کتابوں پر اور جزاً روایات اور رسم و رواج پر مبنی تھے۔

ان ضوابط کو عمل میں لانے اور ذات کی پابندیوں کو رائج کرنے کے لیے نیچی ذات والوں کی ایک مستقل کونسل تھی اور اس کی ایک سب کمیٹی اور ایک افسر اعلیٰ ہوتا تھا مستقل کونسل ایک نمائندہ جماعت تھی کل نمائندے یا تو خاندانوں کے پیشوا یا بالغ اور تجربہ کار لوگ ہوتے تھے کونسل کی ایک کمیٹی اس کے بحثوں کی رہنمائی اور احکام جاری کرنے کے لیے

تھی یہ ایک مختصر سی جماعت تھی جس کے صرف پانچ ممبر ہوتے تھے اور جس کا نام پنچایت تھا پنچایت عمل کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتی تھی اور ایک لمحہ کی نوٹس پر وہ بڑی جماعت کو طلب کر سکتی تھی۔

کمیٹی کا چیرمین مکھیا ہوتا تھا کبھی وہ وراثتاً اس عہدے پر فائز ہوتا تھا اور کبھی انتخاب کے ذریعہ سے آتا تھا اس کا لقب چودھری یا پردھان یا سرپنچ ہوتا تھا کبھی کبھی اس نے دو ایک دوسرے افسران کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیا تو کر لیا جیسے نائب دیوان مختار وغیرہ۔ کمیٹی کے دوسرے ممبران یا پنچ بھی یا تو وراثتاً ہوتے تھے یا زندگی بھر کے لیے منتخب ہوتے تھے سردار کا نشان ایک پگڑی تھی جو چودھری کے سر پر ایک مذہبی رسم کے اندر رکھی جاتی تھی۔

پنچایت کا یہ مستقل نظام کسی خاص مقام کی تحتی ذاتوں کے جھنڈ سے تعلق رکھتا تھا وہ مقام خواہ گاؤں ہو یا شہر یا شہر کا ایک حصہ جیسے جوہر ٹاٹ یا چنالی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا بعض اوقات دو یا دو سے زائد پنچایتیں تحتی ذاتوں کے درمیان کے معاملات پر غور کرنے کے لیے اکٹھا ہوتی تھیں لیکن پوری ذات کی کوئی کونسل یا پنچایت نہیں تھی۔

پنچایت کا دائرہ اختیار کافی وسیع تھا جو مقدمات پنچایت میں بہ غرض فیصلہ آتے تھے وہ ذات کے سماجی رسم ورواج کی خلاف ورزی، اخلاقی ضوابط کی خلاف ورزی بشرطیکہ ان سے ذات کے قوانین کی خلاف ورزی ہوتی ہو، معین مذہبی جرائم، خانگی جھگڑے مثلاً عورت کی رخصتی کے لیے دعوے شادی کے وعدوں کی خلاف ورزی یا جب شادی شدہ لڑکی بالغ ہو جائے تو اس کو اس کے شوہر کے پاس بھیج دینے میں تساہلی کی نوعیت کے ہوتے تھے ان میں وہ بعض چھوٹے موٹے دیوانی اور فوجداری کے مقدمات بھی شامل ہیں جو عام طور پر ملک کے عام قوانین کے اندر ہی آتے تھے جیسے کہ حملہ مجرمانہ یا قرض کا معاملہ اور اکثر تجارتی تنازعے(1)

پنچایت کے فیصلوں پر عمل درآمد کے لیے جو اختیارات حاصل تھے وہ تھے جرمانہ کرنا، برادری یا برہمنوں کی دعوت کے اخراجات ادا کرنے کا حکم دینا عارضی یا مستقل طور پر ذات سے خارج کر دینا کبھی کبھی یاترا کرنے یا بھیک مانگنے یا اور کسی قسم کے ذلت آمیز طریقے پر چلنے کا

---

(1) بلنٹ ای۔اے۔ اے۔ سنس آف انڈیا 1911ء جلد 15 یونائیٹڈ پراونسز آف آگرہ اینڈ اودھ پارٹ 1 رپورٹ صفحہ 337۔

بھی حکم ہوتا تھا۔
اونچی ذات والوں اور بالخصوص برہمنوں اور چھتریوں کے ہاں کوئی مستقل ادارۂ ذات کی گورنمنٹ کے لیے نہ تھا۔ قدیم زمانہ میں بادشاہ ہی ورن شرم یعنی ذات اور مدارج زندگی کا محافظ تھا وسطی زمانہ میں ان علاقوں میں جہاں ہندو راجاؤں کی حکومت تھی ذات کا تحفظ حکومت کا مانا ہوا فرض تھا۔ بکثرت ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ حکومت کے انتظامی محکمہ نے ذات کے قانون پر عمل کرانے کے لیے اپنے اختیارات سے کام لیا۔ لیکن حکومت کے اختیارات کا دائرہ اونچی ذات والوں کے باہر نظر نہیں آتا۔ معدودے چند مقدمات کے نوٹسوں کا پتہ چلتا ہے جس میں گورنمنٹ نے نیچی ذات والوں کی روایات اور ان کے ضوابط پر عمل درآمد کرانے میں دلچسپی ظاہر کی تھی۔
حقیقت یہ ہے کہ ان زمانوں میں ہندوستان کی سیاست ذات کے نظام ہی پر منحصر تھی جس نے سماج کو دو ٹکڑوں میں الگ الگ کر دیا تھا۔ ایک چند سری حکمرانی یعنی ایک قلیل التعداد حکمران جماعت تھی جو اونچی ذاتوں پر مشتمل تھی عوام الناس یا ٹوائن بین کے معنی میں پرولتاریوں کی عظیم تعداد ان لوگوں پر مشتمل تھی جن پر حکمرانی ہوتی تھی اور جو زیادہ تر نیچی ذات کے تھے طاقت کل کی کل متقدم الذکر کے ہاتھ میں تھی اسی طرح علم بھی انہی کی اجارہ داری تھا۔ برہمنوں کا طبقہ اہل علم کا طبقہ تھا ایک ذی علم آدمی کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ قانون اور انصاف کا محافظ ہے اور اس بات کا اہل ہے کہ قانون کے ضوابط عدلیہ کی کارروائیوں اور مناسب سزاؤں کے بارے میں اپنے علم کی روشنی میں فیصلے دے شاستری یا پنڈت کا جو اعزاز تھا وہ اس بات کا ضامن تھا کہ اس کے فیصلوں پر عمل درآمد ہو کیوں کہ رائے عامہ ہمیشہ ان کی تابعداری کرتی تھی
عدلیہ کا نظم و نسق (دیوانی اور مال تو کلیتہً اور فوجداری جزءً) بس برہمنوں سے تعلق رکھتا تھا۔ اور جہاں تک کہ ہندو قوم کا سوال ہے یہ حالات انگریزوں کی حکومت کے قائم ہونے تک باقی رہے۔ مدوّن مذہبی قانون کی موجودگی میں ایک نمائندہ یا مشاورتی اسمبلی کی ذات کے تمام مسائل یا انفرادی جرائم کے طے کرنے کے سلسلے میں کوئی ضرورت نہ تھی لیکن ذات والوں کے اجتماع کے مواقع مذہبی میلوں اور تہواروں میں جیسے کہ ہردوار پریاگ میں اشنان کے عظیم مقررہ اوقات پر اور ممکن حد تک انتہائی مشہور مذہبی مراکز مثل بنارس کے

ممتاز پنڈتوں سے مشورے کیے ہیں۔

برہمنوں کے کندھوں پر ایک بھاری ذمہ داری کا بوجھ تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ معاشرہ کی روحانی واخلاقی فلاح کے لیے جواب دہ تھے بلکہ سماجی نظام کی بقا اور اس کے عناصر کے باہمی ربط کا بھی انحصار انہی پر تھا بدقسمتی سے یہ لوگ ان فرائض کو خوش اسلوبی سے ادا کرنے میں قاصر رہے اگرچہ اس معاملہ میں قصور افراد کا کم اور اس نظام کا زیادہ تھا۔

ذات کی نمایاں خصوصیت اس کی علاحدگی پسندی ہے وہ لوگ جو صرف اصول پر نظر رکھتے ہیں اور جو کسی بات کے لیے خواہ مخواہ کا عذر نکال لیتے ہیں وہ خواہ کچھ بھی کہیں حقیقت یہ ہے کہ ہندو سوسائٹی نے بجائے یک جہتی کے افتراق پر زیادہ زور دیا ہے اس نے سوسائٹی کو فرقوں میں بانٹ دیا جس نے معاشرہ میں مختلف عناصر کے مل کر ایک ہونے میں رکاوٹ ڈالی اس کا ہر عنصر صرف اپنے ریزہ ہی کو کل سمجھ کر علاحدگی پسندی پر قائم تھا۔ وہ تار جوان کو جوڑ کر ناقابلِ تقسیم بنا سکتے تھے بہت کم اور بہت کمزور تھے۔

برہمن ویدک مذہب کے علم بردار تھے لیکن دوسرے مذہب کے نگہبانوں کے برعکس تنہا اپنے کو یہ اس کا زبان سے اقرار اور اس پر عمل کرنے والے سمجھتے تھے وہ اپنے اوپر لازمی قرار دیتے تھے کہ مذہب کے احکام وہدایات اور دینیات کا مطالعہ کریں اور اس کی بتائی طرز عبادت اور مراسم دینیہ پر عمل پیرا ہوں لیکن اگر دوسری ذاتیں عمل نہ کریں تو اس سے وہ کوئی تعلق خاطر محسوس نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے مذہبی عبادات اور مراسم کی بقا اور مذہبی احکام کی تعلیم کو خود ذاتوں پر چھوڑ دیا وہ پوجا اور دیگر مذہبی رسوم کے مواقع پر صرف پروہت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ برہمن اس درجہ قدامت پرست تھے کہ وہ سماجی ضوابط اور پوجا کی تفصیلات سے بال برابر بھی ہٹنا گوارہ نہ کرتے تھے حالات کا تغیر یا رائے عامہ میں تبدیلی ان کے عقائد اور اعمال پر ذرا بھی اثر انداز نہ ہوتی تھی روحانی ارتقا کے منازل کی جھلک دکھا کر اور مختلف ذاتوں کے لیے مختلف قسم کا معیار بنا کر وہ رائے عامہ کا مقابلہ کر لیتے تھے۔ وید کے بتائے ہوئے مذہبی رسوم اور قربانیاں برہمنوں کے لیے مخصوص تھیں لیکن دوسری ذاتوں کے لیے "پران" کافی سمجھے جاتے تھے پہلے بدھ مذہب اور بعد کو اسلام نے جب دعوتِ مقابلہ دی تو ان لوگوں نے پریم اور بھگتی کے فلسفہ کو نشو ونما دی لیکن بھگتی (محبت) تو اونچی ذات والوں کے لیے مخصوص تھی اور "پرپاتی" (سپردگی) نیچی ذات والوں کے لیے تھی۔ برہمن ایک مخصوص دیوتا

رام یا کرشن کی بھگتی پر زور دیتے تھے۔

دوسری ذاتوں کے مصلحین اور پیشوا مثلاً کبیر نانک اور دادو نے تعلیم دی کہ انسان کی نجات اس پر منحصر ہے کہ وہ بے عیب اعلیٰ وارفع ذات الوہیت کے اوصاف کی لطافت اپنے اندر پیدا کرے۔ مقدم الذکر عبادت اور سماجی نظام کے معاملہ میں قدامت پرست تھے جب کہ موخرالذکر بت شکنی کے انداز میں ذات کی مذمت کرنے والے تھے۔

اس طرح مذہب کا اعلیٰ عنصر اور علم دین حاصل کرنے کا طریقہ تو اعلیٰ ذاتوں کے لیے مخصوص تھا جن کا پیشہ ہی یہ تھا کہ پڑھیں اور پڑھائیں لیکن دوسروں کو توہم پرستی اور جہالت کے کیچڑ میں لوٹنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اخلاق اور مذہب کے معیار میں کسی یکسانیت کے قائم کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی گئی۔

سب سے زیادہ خراب بات یہ ہوئی کہ جب ہندو مذہب کو لوگوں نے ترک کیا تو اس کے مقابلہ میں برہمنوں نے مکمل دیوالیہ پن کا اظہار کیا۔ ان لوگوں نے ان اسباب پر غور نہیں کیا جو تبدیلی مذہب کے محرک تھے ان کو نیچے درجہ اور کچلے ہوئے لوگوں سے کوئی ہمدردی نہ تھی ان لوگوں نے کسی ایسی تحریک کو نشوونما نہیں دی جو صحیح علم کی روشنی پھیلا کر اور ان لوگوں کو جو اُسے بھول گئے تھے قدیم اطوار کی تعلیم دے کر برادرانہ تعلقات کے ہاتھوں کو مضبوط کرتی۔ جن لوگوں نے ایسے حالات کی مجبوری سے جو ان کے قابو سے باہر تھے اپنے مذہب کو ترک کر دیا تھا اور اب پھر واپس آنے کے لیے تیار تھے ان کو پھر مذہب میں داخل کرنے تک پر راضی نہ ہوئے۔

لیکن چھتریوں کا حال کیا تھا؟ پُرانی کہانی ہے کہ پرسرام نے جو برہمنوں کے سرغنہ تھے چھتریوں کو اکیس مرتبہ شکست دی۔ اس کہانی کو ثابت کرنے کے لیے کوئی تواریخی شواہد نہیں ہیں لیکن اتنا تو ہے کہ موریا خاندان کے زوال کے بعد پُرانے چھتری خاندان تاریخ میں روز بروز کم نمایاں حصہ لیتے رہے۔ اس کے بعد اچانک چھٹی صدی میں راجپوت میدان میں نمودار ہوئے اور تھوڑی ہی مدت میں وہ ہند گنگا میدانوں میں (علاوہ بنگال کے) اور وسطی بلند زمین پر پھیل گئے۔ آج تک اس تحریک کی کوئی اطمینان بخش تشریح پیش نہیں ہوئی ہے اور یہ بتانا ناممکن ہے کہ کہاں تک وہ اصلاً بیرونی نسل سے تھے اور کہاں تک یہیں کی نسل سے۔ اگرچہ جاٹوں اور گوجروں سے ان کا قریبی تعلق رہا ہے اور نسلی اعتبار سے ان کی ان

سے یکسانیت بھی ہے لیکن یہ باتیں معاملہ کے حل کو کچھ بھی آسان نہیں کرتیں۔

ذاتوں کے نظام کے ڈھانچے میں راجپوت ٹھیک طور سے پیوست نہیں ہوتے روایت یہ ہے کہ وہ ۳۶ قبیلوں یا خاندانوں میں بٹے ہوئے ہیں جن کا تعلق تین شاخوں سے ہے یعنی سورج بنسی، چندر بنسی اور اگنی کولا۔ راجپوت مجموعی طور پر ایک جھنڈ سے مرکب فرقہ ہے لیکن دوسری ہندو ذاتوں کے برعکس ان کی شاخوں کی بہت سی شاخیں نہیں ہیں اور ان کے اندر درجے میں شادی کرنے کا رواج جاری ہے جس کا منشا یہ ہے کہ ایک لڑکی کی شادی ایسے گوت میں ہو جو یا تو رتبہ میں اس کے والدین کے برابر ہو یا ان سے اونچا ہو۔

ہندو۔ لا، چھتری حکمرانوں سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ سماج کا نظام "سمرتی" کے قوانین کے مطابق رکھیں۔ جب ہندوستان پر ہندو بادشاہوں یا راجاؤں کی حکومت تھی تو یہ ممکن تھا کہ ذات کے متعلق قوانین پر عمل درآمد کرایا جا سکے۔ اس کے بعد جب مسلمانوں نے ہندوستان کو فتح کر لیا تب بھی آزاد ہندو سلطنتیں اور ریاستیں ایسا کرنے کی طاقت رکھتی تھیں لیکن ہندوستان کے کثیر رقبہ پر مسلم حکومت کے قیام نے ذات کو اس کی آخری سیاسی پناہ گاہ سے محروم کر دیا۔ راجپوت راجہ گھٹ کر جاگیر دار یا زمین دار کی حیثیت میں آ گئے۔ مسلمان حکمرانوں کو ہندوؤں کے سماجی نظام میں کسی قسم کی کوئی دلچسپی نہ تھی محافظت اور ہدایت سے محروم طوفان اور دباؤ کے بالمقابل ذاتوں کا نظام اپنی محافظت ذاتی کی اندرونی تحریک کی بنا پر ایک سخت ڈھانچے میں بند ہونے پر مجبور ہو گیا۔

مسلمانوں کی فتح کے پہلے ہی سوسائٹی کے اجزائے ترکیبی کا جامد ہونا اور ان کی تقسیم اور خود کفالتی تقریباً مکمل ہو چکی تھی جوڑنے والی طاقتیں گھٹ کر کم سے کم رہ گئی تھیں علاقائی یا مقامی ہونے کا جذبہ زبانوں کا جدا جدا ہونا مذہب اور رسومات کی علاحدگی فرقہ پرستی اور ایک دوسرے سے دور رکھنے کی اور قوتیں غالب آ گئی تھیں۔ اس طرح ذات نے سماج کی فلاح کے مطلع کو نہایت تنگ دائرے میں محدود کر دیا اور اپنے گروہ اور اپنے مقام کے باہر کے معاملات سے کلیتہً بے فکری کا رجحان پیدا کیا۔ بیرونی حملوں سے سوسائٹی کی حفاظت اور اندرونی امن و امان کے قیام کا کام صرف ایک مختصر اقلیتی جنگ جو جماعت تک محدود رہا بہت بڑی اکثریت کا ان اہم امور میں عملی کوئی حصہ نہ تھا۔

قبیلے

ذات کے نظام میں سماجی انتشار کا جو پہلو مضمر تھا وہ قبیلوں کے وجود سے اور زیادہ ترقی کر گیا۔ لیکن ان دونوں میں امتیاز مشکل ہے ذات ایک قسم کی گروہ بندی ہے جس میں اس پر زور دیا جاتا ہے کہ آپس میں کس طرح شادی بیاہ ہو اسی طرح آپس میں کس طرح کھائیں کسی حد تک پیشہ اور سماجی مدارج پر بھی زور دیا جاتا ہے دوسری طرف قبیلوں کا نظام اگرچہ کہا جاتا ہے کہ خونی رشتوں اور یک جدی ہونے (خواہ اصلی ہو یا فرضی) پر مبنی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی توجہ سیاسی تحریکوں جھگڑوں جنگوں زمین ہضم کرنے مملکت اور جائداد حاصل کرنے اور ان کی حفاظت کی جانب رہی ہے۔ ذات کی بہ نسبت قبیلہ علاقہ سے زیادہ وابستہ رہا ہے۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا شروع ہی میں ہر آریائی قبیلہ ان ہی چاروں ورنوں پر مشتمل تھا لیکن بعد کے زمانوں میں ضرور ایسے قبیلوں کا پتہ چلتا ہے جن میں متعدد ذاتیں تھیں۔ مثلاً پنجاب کے جاٹوں میں مالی، بھٹیارہ، جولاہا، تیلی Chuhras درزی، دھوبی، ترکھان، ڈوم راجپوت، کہار، کمہار، کلال، گوجر، لوہار، ملاح، موچی، مچھی، نائی (1) بمبئی کے گوجر قبیلے میں درزی Sonis سوتار، چمار، ڈھیڑ، کمہار اور Vanias (2) خاندیش کے اہیر اپنے گوتی ذاتوں میں اہیر برہمنوں، اہیر نائش، اہیر سونار، اہیر سوتار (3) اہیر لوہار، اہیر Shimpis اہیر Salis اہیر Gurars اور اہیر کولی کو شامل کرتے ہیں۔

اس طرح قبیلے جو بے روزگار اور لاتعداد ہیں۔ کبھی کبھی وہ منظر عام پر آتے ہیں اور پھر غائب ہو جاتے ہیں اور نئے قبائل ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ وید والے جن قبائل کا ذکر ہے ان کے نام Bharatas Purus Anus Yadus Turvasa Druhyus، Alina، Pakthas، Shiva، اور وشنو بھی درج ہیں مگر اب ان کا پتہ لگانا مشکل ہے

---

(1) ابٹسن۔ دی پنجاب کاسٹس صفحہ 7-106

(2) ان ھووین۔ دی ٹرائبس اینڈ کاسٹس آف دی بمبئی صفحہ 21

(3) ایضاً جلد 1 صفحہ 24

کوئی نشان ملے گا۔

بعد کے زمانہ میں ان کی تعداد میں اضافہ ہوگیا۔ بدھ کی پیدائش کی کہانیاں Jatakas شمالی ہند میں سولہ مہاجنپداس یا قبائلی ریاستوں کا حوالہ دیتی ہیں لیکن بعد کو ان کا اتا پتہ غائب ہوگیا۔ پرانوں میں بہت سے بیرونی اور ہندوستانی قبیلوں کا تذکرہ ہے۔ بہت سی حالتوں میں تو وہ ذاتوں کے نظام میں ضم ہوگئے ہیں دراصل قبیلوں کا ذاتوں میں تبدیل ہوجانے کا بہت ہی نمایاں رجحان رہا ہے کیوں کہ جب بھی سیاسی حالات اعتدال پر آئے اور قبیلوں کے لیے مہم بازی کے مواقع کم ہوئے تو قبیلوں نے ذاتوں کے مذہبی رسوم کو اپنے اوپر لاد لیا اس عمل کے دوران یہ کہنا آسان نہیں کہ کس کو قبیلہ اور کس کو ذات تسلیم کیا جائے۔

قبیلوں میں بھی حیثیت عرفی کا فرق ہے کچھ کا رتبہ بلند ہے جیسے کہ راجپوت اور مرہٹے اس کے بعد جاٹوں، گوجروں اور دوسرے بہتوں کا نمبر آتا ہے لیکن بے شمار ایسے بھی ہیں جن کو ہندوؤں کی خارجی ذاتوں سے میز کرنا مشکل ہی سے ممکن ہوگا کچھ قبیلے تعداد کے لحاظ سے اتنے بڑے اور جغرافیائی حیثیت سے اتنے بکھرے ہوئے ہیں کہ باوجود اس کے کہ ان کے نام اور ان کی ٹکڑوں میں تقسیم ان کا جبرگہ اور گوت سب ایک ہی ہیں پھر بھی وہ ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔

قبیلوں اور جبرگوں نے ہندوستان کی تاریخ میں اہم حصہ لیا ہے وہ الگ الگ علاقوں میں مستقل آباد ہوگئے اور وہاں اپنی الگ الگ ریاستیں قائم کرلیں۔ ان ریاستوں میں سے کچھ پھیل کر سلطنت اور بعض تو شہنشاہیت بن گئیں لیکن یہ سیاسی ڈھانچہ صرف چند بڑے اور چھوٹے راجاؤں کے مجموعہ کا نام تھا جن کو آپس میں جوڑنے والا رشتہ ڈھیلا ڈھالا سا تھا اور جن کو ہمہ وقت اندرونی افتراق کا اندیشہ لگا رہتا تھا۔ با اقتدار گروہ اور تابع جماعت دونوں میں زندگی کے مسائل میں کوئی اشتراک نہ تھا ہر ایک صرف اپنے مفاد کی فکر رکھتا تھا کوئی اس بات کی کوشش نہیں کرتا تھا کہ جماعتی اعزاض کے اجزا کو ملا کر سب کی فلاح کے لیے۔ ان کو ایک بنادے۔

اٹھارھویں صدی میں جے پور کے کچھواہہ جودھ پور کے راٹھور اور اودے پور کے سیسودیہ اس کی متعین مثالیں ہیں۔ ان کا ایک دوسرے سے باہمی حسد اور ان کی انتہائی تنگ نظرانہ رقابتیں اتنی گہری تھیں کہ وہ آپس میں مل کر راجستھان کو پر امن اور باعزت حالات عطا کرنے

کے بجائے مغلوں کی ماتحتی میں رہنے اور مرہٹوں کو خراج دینے کو ترجیح دیتے تھے اگرچہ راجپوت ہندو ہندوستان کے عالی نسب سورما تصور کیے جاتے ہیں لیکن اپنے آقائے نامدار شہنشاہ دلی کو خوش کرنے کے لیے جاٹوں اور مرہٹوں کو مغلوب کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔

جاٹ اورنگ زیب کے زمانہ میں دوآبہ کے بلند علاقہ میں عظمت کے ساتھ نمایاں ہوئے۔ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد سلطنت کی روزافزوں کمزوری سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے اپنی سلطنت بھرت پور کو مرکز بنا کر قائم کر لی۔ اورنگ زیب کو ان سے جو خطرہ لاحق تھا اس کا اندازہ کرکے اس نے راجہ کشن سنگھ کچھواہہ کو ان کی سرکشی کرنے کے لیے متعین کیا۔ فرخ سیر کے زمانہ میں جے سنگھ سوائے نے چرمان کے خلاف فوج کی عنان قیادت اپنے ہاتھ میں لی اور جاٹوں کو کسی طرح قدرے اطاعت پر لے آئے لیکن جب یہ خطرہ پیدا ہوا کہ احمد شاہ ابدالی ہندوستان کو فتح کرلے اور مرہٹوں نے ایک فوج افغانی سیلاب کو روکنے کے لیے بھیجی تو جب تک مرہٹہ فوجیں جاٹوں کی سلطنت کے قریب رہیں سورج پال بھرت پور کے جاٹ راجہ نے دوستانہ رویہ ظاہر کیا۔ لیکن جیسے ہی یہ دریائے جمنا عبور کر گئیں اس نے پلٹا پلٹ دیا احمد شاہ ابدالی سے ان کے ساتھ رہنے کا معاہدہ کرلیا اور خود دار مرہٹوں کو کوسنا شروع کردیا۔ دوآبہ کے جاٹوں کے مصائب اور بالآخران کی فتح میں ان کے رشتہ داروں نے جو بھاری تعداد میں پنجاب میں موجود تھے ذرا بھی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔

مرہٹوں کو ایسے مواقع حاصل تھے جو کسی دوسری جماعت کو میسر نہ تھے وہ ایک جگہ آباد تھے جغرافیائی حالات ان کی پشت پناہی کر رہے تھے جو ان کو بہمنی یا مغل حکمران کے دسترس سے محفوظ رکھتے تھے ان کی ایک مشترک زبان تھی اور وہ ایک ہم جنس وہم نوع قوم تھے۔ راجپوتانہ کے راجپوتوں کے برعکس جو اس وقت کل آبادی کے صرف 6 فی صدی ہیں اور دوآبہ میں جاٹوں کے بھی برعکس جن کی تعداد کل آبادی کی 8 فی صدی ہے مرہٹہ اس وقت مہاراشٹر کی کل آبادی کی ایک تہائی کے برابر ہیں اور پورے صوبہ میں وسیع دائرہ میں پھیلے ہوئے ہیں گذشتہ زمانہ میں بھی غالباً ان کی آبادی نسبت وہی تھی جو آج ہے ان کے مذہبی مصلحین نے ان کے دل کے اندر اخلاقِ اعلیٰ پیدا کرنے کا جوش بھر دیا تھا شیوا جی کی فوجی اور سیاسی ذہانت نے ان کو ایک ایسی جماعت بنا دیا تھا جس کے پاس ایک

حاصل تھی لیکن یہ تمام خصائص بیکار ہو گئے کیوں کہ مرہٹوں کے عزائم تنگ تھے ان کا سوراجیہ کا جو تخیل تھا وہ کل ہندوستان کو ایک متحدہ ملک تصور کرنے سے عاری تھا کیونکہ اپنے سوراجیہ کے حدود کے باہر کے کل علاقے کو وہ بیرونی ملک سمجھتے تھے اس لیے اسے اپنی ملک گیری کی ہوس کی مہم بازی کا مناسب میدان خیال کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ جب وہ مغل شہنشاہیت سے اقتدارِ اعلیٰ کے حصول کی جنگ کر رہے تھے تو شمال کی ہندو جماعتوں جاٹ، راجپوت، بندیلا، بنگالی اور اُڑیسہ وغیرہ کو انھوں نے اپنا دشمن بنا لیا۔

ذات اور قبیلے نے مختلف گروہوں کے درمیان اور ہندوستان کی معاشرہ کی وحدت کے خلاف جو ایک ناقابلِ عبور دیوار کھڑی کر دی تھی اس سے معاون ہیں رکاوٹ ڈالی اور باہم متحد نہیں ہونے دیا۔

ازمنہ وسطیٰ کے انگلستان میں بھی چار فرقوں کا نظام تھا۔ امرا، پادری، فری مین (نیم آزاد کاشتکار) اور سرف (زرعی غلام) لیکن یہ سب کسی ناقابلِ عبور خندق کے ذریعہ ایک دوسرے سے جدا نہیں تھے اُمرا اور اونچے درجہ کے پادری ایک ہی صف کے تھے۔ ایک ہی خاندان کے افراد امرا بھی ہوتے تھے اور پادری بھی۔ فری مین خوشحالی کا وصف حاصل کر کے امرا میں شامل ہو سکتے تھے اور اگر بدحال ہو گئے تو نیچے گر کر سرف (زرعی غلام) بن جاتے تھے فرانس میں جو نظام رائج تھا اس میں اس سے کم لچک تھی پھر بھی ہندوستان کی ذاتوں کے نظام کی طرح کی کوئی چیز وہاں نہ تھی۔

انگلستان میں بھی قدیم برطانوی باشندوں کے علاوہ بہت سے قبیلے باہر سے آ کر آباد ہوئے تھے جیسے کہ انگلیس، سیکسن، جوٹ، ڈین اور نارمن۔ لیکن 1066ء میں نارمن فتوحات کے بعد سب متحد ہو کر ایک قوم بن گئے۔ اور دو صدیوں کے بعد ان کی الگ الگ حیثیتوں کا کوئی نشان تک نہ رہا قبیلوں کا اس طرح مل جل کر ایک بننے کا واقعہ فرانس، اٹلی، اسپین بعد کو جرمنی اور دوسرے یوروپین ممالک میں بھی پیش آیا۔

لیکن ہندوستان کا حال یہ ہوا کہ وہ خول جن میں چھوٹے چھوٹے فرقے بند تھے اٹھارھویں صدی کے آخر بلکہ اس کے بعد تک بدستور قائم رہا۔ ان کا یہ جمود بہت سے واقعات کا نتیجہ تھا جن میں مخصوص امر یہ تھا کہ ہندوستان کی اقتصادیات کی سکونی کیفیت تھی یعنی قلیل سرمایہ والی زراعت کی ایسی پیداوار کہ صرف زندگی کسی طرح بسر ہو سکے غیر مشینی گھریلو صنعت

گاؤں کی محدود کفالتی اور کم بیوپاری یہ تھے اس وقت کی اقتصادیات کے نمایاں رنگ روپ جب تک یہ قائم رہے سماجی تبدیلیوں کا جذبہ کمزور رہا اور جب تک قدیم سماجی اقتصادی ڈھانچہ باقی تھا سماجی اتحاد کی جانب قدم بڑھانا ممکن نہ تھا۔

ذات اور قبیلے صرف ہندو سوسائٹی ہی میں باہمی تقسیم کے عوامل نہیں ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی یہ دونوں تقریباً اسی طرح پُر اثر ہیں اگرچہ اس کے قول کے مطابق "اسلام کوہ آتش فشاں کی سی ایک طاقت ہے ایک آتشیں اور متحد کرنے والی قوت جو مناسب حالات میں ایک قوم (نیشن) کی بھی تعمیر کر سکتی ہے۔ یہ قبائل سے قطار در قطار ڈھانچوں کو گلا کر ایک میں ملا دیتی ہے اور ان کی اندرونی تنظیموں کو تحلیل کر کے ایک ہم صفت نمونہ میں تبدیل کر دیتی ہے جن میں اس سے قبل کے رسم ورواج کا کوئی وجود یا نشان تک نہیں مل سکتا ہے"(1) پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ اسلام جو کتابوں میں ہے وہ اس سے بہت مختلف ہے جو اسلام عمل میں دکھلائی دیتا ہے پیغمبر اسلام کی تعلیمات اور ازمنہ وسطیٰ میں مسلمانوں کے اندر جو واقعی رسم ورواج جاری تھے اور ان کی جو تنظیمیں قائم تھیں ان دونوں کا درمیانی وقفہ اس سے کم وسیع نہیں ہے جو وقفہ ہندو دھرم شاستر اور ذاتوں کے اس نظام میں ہے جس پر واقعی عمل ہو رہا تھا۔ ایبٹسن کہتا ہے "یہ لوگ (مسلمان) کسی مذہبی قوانین سے کہیں زیادہ سماجی اور قبائلی رسم ورواج کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں"(2)

پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت تھی یہ لوگ زیادہ تر وہ تھے جو ہندو سے مسلمان ہوئے تھے لیکن ایبٹسن کے قول کے مطابق "ہندو مذہب تبدیل کر کے اسلام قبول کرنے سے اس (ذات) پر ذرا بھی اثر پڑنا لازمی نہ تھا"(2) وہ آگے چل کر کہتا ہے "ایک مسلم راجپوت گوجر یا جاٹ معاشرتی قبائلی سیاسی اور انتظامی اغراض کے لیے اسی طرح راجپوت گوجر یا جاٹ ہے جیسے کہ اس کا ہندو بھائی۔ اس کے سماجی رسم ورواج بلا ذرا سی تبدیلی کے قائم رہے اس کی قبائلی پابندیوں میں کسی طرح کا ڈھیلا پن نہیں آیا اور شادی اور وراثت کے قوانین بدستور غیر مبدل رہے"

---

(1) رسلے ۔ دی پیپل آف انڈیا 1908 ایڈیشن صفحہ 2?8

(2) [illegible]

ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کی مردم شماری کی رپورٹ میں بلنٹ لکھتا ہے کہ سید شیخ مغل اور پٹھانوں کے علاوہ "باقی سب مجموعی طور پر ہندو مذہب تبدیل کر کے مسلمان ہوئے تھے اور ایک بڑی حد تک شادی بیاہ اور پنچایتوں کے بارے میں ان کے اندر جو مراسم رائج ہیں وہ اس ذات کے مراسم کا مثنیٰ ہیں جس سے یہ لوگ پہلے تعلق رکھتے تھے مسلم راجپوت مجموعی طور پر اپنے قبیلے کے اندر ہی شادی بیاہ کرتے رہے ہیں کبھی کبھی اتفاقی طور پر راجپوتوں کے گوت کے باہر کی شادی کے قوانین پر بھی عمل قائم رکھا ہے پیشہ ور گروہوں کے ہاں پنچایتیں اتنی ہی طاقتور ہیں جتنی ہندو بھائیوں کے یہاں یہی حال بنجاروں، کمہاروں، جولاہوں، دُھنیوں، کرگروں یا کسگروں (مسلم کمہار) کبریوں، طوائفوں شیخوں، مہتروں (بھنگی) حلوائیوں، کنجڑوں، سنیہاروں، چوڑیہاروں، نانبائیوں، قلندروں، گھوگھروں، کان میلیوں اور دوسروں کا ہے"(1)

پی. سی. ٹیلنٹس، بہار اور اڑیسہ کی مسلم ذاتوں کی ایک فہرست دیتا ہے(2) اس میں دُھنیا، جولاہا، کنجڑہ، پٹھان، سید، شیخ کے نام درج ہیں۔ انتھوون نے گجرات کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ موسن کبنی اور مولے سلام اسلام کو اپنا مذہب اور ہندو ازم کو اپنا سماجی ڈھانچہ تصور کرتے ہیں (3) سندھ کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ "اصولاً تو مسلمان اور تحتی قبیلے سب برابر ہیں اور آزادی کے ساتھ ایک دوسرے سے شادی کر سکتے ہیں لیکن عملاً مختلف اجزا کی سماجی پوزیشن کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے شادی یا تو اسی قبیلے کے اندر یا ایسے قبیلے کے ممبران سے کی جاتی ہے جو سماج میں مساوی درجہ رکھتے ہوں"(4)

رچرڈ ہرن نے مسلمانوں میں ہندو ذاتوں کے تمام خط و خال کو پایا. یعنی اپنے ہی قبیلے کے اندر شادی کرنا، پیشوں کا مخصوص ہونا، حقِ ترجیح کے ضابطے اور سماجی پابندیاں. جے اتج

---

(1) بلنٹ ای۔ اے۔ اتچ سنس آف انڈیا 1911، جلد 15 یونائیٹڈ پراونسز آف آگرہ اینڈ اودھ پارٹ I رپورٹ صفحہ 358

(2) ٹیلنٹس پی۔ سی سنس آف انڈیا 1921، جلد 7 بہار و اوڑیسہ رپورٹ صفحہ 48 - 247

(3) انتھوون آر۔ ای سنس آف انڈیا 1901، جلد 9 بمبئی پارٹ I رپورٹ صفحہ 177

(4) ایضاً صفحہ 34

(5) ہوٹن جے۔ اتچ سنس آف انڈیا 1931، رپورٹ صفحہ 430

ہٹن اس امر پر اظہارِ افسوس کرتا ہے کہ" باوجود اس کے کہ اطلاعات رضا کارانہ طور پر دی گئی تھیں پھر بھی گورنمنٹ نے صرف ذاتوں کے لکھنے کا حکم دیا" اور لکھتا ہے کہ مسلمانوں کے معاملہ میں ان کے صرف ایسے جتھوں کی فہرست مرتب کی گئی جو کوئی خاص پیشہ کرتے یا کوئی خاص سماجی رنگ روپ رکھتے ہیں جو ظاہر ہے کہ ذات کے نظام سے ماخوذ ہیں" آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ" دو جتھوں کے درمیان شادی بیاہ مسلم جتھے کے معاملہ میں ممنوع ہے یہ مسئلہ بھی ہندو ذاتوں سے ماخوذ ہے"(5)

1931ء کے پہلے تمام مردم شماری کی رپورٹوں میں مسلم ذاتوں کی ایک طویل فہرست دی ہوئی ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کے رہنے والے مسلمان ہندو سوسائٹی کے نمونہ کی اتباع کرتے تھے لیکن بہر حال ہندو ذات کے نظام سے ایک بنیادی فرق اس میں تھا۔ ہندو ذات کا نظام خواہ عمل میں کسی قدر مذہبی کتابوں کے قواعد و ضوابط سے دور چلا گیا ہو لیکن جہاں تک اس کی ماہیت کا تعلق ہے ان کی تائید اُسے حاصل تھی۔ مذہبی احکام اور عمل میں آنے والے مراسم میں کوئی بنیادی اختلاف نہ تھا۔

اس کے برعکس مسلمانوں میں" ذات" اسلام کے احکام کے براہ راست منافی تھی مذہبی نقطۂ خیال سے" ذات" غیر اسلامی تھی اور جب کسی مسلمان کا ضمیر بیدار ہوتا تو وہ اس پر مجبور ہوتا تھا کہ وہ اس سے انکار کرے۔ لیکن اٹھارہویں صدی میں اس بیداری کا خواب بھی نہ دیکھا جا سکتا تھا۔

مسلم قبیلہ بندی نے ہندوؤں سے زیادہ مصیبت میں مبتلا کیا۔ پٹھان اور بلوچ قبائل اور ان کے بے شمار جتھے اور خاندان دریائے سندھ کے مغربی علاقہ میں گنجان بسے ہوئے تھے۔ ہندو قبیلوں نے تبدیل مذہب کے بعد بھی اپنی تنظیموں اور اپنے قبایل کی علاحدگی پسندی کو باقی رکھا۔ یہ مسلم راجپوت جاٹ اور گوجر تھے سیدوں کا دعویٰ ہے کہ وہ عربی النسل ہیں اور مغل اپنے کو وسط ایشیا کے قبائل کی اولاد کہتے ہیں خاندانِ لودی کی حکومت میں بہت سے افغان ہندوستان میں مستقلاً قیام اختیار کر چکے تھے ان میں سوری قبائل جو مغلوں کو اور روہیلوں کو مار بھگانے میں تقریباً کامیاب ہو گئے قابلِ ذکر ہیں اور جنھوں نے اٹھارہویں صدی میں بڑی ناموری حاصل کی تھی۔ ایک قدیمی اور بہت ہی سرکش قبیلہ

میو کا ہے جو دلی کے جنوب مغرب میں رہتے تھے۔

مسلمانوں میں سید مخصوص لحاظ اور انتہائی ادب اور احترام کے لیے مخصوص تھے ایک سید کو مارنا یا گالی تک دینا گناہ تھا۔ اورنگ زیب کا کہنا ہے "عالی نسب سادات سے حقیقی محبت کرنا ہمارے دین کا ایک جز ہے یہی نہیں بلکہ یہ روحانی معلومات کا جوہر ہے اور اس قبیلہ سے عداوت رکھنا آتش جہنم میں داخل ہونے اور غضب کے مستحق ہونے کا باعث ہے"

مغل اور پٹھان سپہ گر طبقے تھے۔ مغلوں پر حکمرانوں کی خاص نظرِ التفات تھی ان کو شہری اور فوجی ذمہ داریاں سونپی جاتی تھیں۔ حکومت سے وفاداری کے معاملہ میں پٹھان مشکوک تصور کیے جاتے تھے وہ عام طور پر حاکمِ وقت سے سرکشی اور بغاوت کرتے رہتے تھے۔

اونچے طبقے کے ہندو جو اسلام لے آتے تھے ان کو نو مسلم کہا جاتا تھا اور ان کو شیخ کا لقب دیا جاتا تھا۔ وہ اپنے ابتدائی جتھے ذات کے نام پیشے اور رواج سے پٹے رہتے تھے۔ وہ مسلمان جو ہندوستان میں پیدا ہوئے (خواہ وہ نو مسلم ہوں یا ماقبل کے تارکینِ وطن کی اولاد ہوں) زیادہ عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ بادشاہ باہر سے آئے ہوئے مسلمانوں پر اپنا لطف و کرم اور مناصب برساتا رہتا تھا جو اپنے آپ کو برتر سمجھتے تھے "او" اور "فرائر" ان کے جذبۂ برتری سے تعجب میں آگئے وہ لکھتے ہیں کہ یہ لوگ (یعنی مغل) اس میں فخر محسوس کرتے تھے وہ گورے کہے جاتے ہیں۔ ہندوستانیوں سے نفرت کے انداز میں جو سیاہ فام تھے۔

ہندوؤں کی طرح مسلمان میں بھی دو طبقے تسلیم کرتے تھے ایک وہ جو اعلیٰ درجے کے تھے اور حکومت کی کارروائیوں میں دخل دینے کا منصوبہ رکھتے تھے اور "شریف" کہلاتے تھے دوسرے جو زیادہ تر نیچے درجے کے ہندو تھے اور تبدیل مذہب کرکے مسلمان ہوئے تھے "رذیل" (قابلِ نفرت) کہے جاتے تھے۔

اس طرح علاقائی قبائلی نسلی فرقہ ورانہ اور ذات کی تفریقات کے باعث مسلمان ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے تھے۔ تورانی ایرانیوں کے رقیب تھے۔ افغانی مغلوں کے مخالف تھے جنھوں نے دلی میں انھیں نکال کر ان کی جگہ لے لی تھی۔ ہندوستانی مسلمان ولایتوں کے (یعنی وہ لوگ جو ممالکِ ایران و ماورائے آکسس سے آئے تھے) غرور پر ناراض تھے۔ شیعہ تین خلفا کو بُرا بھلا کہتے تھے جن کو سنّی لوگ مسلمانوں کے دینی پیشوا (خلفاءِ راشدین) تصوّر

کرتے تھے سنی شیعوں کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتے تھے۔ (رافضی)

مسلمانوں میں پیشہ کی بنیاد پر بے شمار ذاتیں تھیں مثلاً سوت بننے والے (جولاہے) ذبح کرنے والے (قصاب) پانی لے جانے والے (بہشتی) جھاڑو دینے والے (لال بیگی) وغیرہ۔

سوسائٹی میں تفریق ڈالنے والی ترغیبات اور سیاسی معاملات میں چند افراد کی جو اونچی ذاتوں پر مشتمل تھے حکمرانی پر اجارہ داری مسلمانوں میں بھی اسی طرح قائم تھیں جس طرح کہ ہندوؤں میں تھیں۔

ہندوستان میں سماجی زندگی کی بنیاد ذات اور قبیلہ ہی ہے لیکن رشتہ داریوں کے ماسوا اور بھی معاملات ہیں جو انسان کی اجتماعی زندگی تہہ میں ہیں۔ ان میں علاقہ کو اہمیت حاصل ہے یہ قرب مقامی کا اصول ہے یعنی ہمسائگی۔ زمین انسان کی بعض لازمی ضروریات پوری کرتی ہے اور اس کا ناجائز استعمال ایسے تعلقات کو جنم دیتا ہے جو جتھا بندی کی بنیاد ہیں۔

ذات اور قبیلے لازمی طور پر علاقائی نہیں ہیں لیکن ہندوستان میں ان کی کثرت ان کے اندر تقریباً خود اختیاری اور اندرونی سالمیت یہ وہ عوامل تھے جو باہم مل جل کر ان کے ایک عظیم تر وحدت بننے میں مانع ہوئے۔ ایک مربوط ہندو سوسائٹی کا تخیل کبھی نشوونما نہ پا سکا حتیٰ کہ جو ایک ہی علاقہ میں رہتے تھے اور ایک ہی زبان بولتے تھے ان میں بھی مل جل کر سب کی ایک مقامی سوسائٹی کا تخیل پیدا نہ ہو سکا کبھی کوئی بنگالی یا پنجابی یا آندھرا یا تامل یا گجراتی قومیت رونما نہیں ہوئی مرہٹوں کا تلاطم استثنا تصور کیا جا سکتا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہ تھا کیوں برہمن پیشواؤں کے زمانہ میں کٹر تقلیدی تربیت نے پھر سر اٹھایا اور کچھ بھی تھوڑی سی سالمیت انقلابی سماجی طاقتوں نے پیدا کی تھی انھیں ختم کر دیا۔

نیشنلزم کے مثبت اور منفی دونوں پہلو ہیں یہ اپنے اندر ان لوگوں کو شامل کرتا ہے جو ایک خاص طور طرز رکھتے ہیں اور بقیہ سب کو اپنے سے خارج کر دیتا ہے۔ شیواجی نے جو سیاسی نظام تعمیر کیا تھا اور جو ان کے بعد کے آنے والوں کو وراثۃً ملا اس میں ایک خالص مرہٹہ قوم کا ایسا تخیل کبھی نمایاں نہیں ہوا جو قومی اور اخلاقی پابندیوں سے بندھا ہوا ہو اور مرہٹوں کی انفرادیت قائم رکھنے کی لگن رکھتا ہو۔

مزید براں ذات کا فلسفہ اس کی اجازت ہی نہیں دے سکتا تھا کہ پیشہ یا فرقہ ہی کی

بنا پر سماجی گروہ بندیاں یا رشتہ داریاں زیادہ پھیلی ہوئی ہوں۔ برہمن چھتری یا دوسری ذاتوں نے کل ہند بنیاد یا علاقائی ہی بنیاد پر کبھی باہمی تعاون نہیں کیا اور نہ زراعت، تجارت یا صنعت کے پیشوں نے اس جانب رہنمائی کی کہ ایک قوم کے پیشوں کا ایک وفاق تیار کیا جائے۔ وشنو اس شیواس اور شاکتاس جو مختلف علاقوں میں آباد تھے برائے نام ہی یہ محسوس کیا کہ ان کی طرح کے فرقے دوسری جگہ بھی آباد ہیں اگرچہ نانک، کبیر اور چیتنیا اور رام داس وغیرہ نے ایسی تحریکات چلائیں جن کا نظریہ ہمہ گیر تھا لیکن وہ بھی محدود ہو کر رہ گئیں۔

قبیلوں نے بھی ایک ساتھ مل جل کر کام کرنے کی کسی رغبت کا کوئی اظہار نہیں کیا سندھ کے جاٹ، پنجاب کے جاٹ، راجستھان کے جاٹ اور اتر پردیش کے جاٹ اپنا تنہا ہل چلانے پر قائم رہے، یہی پنجاب، راجستھان، اتر پردیش اور وسطی ہندوستان کے راجپوتوں نے بھی کیا۔ ترقی یافتہ قبیلوں میں کسی طرح کا باہمی میل جول نہ تھا۔ افغان، پٹھان، بلوچی روہیلہ وغیرہ ایک ہی مذہب کے پیرو تھے لیکن ان کا کوئی مشترک منصوبہ یا نظام نہ تھا۔

اس طرح نہ تو ہندو اور نہ مسلمان مجموعی طور پر ایک واحد سوسائٹی بناتے تھے اس وقت جو حالات تھے ان کی بنا پر ان کے لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ اپنے مذہبی اختلافات کو دور کر دیتے اور مل جل کر ایک وطنی قومیت بن جاتے۔

کثرت کے یہ عہد برابر تفریقات کی جانب اشارے کرتے رہے اور اس میں ایک وحدانی تشکل اختیار کرنے کا کوئی ضروری مادہ نہ تھا۔

(6) گاؤں

ذات ایک نیم سماجی مذہبی ادارہ تھا لیکن اس کے عظیم اقتصادی نتائج تھے اگر اپنے سماجی مذہبی پہلو سے سوسائٹی ڈھیلے رشتہ میں بندھی ہوئی مختلف ذاتوں کا ایک مجموعہ تھی تو اپنی سیاسی اقتصادی پہلو سے یہ بہت سے گاؤں کا ایک مجموعہ تھی جس میں گاؤں اس کی اقتصادی اور علاقائی اکائی تھے۔ یورپ کے از منہ وسطیٰ میں انگلستان میں جو مینور اور فرانس میں سگینور تھے وہی اٹھارھویں صدی کے آخر تک ہندوستان میں گاؤں تھے۔

لیکن ہندوستان کا گاؤں اپنی ابتدا اپنے عمل دخل اور اپنی تعمیر میں یورپ سے مختلف تھا۔ موخر الذکر عالمگیر جنگ اور تشدد کی للکار کے نتیجہ میں عالم وجود میں آئے تھے اور مقدم الذکر

قانونِ حیات مرتب کرنے کی کوشش کا آئینہ دار تھا۔ ورن آشرم دھرم
یہ امر کہ واقعاتی حیثیت اور بنیادی اصول میں بہت دُور کا فاصلہ تھا کوئی معقول دلیل اس کی تہہ کے اصول موضوعہ کو نظر انداز کرنے کی نہیں ہے اور نہ تو اس نظریہ کی تردید اس واقعہ سے ہو سکتی ہے کہ اٹھارھویں صدی کے ہنگامہ خیز زمانہ میں گاؤں قلعوں کی شکل میں نظر آتے تھے جن کے چاروں طرف دیواریں تھیں۔ برج اور پاسبانی کے لیے مینارے تعلقدار اور ماتحت (دیسل) کے رشتے تھے۔ اس کی اقتصادی بنیاد اور اس کی عمارت بالائے عمارت کی مالیات دونوں اس کے جنگ جویانہ اغراض کا اعلان کرتے تھے۔

ہندوستان کے گاؤں میں زرعی غلام یا ایسے غلام کے لیے جو زمین یا آقا سے بندھے ہوئے ہوں کوئی جگہ نہ تھی۔ ہندوستان کے گاؤں براہِ راست جنگوں میں حصہ لیتے تھے یہ فرض راجاؤں اور بادشاہوں یا ان ذاتوں کا تھا جن کا پیشہ ہی لڑائی لڑنا تھا۔ ہنری مین کہتا ہے کہ "اگرچہ امن بردار برطانیہ کے اقتدار کے قیام کے قبل ہندوستان جس مسلسل جنگ کی لعنت میں گرفتار رہا اتنا کوئی دوسرا ملک نہ تھا۔ لیکن پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کے لوگ کبھی جنگجو قوم نہ تھے۔" (1) ہندوستان کے مواضعات کا اصل کام یہ تھا کہ دھرتی ماتا کو حتی المقدور دبا کر اتنی پیداوار نکالیں جس سے بنی نوعِ انسان کی غذا کامیابی کے ساتھ مہیا ہو سکے۔ اس مقدس کام میں سب کی شرکت واجب تھی یعنی برہمن اپنی عبادتوں اور پیشین گوئیوں اور مذہبی احکام و رسوم کی کارروائیوں سے چھتری اپنے حفاظتی انتظامات اور سرپرستی سے کسان اپنی محنت سے اور اہل حرفہ اپنے فن کی خدمت سے تعاون کریں۔ زمین سے جو کچھ بھی پیدا ہوا اس میں سے ہر ایک کو اپنی خدمت کا معاوضہ حصہ رسدی کے طور پر ملے۔

مسلمان جو گاؤں میں آباد ہو گئے وہ بھی اسی رنگ میں رنگ گئے ہندو نظام کے ورثہ خیالات نے ان کے دماغوں پر قبضہ کر لیا۔ مذہب، عبادت، رسوم اور تہواروں کے معاملات میں مسلمان مختلف تھے لیکن ان کے انجام دینے کے طور طریق میں انھوں نے بہت سا رنگ ڈھنگ ہندوؤں سے مستعار لے لیا تھا۔ گاؤں کے عام میلوں اور رنگ رلیوں میں دونوں مشترک

---

(1) ہنری مین ولیج کمیونٹیز ان دی ایسٹ اینڈ ویسٹ لندن 1887 صفحہ 124

ہو کر کام کرتے تھے اور تہواروں میں جو کسی ایک ہی کا مخصوص ہوتا تھا دونوں شریک ہوتے تھے
اس زمانہ کے حالات کے مطابق گاؤں نے ایسا اندرونی تال میل بنا لیا تھا جس نے استحکام اور امن قائم کر دیا اور ایک پر اس کی حیثیت کے مطابق ذمہ داری ڈال دی تھی لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوا کہ اس نے سماجی حالات کو بے جان کر دیا. سوسائٹی جو درجہ دار طبقات میں تقسیم ہو گئی تھی وہ مضبوطی سے اپنی اسی جگہ پر قائم ہو گئی۔ فرد کا حال یہ تھا کہ وہ اپنی پیدائش کے دھاگے میں بندھا ہوا تھا اور اس کو اپنی حالت میں تبدیلی کرنے کے مواقع حاصل نہ تھے گاؤں کے لوگ مضبوطی سے الگ کیے ہوئے خانوں میں بٹ گئے جس میں ایک مختصر اقلیت کو حق اعلیٰ عزت اور عیش میسّر تھا اور زبردست اکثریت کے عوام کو محنت کی چکّی میں پیسے جانے ستمگرانہ احتیاج اور خلاف انصاف ذلتوں کی سزا دے دی گئی۔

گاؤں اور قصبات

گاؤں اقتصادیات کی مشین کے پہیّے کے بیچ کا حصّہ یعنی مرکز تھا. زراعت صنعت اور تجارت سب اسی کے گرد گھومتے تھے اس معاملہ میں ہندوستان وسطی زمانہ کے یورپ سے مختلف تھا جہاں اقتصادی زندگی منقسم تھی یعنی زراعت تو گاؤں کے حصّہ میں تھی اور صنعت اور تجارت قصبات کے حصّہ میں. ہندوستان میں شہر بھی تھے لیکن وہ صرف اس طفیلی کیڑے کی طرح تھے جو دوسرے پودے یا کیڑے سے غذا حاصل کرتا ہے۔ کچھ تو سیاسی اقتدار کے مرکز تھے اور کچھ مذہبی مرکز تھے کچھ کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ دریا کے گھاٹ یا سڑک کے چوراہے پر واقع تھے لیکن ان میں کوئی ایسا نہ تھا جس کی خوش حالی یا آبادی کسی آزاد صنعت یا تجارت کی وجہ سے ہو۔ برنیر کو یہ نظر آیا کہ شہروں کا تنزل حکمرانوں کی لاپرواہی کا نتیجہ تھا مثلاً لاہور اس لیے اجڑا ہوا تھا کہ حکمران دلّی یا آگرہ میں رہتے تھے اس کو یہ بھی نظر آیا کہ دلّی اور آگرہ کی آبادی کا بیشتر حصّہ فوج کی موجودگی پر منحصر تھا (1) درحقیقت باشندگان دلّی شاہی فوج کا ایک حصّہ تھے ان کی حقیر صنعت کا بیشتر حصہ قلیل التعداد صاحبان اقتدار، سیاسی افسران، دولت مند امرا اور ان کے خواص کی ضروریات پوری کرنے کے لیے وقف تھا.

---

(1) برنیر. ایف ٹریولس ان دی مغل امپائر (کانسٹیبل اینڈ اسمتھ ایڈیشن 1934) صفحہ 85-384

لیکن شہروں کے دل صنعتی کارخانوں میں ہر وقت کام کی مشغولیت کے سبب شور و غل سے یا جان دار پریس کی آوازوں سے یا تاجروں کے بازار میں سودا کرنے کی دوڑ دھوپ کی ہلچل سے دھڑکتے نہیں رہتے تھے۔ شہریوں کی کوئی ایسی کونسل نہ تھی کہ تعلقدار یا مذہبی پیشوا اگر ان کی آزادی میں مداخلت کریں تو وہ ان کے سامنے مقابلے کے لیے کھڑی ہو اور نہ اٹھارھویں صدی کے ہندوستان کا گاؤں اسی صدی کے انگلستان کے گاؤں کے مثل قرار دیا جا سکتا ہے کیوں کہ انگلستان میں شہروں کے باہر رہنے والی ایک کثیر آبادی کے رزق کا انحصار زراعت پر نہیں بلکہ کلیتہً یا جزءً صنعتی پیشوں پر تھا (۱)

ہندوستان میں زراعت ہی حاوی تھی اور وہ ذاتیں بھی جو شروع میں دوسرے پیشوں سے تعلق رکھتی تھیں وہ بھی زراعت کو بطور ایک اضافی پیشہ کے اختیار کر لیتی تھیں۔

گاؤں سماجی زندگی کے مرکز کی حیثیت سے

گاؤں سماج کے تمام تحریکات کا مرکز تھا۔ گاؤں ہی اپنے باشندے کو ایک گھر دیتا تھا جس میں وہ رہتا تھا شادی کرتا تھا اور بچے پیدا کرتا تھا یہ اس کے دیوتاؤں کا بھی استھان تھا گرام دیوتا اور کل دیوتا اور ان دیوتاؤں کی متبرک جگہیں، یہی اس کے پیشوں کے کرنے کا مقام تھا۔ گاؤں ہی میں اس کو زمین ملتی تھی جس میں وہ فصل اگاتا تھا۔ جس سے اپنا پیٹ پالتا، اپنے کپڑے اور رہنے کے مکان کا سامان کرتا تھا۔ کلچرل اور اجتماعی زندگی کا بھی یہی مرکز تھا۔

گاؤں میں مکانات صرف پناہ کے لیے بنائے جاتے تھے لیکن علاقے علاقے آب و ہوا کے حالات پر جو ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف تھے تعمیر کا انحصار ہوتا تھا البتہ خاص فرق چھت چھانے کے معاملہ میں تھا یعنی ڈھلوان چھت جو پھوس یا کھپریل سے چھائی ہوئی تھی یا ہموار چھت جو لکڑی کی بلیوں اور پٹیوں پر ہوتی تھی۔ مٹی کی دیواریں اور کچے مٹی کے پٹے ہوئے فرش عام تھے لیکن گاؤں کے مکانات رہنے والوں کی حیثیت کے مختلف قسم کے ہوتے تھے یعنی دولت مند زمین داروں اونچے طبقہ کے لوگوں کا شتکاروں

---

(۱) کول اینڈ پاسٹ گیٹ دی کامن پیپل صفحہ 24-123

اہل حرفہ اور ان ذاتوں کے مکانات جن کا پیشہ گندہ ہے ایک دوسرے سے مختلف تھے زمیندار کے مکان کے علاوہ بقیہ مکانات ایک ہی جگہ تنگ اور پیچیدہ گلیوں کے آس پاس گڈمڈ ہوتے تھے انسان اور جانور آس پاس ہی رہتے تھے اور حفظان صحت کے حالات کو یک قلم نظر انداز کیا جاتا تھا۔

گاؤں کی آبادی عام طور پر محنت کش اور مزدور طبقوں، اونچی ذات کے لوگوں اور سرکاری افسران پر مشتمل ہوتی تھی۔ محنت کش طبقہ میں کسان اور اہل حرفہ شامل تھے اہل حرفہ یا تو بوتر پیشوں کے کرنے والے ہوتے تھے یا ذات کے باہر کے لوگ۔ اونچی ذاتوں میں برہمن چھتری (مالکان اراضی کا گروہ) اور ویش (وہ لوگ جو تجارت اور بنک وغیرہ کے کام میں مشغول رہتے تھے) شامل تھے۔ اسی طرح مسلمان جو گاؤں میں آباد تھے یا تو اونچے طبقہ کے ہوتے تھے (یعنی شریف) جو بالکل ہندوؤں کی اونچی ذاتوں کے مشابہہ تھا یا نیچے طبقے کے (رذیل یعنی وہ لوگ جو کمتر درجہ کے پیشے کرتے تھے۔

ذاتوں کی تعداد معین نہیں تھی لیکن ایک اوسط درجہ کے رقبہ کے گاؤں میں پندرہ سے بیس تک ذاتیں ہوں گی۔ گاؤں کے حسنِ انتظام کا انحصار ان سب کے تعاون پر تھا کیونکہ گاؤں کے تمدنی جسم کے یہ اعضا تھے۔

گاؤں کے جماعتی نظام سے تین قسم کے فرائض منصبی متعلق تھے (1) سماجی مذہبی اور ثقافتی (کلچرل) (2) اقتصادی (3) انتظامی اور سیاسی۔

1۔ کلچرل

سماجی، مذہبی اور ثقافتی ذمہ داریوں کے فرائض میں ذات کے اندرونی انتظامات ممبران کے باہمی تعلقات کو ہموار کرنا ان کو ہم نوالہ وہم پیالہ بنانا زن وشو کے تعلقات کو سنوارنا اور ان سب کے لیے ضابطے تیار کرنا شامل تھے مختلف ذاتوں کے معاملات گاؤں کے عام تہوار اور مذہبی رسوم کا انجام دلانا اور تعلیم تفریح اور کھیل کود بھی ان میں آتے تھے ان فرائض کو معقول طریقہ پر ادا کرانے کا آلہ ذات کی پنچایت تھی۔

2۔ اقتصادی

(الف) زراعت

جہاں تک کہ اقتصادی نظام کا سوال تھا گاؤں ایک خودکفیل اکائی تھا اس کی پیداوار کی کل صلاحیتیں غلہ پیدا کرنے تک محدود تھیں کاریگری اور حرفت جزوی حیثیت رکھتے تھے اور تجارت اور بنک کا کام وغیرہ مختلف قسم کی فصل اگانے اور ان کی تقسیم اور استعمال کو مرتب کرنے میں محدود معاون ہوتا تھا۔ دیہات کا معیارِ زندگی بہت پست تھا گاؤں کی اقتصادیات صرف زندہ رہنے کے حد سے اوپر کبھی نہیں اٹھی۔

گاؤں کی ضروریات سے جو کچھ پیداوار فاضل ہوتی تھی اُسے مختلف ایجنسیاں چھین لیتی تھیں جیسے تعلقدار، درمیانی لوگ اور حکومت زراعتی ترقی کے لیے مزید لگانے کے لیے کچھ بچتا نہ تھا۔

سرمایہ دارانہ نظام اور مشینوں سے کام کرنے کا وقت آنے سے پہلے گاؤں کا نظام صدیوں تک بلکہ تقریباً عہدِ ہزار سالہ تک اسی طرح بلا کسی ترمیم یا تبدیلی کے قائم رہا گاؤں لازمی طور پر جوتنے کے قابل کھیتوں اور رہنے کے لیے گھروں کے ایک باضابطہ مجموعہ کا نام تھا اس میں کئی طبقوں کے لوگ بستے تھے جن کے اندر آپس میں کسی نہ کسی قسم کا کوئی تعلق تھا اور کام میں شرکت کا کوئی نہ کوئی ذریعہ تھا۔

گاؤں کی زمین یا تو قابلِ زراعت تھی یا قابلِ زراعت زمین جوتوں میں بٹی ہوئی تھی جسے کاشتکار انفرادی طور پر جوتتے تھے۔ برخلاف یورپ کے ان کے حدود کی نشاندہی جھاڑیوں یا کھائیوں سے نہیں ہوتی تھی۔ پانی کی نالیاں یا دوسرے غیر واضح شکلوں سے کھیتوں کی نشان دہی ہوتی تھی۔ ہر کاشتکار کی جوت الگ الگ ہوتی تھی اور ایک کا رقبہ دوسرے سے مختلف تھا۔ جیسا کہ صوبہ پنجاب کے پرگنہ بادشاہ پور کے 81-1680 کے محاصلِ جزیہ کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے (1)

پرگنہ کی کل آبادی 855 تھی۔ ان میں سے 320 مفلس اور ادائگی کے قابل نہ ہونے کی وجہ سے جزیہ کی ادائگی سے بری کر دیئے گئے تھے 535 جو بچے اور جن سے مجموعی آمدنی

---

(1) ملاحظہ ہو خلاصہ السیاق (ایم۔ ایس ان دی لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ فولیو 39-38)

2950 روپے سالانہ تھی ان میں سے 88 اول درجہ کے تھے اور 1100 سو روپیہ دیتے تھے 145 متوسط درجہ کے تھے اور 904 روپیہ 4 آنہ دیتے تھے اور بقیہ 302 وہ تھے جو سوسائٹی کے سب سے ادنیٰ درجہ کے تھے اور 934 روپیہ 12 آنہ دیتے تھے۔

بنجر زمین جانوروں کے چرانے اور لکڑی کاٹنے کے لیے استعمال ہوتی تھی اور کل گاؤں والوں کے انتظام میں رہتی تھی ان تقسیموں کے علاوہ کچھ زمین تالاب، کنواں، قبرستان باغ جانوروں کے کھڑے کرنے اور جماعتی کاموں کی جگہ قرار دے دی جاتی تھی۔

زمین کے استعمال کا کل بوجھ کاشتکار کے کندھوں پر تھا۔ ہر کاشتکار اپنے اہلِ خاندان اور متوسلین کے ساتھ اپنے فارم پر جو تنہا اس کا ہوتا تھا کام کرتا تھا۔ کھیتوں کو پُرانی وضع کے ہل سے جوتتا تھا۔ اور دریا چشمہ کنواں تال یا ذخیرہ آب سے یعنی جس ذریعہ سے بھی اسے پانی ملے اس سے سینچتا تھا۔ نراتا تھا۔ چڑیوں جانوروں اور بلا کی طرح آنے والے کیڑوں سے اُسے بچاتا تھا اور پھر فصل کو کاٹ کر کھلیان میں جمع کر دیتا تھا۔

کاشت کاری کی کارروائیوں میں بڑی بڑی زحمتیں تھیں اس کے اوزار بہت ابتدائی وقت کے تھے۔ فصل کے لیے جو کھاد ملتی تھی وہ بہت کم تھی بیج کا انتخاب نہیں ہوتا تھا۔ آہستہ چلنے والے بیلوں سے طاقت کا جو حصّہ میسر ہوتا تھا وہ بہت کمزور تھا اور ذرائع آبپاشی محدود تھے لیکن ان تمام رکاوٹوں کے باوجود کاشتکار وہ کام انجام دیتا تھا جو ہندوستان کے باہر سے یہاں آنے والے سیاحوں کو معجزانہ کارنامہ نظر آیا یعنی وہ سال میں دو اور کبھی کبھی تین فصلیں کاٹ لیتا تھا۔ یورپ میں اٹھارھویں صدی کے زرعی انقلاب سے پہلے کے زمانہ میں جو طریقۂ کار رائج تھا اگر اس کا مقابلہ یہاں کے کاشت کار سے کیا جائے تو وہ پسماندہ نہیں کہا جا سکے گا۔

گاؤں کے باشندوں کی ضروریات کے لیے ہر چیز وہ کافی مقدار میں پیدا کر لیتا تھا۔ غلّہ، ترکاری، کچھ مسالے کھانے کو مزیدار بنانے کے لیے ریشے جیسے روئی اور لباس کے لیے سنجاف۔ اپنے کپڑوں کو رنگنے کے لیے سبزی سے بنے ہوئے رنگ جیسے نیل اور مجیٹھ۔ پان چبانے کے لیے۔ تاڑی، افیون، بھنگ اور تمباکو طبیعت میں تازگی فرحت اور اُمنگ لانے کے لیے۔ اپنی نقدی ضروریات کے لیے وہ تیل، اوکھ، سرسوں، روئی اور السی کی کاشت کرتا تھا۔ وسیع اور بنجر زمین اور جنگلات میں اس کو لا محدود رقبہ اپنے جانوروں کی چراگاہ

کے لیے حاصل تھا اور جو زمین کی زراعتی کارگذاریوں میں ممد و معاون ہوتا تھا اور کثیر تعداد میں اس کو دودھ مکھن اور چمڑا حاصل ہوتا تھا۔ اس کو کھانے کے لیے کافی ملتا تھا اگرچہ آج کے مغرب کے حالات میں اس کا معیار زندگی پست تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے بعد کے آنے والے اپنے جانشینوں کے مقابلے میں جو انگریزی راج کے تحت تھے وہ زیادہ آرام دہ اور بہتر زندگی بسر کرتا تھا۔ کیوں کہ اٹھارھویں صدی میں زمین بہت زیادہ تھی اور اس کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ کم زرخیز زمین کو جوت میں شامل کیا جائے۔ ہندوستان کی آبادی چونکہ مختصر تھی یعنی 100 اور 140 ملین کے درمیان اس لیے انسان کی ذاتی قیمت بہت اونچی تھی اور اس کو بہتر زندگی گذارنے کے زیادہ بہتر مواقع حاصل تھے۔

وسطی زمانہ کے ہندوستان کی زراعت کے بعض انوکھے رنگ روپ تھے پیداوار کے لوازمات میں 2 کی خاص اہمیت تھی۔ زمین اور مزدور۔ جہاں تک زمین کا تعلق ہے اس کی مقدار اس قدر زیادہ قابلِ حصول تھی کہ باہمی مقابلے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ اس کا شمار کیا گیا ہے کہ ہندوستان میں ایسے علاقے تھے جہاں آج کے مقابلے میں صرف اس کا آدھا رقبہ جوتا جاتا تھا اور دوسرے علاقوں میں دو تہائی یا تین چوتھائی۔ کوئی بھی علاقہ ایسا نہ تھا جہاں زمین پر دباؤ بھرپور حد تک پہنچ گیا ہو۔ اگر کوئی شخص زمین کا خواستگار ہوتا تو بس جنگل کے ایک حصہ کے درختوں کو کاٹ کر صاف کر دیتا اور جوتنے کے لیے اس پر قابض ہو جاتا تھا۔

مغل سلطنت کا سب سے مرکزی حصہ دریائے جمنا اور گنگا کے کنارے آگرہ سے ڈھاکہ تک کا علاقہ تھا۔ لیکن دریاؤں کی اس وادی کے اندر کثرت سے جنگلات تھے متھرا اب بھی "برسان" کے مشہور جنگل میں تھا جہاں اکبر شیر کا شکار کیا کرتا تھا۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں اودھ بدستور بہت سے جنگلات کے درمیان کا ایک ٹکڑا تھا۔ الٰہ آباد سے بنارس اور جونپور تک کا مزروعہ رقبہ آج کے مزروعہ رقبہ کا 1/4 تھا۔ اور گھاگھرا کے کنارے تو 1/2 یا [illegible] ہی تھا۔ کڑا میں جنگلی ہاتھی گھومتے تھے۔ اعظم گڑھ، غازی پور، گورکھپور اور بستی کا زیادہ حصہ غیر مزروعہ تھا۔ جنگلی جانور ہاتھی اور گینڈے وغیرہ سے یہ علاقہ پٹا پڑا تھا۔ بہار میں آج مزروعہ زمین کل رقبہ کا نصف ہے لیکن اٹھارھویں صدی میں 1/5 سے زائد نہ تھا۔ شمالی بہار ترہت، چمپارن، مظفر پور اور دربھنگہ جنگلوں سے ڈھکے ہوئے تھے اگرچہ مغربی بنگال گنجان بسا ہوا تھا لیکن مشرقی بنگال دلدل اور بیابانوں سے بھرا ہوا تھا۔

مغلوں کے راج میں مزروعہ رقبہ بالخصوص وادی گنگا میں کچھ اضافہ ہوا۔ ایسے اہم علاقوں میں جیسے دلّی، آگرہ، اجودھیا، پریاگ، جونپور، بنارس، پٹنہ، راج محل، بردوان وکرماپور اور پٹنہ میں آبادی بھی پھیلی اور زراعت بھی لیکن انیسویں صدی کے حالات سے اگر مقابلہ کیا جائے تو آبادی گنجان نہیں تھی اور ناقابلِ زراعت، بنجر اور غیر مزروعہ زمین کا تناسب بہت زیادہ تھا۔

اس صورتِ حالات کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ قابلِ زراعت زمین کی سپلائی بکثرت تھی اور "زمین نے عام طور پر ابھی قدر و قیمت حاصل نہ کی تھی" (1) زمین کی قیمت برائے نام تھی۔ سر ٹامس منرو 1807ء میں لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ "اس سے زیادہ اور کوئی چیز صاف نہیں ہے کہ زمین کے ملکیت ہونے کے خیال کا وجود ہندوستان میں کہیں بھی اور کبھی بھی سوائے ساحل مالابار کے نہ تھا" (2) انگریزوں کی فتح کے پہلے پنجاب میں زمین کے بیعانہ کا نام تک نہ تھا (3) سر جان اسٹریچی نے لکھا ہے کہ "اگرچہ ہماری پالیسی یہ رہی ہے کہ زمین میں انفرادی ملکیت کے نشو و نما کی ہمت افزائی کریں۔ پرانی حکومتوں نے اس ملکیت کے وجود کو تسلیم نہیں کیا" (4) الفنسٹن نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ عملی صورت میں سوال یہ نہیں ہے کہ جائداد کس کی ملکیت ہے بلکہ ہر فریق کو پیداوار کا کونسا حصہ ملنا چاہیے۔(5)

"بنٹ" گونڈہ سروے رپورٹ میں کہتا ہے کہ "ابھی تک ذاتی جائداد کا کوئی نشان نہیں ہے خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی" 6 اسی طرح "سر جان کیمپبل" کے ان الفاظ کا حوالہ دیا جاسکتا ہے کہ "ہم بہت آسانی سے یہ بھول جانے پر مائل رہتے ہیں کہ زمین میں ایسی ملکیت کا تخیل کہ اسے بازار کے قابل چیز سمجھا جائے وہ کسی ایک کی ملکیت ہو اور کسی دیگر مال و متاع کی طرح ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں گذرتی رہے کوئی قدیم طرزِ فکر نہیں ہے بلکہ اس

---

(1) بنگال ریونیو کنسولٹیشن جون 2 - 1808ء (رپورٹ آف برس کامن اینڈ میکر پیرا 67

(2) منرو لیٹر مورخہ اگست 15۔ 1807ء، پیرا 2

(3) تھرنٹن ایس۔ ایس۔ مسلمان اینڈ میٹی مینڈرس ان دی پنجاب صفحہ 66

(4) اسٹریچی سر جن انڈیا (1885 ایڈیشن صفحہ 85

(5) الفنسٹن ہسٹری آف انڈیا 1916ء صفحہ 85

(6) ڈبلو سی بنٹ سٹلمینٹ رپورٹ آف گونڈہ اودھ

نے ابھی حال میں نشو و نما پائی ہے (۱) ایک طویل بحث کے بعد "بیڈن پاول" یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ "ملکیت زمین کے اندر نہیں ہے بلکہ پیداوار کے حصے زراعت کے روزگار اور مالگذاری کی ادائیگی میں ہے"

وافر ہونے کی وجہ سے زمین دوسری جائدادوں سے مختلف تھی یا بازار کے قابل چیز نہ تھی اسی لیے ان زمانوں میں رہن، بیع اور زمین کے انتقال کی بات سنائی ہی نہیں دیتی تھی۔ اٹھارھویں صدی کے اندر دکن میں جو بیع نامے ہوئے اس کے الفاظ یہ تھے کہ "زمین کے مالک نے خریدار سے التجا کی کہ وہ اس کی زمین خرید لے وغیرہ" نتیجہ یہ ہے کہ زمین کی ملکیت کا فیصلہ کرنے میں بڑی دقتوں کا سامنا رہا ہے۔

درحقیقت قبضہ دخل اور استعمال ہی جائداد کے وہ اوصاف تھے جن سے لوگوں کو تعلق تھا۔ قبضہ دخل اور استعمال نے حقوق عطا کیے جو موروثی ہو گئے اور ہندو لا کے مطابق ان کی وراثت طے ہوتی لیکن اس کے ساتھ بھی شرائط تھے ایک کاشتکار اور اس کے ورثا کو اسی وقت تک حق تھا کہ زمین کے ایک ٹکڑے یا کئی ٹکڑوں پر قابض رہیں اور اس کا منافع تصرف میں لائیں جب تک پیداوار میں سے حکومت کا مقررہ حصہ ادا کرتے رہیں گے ان کو بے دخل کرنے کا کوئی سوال نہ ہوگا لیکن اگر وہ کاشت ہی نہ کریں تو ان کو دست برداری پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔

اس طرح ہندوستان کا تخیل جائداد غیر منقولہ کے بارے میں بالکل نرالا تھا اس زمانہ کے یورپ میں جو تصور پھیل چکا تھا اس سے بالکل بے جوڑ تھا۔ اٹھارھویں صدی میں یورپ کے نظام نے جاگیردارانہ اوصاف کو اتار پھینکا تھا۔ اور خود مختاری اور تنہا ملکیت اور انفرادیت کے خصائص حاصل کر لیے تھے اس نے تقریباً تمام وہ مقدس مستقل حقوق حاصل کر لیے تھے (قدرتی ناقابل منسوخی، غیر منفک اور غیر متغیر) جو آزادی، ذاتی جائداد خوش حالی اور کلچر کی بنیاد تصور کیے جاتے تھے۔ عدلیہ نے ملکیت کی مبہم صورتِ حال کو مخصوص حقوقِ مراعات اختیارات اور تحفظ میں بدل دیا جو افراد کو مستقل طور پر عطا ہوئے او متعین طریقوں سے جائز قرار پائے۔

---

(۱) بیڈن پاول: ہسٹری آف برٹش انڈیا ۱۸۹۲ جلد اول صفحہ ۲۹۹

دوسرا معاملہ یعنی مزدور کا معاملہ یہ تھا کہ مزدوروں کی کمی تھی اس لیے اہمیت میں اس کا درجہ اونچا اور اس کی قیمت بڑی تھی بادشاہوں کو یہ فکر تھی کہ جوت کے رقبہ میں اضافہ کریں وہ اپنے گورنران اور دیگر افسران کو بار بار ہدایتیں جاری کرتے تھے کہ کسان کے مفاد کا لحاظ ان کا اولین فرض ہے۔ ناقابلِ برداشت ظلم اور جبر کے خلاف کسان کا سب سے زیادہ کارآمد حربہ عدم تعاون تھا یعنی گاؤں کو چھوڑ دیا اور اگر ضرورت ہوئی تو قریب کے جنگل کو نئے سرے سے صاف کرلیا اور وہیں قیام اختیار کرلیا۔

ان حالات میں مغرب کے نمونہ کی ذاتی یا زرعی غلامی ممکن ہی نہ تھی لیکن بھاگ جانے کی آخری دوا بار بار استعمال نہیں کی جاسکتی تھی۔ ہندوستان کا کاشتکار صابر اور متحمل تھا اس لیے بہت سے مصائب اور ناانصافیاں جن سے بچا جاسکتا تھا خاموشی سے برداشت کرلی جاتی تھیں۔

(ب) گاؤں کی صنعت

گاؤں کے باشندوں کا اصل ذریعہ معاش زراعت تھا۔ یہ ان کی ابتدائی ضروریات کو پورا کرتی تھی لیکن زراعتی کام اہلِ حرفہ کی خدمات کے بغیر کیے نہیں جاسکتے تھے۔ اور دوسری ضروریات بھی تھیں جن کو پورا کرنا تھا اس لیے ہر گاؤں متعدد قسم کے فنون اور حرفوں کا گھر تھا۔ لیکن گاؤں کی صنعت کا بنیادی اصول اس زمانہ میں آج کے وقت سے بہت مختلف تھا اس کے بنے ہوئے سامان کو بیچنے کے لیے بازار صرف گاؤں تک محدود تھا زیادہ تر ایسی ہی اشیا تیار ہوتی تھیں جن کی کھپت گاؤں ہی میں ہوجاتی تھی۔ بہت سا سوت جو کاتا جاتا تھا اور کپڑا جو بنا جاتا تھا تیل جو پیرا جاتا تھا اور چینی جو بنائی جاتی تھی وہ سب گاؤں ہی کے لوگوں کے لیے ہوتی تھی۔ اس کے اہل حرفہ بھی جولاہے، لوہار، بڑھئی، کمہار اور موچی وغیرہ صرف گاؤں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کام کرتے تھے بہت سی چیزیں جو وہ تیار کرتے تھے ان کے دام ملتے تھے لیکن نقدی میں نہیں اور نہ ہر چیز کے الگ الگ دام مقرر ہوتے تھے۔ بلکہ تبادلہ جنس با جنس کا رسم ورواج تھا۔ اور اسی نوعیت سے دام گویا مل جاتے تھے کھیت کے کٹنے کے وقت فصلوں میں اہل حرفہ کا حصہ مقرر تھا۔ اکثر اہل حرفہ کے پاس خود اپنے چھوٹے موٹے کھیت تھے جن کی پیداوار اس حصہ میں اضافہ کرتی تھی جو انھیں کسان سے ملتا تھا۔ اس

اقتصادی نظام میں مال کی مقدار اور مال، مالک کے منافع اور نقصان یا قیمتوں کو پیداوار سے باندھ دینے کے آج کل کے قوانین کا تشکل ہی سے عمل دخل ہو سکتا تھا۔

(س) تجارت

گاؤں کے اندر اور گاؤں کے باہر کچھ تجارت ہوتی تھی۔ ایسا ہوتا تھا کہ ایک غلہ بیچنے والے کی دُکان ہوتی تھی جو ایک طرح کا مہاجن بھی ہوتا تھا ایک مقررہ دن پر کسی بڑے گاؤں میں ایک بازار لگتا تھا۔ جہاں، وہ چیزیں جو عام طور پر نہیں ملتی ہیں خریدی جا سکتی تھیں بازار میں قریب اور دور کے سوداگر آتے تھے اور اپنا سامان خاص سڑک کے دونوں جانب پھیلا دیتے تھے مویشیوں کے میلے جو سالانہ کسی اہم دیہی مقام پر لگتے تھے وہاں اس بات کا موقع ملتا تھا کہ بیل، گائے اور سانڈ خریدے اور بیچے جا سکیں۔

کسان جس کو اپنا لگان نقدی میں ادا کرنا ہوتا تھا اپنا فاضل غلّہ یا تو مقامی غلّہ بیوپاری کے ہاں یا قریب کے بازار میں لے جاتا تھا اور اس معاملہ کرنے میں اس کی نہ ٹلنے والی سخت ضرورت ہوتی تھی اور دوسرے فریق کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا تھا اس طرح گاؤں کی پیداوار کا ایک چھوٹا سا حصّہ گاؤں سے باہر نکل کر شہر میں پہنچ جاتا تھا۔ جہاں اس کی مانگ تھی لیکن یہ بس یک طرفہ ہی معاملہ ہوتا تھا کیوں کہ اس دولت میں سے اُسے کچھ واپس نہیں ملتا تھا جو مالگزاری کی شکل میں باہر نکل جاتی تھی اس طرح دیہی علاقہ بلا معاوضہ برآمد کے نقصانات کی مصیبت میں گرفتار رہتا تھا۔ گاؤں کی خود کفالتی ایک طرف اور دوسری طرف شہروں میں صنعت کی پسماندگی یہ دونوں تجارت کی نشوونما کو روکنے والے حالات تھے۔

گاؤں کو باہر سے کچھ بھی درآمد کرنا نہیں ہوتا تھا اسے جو سامان باہر بھیجنا ہوتا تھا وہ وزنی اور کم قیمت اشیا ہوتی تھیں۔ اس لیے اندرونِ ملک بعید مسافت کی تجارت کبھی بھی وسیع تر نہ ہو سکی۔ البتہ ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ کو سامان آتے جاتے رہتے تھے مثلاً بنگال روئی کا سوت، گیہوں، چینی (یا گڑ) افیون اور نمک درآمد کرتا تھا۔ اور اپنا سلک کا کپڑا اور چاول ہندوستان کے مختلف حصوں میں بھیجتا تھا۔ گجرات کھانے کا سامان درآمد کرتا اور ان فصلوں کو باہر بھیجتا تھا جن کا معاوضہ نقدی میں ملتا تھا مشرقی اور مغربی ساحل چاول چینی اور مکھن باہر سے لے لیتے تھے اور نمک اور سیاہ مرچ بیچتے تھے۔ تیل دوآبہ، بیانہ اور

سرخیل سے جمع کیا جاتا تھا اور سمندری بندرگاہوں کو بھیجا جاتا تھا۔
ملک کے رقبے اور اس کی آبادی پر نظر کرتے ہوئے مجموعی طور پر مال کا اِدھر سے اُدھر چکر کافی نہیں تھا۔ اس کے بہت سے وجوہ تھے یعنی رسل و رسائل کی دقتیں خشکی کے راستے سامان لے جانے میں دشواریاں اور اس میں وافر خرچ اندرونِ ملک میں کثیر تعداد میں پریشان کن چنگی کا نفاذ اور اٹھارھویں صدی میں ملک کے اندر بدامنی کے حالات تجارتی خطرات اور دیہی آبادی کا پست معیار کوئی پکی (کنکری) سڑک نہ تھی اور نقل و حمل کا ذریعہ صرف بوجھ ڈھونے والے جانور تھے۔

(3) گاؤں کا نظم و نسق

گاؤں کا تیسرا اہم کام نظم و نسق تھا۔ اس کے دو پہلو تھے یعنی اندرونی اور بیرونی گاؤں کا نظام امن اور قانون کو برقرار رکھنا تھا۔ اور پولیس اور مجسٹریٹ اور عدلیہ تینوں کے فرائض ادا کرتا تھا۔ اس پہلو سے وہ ایک اندرونی خود مختار ادارہ تھا اور کام کرنے کا آلہ پنچایت تھی۔
شمال میں ازمنہ وسطیٰ کے اندر گاؤں کی پنچایت کی روایات کیا تھیں ان کا نقشہ غیر واضح ہی نہیں قطعی غائب ہے۔ اس کے برعکس دکن اور جنوب بعید میں گاؤں کی پنچایتیں اٹھارھویں صدی کے آخر تک قائم رہیں اگرچہ اس وقت تک وہ اپنی دیرینہ طاقت کھو چکی تھیں۔ بہت سے مال کے مقدمات اور چھوٹے چھوٹے فوجداری کے مقدمات ان کے سامنے فیصلے کے لیے آتے تھے۔ مہاراشٹر میں تمام مقدمات جن کی بنیاد معاہدے پر ہوتی تھی خواہ وہ حساب کے بارے میں اقرارنامے ہوں یا قرضہ جات ہوں یا ایسے مقدمات ہوں جن کا تعلق ذاتی اور شخصی ملکیت سے ہو یا کھیتوں کے حدود کی نشان دہی یا پانی کی تقسیم کے تنازعے ہوں یا زمین پر بذریعہ مقابضت یا بذریعہ تمادی حق کا دعویٰ ہو یا ذاتوں کے مابین جھگڑے ہوں یا مروجہ رسم و رواج کی خلاف ورزی ہو یا معاہدہ شادی کا توڑنا ہو یا متبنیٰ کے قوانین کو نظر انداز کرنا ہو اور ان کے علاوہ تمام تنازعے ھبہ، عطیہ (گرانٹ) یا وراثت سے حاصل شدہ حقوق سے متعلق ہوں یہ سب ان کو فیصلے کے لیے بھیج دیے جاتے تھے۔
چند مقامات پر پنچایت ایک مستقل جماعت تھی جس کو گاؤں کی آبادی مقررہ وقت

پر پہنچتی تھی دوسری جگہوں پر بوقت ضرورت یہ عارضی طور پر بنائی جاتی تھی فریقین دو سے بیس تک لوگوں کو نامزد کرتے تھے۔ اور حکومت کا مقامی افسر ایک ثالث مقرر کرتا تھا تاکہ وہ کارروائیوں کی نگرانی کر سکے۔ جن مقدمات میں روپیہ کے لین دین کا معاملہ ہوتا تھا ان میں کوئی مشہور بنیا معاونت کے لیے مدعو کیا جاتا تھا۔ مذہبی امور میں شاستری لوگ پنچایت پر بیٹھتے تھے مشکل مقدمات میں جہاں پیچیدہ قانونی مسائل آجاتے تھے پوری پنچایت صرف متبحر علما (شاستری) پر مشتمل ہوتی تھی۔

گاؤں کا پٹیل یا مقدم وہ شخص تھا جس پر پنچایت کے طلب کرنے کا انحصار تھا" پاٹنگر" کے قول کے مطابق "جب کوئی تنازعہ ابھرتا تھا تو پٹیل پہلے اسے دوستانہ بات چیت سے طے کرانے کی کوشش کرتا تھا اور اگر وہ ناکامیاب ہوتا تھا اور فریقین پنچایت کا مطالبہ کرتے تھے تو ایک پنچایت کے طلب کرنے کی اجازت دے دیتا تھا پٹیل یا مقدم جب تک دوسری حیثیتوں سے بڑی اہمیت کا حامل شخص نہ ہو خود ممبران کو نامزد نہیں کر سکتا تھا لیکن جس کسی کی گواہی کی ضرورت ہو اس کی طلبی کا حکم وہ دے سکتا تھا۔ (۱)

لیکن پٹیل کے اختیارات پنچایت کو طلب کرنے تک محدود تھے وہ پنچایت کے ثالثی فیصلے میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔ اور اگر فریقین اس بات پر اتفاق کر لیں کہ وہ اپنے دوستوں ہی کو ثالث مانیں گے یا ان کے ہی فیصلے کو قبول کریں گے تو اس میں بھی پٹیل کوئی مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔

پنچایت کی ممبری کا دروازہ ہر ایک کے لیے کھلا ہوا تھا جس میں کسان بھی شامل تھے لیکن عام میلان یہ تھا کہ وہی لوگ چنے جائیں جو زندگی سے معقول حد تک واقف ہوں اور تجربات کی بنا پر فطرتِ انسانی کا ایک اچھا علم رکھتے ہوں

فریقین کو یہ حق تھا کہ وہ ممبران پنچایت کی نامزدگی پر اعتراض کریں اور ان کے تبادلے کا مطالبہ کریں۔ گواہان کی حاضری لازمی تھی، اور قاصر رہنے پر جرمانے کی سزا ہوتی تھی پنچایت کی ممبری کے لیے کوئی مقررہ فیس نہیں تھی لیکن یہ توقع کی جاتی تھی کہ فریقین خرچہ ادا کریں گے مدعی کو مقامی افسر سے وعدہ کرنا پڑتا تھا کہ وہ پنچایت کو طلب کرنے کے لیے ایک رقم ادا کریگا

---

(۱) پانچویں سلکشن آف پیپرس فرام دی ریکارڈس آف ایسٹ انڈیا ہاوس جلد 4 صفحہ 288

لیکن اس کا کوئی پیمانہ مقرر نہ تھا۔

کارروائی کا طریقہ سادہ تھا پہلے مدعی اور اس کے بعد مدعا علیہ اپنے اپنے مقدمہ کا حال بیان کرتے تھے۔ اس کے بعد گواہان بلائے جاتے تھے اور اگر ضرورت ہوئی تو ان کو حلف دیا جاتا تھا۔ اگر کوئی بات تشریح طلب نظر آئی تو پٹواری سے کہا جاتا تھا کہ وہ وضاحت کرے پنچایت کا فیصلہ ضروری غور و فکر کے بعد دیا جاتا تھا جو فریق مقدمہ جیتتا تھا عام طور پر ڈگری کے اجرا کا کام اسی کے سپرد کیا جاتا تھا۔ اگر وہ ناکامیاب ہو تو وہ مقامی افسر کی مدد پر پورا بھروسہ کرسکتا تھا وکلا نہیں تھے مدعی اور مدعا علیہ کے درمیان مصالحت یا پنچایت کے نالثی فیصلے کے ماسوا دیگر کارروائیوں کا کوئی تحریری ریکارڈ نہیں رکھا جاتا تھا۔

ناراض پارٹی کو یہ حق تھا کہ وہ اس سے اونچی عدالت میں اپیل کا حق استعمال کرے وہ پٹیل سے لے کر طراف (تحصیل) کے حاکم یا معاملت دار ضلع کے حاکم تک جہاں اس کی مرضی ہو اپیل کرنے کے لیے انتخاب کرسکتا تھا۔ اگر یہ لوگ اس امر پر مطمئن ہوئے کہ اپیل لائق سماعت ہے تو پھر وہ دوسری پنچایت فیصلے کے لیے مقرر کرتے تھے۔ اگر ڈگری یا سزا رشوت خوری سے یا ممبران کی بداطواری سے حاصل کی گئی ہے یا فیصلہ میں کوئی ایسی چیز ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انصاف اور رسم و رواج سے انحراف کرکے فیصلہ دیا گیا ہے تو پھر ایک نئی پنچائت کا حکم دے دیا جاتا تھا۔

ہر موضع ایک خود مختار ادارہ تھا۔ جو ایک اہم مرکزاعضا کے درجہ داری ترتیب کے ساتھ مرکزی حکومت سے جڑا ہوا تھا۔ گاؤں بنیادی حیثیت رکھتا تھا۔ جس پر سلطنت کا پورا محل کھڑا تھا۔ یہی سرمایہ دیتا تھا جس پر حکومت کی کارروائیوں کا انحصار تھا۔ سرمایہ کی ضرورت کے باعث سلطنت نے گاؤں سے رشتہ جوڑا جو اس کا خاص سرمایہ مہیا کرنے والا تھا۔

وسطی زمانہ کی حکومتوں کا ڈھانچہ تھا اس میں مالگذاری کے نظام کو قدرتاً سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی کیوں کہ اسی نظام کی درستگی اور کارگذاری پر سلطنت کی زندگی اور اس کی طاقت منحصر تھی۔

ہندوستان کے مختلف حصوں میں مالگذاری کا نظام بہت متنوع تھا لیکن یہ تنوع عام بنیادی پلان پر اثر انداز نہ تھا اصل فرق ان بچولیے (درمیانی) لوگوں سے متعلق تھا جو کاشتکار اور حکومت کے بیچ میں تھے۔

سطحی طور پر گاؤں دو طرز کے تھے شمالی اور جنوبی۔ شمال کا جو نمونہ تھا اور جو ہند گنگا میدانوں میں پایا جاتا تھا اس میں گاؤں کی پیداوار بانٹنے والے تین حصہ دار تھے یعنی پیدا کرنے والا۔ درمیانی شخص (زمین دار یا جاگیر دار) اور حکومت۔ جنوب کا جو نمونہ تھا اور جو دکن کے وسطی بلند سطح میدان اور ساحلی علاقوں میں پایا جاتا تھا اس میں پیداوار بالعموم دو پارٹیوں میں تقسیم ہوتی تھی یعنی پیدا کرنے والے اور حکومت میں اغلب ہے کہ یہ تقسیم مسلمانوں کی فتح کا نتیجہ تھی۔

لیکن ان دونوں قسموں کے گاؤں میں دو طبقے کے لوگ بستے تھے ایک وہ جو مالگذاری ادا کرتے تھے اور دوسرے وہ جو نہیں ادا کرتے تھے۔ دوسرے طبقہ میں وہ لوگ تھے جو گاؤں کی ضروریات میں اپنی خدمت سے مدد کرتے تھے (۱) وہ جو خیرات لیتے تھے یا پروہت، علما نجومی، مسجدوں، مندروں اور مزاروں کے خدمت گار (۲) بیوائیں اور پنشن پانے والے لوگ (3) گاؤں کے ملازمین جیسے ہر کارے، رات کو پہرہ دینے والے، فصلوں کی رکھوالی کرنے والے، پانی بانٹنے والے اور گاؤں کی حد بندی والے (۴) گاؤں کے اہل حرفہ اور خدمت کرنے والے جیسے کمہار، ٹھٹھیر، موچی، بڑھئی، دھوبی، حجام، دوکاندار، ناچنے والی لڑکیاں اور بھنگی وغیرہ (۵) بھوم ہین مزدور اور مفلس لوگ مثلاً حقیر اور بھیک مانگنے والے، دکن کے مواضعات ملازمین اور کاریگروں کو "بارہ بلوتا" کہا جاتا تھا (یعنی غلہ میں حصہ پانے والوں کی بارہ جماعتیں)

مالگذاری ادا کرنے والوں میں مختلف ذاتوں کے کسان تھے۔ برہمن سے لے کر ذات باہر تک کے لوگ غیر آباد کاشتکاران بھی جن کا گھر ایک گاؤں میں تھا لیکن انھوں نے دوسرے گاؤں میں کھیتی کے لیے پٹہ پر زمین لے لی تھی۔ اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے مالکان زمین بھی تھے جو خود اپنے کھیت جوتتے تھے اور بڑے بھی جو اپنے کھیت کاشتکاران سے جتواتے تھے یہ طبقہ اتر کے مواضعات میں تو عام تھا لیکن دکھن کے گاؤں میں استثنا کی حیثیت رکھتا تھا یہ لوگ شمال میں "زمین دار" گجرات میں "گراسیاس"۔ کونکن میں "کھوٹ" اور بہار میں "مالگذار" کہلاتے تھے۔

ان دو طبقوں کے علاوہ گاؤں میں ایک چھوٹی تعداد گاؤں اور حکومت کے اہکاران کی بھی رہتی تھی۔

فی صدی کاشت کار اور اس کے خاندان کے سال بھر کے جملہ اخراجات اور حکومت کے مطالبات ادا کرنے کے لیے بچتا تھا۔ کاشتکار کی پیداوار کی معمولی مقدار کے پیشِ نظر یہ بات بڑی ہی اہم تھی کہ وہ گورنمنٹ کو کتنا دے۔

ان حالات کا پریشان کن پہلو یہ تھا کہ بے چارہ بخشش کرنے والا جو کچھ دیتا تھا وہ قطعی ناواقف تھا وہ کس طرح خرچ ہوتا تھا اور ادائیگی کی واحد وجہ جو وہ جانتا تھا یہ تھی کہ رواج اور روایت چلی آ رہی ہے اور یہ پُراسرار عقیدہ کہ جو کچھ وہ اپنا حصہ دیتا ہے وہ اس کی جان و مال کی حفاظت کی فیس ہے دراصل بے شمار نسلوں سے وہ اسی طرح بادشاہ کو پیداوار میں سے ان کا حصہ دینے کا عادی رہا تھا اسے بزرگوں نے یقین دلایا تھا کہ "بادشاہ صرف اپنی رعایا کی خوشحالی کے لیے پیداوار کا ایک حصہ لیتا تھا بالکل اسی طرح جس طرح سورج پانی کو اس لیے سوکھ لیتا ہے کہ وہ پھر اس کا ہزاروں گنا زمین کو واپس دے" (1) ابوالفضل جو کسان کو سوسائٹی کے پانچ عناصر میں سے ایک عنصر تصور کرتا تھا لکھتا ہے کہ "ان کی محنت سے زندگی کا جزوِ اعظم تکمیل کو پہونچتا ہے اور ان کے کام سے قوت اور آسودہ حالی کے دھارے بہتے ہیں" ان کی رائے میں گورنمنٹ کا وہی ایجنٹ ایماندار ہے "جو کسانوں کا تحفظ کرے، رعایا کی نگہبانی رکھے ملک کو ترقی دے اور محاصل میں اضافہ کرے" (2)

ان جذبات کی عظمت کے باوجود واقعہ تو یہ ہے کہ اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کے کاشتکار کی زندگی نادار، بدمزہ، مصیبت خیز اور غیر یقینی تھی۔

حکومت اور گاؤں کے درمیان چھپنے اور ڈھونڈنے کا کھیل مسلسل کھیلا جاتا تھا یعنی ایک طرف سے ہمیشہ اضافہ در اضافہ کا مطالبہ اور دوسری جانب سے مسلسل ٹال مٹول حکومت کی خواہش یہ تھی کہ اتنا زیادہ سے زیادہ لگان زبردستی لے لے کہ کاشتکار کے پاس اتنا ہی باقی رہے جو صرف اس کے خورد و نوش کے لیے کافی ہو سکے۔ اورنگ زیب کی ہدایت تھی کہ ہر وہ شخص جو اپنی زمین جوتتا ہے اس کے پاس اتنا چھوڑ دینا چاہیے جو آئندہ فصل تک اس اور اس کے

---

(1) آئین اکبری ترجمہ بلوچمین ایڈیشن کلکتہ 1927ء صفحہ 5-4

(2) جان اسٹریچی نے حوالہ دیا ہے دی انڈیا [illegible] ایڈمنسٹریشن اینڈ پروگریس (تھرڈ ایڈیشن) صفحہ 126، 1911ء [illegible]

مختصر [illegible] صفحہ

کے خاندان کی کفالت اور بیج کے لیے ضروری ہو۔

یہ پالیسی خودکشی کے مترادف تھی کیوں کہ اس نے وہ مرغی ہی مار ڈالی جو سونے کے انڈے دیتی تھی اس کی وجہ سے پیداوار کو بڑھانے یا کھیتی کے طریقوں میں ترقی دینے کا کوئی جذبہ ہی باقی نہ رہا۔

سالانہ اخراجات جانتے ہوئے گورنمنٹ کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ کس طرح محاصل میں اضافہ کیا جائے کہ یہ اخراجات پورے ہوسکیں۔ مقررہ رقم جو برابر گھٹتی بڑھتی رہتی تھی اور پھر بھی ہمیشہ محسوس ہوتی تھی زمین کا لگان ہی وہ اصل ذریعہ تھا جس سے یہ خرچ پورا کیا جاتا تھا کوئی آدمی حکومت کے اس حق کو ماننے میں عذر نہیں کرتا تھا کہ اسے پیداوار میں ایک حصہ ملنا چاہیے وہ حصہ دراصل لیا ہو وہ وقت وقت اور حکمران حکمران کے ساتھ بدلتا رہتا تھا ہندوؤں کے قانون کی کتابوں کی رو سے حکومت $\frac{1}{6}$ تا $\frac{1}{12}$ لے سکتی تھی اور دشواریوں کے اوقات میں $\frac{1}{4}$ تک لیا جا سکتا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر $\frac{1}{4}$ حصہ لیا جاتا تھا۔ جیسا کہ یووان چوانگ، چینی سیاح نے تصدیق کی ہے۔ جو یہاں ساتویں صدی میں آیا تھا۔ تیرہویں صدی میں علاؤالدین نے اُسے بڑھا کر کل پیداوار کا نصف کر دیا تھا۔ شیر شاہ نے اُسے گھٹا کر فی بیگہ کی اوسط پیداوار کا $\frac{1}{3}$ کر دیا۔ اکبر نے اسی شرح کو قائم رکھا جو شیر شاہ نے رائج کی تھی لیکن اورنگ زیب کے زمانہ میں یہ پیمانہ بڑھ کر $\frac{1}{2}$ ہوگیا اور یہی مغلوں کی حکومت کے آخری ایام تک جاری رہا۔

اس کے لیے یہ جاننا ضروری تھا کہ کل پیداوار کیا تھی جس کا ایک مقررہ فی صد حصہ لازمی طور پر حکومت کے خزانہ کو منتقل ہوتا تھا۔ اس مسئلہ کے منطقی حل میں حسب ذیل مسائل مضمر تھے (1) الگ الگ ہر کاشتکار کے کھیت کی پیمائش (2) ہر ایک رقبہ (بیگہ) میں اوسط پیداوار کا تخمینہ قسم زمین اور قسم فصل کو دھیان میں رکھنے کے بعد (3) کئی سالوں سے ہر غلہ کا جو بھاؤ فی بیگہ رہا ہے اس کا اوسط نکال کر قیمت مقرر کرنا (4) ان شرحوں کی بنیاد پر مزروعہ رقبہ میں ادل بدل اور ناموافق قدرتی حالات یا قدرتی آفات کے لیے ضروری رعایت دیکر ہر سال کا لگان وصول کرنا۔

بحیثیت مجموعی یہی وہ طریقہ تھا جو اکبر نے اپنی سلطنت کے بہت سے صوبوں میں جو ہندوستان کے میدانوں اور وسطی ارض مرتفع کے جزو حصہ میں پھیلے ہوئے تھے جاری کیا تھا

بنگال جسے حال ہی میں سلطنت کے اندر شامل کر لیا گیا تھا اس طرز سے مستثنیٰ تھا اور یہی حال دکن کا تھا جو سلطنت کی حدود کے باہر تھا اکبر کے مروجہ طریقہ سے لگان کی وصولی کی خوبیاں یہ تھیں کہ اس نے گورنمنٹ اور کسان دونوں کو غیر یقینی حالات سے نجات دے دی اور دونوں کے حصوں کو متعین کرنے کے لیے نقد ادائیگی کی ایک مستحکم بنیاد قائم کر دی۔ یہ ترکیب ایسی تھی کہ موسم موسم جو بھاؤ میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اور غلہ کو نقدی میں بدلنے میں جو اذیت ناک دیر ہوتی تھی ان سب سے بچاؤ ہو گیا۔

لگان کی اس طرح جو تشخیص ہوتی تھی اور جو فہرست گورنمنٹ کے مطالبات کی تیار ہوتی تھی وہ کل زمینوں پر لاگو تھی یعنی اس زمین پر بھی جو خالصہ تھی یعنی جو تاج کے لیے مخصوص تھی اور جس کا انتظام حکومت کے افسران بہ ذات خود کرتے تھے اور وہ عوامی زمین جو تنخواہوں کی ادائگی اور موہوب الیہم اور معطی علیہم کو نقدی یا جاگیر کی شکل میں عطایا کے لیے مخصوص تھی موخر الذکر صورت میں یہ لوگ اپنے آدمیوں سے اس کا انتظام کرتے تھے۔

مالگذاری کی تشخیص اور اس وصولی کے لیے ایک وسیع نظام قائم کیا گیا۔ محاصل کی وزارت کی ماتحتی میں سب سے اونچی جگہ پر دو دیوان تھے یعنی "دیوان خالصہ" جو تاج کی زمینوں کے انچارج تھے اور "دیوان تن" جو جاگیر کی زمینوں کی دیکھ بھال کرتے تھے ہر دیوان کی ماتحتی میں علاقائی یا صوبائی دیوان تھے جن کا ایک اسٹاف تھا جس کی تین شاخیں تھیں ایک کا کام لگان کی تقرری طے کرنا تھا دوسرے کا تعلق وصولی مالگذاری سے تھا اور تیسری خزانہ سے متعلق تھی۔ صوبے مختلف ٹکڑوں میں بٹے ہوئے تھے جنھیں "سرکار" کہا جاتا تھا اور ہر سرکار کا چارج ایک ماتحت افسر کے سپرد تھا "سرکار" میں کئی پرگنے ہوتے تھے اور ان میں ہر ایک کے اپنے افسران ہوتے تھے۔ قانون گو چودھری اور کارکن۔ ان گاؤں میں جن سے پرگنہ بنتا تھا ایک "مقدم" ہوتا تھا جو مالگذاری وصول کرتا تھا اور ایک پٹواری جو کاغذات رکھتا تھا۔

شمال کے نمونہ کے گاؤں میں مقدم یا گاؤں کا سردار جو خود کسان ہوتا تھا وہ حکومت اور گاؤں کے بیچ درمیانی شخص کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ اس بات کا ذمہ دار تھا کہ گاؤں سے مالگذاری وصول کرے اور گاؤں پر حکومت کا جو مطالبہ ہے اسے حکومت کو ادا کرے۔ اس کا عہدہ موروثی ہوتا تھا اور اپنی خدمات کے صلہ کے طور پر جو مالگذاری وصول ہوتی تھی اس کا

ان سب لوگوں میں زمین کو جوتنے والا جس کے پسینہ اور محنت سے یہ عظیم سماجی نظام متحرک رہتا تھا سب سے زیادہ اہم تھا۔ افسانوی دیو اٹلس کی طرح وہ اپنی پیٹھ پر حکومت کا کچل ڈالنے والا بوجھ اٹھائے ہوئے تھا سوال یہ تھا کہ اس بوجھ کو جو روز بروز بڑھتا جارہا تھا اس سے کیسے اٹھوایا جائے۔

اس زمانہ کے حالات میں طاقت کا استعمال جو موجودہ عصر میں امن اور قانون کے قیام کے لیے آخری حربے کے طور پر ہی استعمال کیا جاسکتا ہے گورنمنٹ کا عام طریقہ تھا ایک حکمران کے واسطے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے اندرون ملک امن وامان میں خلل اندازی کرنے والوں اور گستاخ عناصر کے خلاف اور اسی طرح لالچی ہمسایوں کے خلاف تھی جو ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ کسی کی کمزوری اور مشکلات سے ناجائز فائدہ اٹھائیں مستقل طور پر چوکنا رہنا ضروری تھا۔ طاقت اور وقار حکومت کی جان تھے" طاقت" چمکتے ہوئے اسلحوں اور خوف دلانے والے سازوسامان سپہگری سے لیس ایک فوج کا فرض منصبی تھا۔" وقار" صرف پبلک کے کاموں سے درخشاں ہوسکتا تھا۔ جن کی عظمت دولت اور قوت کی بہتات کا مظاہرہ کرے۔

جنگ اور امن کے ان کھمبوں کی مضبوط بنیاد گاؤں کا کسان تھا۔ عطا کرنے والے (گاؤں) اور حاصل کرنے والے (حکومت) دونوں کے لیے حالات پریشانیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ حکومت کی دقتیں دو طرح کی تھیں (۱) کیسے کسان سے زیادہ سے زیادہ رقم جبراً حاصل کی جائے اور کاشتکار سے رقمیں اکٹھا کی جائیں جو ایک وسیع براعظم پر پھیلے ہوئے لاکھوں بستیوں اور گاؤں میں بسے ہوئے تھے۔

کسان پرانے طرز پر کام کرتے ہوئے اس سزا کا مستوجب قرار دیا جاچکا تھا کہ وہ سخت محنت بغیر ستائے کرتا رہے اسے اس کا معاوضہ بہت ہی معمولی ملتا تھا، جو کچھ وہ پیدا کرتا تھا اس میں سے اس کو جوت کے اخراجات نکالنے پڑتے تھے اور رسم ورواج کے مطابق پہلے سے طے شدہ اہل حرفہ گاؤں کے ملازمین اور افسران کا حصہ نکالنا ہوتا تھا اور گورنمنٹ کے مطالبات پورے کرنے پڑتے تھے جو کچھ بچ جاتا تھا وہی اس کی شدید مشقت کا انعام تھا۔ اس بات کا حساب لگایا گیا ہے کہ جو کل پیداوار ہوتی تھی اس کا 25 فی صدی کھیتی کے اخراجات میں لگ جاتا تھا۔ 5 سے 15 فی صدی تک پہلے سے طے شدہ لوازمات پر لگتا تھا اور 40

2 ½ فی صدی وہ پاتا تھا۔

جاگیر کی زمینوں کے لیے اگر جاگیر بڑی ہے تو جاگیر دار کا کارندہ مالگذاری وصول کرے گا ورنہ ایک جاگیر دار کسی کسان کو وصولی کے لیے مقرر کردے گا۔

جاگیرداروں کے علاوہ زمین داران تھے جن کو زمین میں موروثی حقوق حاصل تھے بعض حالات میں زمین دار ایک فرد ہوتا تھا اور دوسری صورتوں میں ایک جماعت ہوتی تھی جس کی نمائندگی ایک مینیجر کرتا تھا۔ زمین داروں میں ان قدیم خاندانوں کے نوجوان شرفا بھی تھے جو کبھی آزاد تھے اور اقتدار اعلیٰ کے اختیارات رکھتے تھے لیکن فاتح کی بالادستی قبول کرنے پر مجبور ہوگئے تھے ایسی صورت میں مالگذاری دراصل ایک قسم کا خراج تھا جو باہمی رضامندی سے طے کیا جاتا تھا لیکن بہت سے زمین دار ایسے بھی تھے جن پر عام کاشتکاروں کی طرح مالگذاری تشخیص کی جاتی تھی۔

دکن کے نمونہ کے گاؤں میں جہاں زمین داری کا وجود نہ تھا اور جاگیر دار ناقابل لحاظ پوزیشن رکھتے تھے حالات قدرے مختلف تھے مہاراشٹر میں ملک امبر (1626-1605) کے مالگذاری نظام میں تمام مزروعہ زمین کی پیمائش۔ اقسام زمین کی درجہ بندی اور کل پیداوار کا ⅖ گورنمنٹ کا حصہ ہونا داخل کیا گیا۔ اس نے کل زمین کو خالصہ اور انعام دو قسموں میں بانٹ دیا۔ موخر الذکر کی مالگذاری خیرات کے لیے اور خدماتِ وطن کا صلہ دینے کے لیے الگ کردی جاتی تھی پٹیل اور کلکارنی گاؤں کی مالگذاری کا انتظام کرتے تھے۔

شیواجی نے اس نظام میں کافی ترقی دی لیکن اس نے لگان کو بڑھا کر کل پیداوار کا 40 فیصد کردیا اور بہت سے ٹیکس معاف کردیئے دوسرا قدم بالاجی باجی راؤ تیسرے پیشوا نے اٹھایا (61-1740) جس نے ایک نیا بندوبست کیا از سرِ نو فصل اور زمین کی تقسیم کی اور نئی شرحیں مقرر کیں۔ اس کا بندوبست "کمال" کے نام سے موسوم ہے۔

مرہٹوں کے نظام میں دو قسم کے کسان تھے "مساردار" اور "اپارس" اول الذکر کو زمین میں موروثی حقوق حاصل تھے ان حقوق کی وراثت ہندو لا کے مطابق طے ہوتی تھی اور ان کی زمینیں قرضہ کی یا عدم ادائیگی لگان کی علت میں قرق نہیں ہوسکتی تھیں۔ حکومت کا مطالبہ استمراری یعنی ایک مرتبہ ہمیشہ کے لیے مقرر ہوجاتا تھا لیکن یہ مراعات ٹیکسوں کے لگادینے سے بیکار ہوگئیں تھیں۔

۱۰ پارس ۱۰ ایسے کاشتکار تھے جو حکومت کی مرضی پر کھیت جوتتے تھے اور ہر سال کے آخر میں ان کا معاہدہ قابلِ تنسیخ تھا۔

مرہٹوں کے گاؤں کے افسران، پٹیل، کلکارنی، چوگولا (پٹیل کے نائب) اور مہاریا (گاؤں کا چوکیدار) ایسی پوزیشن رکھتے تھے جو شمال کے مواضعات کے افسران کی مثل تھے لیکن شمال کے مقدم کے برعکس پٹیل ان سے زیادہ اعزاز اور اختیار کا مالک تھا وہ گاؤں کا سب سے بڑا افسر تھا گورنمنٹ کا ایک مقرر عہدیدار جس کو گاؤں کے سماج میں سب سے زیادہ آرام حاصل تھا۔ وہ کھیتی کی نگرانی کرتا تھا اور اس بات کا ذمہ دار تھا کہ پیداوار کا معیار برقرار رہے اور اس کا بھی ذمہ دار تھا کہ بنجر زمین کا شت میں لانے کا بندوبست کرے۔ پولیس اور مجسٹریٹ کے فرائض کا چارج بھی اسی کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ وہ امن قائم رکھتا تھا اور جرائم کا انسداد کرتا تھا گاؤں کی حفاظت کے معاملات میں وہ رہبر کا کام کرتا تھا۔ وہ افسران کو دعوتیں کھلاتا تھا اور گاؤں کے تہواروں میلوں اور تفریحات کی تنظیم بھی کرتا تھا۔

مشرقی علاقوں یعنی ممالک تیلنگو اور تامل کے گاؤں کی تنظیم بھی اسی لائن پر تھی ان میں سے بہت بڑی تعداد تین طبقوں میں بٹی ہوئی تھی (۱) کسان (والان داگے) جو الگ الگ اپنے کھیت جوتتے اور گورنمنٹ کو لگان دیتے تھے (۲) بالعوض خدمت قابضانِ اراضی (بھوگا وری تی، کاتی) یعنی وہ جو یا تو "بلیوتے دار" تھے گاؤں کے ملازمین تھے اور وہ لوگ تھے جو فوجی، مذہبی، تعلیمی یا کسی دوسری قسم کی خدمت کے لیے زمین جوتنے کے لیے پائے ہوئے تھے (3) وہ لوگ جو خیرات کے طور پر کھیت پائے تھے (برہمن دیوی داس اور شالی بھوگم) یعنی برہمن مذہبی تنظیمیں وغیرہ۔

جا بجا چند ٹکڑے زمین دارانہ (میراثی) مواضعات کے بھی تھے لیکن اٹھارھویں صدی کے آخر تک ان سب پر زوال آگیا تھا سوائے اس کے کہ جاگیر داران اور زمین داران کے سرداروں کی بڑی ریاستیں باقی تھیں۔

ان گاؤں میں جو کھیت جوتتا تھا وہ کسان بھی تھا اور وہی کھیت کا مالک بھی تھا جو اپنے کھیت بیع کر سکتا تھا اور اسے ترقی بھی دے سکتا تھا۔ ان کے علاوہ کمتر درجہ کے بھی کسان تھے (اُنکودی) اور وقتاً فوقتاً (پارکوری) بھی تھے جن کا کوئی حصہ پہلے سر کھاتہ دار

کاشتکاروں کی جائداد نہ تھا۔

اٹھارھویں صدی میں دکن کے ان گاؤں کا نظام ملک کے دوسرے حصّوں کے گاؤں کے نظام سے مختلف نہ تھا۔ درجہ بندی کے ساتھ گاؤں کے ملازمین کا نظام تھا جن میں گاؤں میں کام کرنے والے اور اہلِ حرفہ گاؤں کے سرکاری اہلکاران جن میں گاؤں کا سردار بھی شامل تھا جسے کہیں پٹیل کہیں نمبردار کہیں فائیڈ کہیں ریڈی کہیں پڑا کایا وغیرہ کہا جاتا تھا اور گاؤں کا حساب رکھنے والا جسے کرنام کہتے تھے یہ سب شامل تھے ان کے فرائض بالکل وہی تھے جو شمال میں انہی کی طرح کے لوگوں کے تھے ملازمین اور اہلِ حرفہ فصل میں اپنا حصّہ پاتے تھے (میواسوامترم) اور سرکاری اہلکاران لگان معاف یا انعامی زمین رکھتے تھے اور وہ فیس بھی پاتے تھے جو کاشتکاران بقدر حصہ پاتے تھے۔

پیداوار کو تین حصّوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا ملازمین اور اہلِ حرفہ کا حصہ 5 فی صدی اور اس کے بعد جو بچ جاتا تھا اس میں کسان اور گورنمنٹ نصف نصف لیتے تھے۔

اٹھارہویں صدی میں اکبر کا ضابطہ نظام (ضبطی) اور اسی کے مساوی مرہٹوں کا کمال سسٹم تیزی کے ساتھ منتشر ہوگیا اس نظام کا اصل وصف یہ تھا کہ یہ انفرادی کسان کو براہِ راست افسرانِ حکومت کے ربط میں لایا اس نے اپنی مرضی پر چلنے والے درمیانی لوگوں کی مطلق العنانی کو محدود کیا اور ان کو مجبور کیا کہ وہ حکومت کے مقرر کردہ طریقوں اور اس کے مرتب کردہ گوشواروں کی پابندی کریں۔ بہت سے ٹیکسوں کو منسوخ کر دیا شرح میں استحکام کا آغاز کیا کسان کے بوجھ کو کم کیا اور فصل کو زیادہ وسیع رقبہ پر کرنے اور ترقی دینے کے مواقع پیدا کیے۔

لیکن یہ طریقہ کار بہت خرچ مانگتا تھا اور یہ اسی حالت میں کامیاب ہوسکتا تھا جب مرکز کی جانب سے ہمہ وقت نگرانی ہوتی رہے اور مالگذاری کے اسٹاف میں ایمانداری اور اہلیت ہو۔ بدقسمتی سے اٹھارھویں صدی کے شاہانِ مغل قلاش تھے ان کے خزانے خالی تھے اور ان کے ملازمین کی تنخواہیں ہمیشہ بقائے میں پڑی رہتی تھیں۔ قابضانِ تخت نالائق کاہل اور بے مصرف تھے اور ان کے ملازمین بے وفا، خودغرض اور نالائق تھے۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ان حالات میں نظم ونسق پرزے پرزے ہوگیا۔ اکبر کا مقصد یہ تھا کہ وہ ہر منفرد کسان سے براہِ راست اس طرح معاملہ کرے کہ الگ الگ ہر

ایک سے مالگذاری کے لیے اقرار نامے کرے (پٹہ اور قبولیت) اور اس طرح کہ ہر کاشتکار کا نام اس کے باپ کا نام اس کا مزروعہ رقبہ اور جو فصل وہ بوتا تھا الگ الگ کاغذات میں درج ہو جائے اور ہر ایک کو الگ الگ ادائگی کی رسید دی جائے۔ لیکن اٹھارھویں صدی میں گاؤں اور حکومت کا یہ ناطہ تڑاق سے ٹوٹ گیا۔ اگرچہ گاؤں اب بھی جماعتی حیثیت سے ایک اکائی باقی رہا کیوں کہ اب حکومت نے گاؤں سے مجموعی طور پر معاملہ کرنا شروع کیا۔ اور گاؤں کے پیشوا کار سے معاہدہ کیا اور ہر کسان سے وصولی اس کے ذمہ کر دی اس طرح گاؤں کی خود کفالتی اور علاحدگی پسندی اور زیادہ نمایاں ہوگئی اور جماعتی وحدت کی وہ زنجیر جس میں گاؤں ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے تھے کمزور ہوگئی۔

دوسرا مکروہ شاخسانہ فارمنگ کے طریقہ کا پھیلنا تھا اکبر نے بجا طور پر اس پر ناگواری ظاہر کی تھی۔ لیکن ان کے جانشینوں کے زمانہ میں یہ ایک نقصان دہ گھاس کی طرح پھیل گئی جو زمین کو ڈھانک لیتی ہے اور اس کا رس چوس لیتی ہے۔ بہت سی چیزیں مل جل کر اُسے وجود میں لائیں جن میں خاص چیز جاگیر داروں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ تھا۔ جاگیر داروں نے براہ راست نگرانی کے قابل نہ ہونے کے باعث ٹھیکہ داروں کو مقرر کر دیا جو استحصال بالجبر کے طریقہ استعمال کر کے مالگذاری اکٹھا کرتے تھے ایک مقررہ رقم جاگیر دار کو دیتے اور بقیہ خود اپنے لیے رکھ لیتے تھے پھر دوسرے درمیانی لوگ اور ان کے ٹھیکیدار بلکہ سرکاری ملازمین بھی اپنے کو گاؤں کا موروثی مالک ہونے کا دعوی کرنے لگے اس طرح تعلقدار اور زمین داروں کا ایک طبقہ عالم وجود میں آیا جس نے مالکانہ حقوق چھین لیے اور تقریباً اقتدار اعلیٰ کے مراعات کے دعویدار بن بیٹھے مثلاً تعلقدار زمینوں کی وراثت کے معاملہ میں ایسے قوانین کے تابع ہوگئے جو بادشاہوں کے لیے مخصوص تھے نہ کہ افراد کی ذاتیات کے لیے چنانچہ مرنے کے بعد ان کی جائداد تقسیم نہیں ہوتی تھی جیسا کہ ہندو اور مسلم دونوں کے قانونِ وراثت کا مطالبہ تھا۔ غلط دعوں کی بہانہ بازیوں نے مرکزی حکومت پر ایک ضرب لگائی اور نراج کو ابھارا۔

تیسرا باب

ہندوستان کا سیاسی نظام

مملکت

باوجود اس حقیقت کے کہ ازمنۂ وسطیٰ کی پوری مدت میں ہندوستان کی حکومت کا سربراہ ایک مسلمان تھا حکومت اسلامی نہ تھی۔ حکومت نہ تو دستوری اصولوں میں اور نہ اپنے بنیادی تخیلات یا اغراض و مقاصد میں کتب مقدسہ قرآن و حدیث یا ان قوانین کی اتباع کرتی تھی جو سنّی فلسفۂ قانون کے چار مکاتب خیال نے بطور شرح تفصیل سے مدوّن کیے ہیں۔ ہندوستان کی ازمنۂ وسطیٰ کی حکومت کو دینی حکومت کہنا غلط ہوگا۔ کیونکہ وہ مسلم علما کی رہنمائی میں کام نہیں کرتی تھی۔ بادشاہ کے ذاتی عقائد کا اس کی پبلک پالیسیوں (نظام امور جہاں بانی) سے کوئی تعلق نہ تھا۔

تیرھویں صدی سے اور آگے تک ہندوستان کے تقریبًا ہر ایک مسلم بادشاہ نے شریعت کے مطابق حکمرانی کرنے سے اپنی معذوری ظاہر کی اور ایسا کرنا ناممکن قرار دیا۔ التمش، بلبن، علاؤ الدین اور محمد تغلق مغل حکمرانوں سے پہلے کے فرماں رواؤں میں ایسے تھے جنھوں نے مسلم قانون کو ہندوستان میں نافذ کرنے کی صحت پر شک ظاہر کیا ہے۔ انتہائی اچنبھے کی بات یہ ہے کہ ان بادشاہوں کے ترجمان پکے از علما، یعنی ضیاء الدین برنی مورخ اپنی کتاب فتاوا جہاں داری میں جو اصول سیاستؐ پر بحث کرتی ہے لکھتے ہیں۔ "اصل مذہب پیغمبر صاحب کی کامل اتباع میں ہے ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن دوسری جانب شاہانہ حکومت صرف خسرو پرویز اور ایران کے عظیم سلاطین کے اصول جہاں بانی کی تقلید ہی سے چلائی جا سکتی ہے۔" وہ تسلیم کرتے ہیں کہ "پیغمبر محمد صاحب کی احادیث (سنت) اور ان کی سیرت کے طور وطرز اور طریقہ رہائش نیز بعد ایرانی بادشاہوں کے مروجہ مراسم اور زندگی کے جس طور و طرز و طریقہ رہائش پر ان کا عمل ہے ان دونوں میں مکمل تضاد ہے اور فعلوں میں ایک دوسرے کے کلیتًا خلاف ہیں لیکن وہ اپنا قول فیصل یہ دیتے ہیں کہ شریعت پر جو مجموعۂ احکام الٰہی ہے، حکومت کے معاملات میں محض خاص زمانوں ہی میں عمل درآمد ممکن ہے۔ محمد صاحب

شرع نافذ کرنے میں کامیاب رہے کیونکہ ان کو براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوتا تھا۔ اور ان کے چار خلیفہ اس لیے کامیاب رہے کہ وہ پیغمبر صاحب کے صحابی تھے۔ لیکن ان کے جانشینوں کے سامنے دو چیزوں میں سے ایک کے انتخاب کا سوال تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے سے کسی حال میں بھی مطابقت پیدا نہیں کر سکتیں یعنی ایک طرف پیغمبر صاحب کی سنت اور دوسری جانب ایرانی بادشاہوں کی پالیسی لیکن پیغمبری مذہب کا کمال ہے اور سلطانی دنیوی اعزاز و اکرام کا کمال ہے یہ دونوں کمالات ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ ان دونوں میں باہمی تضاد ہے۔ اور ان دونوں کمالات کا ایک میں جمع ہونا امکان کے حدود کے اندر نہیں ہے[2]۔

التمش کے پاس کچھ علماء درخواست لے کر گئے کہ چونکہ ہندو اہل کتاب نہیں ہیں جنھیں مسلمانوں کی حفاظت میں بطور ذمی لے لیا جائے۔ اس لیے ان سے کہا جائے کہ وہ اسلام قبول کریں اور انکار کی صورت میں وہ تلوار کے حوالے کر دیے جائیں۔ التمش نے اپنے وزیر سے جواب دینے کے لیے کہا اور اس نے جواب دیا کہ یہ تجویز ناممکن العمل ہے جہاں تک بلبن کا سوال ہے نظام الدین مورخ لکھتا ہے کہ "وہ امور سلطنت کو امور مذہبی پر ترجیح دیتا تھا[3]۔" برنی لکھتا ہے "سزاؤں کو دینے اور اپنے شاہانہ اختیارات کے استعمال میں وہ خوف خدا کی پروا کیے بغیر عمل کرتا تھا اور جس جس چیز کو وہ حکومت کے مفاد میں سمجھتا تھا بلالحاظ اس کے کہ وہ مطابق شریعت بھی ہے یا نہیں ان سب کو کر ڈالتا تھا[4]۔ قاضی مغیث الدین کو رخصت کرتے وقت علاؤالدین نے جو گفتگو کی تھی وہ کس کو نہیں معلوم۔ قاضی صاحب سے اس نے کہا تھا "جو کچھ حکومت کا مفاد میں سمجھتا ہوں اور زمانہ کی ضروریات کے تقاضے جن کے لیے پاتا ہوں ان سب کو میں کرتا ہوں میں نہیں جانتا کہ اللہ تبارک تعالیٰ میرے ساتھ یوم قیامت کیا معاملہ کرے گا۔"

محمد تغلق کے بارے میں شیخ عبدالحق نے کہا ہے کہ "اس نے احکام کو عقل کے تابع بنا دیا تھا اور مسموعات کو اس کے تابع کر دیا تھا جو قیاس و عقل ہے۔" "حکم تو قرآن اور حدیث ہے۔" "مسموعات فقہ ہے۔" برنی کو شکایت تھی کہ پیغمبری اور سلطانی کے احکام اس کے (یعنی محمد تغلق کے) دارالسلطنت سے جاری ہوتے اور اس نے اپنی ذات میں پیغمبری اور سلطانی دونوں عہدوں کو جمع کر لیا تھا۔

پروفیسر حبیب اس نتیجہ پر پہنچے کہ "یہ صحیح ہے کہ مسلمان بادشاہ جو زیادہ تر بیرونی نسل سے تھے چھ سات صدیوں تک ہندوستان کے تخت پر بیٹھے لیکن وہ ایسا اس لیے کر سکے کہ ان کی تخت نشینی "مسلم حکومت کی" تخت نشینی نہ تھی اگر اس کے برخلاف ہوا ہوتا تو وہ ایک نسل

تک بھی قائم نہ رہ سکتے تھے۔[5]"

مغل بادشاہوں میں بابر اس وجہ سے کہ اس کی حکومت کی میعاد بہت تھوڑے عرصے کی تھی اور ہمایوں اس وجہ سے کہ وہ مشکلات میں گھرا رہا، انتظامی امور کی جانب زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ اکبر نے ایک ایسی پالیسی کا آغاز کیا جو احکام اسلام کے تابع نہ تھی وہ تمام مذاہب کو ایک نظر سے دیکھتا تھا اور اپنا یہ فرض سمجھتا تھا کہ مذہب کی بنیاد پر رعایا کے اندر کوئی فرق نہ کرے۔ اس نے بڑے سے بڑے عہدوں کا دروازہ غیر مسلموں کے لیے کھول دیا۔ اس نے ہندو شہزادیوں سے شادیاں اور ان کو اپنا مذہب قائم رکھنے اور محل کے اندر ہندو مذہبی مراسم ادا کرنے کی اجازت دی ان کے لڑکے مغلیہ تخت کے جانشین ہوئے۔ اس نے بذات خود یہ اختیار لے کر کہ جہاں مجتہدین میں اختلاف ہو وہ آخری فیصلہ دے گا۔ علما کی مداخلت کو ختم کر دیا۔ بہت سے معاشرتی اور دیگر امور میں اس نے اپنی غیر مسلم رعایا کے جذبات و روایات کا لحاظ کیا۔ ان میں سب سے اہم یہ تھا کہ اس نے جزیہ کو جو ایک عام ٹیکس تمام ہندوؤں پر تھا ختم کر دیا۔ ابوالفضل کہتا ہے "سلطانی اللہ تعالیٰ کا ایک عطیہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اگر اس بلند ترین اعجاز تک پہنچنے کے بعد وہ عالمگیر امن (رواداری) قائم نہیں کرتا ہے اور اگر انسانیت کے تمام حالات اور تمام مذہبی فرقوں پر لطف و کرم کی یکساں نگاہ نہیں کرتا بلکہ کسی کے ساتھ مادرانہ اور دوسروں کے ساتھ سوتیلی ماں کا برتاؤ کرتا ہے تو وہ اس اعلا اعزاز کا مستحق نہیں ہوگا۔[6] آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ "مذہب کے فرق کو رعایا کی نگہبانی کے شاہی فرض منصبی میں رکاوٹ نہ بننا چاہیے اور ہر فرقہ و خیال کے لوگوں کو امن و امان ملنا چاہیے تاکہ اللہ کا سایہ اعزاز و اکرام بخشے۔[7]" نتیجہ یہ ہے کہ ابن حسن کے الفاظ میں "اسلامی قانون اور احادیث دونوں حکومت کا ضابطہ قانون نہ بن سکے۔[8]"

جہانگیر اگرچہ اپنے باپ کی ایسی دلیرانہ ساخت کا نہ تھا لیکن وہ انھیں اصولوں پر برابر عمل درآمد کرتا رہا۔ شاہجہاں اپنے ابتدائی دور میں ان سے ہٹ گیا اور تعصب کے بعض بدترین رنگ روپ نمایاں کیے۔ لیکن اپنے آخری ایام میں وہ ملائم ہو گیا اور اس کا بت شکنی کا جذبہ مرجھا گیا۔

بدقسمتی سے اورنگ زیب نے اکبر کی پالیسی کو الٹ دیا لیکن اپنے ارادوں کے باوجود وہ شرع یعنی اسلامی قانون کا اقتدار اعلا جما نہ سکا۔ اس کی چالیس سال کی غلط روی کی کوششیں مکمل ناکامی پر منتج ہوئیں آخری ایام میں محرومی اور غم اس کے اوج پر چھائے ہوئے تھے اور تباہی و بربادی کے شگون ہر وقت اندیشے دماغ میں بھرے ہوئے تھے اس کا انتقال کیا۔ اس کے بعد ان کے جانشینوں

نے یہ تباہی خیز رویہ ترک کر دیا۔ لیکن اس وقت تک شہنشاہیت کے عظیم قصر کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ چکا تھا۔

مغل بادشاہوں اور ہندوستان کے سلاطین نے حکومت کے بارے میں اسلامی تصور پر ادنا ترین توجہ بھی نہ دی۔ کل مسلمان مل کر ایک سوسائٹی ہیں جسے ملت کہا جاتا ہے اور اس سوسائٹی کے لیے ایک مسلم افسر اعلا کی ضرورت ہے ایک عالمگیر سوسائٹی اور ایک عالمگیر مملکت جس کی بنیاد احکام اللہ پر ہو یہ تھی اسلامی سیاست کی روح۔ اس کا تقاضہ یہ تھا کہ مملکت کا افسر اعلا بذریعہ انتخاب ہو جس کو مسلمان کا سربراہ (امیر المومنین یا خلیفہ) کہتے تھے جو شخص اس اعلا عہدے کے لیے منتخب ہوتا تھا اس پر لازم ہوتا تھا کہ وہ چند خصائص کا حامل ہو اور انتخاب کے بعد اس کو چند مراعات حاصل ہوتی تھیں اس کا کام یہ تھا کہ مذہب کی محافظت کرے اور مسلم حکومت کے معاملات کا انتظام دینی قانون کی رو سے کرے۔

جوں جوں زمانہ گذرتا گیا یہ تصور رفتہ رفتہ اپنی جاذبیت کھوتا گیا۔ خلفا بنی امیہ نے اس عہدے کو جو انتخاب سے عطا ہوتا تھا بدل کر موروثی کر دیا۔ عباسیوں کے زمانے میں اگرچہ خلیفہ کی برائے نام سلطانی تسلیم کی جاتی تھی لیکن صوبوں کے حکمرانوں نے اپنی الگ الگ ریاستیں قائم کر لی تھیں۔ جب منگولوں نے 1258ء میں عباسیوں کا تختہ الٹ دیا تو خلیفہ سے وفاداری کا ایک بہانہ سا جو چلا آ رہا تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔

اس طرح اسلام اپنی عالمگیر جمعیت عالمگیر مملکت اور قانون کے معاملہ میں مسترد کر دیا گیا۔ وہ حکمران جنھوں نے اپنے اپنے علاقوں پر اپنا اقتدار سلطانی قائم کیا انفرادیت کے علمبردار تھے جس کی بنیاد ان لوگوں کے مذہبی مراسم اور روایت تھیں جن پر وہ حکومت کرتے تھے۔

شروع زمانے کے کچھ حکمرانوں نے خلیفہ سے برائے نام وفاداری ظاہر کی۔ لیکن تیرھویں صدی کے وسط کے بعد جب بغداد جو خلیفہ کا دارالسلطنت تھا منگولیوں کے ہاتھ میں چلا گیا اور خلیفہ نے بھاگ کر مصر میں پناہ لی تو اسلامی قومیت کے پیچھے سے وہ دلیل بھی نکل گئی جس پر یہ مبنی تھا نتیجہ یہ ہو کر اسلامی سیاست کافور ہو گئی۔

جس وقت بابر نے اپنی سلطنت ہندوستان میں قائم کی خلافت ترک عثمانی خاندان کو منتقل ہو چکی تھی۔ چونکہ بابر چغتائی ترک تھا اس لیے وہ ان طونیہ کے ترکوں کے بہانہ ساز دعووں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تھا۔ اس کے ساتھ یہ ہوا کہ مغلوں نے ایران کو ایک شیعہ حکومت میں بدل دیا سنی خلیفہ

کے دعووں کو رد کر دیا اور خود ربانی اعزاز کے دعوے دار ہوئے جو یقیناً دلنشیں تھے[9]۔ بابر جو وسط ایشیا سے آیا تھا اور جو چنگیز خاں کی ماں کے سلسلے سے اس کی نسل سے تھا اس کے سامنے ایک طرف ایران کی مثال تھی اور دوسری جانب منگولوں کی شاہانہ روایات تھیں ان دونوں اثرات کے تحت مغلوں کے شاہانہ نظام کا نشو و نما ہوا۔

مغل بادشاہوں کا تخیل اپنے عہدے کے بارے میں ایرانی اور غیر اسلامی تھا۔ بادشاہ اپنے کو مسلم قوم کا منتخب شدہ سربراہ یا نمائندہ تصور نہیں کرتا تھا اور نہ اپنے کو امیر المومنین خلیفہ کا ماتحت سمجھتا تھا اور خود اپنے کو سایہ خدا یا ظل اللہ تصور کرتا تھا۔ ابوالفضل اس کی اس طرح شرح کرتا ہے ـــ

"سلطانی ایک نور ہے جو خدا سے نکلتا ہے اور سورج کی ایک کرن ہے۔ . . . . عصر حاضر کی زبان میں اسے "فرایزدی" (نور الہی) کہتے ہیں اور عہد قدیم میں اسے کیان خیرہ یعنی مرتفع تاج روحانی کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اسے بادشاہوں تک بلا کسی درمیانی واسطہ کے براہ راست بھیجتا ہے اور اس کے سامنے لوگ تحسین و آفرین سے اپنا سر اطاعت کی زمین پر جھکا دیتے ہیں[10]۔"

جہانگیر کا خیال تھا کہ اقتدار اعلا اور جہاں بانی کے اعمال ایسے نہیں جن کا فیصلہ چند ناقص ذہن کے لوگ اپنی ناکارہ کوششوں سے کریں۔ خالق عادل جس کو اس شان دار اور اعلا فرض کے لیے منتخب کرتا ہے اس پر خود ان اعمال کو نازل کر دیتا ہے[11]۔

اورنگ زیب کا دعوا یہ تھا کہ وہ سایہ خدا اور اس عہد کا خلیفہ یعنی اللہ کا زمین پر وکیل ہے اور اس کا نام عالمگیر پر مشہور تھا یعنی عالمگیر زندہ بزرگ۔

یہ خطابات و القابات ایران اور بازنطی بادشاہوں کے بہانہ ساز دعووں اور ہندو راجاؤں کے خود ساختہ اوصاف کی یاد دلاتے ہیں۔ لیکن یہ سب خلافت یا سلطانی کا جو اسلامی تخیل ہے اس کے بالکل منافی ہیں۔ اسلام میں خلافت ایک عہدہ ہے۔ جسے ملت (کل قوم) بذریعہ انتخاب عطا کرتی ہے۔ اسلامی قانون میں ایک موروثی بادشاہت کا تخیل کا کسی درجے میں بھی وجود نہیں ہے۔

ازمنۂ وسطیٰ کی ہندوستان کی سلطنتوں کی مثال یورپ کی ازمنۂ وسطیٰ کی سلطنتوں سے دی گئی ہے لیکن درحقیقت ان دونوں میں کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔ یورپ کی ریاستیں ایک ایسی قصر امرا تھیں جن کی بنیاد ایک انوکھے قسم کے فوجی زرعی بندوبست پر تھی۔ جاگیرداری کے مالکان موروثی نائب جاگیرداروں کے ساتھ مل کر درجہ واری ترتیب کے ساتھ ایک ایسا نظام

بناتے تھے جس میں بادشاہ سے لے کر جو چوٹی پر تھا نائٹ تک جو سب سے نیچے تھے ایک سلسلہ مدارج قائم تھا۔ اس کے برعکس مغلوں کے امرا محض عمال اور بادشاہ کی مرضی کے کلیتاً تابع تھے امرا کی اس جماعت کی کوئی جڑ زمین میں نہ تھی کیونکہ ان کی کاشت کارانہ زمین موروثی نہیں تھی۔ عہدوں پر تقرری کا انحصار جائداد پر نہیں نسب پر تھا۔ امرا کی جماعت مالی حیثیت سے آزاد نہ تھی۔ ان کی آمدنی کا ذریعہ یہ تھا کہ یا تو خزانہ شاہی سے نقد روپیہ پائیں یا مالگزاری وصول کرنے کے لیے ان کو سند دے دی جائے۔ یہ سندیں اکثر تبدیل ہوتی رہتی تھیں۔ امرا کی جائدادان امرا کے بعد حکومت میں شامل ہوسکتی تھیں۔ عہدے موروثی نہیں تھے اگرچہ بعد کے زمانوں میں موروثی تقرریوں کی جانب میلان ہوگیا تھا۔ یہاں کا طبقہ امرا جدید یہ یا چند سیری حکومت کا جز و تھا نہ کہ یورپ کے جاگیردارانہ نظام کے مثل۔

غور سے تجزیہ کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کی ریاستیں محدود اختیارات اور وسیع ذمہ داریوں کا ایک عجیب مجموعہ تھیں اگر ان کی پابندیوں کا لحاظ کیا جائے تو ان کو موجودہ زمانہ کے الفاظ میں اقتدار اعلا رکھنے والی فرماں بردار قوت کی حکومت نہیں قرار دیا جاسکتا۔ موجودہ زمانہ میں اقتدار اعلا تین اداروں سے ظاہر ہوتا ہے یعنی قانون ساز جماعت انتظامیہ اور عدلیہ اقتدار اعلا قوت کا استعمال قانون بنانے اور قانون کو نظم کرنے اور انصاف دینے میں ہے۔

ہندوستان کی ازمنۂ وسطیٰ کی حکومتوں کے پاس کوئی قانون ساز جماعت نہ تھی۔ مسلمانوں کے لیے قانون سازی کا کام تو محمدؐ صاحب پر ختم ہوگیا جو آخری نبی تھے اور جن کے ذریعہ سے خدا نے اپنی رضا اور حکم کو ایک مرتبہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بذریعہ وحی نازل کردیا۔ احکام الٰہیہ میں کسی اضافہ یا ترمیم کی حاجت نہیں ہے اور روزمرہ کے معاملات پر ان کے نفاذ کا معاملہ علما کا کام ہے نہ کہ حکومت کے فرماں روا کا۔ یہ لوگ (علما) زندگی کے بدلتے ہوئے حالات و واقعات سے مطابقت کرنے کے لیے قانون کی تفصیل و شرح کرتے ہیں۔

ہندوؤں کو بھی کسی قانون ساز جماعت کی ضرورت نہ تھی ان کے پاس ان کی خود قدیم قانون کی کتابیں تھیں جو زندگی کے ہر شعبہ کے لیے ہدایت اور رہنمائی رکھتی تھیں۔ ذی علم پنڈتوں مثلاً مثر مصر اور رگھو نندن نے شرحیں لکھیں جو حکومت سے آزاد ہوکر ہندو ججوں (شاستریوں) کی قانون نافذ کرنے میں رہنمائی کرتی تھیں۔

اسلامی قانون (فقہ) احکام الٰہی کا وہ علم ہے جو انسان کے ہر فعل پر حاوی ہے اور جس میں

تبلایا گیا ہے کہ کیا کرنا لازمی ہے۔ کیا منع ہے کس کے کرنے کی سفارش کی گئی ہے کونسا نامناسب ہے۔ کس کی صرف اجازت ہے اور ان سب کا ماخذ قرآن اور حدیث ہے۔ علم لا ہمہ گیر ہے۔ اور افراد اور سوسائٹی کی زندگیوں سے متعلق تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ ذاتی اور پرائیویٹ اور پبلک جن میں دیوانی فوجداری اور دستور کے متعلقات بھی شامل ہیں۔ . . . . انتہائی پرائیوٹ اور ذاتی زندگی میں آدمی کے عقائد اس کی عقیدت اور پرستش کو عبادت کہا جاتا ہے۔ ان تمام معاملات میں اسلامی قانون بہت سخت قواعد وضوابط مرتب کرتا ہے قانونی دیوانی معاملات کو دو شعبوں میں تقسیم کر دیا ہے (۱) شادی (2) جائداد۔ پہلے شعبے میں رشتے، اہلیت حق بیوگان اور طلاق شامل ہیں دوسرے باب میں وراثت بیع و شریٰ سود اور کرایہ ہیں۔ پبلک قوانین کا تعلق سیاسی معاملات سے ہے "خلافت اور حکومت" مسلم حکومت غیر مسلم رعایا سے تعلق مسلمانوں کے بارے میں حکومت کے فرائض اور جرائم اور سزائیں یہ پبلک قوانین کے تحت ہیں۔

جہاں تک عبادت کا تعلق ہے ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ احکام شرع کی پابندی کرے مسلمانوں سے کچھ بالخصوص صوفیا ان احکام کو مشینی اور رسمی تصور کرتے تھے۔ وہ ان کے وجوب سے انکار نہیں کرتے تھے لیکن معرفت الٰہی کے حصول کے لیے صوفیانہ طریقے استعمال کرتے تھے۔ ہندوستان میں علما اور صوفیا دو گروہ ہمیشہ رہے ایک شریعت پر زور دیتا تھا اور اس سے ذرا بھی ہٹنے کو گناہ خیال کرتا تھا دوسرا تصوف کے ذریعہ اصلاح کو قانونی پابندی سے زیادہ لائق توجہ سمجھتا تھا۔ اورنگ زیب اور دارا شکوہ دونوں ایک دوسرے کے مقابل شعبۂ فکر کے نمائندے تھے۔

جہاں تک کہ شادی اور جائداد کے معاملات میں عام طور پر ان کی پابندی کی جاتی تھی۔ پھر بھی دونوں میں بڑی حد تک مداخلتیں ہوئیں۔ مسلمانوں نے بہت سے ہندو رسم و رواج کو قبول کر لیا اور بہت سے ایسے طریقوں پر عمل درآمد کیا جو اسلام کی نگاہ میں نامرغوب تھے مثلاً شادی کے معاملہ میں یہ طے کرنے میں کہ کتنی پیڑھی کے اندر شادی کی جا سکتی ہے۔ شادیاں ذات یا برادری یا قبیلے کے اندر ہی ان کے ہی قواعد وضوابط کے مطابق ہوں یا باہر شادی کے معاہدے کے سلسلے کے مراسم ہوں۔ ہندوستان کے بہت سے حصوں میں وراثت کے قوانین کی جگہ رسم و رواج نے لے لی۔ ہندوؤں کی طرح بیوہ کی شادیاں اور طلاق پر ناپسندیدگی ظاہر ہونے لگی[12]

ہندوؤں اور مسلمانوں میں شادیاں شاذ و نادر ہی ہوتی تھیں لیکن حکمران خاندانوں میں زدہ کافی رائج تھیں۔ شاہان مغلیہ ہی اس پالیسی کے اوّلین راہ دکھانے والے نہ تھے۔ کشمیر میں ہندو مسلم شادیاں عرصۂ دراز سے چلی آرہی تھیں۔ زین العابدین 1740ء تا 1770ء نے جموں کے

راجہا ملک دیو کی دو لڑکیوں سے شادی کی۔ تیسری لڑکی گکھڑ کے مسلمان راجہ جسرتھ سے بیاہی گئی۔
دکن کے بہمنی بادشاہوں نے ہندو خاندان میں شادیاں کیں۔ تاج الدین فیروز (1397-1422ء) نے وجیانگر کے دیورائے اور کھرلا کے نرسنگھ راؤ کی لڑکیوں سے شادیاں کیں۔ احمد شاہ ولی[13] جو نواں بہمنی بادشاہ تھا۔ اس نے سون کھید کے راجہ کی لڑکی سے شادی کی۔ بیجاپور کے سلطان یوسف عادل شاہ (وفات 1510ء) مکند راؤ جو ایک برہمن تھے ان کی لڑکی کو اپنی زوجہ بنایا اور وہ ان کی خاص ملکہ ہوئی۔ بیدر کے امیر بارد (وفات 1539ء) نے بھی ان کی تقلید کی[14]۔ اکبر جہاں گیر فرخ سید سلیمان شکوہ نے ہندو شہزادیوں کو اپنی زوجہ بنایا کچھ کے ہندو شاہی خاندان نے مسلمانوں سے شادی بیاہ کے تعلقات قائم کیے[15]۔

دوسری جانب ہندو اپنی ذات کی سخت گیریوں سے اس طرح چھلنی تھے کہ وہ کسی مسلم خاتون کو اپنے قصر معلاّ کے پاکیزہ محل میں داخل نہ کر سکے۔ پھر بھی ہندو اور مسلمانوں میں شادیاں بالکل ہی نامعلوم تھیں۔ جہانگیر کو پتہ لگا کہ راجوری (لداخ، بلوچستان) میں دونوں فرقوں کے اندر شادی بیاہ ہوتے ہیں[16]۔ مستانی سے پیشوا باباجی راؤ کے معاشقہ کی داستان سب کو معلوم ہے وہ ایک طوائف تھی جو مسلسل پیشوا کے ساتھ رہتی تھی اور باباجی راؤ کی فوجی مہموں میں بھی ہمراہ رہتی تھی۔ اور رکاب سے رکاب ملا کر گھوڑے کی سواری کرتی تھی[17]۔ 1734ء میں پیشوا کے نطفے اور اس کے بطن سے ایک لڑکا شمشیر بہادر پیدا ہوا جس کی پرورش ایک مسلمان کی طرح ہوئی کیونکہ برہمنوں نے اس کو ہندو قوم کے اندر داخل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ 1753ء میں شمشیر بہادر رگھوبا کے ساتھ شمال کو گیا اور کمبھ اور دلّی کی لڑائیوں میں حصّہ لیا۔ 1755ء میں باغی راجہ تولاجی انگریا کے خلاف جنگی مہم کا سربراہ ہو کر گیا۔ 1761ء میں وہ پانی پت میں قتل ہو گیا۔ اس کا لڑکا علی بہادر اس کی جائداد کا وارث قرار پایا۔ 1787ء میں جب مہارجی کو شکستیں ہوئیں تو دکن سے علی بہادر کی سرکردگی میں پیشوا کے خاندان کے نمائندے کی حیثیت سے کمک بھیجی گئی علی بہادر کو خفیہ ہدایت دی گئی تھی کہ بلا سندھیا کو خبر دیے براہ راست راجپوتوں سے گفت شنید کرے۔

یہ عجیب بات ہے کہ کئی خاندانوں میں ہندو و مسلم دونوں شاخیں تھیں اور اپنے خاندانی تعلقات کو کئی پشتوں تک انھوں نے قائم رکھا۔

اسی طرح کا ڈھیلا پن ربا (سود) کے معاملہ میں بھی ہوا عملاً اس پر عمل درآمد ناممکن نظر آیا۔ بہت سے پاکیزہ مسلمانوں نے سود لینے سے انکار کر دیا لیکن وہ لوگ جن کا ضمیر زیادہ پختہ نہیں تھا انھوں

نے خدا اور مالی دنیا میں مصالحت کرنے کے لیے عجیب و نادر ترکیبیں نکالیں۔

اسلامی قانون فوجداری کا نفاذ انتہائی مشکل تھا۔ جرم کے ثابت کرنے کے لیے جو شرائط رکھی گئی تھیں۔ بسا اوقات ان کا پورا ہونا ناممکن تھا مثلاً زنا بالجبر کے لیے چار گواہوں کی شہادت ضروری تھی۔ سزائیں انتہائی ظالمانہ تھیں۔ جیسے چوری کے لیے جسم کا ایک عضو کاٹ لینا۔ سنگسار کرنا کوڑے مارنا مرتد ہو جانے پر موت کی سزا دینا بلکہ ایک فرد اور اس کے خاندان کے ظلم۔ اس لیے جب کہ واقعہ کا فیصلہ توجہ کرتا تھا لیکن سزا کے عمل درآمد کو مقتول کے اعزہ پر چھوڑ دیا جاتا تھا وہ چاہیں تو یہ مطالبہ کریں کہ قاتل کو قتل کیا جائے یا خون بہا لے لیں۔

ہندوستان میں یہ محسوس کیا گیا کہ اس قانون کے لوازمات کا پورا کرنا دشوار ہے اس کے فوجداری کے قانون کی کارروائیوں کا بیشتر حصہ قاضی کے حدود سے نکل کر حکومت کے افسران کے حدِّ اختیار میں آگیا۔

حکومت کے دستور اور اس کے کاموں کی فہرست کا جہاں تک تعلق ہے۔ ہندوستان میں مشکل سے ان کا کسی قسم کا جواز ہو سکتا تھا۔ ماہرین قانون اور عملی کام کرنے والے مدبرین دونوں نے شریعت کے قانون کو ہندوستان کے لیے نامناسب تسلیم کیا تھا۔ یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ خلفا مقدسین کی اتباع اس قسم کے معاملات میں جیسے سرکاری ملازمین اور فوج کے بے کس نظام کا قیام یا ٹیکس لگانے یا مالگذاری وصول کرنے میں کی جا سکے۔

ابتدائی دور کے خلفا کے زمانہ میں جو مسلم نظام قائم کیا گیا تھا اس میں حکومت کے محاصل کے خاص ذرائع تھے اور دو حصّوں میں منقسم تھے، مسلمان زکوۃ یا خیراتی ٹیکس اور خراج یا زمین کا لگان ادا کرتے تھے اور غیر مسلم جو حکومت کی حفاظت میں رہتے تھے وہ جزیہ اور خراج دیتے تھے۔

ہندوستان میں زکوۃ شاید ہی کبھی حکومت نے وصول کی ہو اور حکومت کے خزانے کے لیے اس کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔ زمین کا ٹیکس تمام رعایا کے لیے یکساں تھا اور اس کے لوازمات ہر شخص کے لیے ایک ہی طرح کے تھے لیکن تشخیص اور وصولی کے طریقے قدرتاً ان سے مختلف تھے۔ جو خلافت کے ماتحت زمینوں کے لیے جاری تھے۔ ہندوستان کے طریقے اپنی تمام خصوصیات میں ہندوانہ تھے البتہ ان میں ان تجربات کی بنا پر جو ہندوستان میں ہوئے ترمیم ہو گئی تھی۔ جزیہ تھوڑی مدت کے لیے وقفوں کے بعد ہی لگا یا مغلوں کے زمانہ کے پہلے فیروز تغلق اور سکندر لودی نے اسے لگایا تھا، اس کے بعد 1569ء سے 1673ء تک یہ موقوف رہا۔ اورنگ زیب نے چودھویں اور

پندرھویں صدی کے بعد پرانے منسوخ شدہ عمل کو پھر دُہرایا لیکن انھوں نے یہ محسوس کیا کہ جزیہ غلط قانون غلط مالیاتی نظریہ اور غلط سیاست ہے۔

اورنگ کا جزیہ عائد کرنا قانوناً غلط اس وجہ سے تھا کہ مسلمانوں نے جو روایات ہندوستان میں قائم کی تھیں ان کے خلاف تھا اور جن شرائط پر اس کو لگایا جا سکتا تھا ان کی اس سے خلاف ورزی ہوئی۔ مسلم قانون کے ماتحت اس کی ادائیگی دو پارٹیوں کے درمیان ایک معاہدہ کی شکل میں ہے۔ اور دونوں کے اپنے اپنے عہد پورا کرنے کے شرائط ہیں۔ ایک پارٹی تو مسلمانوں کا امیر ہے اور دوسری پارٹی غیر مسلم میں اس کا حکم قرآن سے ماخوذ ہے جو کہتا ہے کہ ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ "ان سے لڑو جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے۔ . . . . . اور نہ سچے دین کو قبول کرتے ہیں وہ لوگ جو اہل کتاب ہیں یہاں تک کہ وہ ماتحت ہو کر رعیت بن کر جزیہ دینا منظور کر لیں"۔

پیغمبر صاحب اور ان کے چار خلفا نے یہودیوں، عیسائیوں اور بعد از ان زرتشتیوں سے معاہدے کیے اور احکام قرآن کی پابندی کی۔ یہ مثالیں اس موضوع پر مسلم لا کی بنیاد ہیں۔

قانون یہ ہے کہ غیر مسلم جو اسلامی حکومت کو تسلیم کر لیں وہ ذمّی ہیں۔ لفظ ذمّی کے معنی ہیں ایک عہد جس کی پابندی کرنے پر مسلمان رضامندی دیتے ہیں اور جس کی خلاف ورزی کرنا لائق ملامت ہے اس عہد کے ذریعہ غیر مسلموں کو کچھ حقوق حاصل ہوتے ہیں جس کی حفاظت کرنا اسلامی حکومت کا فرض ہے۔ ان حقوق میں جان و مال کی حفاظت اور امن کی گارنٹی شامل ہے۔ اس کے بدلہ میں ذمی کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے تحفظ کی قیمت کے طور پر جزیہ ادا کرے۔ اور کوئی ایسا کام نہ کرے جو مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہو۔ یہ عہد ذمیوں کو لڑائیوں میں حصہ لینے سے بھی مستثنیٰ کرتا ہے۔ جزیہ کی رقم بدلتی رہی لیکن آخرکار ذمی کی حیثیت ادائیگی کا لحاظ 12۔ 24 یا 48 درہم نقد کر دی گئی وہ لوگ جو لڑائی میں حصہ لینے کے قابل ہی نہیں ہیں ان کو جزیہ نہیں دینا ہوتا تھا۔ اس طرح بوڑھے آدمی عورتیں بچے اور معذور بری تھے۔ محمد بن قاسم نے اس فہرست میں برہمنوں کو بھی شامل کر دیا تھا لیکن فیروز تغلق نے ان کو اس فہرست سے خارج کر دیا۔

محمد صاحب نے یہودیوں سے جو معاہدہ کیا تھا اس کا منشا یہ تھا کہ جنگ کے اخراجات کا ایک حصہ ادا کریں لیکن ان کو فوج میں بھرتی ہونے کی اجازت نہ تھی۔ انھوں نے اس قسم کے احکام عالیہ عرب کے مختلف حصوں میں بسنے والے اہل کتاب کے نام بھی جاری کیے۔ جزیہ کی ادائیگی کے عوض میں انھوں نے نجران کے عیسائیوں کی سرپرستی اور جان و مال جائداد زمین عقاید کی محافظت

جو لوگ موجود ہیں یا جو غیر حاضر ہیں ان کے خاندان سب کے لیے اور گرجا اور جو کچھ مال ان کے پاس ہے ان کے لیے بھی وعدہ کیا یہ بھی وعدہ کیا گیا کہ کسی بطریق کو اپنی پادری کی زندگی ترک کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ ان پر کسی قسم کی سختی یا ذلت عائد نہ کی جائے گی[19]

ابو بکر اور عمر نے اسی قسم کے معاہدے عراق اور شام کے عیسائیوں کے ساتھ کیے ایسے واقعات تاریخ میں محفوظ ہیں کہ جب خلیفہ ذمیوں کی مخالفت کی گارنٹی نہ کر سکتا تھا تو اس نے جزیہ کی رقم واپس کر دی۔ ایسے بھی واقعات ہیں کہ جب ذمیوں سے جنگ میں شرکت کا کام لیا گیا تو ان کا جزیہ معاف کر دیا گیا[19]

بعد کے ماہرین قانون جزیہ عاید کرنے کی جو اصل روح تھی اس سے ہٹ گئے اور نہایت بسیط قوانین مرتب کر ڈالے ان کو بارہ حصوں میں تقسیم کیا ان میں سے چھ واجبات سے تھے جن کی خلاف ورزی سے معاہدہ شکست ہو جاتا تھا بقیہ چھ میں ایسے فرائض اور لوازمات کا تذکرہ تھا جو مناسب تصور کیے گئے موخر الذکر فہرست میں ایسے معاملات کے متعلق ضوابط مرتب کیے گئے تھے جیسے کہ ذمیوں کے لیے ایک خاص قسم کا لباس پہننا، گھوڑے کی سواری کرنا زور سے گرجا کا گھنٹہ بجانا اور مردوں کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنا۔ اس کے بعد کچھ اور اذیت ناک طریقوں کا اضافہ کیا گیا مثلاً نئی عبادت گاہوں کا بنانا پرانی عبادت گاہوں کی مرمت کرنا اور یہ واجب قرار دیا کہ جزیہ ذمی خود کامل ادب کے ساتھ پیش کرے یہ غیر روادارانہ مطالبات کی تائید حاصل کرنے کے لیے ایک دستاویز کا سہارا لیا گیا جسے عمر کا معاہدہ کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کے معتبر ہونے میں شبہ ہے[20] اورنگ زیب کے عمل نے اکبر کے زمانے سے جو معاہدہ عمل میں مضمر چلا آ رہا تھا اس کو توڑ دیا یہ قانوناً ناجائز تھا۔ کیونکہ ایک طرف وہ ہندوؤں سے جزیہ ادا کرنے کا مطالبہ کرتا تھا اور دوسری جانب وہ ان سے یہ بھی مطالبہ کرتا تھا کہ وہ ان کے مسلمان اور ہندو دونوں قسم کے دشمنوں کے خلاف لڑائی میں بھی حصہ لیں یعنی وسط ایشیا افغانستان اور دکن کے مسلمانوں کے خلاف اور مرہٹوں کے خلاف جو ہندو تھے۔

جزیہ اقتصادی نقطۂ نظر سے غلط تھا کیونکہ یہ ان لوگوں کو بہت بھاری پڑتا تھا جو اس کے برداشت کی بہت کم طاقت رکھتے تھے۔ سب سے غریب افراد جن کی ملکیت کی آمدنی باون روپیہ سالانہ سے کم تھی ان کو تین روپیہ دو آنے سالانہ دینا ہوتا تھا۔ متوسط لوگ جن کی آمدنی باون روپیہ سے دو ہزار پانچ سو روپیہ سالانہ تک تھی وہ بارہ روپیہ آٹھ آنہ سالانہ دیتے تھے۔ یہ مالیات کے تمام صحیح اصولوں کے خلاف بات تھی۔

یہ غلط قسم کی سیاست تھی غریبوں کو بے رحمی سے چوسا جاتا تھا اور امیروں کو آسانیاں دی جاتی تھیں علاوہ ازیں غریب لوگ دیہات کے رہنے والے تھے جن پر جزیہ ان بہت سے ٹیکسوں

میں سے ایک تھا جو ان کو دینے پڑتے تھے جو ہندو مقدم اور زمینداروں اور کاشتکاروں سے وصول کرتے تھے یہ سخت گیری تو تھی لیکن اس میں ذلت نہیں تھی، دوسری جانب اگرچہ شہروں میں جزیہ بہت مالی بوجھ نہ تھا لیکن اس میں کمتری کی رسوائی پنہاں تھی۔ اور بد طینت پُرجوش مسلمانوں کی جانب سے اس کی بنیاد پر شاید ذلت بھی عائد کی جاتی ہو اونچی ذات کے ہندوؤں کو اس سے بڑا رنج پہنچتا تھا اور سخت ناراضگی پیدا ہوتی تھی۔

دوسرے اور ٹیکس جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز برتتے تھے وہ بھی اسی طرح غیر ضروری اور اسی طرح خلاف قانون تھے۔ ان میں کسٹم اور تجارت کے ٹیکس شامل ہیں جن میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں امتیاز برتا جاتا تھا۔

عدلیہ

حکومت کی عدالتی کارروائیاں انتہائی محدود تھیں اور غیر مسلموں سے ان کا تعلق بہت ہی محدود حصہ پر تھا۔ اورنگ زیب تسلیم کرتے تھے کہ غیر مسلم رعایا یعنی ذمی قوانین اسلام کے تابع نہیں ہیں۔ ان کے معاملات کا تصفیہ ان کے مذہبی اصولوں کے ماتحت ہونا چاہیے[1] ہندو صرف مقدمات فوجداری میں قاضی کے سامنے حاضر ہوتے تھے۔ لیکن جہاں تک جرم کا تعلق تھا جوں کا کام صرف یہ تھا کہ جرم کا اعلان کر دیں لیکن کیا سزا دی جائے یہ کام مدعی پر منحصر تھا اس لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کی کثیر تعداد گاؤں کے اندر ہی انصاف طلب کرنے پر قناعت کرتی تھی جہاں جہاں یعنی قاضی ایسے افسران نہیں ہوتے تھے جنھیں حکومت نے مقرر کیا ہو۔

عدلیہ کے نظام اس نظام سے یکسر مختلف ہیں جس سے یورپ آشنا ہے یا جو آج کل ہندوستان میں رائج ہے۔ عدالتیں مدارج کے لحاظ سے مرتب نہیں تھیں جن میں اختیار سماعت کے رتبے مقرر ہوں۔ ہر جج (قاضی) عدالت ابتدائی بھی تھا اور عدالت اپیل بھی۔ درحقیقت[2] اپیل کے اختیار سماعت کا صحیح معنوں میں کوئی وجود ہی نہ تھا۔ اگرچہ ابتدائی عدالت کے علاوہ دوسری عدالت میں از سرِ نو مقدمہ کی سماعت کی اجازت تھی جج کو تحقیقات اور تفتیش اور سزا اسباب کا اختیار تھا۔ ہر قاضی فوجداری اور دیوانی کے کل مقدمات کی سماعت کر سکتا تھا چاہے مقدمہ بڑا ہو یا چھوٹا۔ جائداد اور فوجداری کے مقدمات میں کسی قسم کی حد بندی نہ تھی اور نہ اختیار سماعت کا تعین تھا۔ دونوں طرح کے مقدمات خواہ وہ قانون پر مبنی ہوں یا رسم و رواج پر ان کے سامنے آتے تھے۔
عدلیہ کے افسران کا نظم و نسق شہروں اور بڑے بڑے قصبات تک محدود تھا جیسے دار السلطنت

یا صوبوں، اضلاع (سرکار) اور اضلاع کے حصّوں (پرگنوں) کے مرکزی مقام۔ بادشاہ کل سلطنت کے لیے قاضی یا قاضی القضاۃ اور صوبوں کے قاضیوں کو مقرر کرتا تھا۔ اضلاع اور اضلاع کے ہر حصّے کے قاضی بذریعہ شاہی سند مقرر کیے جاتے تھے جس کا اجرا قاضی القضاۃ کے دفتر سے ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ جو قاضی مقرر ہو گیا وہ کبھی تبدیل نہیں ہوتا تھا اور اس عہدہ پر تمام عمر فائز رہتا تھا ان کو معاوضہ دینے کا عام طریقہ یہ تھا کہ انھیں زمین دے دی جاتی تھی جس کا کوئی لگان نہیں لیا جاتا تھا۔

اس نظام کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ سوائے تقرری کر دینے کے عدلیہ کے نظم و نسق سے حکومت اور کوئی تعلق نہ رکھتی تھی عدلیہ اور انتظامیہ میں مکمل علاحدگی تھی اگرچہ بادشاہ انصاف کا سرچشمہ تصور کیا جاتا تھا اور بادشاہ کے جو نمائندے صوبوں میں رہتے تھے ان کا فرض تھا کہ شکایتیں سنیں، اور غلط کارروائیوں کو دبائیں۔ ان حالات میں حکومت کے منصب اقتدار اعلا کا ظہور انتظامی امور میں سب سے زیادہ نمایاں رہتا تھا۔ یہ ایک قدرتی بات تھی لیکن حاکمیت ہر جگہ تریع کے دھندلے سائے سے گھری ہوئی رہتی ہے۔ ممالک ایشیا میں امور کے سایے گہرے تھے جو ہمیشہ افق پر چھائے رہتے تھے ایک ذرا سی ہوا اس کو زمین پر تیزی سے لانے کے لیے کافی تھی تاکہ اس تاریکی میں لپیٹ لے۔ اس لیے ان حالات میں چوکنا رہنے۔ فوراً قدم اٹھانے۔ فیصلہ کرنے اور اس پر مضبوطی سے قائم رہنے کے صفات کی ضرورت مقتضائے وقت تھی۔ یہ ضروریات صرف انتظامیہ کا بازو مضبوط کرنے ہی سے پوری ہو سکتی تھیں۔

حکومت کے استحکام ہی کو نہیں اس کے وجود کو بھی ہر وقت خطرہ لاحق رہتا تھا۔ تیرھویں صدی کی ابتدا میں ترکوں کو شہنشاہیت کے آغاز سے لودیوں کی سلطانی کے اکھڑنے تک پانچ خاندانوں نے ہندوستان پر اپنا تسلط رکھا یعنی ہر خاندان نے ساٹھ سال اوسطاً حکومت کی۔ اس زمانے میں خطرے کے ڈر کے لمبے وقفے رہے۔ منگولوں کا خطرہ اور تیمور کا برق رفتار حملہ۔

اس لیے ضروری تھا کہ انتظامیہ کو کل طاقتوں سے مسلح کیا جائے اور اس کو زیادہ سے زیادہ وسائل دیے جائیں لیکن انسانی دماغ صرف افادیت کی بنا پر جواز کا قائل نہیں ہوتا اس لیے انتظامیہ کے اختیارات کے لیے اخلاقی دلائل تلاش کرنے کی ضرورت ہوئی۔ پھر یہ بھی ہے کہ عظیم الشان طاقت کا مظاہرہ ہمیشہ پر اثر ہوتا ہے اس سے خوف اور احترام کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے لازماً سلطان کو ایسے اوصاف کا حامل قرار دے دینا پڑا جس سے الوہیت کی بھینی بھینی خوشبو آتی ہو،

تب یہ ضروری ہوا کہ اس اختیار کے مالک کو ایک مشن کا احساس ہوتا کہ ان لوگوں میں جو اس اختیار کے ماتحت آتے تھے اس ہیبت کو روکنے کا جذبہ پیدا ہو جو ان کے اندر تھی اور وفاداری کے جذبہ کو استحکام ہو۔ اس اختیار کے اوصاف اپنی وسعت اور پابندی دونوں میں ذاتی پہلو کی جانب رجحان رکھتے تھے۔ اس اختیار کو استعمال کرنے والا شخص خدائی کا درجہ رکھتا ہے۔ ظاہر میں تو یہ سیاسی اقتدار کی نشانی تھا جو سلطنت کے اختیار کلی اور طاقت کا حامل اور مظہر تھا اور یہ شخصیت اپنی رعایا کی وفاداریوں کا مرکز اور اپنی فوج کی قوت و طاقت کا مطلع تھا۔ فوجوں کے افسران گورنمنٹ کے حکام، امرا، اہل علم، اہل فن اور شعرا سب اسی کی ذات سے وابستہ اور اس کے فیاضیوں کے محتاج تھے۔

سلطان یا شہنشاہ اور اس کے درباری ملک کی سماجی سیاسی اور ثقافتی زندگی میں نمایاں کردار ادا کرتے تھے۔ بدقسمتی سے حکمران کی پوزیشن کی اس رفعت نے خوشامد کی ہمت افزائی کی اور خیال اور عمل کی آزادی کے رجحان کی مانع ہوئی۔ دربار میں مدارج کی ترتیب اور وہاں جو آداب برتے جاتے تھے ان کی مثال صرف ایک مندر میں پوجا سے دی جا سکتی ہے۔ بادشاہ ایک تخت پر جو اہرات سے مرصع ہوتا تھا بیٹھتا تھا اس کے اوپر سلک کا چھتر ہوتا ہوتا تھا جس پر چاندی اور سونے سے کام کیا ہوتا تھا۔ تخت اونچے چبوترے پر رکھا رہتا تھا جو اتنا بلند ہوتا تھا جہاں تک درباریوں فریادیوں یا الطاف و اکرام طلب کرنے کے ہجوم کی دسترس نہ ہو سکے۔ خوشامد چاپلوسی اور غلامانہ اطاعت کی ایک فضا قائم تھی۔ 'برنیئر' جو ان درباریوں کا عینی مشاہد ہے اس کی تفصیل بیان کرتا ہے کہ کس طرح ہر لفظ جو ذات اعلا کی زبانی سے نکلتا تھا اس پر درباری ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا اٹھا کر سبحان اللہ سبحان اللہ کہتے تھے یہ عادت اس درجہ راسخ ہو چکی تھی کہ ایک امیر الامرا جس نے برنیئر سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کو اپنے علاج میں لے لے برنیئر کو ارسطو، لقمان اور بوعلی سینا کہہ کر خطاب کرتا تھا۔

اس طرح از منہ وسطیٰ کے ہندوستانی حکمران اپنے کو قوت کل کا حامل سمجھنے لگے۔ طاقت کے منطقی معنی فوج اور خزانہ کے تھے۔ یہ دونوں چیزیں فوج اور خزانہ انتظامی اختیارات کے برتنے کے لیے ناگزیر تھے اس کے علاوہ محض زیور کی طرح اور محض دکھادے کے لیے کچھ معاملات بھی تھے۔ محض نمائشی معاملر جس سے کہ اس طاقت کی عریانیت چھپی ہے مثلاً فن اور کاریگری سائنس مذہب خیرات تہواروں اور تفریحوں کی ترقی۔

لیکن ازمنۂ وسطیٰ کی حکومتوں نے تجارت اور صنعت پر عوام کی سماجی اور اقتصادی زندگی میں کسی قسم کوئی دلچسپی نہ لی۔ پھر بھی بہرحال ایک مسلم حکمران کا یہ مذہبی فرض تھا کہ وہ مسلمانوں پر (یعنی کیا کرنا ضروری ہے اور کیا کرنا منع ہے) کے اسلامی احکام کی پابندی نافذ کرے۔

اگرچہ کروفر شان و شوکت اور دھوم دھام سلطان کے چاروں طرف ظہور پذیر رہتے تھے۔ لیکن سلطانی کا حلقۂ عمل محدود تھا۔ اس کے اختیارات میں کوئی حصہ دار نہ تھا۔ اس لیے سلطانی الگ تھلگ رہی۔ اس کی خوشحالی کے لیے زیادہ لوگ فکرمند نہ تھے۔ اس کے پیروؤں کو جو تعلق باندھے ہوئے تھا وہ کبھی بھی مضبوط نہ تھا۔ سلطان حسد رکھنے والے رقیبوں سے گھرا رہتا تھا۔ یہ لوگ اس کے قریبی رشتہ دار اور شریک کار اور رفقا کے حلقہ کے تھے۔ ان حالات میں صرف وہی لوگ جو غیرمعمولی ذہانت کے حامل ہوں، اپنا سر اونچا رکھ سکتے تھے۔ جو کمزور ذہن یا کمزور کردار کے لوگ تھے وہ تیزی کے ساتھ سرنگوں ہو جاتے تھے۔ سلطانی موروثی تھی لیکن اس بات کے یقین کرنے کے لیے کوئی ذرائع نہ تھے کہ جو وارث ہوا وہ ضروری صلاحیت و ذہانت بھی رکھتا ہے۔ اس لیے ہر وہ شخص جو وراثتاً سلطان ہوتا تھا اسے اپنی اہلیت ثابت کرنی پڑتی تھی۔ اس چیز نے حکومت کو عدم استقلال عطا کیا اور یہی وجہ ہے کہ وراثت کے لیے جنگیں ہوئیں اور حکمرانوں کے خاندان جلدی جلدی بدلتے رہے۔

حکومت اور نظم و نسق

مغلوں کا نظم و نسق کا نظام تین تعمیری اثرات کے ماتحت نشوونما پایا۔ ان میں دو بیرونی اور ایک دیسی تھا بیرونی اثرات مغل بادشاہوں کے وطن سے آئے یعنی وسط ایشیا سے جہاں منگولوں کی خانہ بدوشانہ تہذیب ایران کی جامد و ساکت تہذیب سے ملی۔ مغلوں نے یہ دہرا اثر وراثت میں پایا۔ حکومت اور حکومت کے سربراہ کا نظریہ ان کو ایران سے حاصل ہوا اس کے علاوہ ان کے کلچر یعنی زبان، ادب، فلسفہ اور ان کا علمی جمالیاتی نظریہ ان سب پر ایران چھایا ہوا تھا۔ لیکن اپنی فوجی تنظیم میں انھوں نے منگولوں کی روایت کی پیروی کی اور اسی طرح انھوں نے ملازمتوں کے ترتیبی مدارج مرتب کرنے میں بھی کی۔

ہندوستان نے ان کو مالیاتی نظم و نسق اور محاصل کی تنظیم کی بنیاد عطا کی۔ مغل حکومت کی اساس فوج پر تھی۔ بادشاہ سپہ سالار اعظم تھا اور اس کے وزرا فوجی افسران تھے۔ تمام ملازمین فوجی تھے کیونکہ سول اور فوجی افسران میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ تمام افسران ایک متحدہ فوجی عملہ

سے تعلق رکھتے تھے۔ شاہانہ ہیڈ کوارٹر خواہ دارالسلطنت میں ہو یا فوجی مارچ پر" اردوئے معلیٰ" دارفع کیمپ) کہلاتا تھا۔

کل نظام منگولوں کے نمونہ پر تیار ہوا تھا منگول فوجیں عددی اسکیم پر تقسیم تھیں۔ سب سے نیچے کا عہدہ دس فوجیوں کے کمانڈر کا تھا اور اونچے درجے کے عہدے سو۔ ایک ہزار۔ دس ہزار۔ اور ایک لاکھ گھوڑوں کے سواروں کی سپہ سالاری تھی۔ منگول خانہ بدوش تھے اس لیے مزروعہ زمین سے بندھے ہوئے نہ تھے۔ ان کی بھیڑوں اور گھوڑوں کے گلے ان کی دولت تھے اور ان کے چراگاہوں کے حدود ان کے اختیارات کے علاقے تھے۔ افسران اور پاسبانوں کی گذراوقات انہی سے ہوتی تھی۔ لیکن وہ اپنی آمدنی میں اپنے حملوں کے مال غنیمت سے بھی اضافہ کر لیتے تھے۔

لیکن ہندوستان کے حالات بالکل مختلف تھے، اور فوج کے بارے میں جو خانہ بدوشی یا بدوی تخیلات تھے ان کو ہندوستان میں رائج زرعی اقتصادی نظام سے ہم آہنگ اور مطابق ہونا تھا۔ فوج کی تنظیم منگولوں کے نمونہ پر عددی کمان پر تھی جس کا نام منصب تھا۔ اس کو تینتیس زینہ بہ زینہ حلقوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ جو دس سے شروع ہوتے تھے اور امرا کے لیے پنج ہزاری تک تھے۔ شہزادوں کے لیے اور بھی اونچے درجے تھے منصب داری کی تنخواہ اس لحاظ سے مقرر کی جاتی تھی کہ وہ اپنے ذاتی نظام خانہ داری اور جو سپاہی اس کے ماتحت تھے ان کی تنخواہ اور رسل ورسائل کے اخراجات ادا کر سکے۔ یہ تنخواہ یا تو خزانہ شاہی سے نقد ادا کی جاتی تھی یا حکومت کو جن جائداد سے محاصل ملتے تھے ان محاصل میں سے کچھ ان کی سپردگی میں دے دیے جاتے تھے۔ منصب دار حکومت کے شاہی افواج کی کثیر تعداد فراہم کرتے تھے۔ ہر منصب دار کا فرض تھا کہ جتنے سپاہیوں کی تعداد حصہ رسدی کے حساب سے ان کے لیے مقرر کی گئی ہے ان کو بھرتی کریں اور ان کا خرچ اٹھائیں قدرتاً منصب دار خدام دولت کے انتخاب میں فرقہ وارانہ خیالات سے متاثر ہوتا تھا لہذا مغل افسران اپنے پیچھے چلنے کے لیے صرف مغلوں کا انتخاب کرتے تھے۔ ایرانی ایرانیوں کی فوجی ٹولی بناتے اور پٹھان منصب دار اپنے جھنڈے کے نیچے پٹھانوں کو جمع کرتے تھے۔ لیکن ایک حد تک ملی جلی بھرتی کی بھی اجازت تھی۔

یہ ضروری نہ تھا کہ جو سپاہی بھرتی کیے جائیں وہ ضرور کسی منصب سے وابستہ جاگیر کے کاشتکار ہی ہوں۔ ان میں بہت سے تو شہر کے غیر مستقل باشندے اور دریائے سندھ کے اُس پار کے تارکین وطن ہوتے جن کا ہمیشہ خیر مقدم ہوتا تھا۔ جب لڑائی کا میدان آراستہ

ہوتا تو ہر فوج کی ہر ٹولی اپنے قبیلے کے سردار کے جھنڈے کے نیچے جم کر کھڑی ہوتی تھی۔

ایک فوج جو اس طرح منظم کی گئی ہو اس کے نقائص بالکل ظاہر تھے۔ ان میں یک جہتی ناپید تھی۔ یہ باہم گتھے ہوئے ایک جسم کی مانند متحد ہو کر ایک شخص واحد کی مرضی پر حرکت نہیں کر سکتی تھی۔ بنیادی طور پر کرایے کے سپاہیوں کی فوج تھی یعنی ان آدمیوں کی جو فوجی قبائل جنگجو ذاتوں اور خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور فوج میں اس لیے بھرتی ہو گئے تھے کہ اس سے ان کو ملازمت اور لوٹ کے مواقع حاصل ہوتے تھے۔ فوج میں کسی اعلا اصول کا جوش نہیں تھا۔ اس کے انضباط اور اعتماد نفس کا انحصار اس کے لیڈر پر تھا۔

شاہان مغلیہ کی فوج جاگیردارانہ انداز پر منظم نہیں کی گئی تھی اس کے سپہ سالار موروثی مالکان آراضی نہ تھے جن کی ماتحتی میں سوار اور وابستہ دولت خدام زمین رکھتے تھے اور خدمت کرتے تھے۔ یہ لوگ اپنی ذاتی لیاقت کی بنا پر اور بادشاہ یا کسی دوسرے اعلا عہدے کے افسر کے لطف و کرم کے زیر سایہ مقرر ہوتے تھے جس میں خاندانی روایات بہترین سفارش کا کام دیتی تھیں۔ ان کو صرف یہ حق تھا کہ وہ اپنی تنخواہ یا تو خزانہ شاہی سے بطور نقد یا مالگذاری جو ان کو تفویض کر دی جاتی تھی اس سے پائیں یہی وجہ تھی کہ جب تک مغل حکومت کے اندر دم خم رہا موروثی مالکانِ آراضی کی جماعت عالم وجود میں نہ آ سکی۔

موروثی امیر الامرا میں غالب تر تعداد ہندوؤں کی تھی۔ اس گروہ میں زمینداران شامل تھے جو پرانے ہندو حکمرانوں کے خاندان کے تھے۔ انھوں نے فاتحین کے سامنے اپنے سر جھکا دیے تھے ان کی بالاتر اقتدار کو تسلیم کر لیا تھا اور اپنی جائدادوں پر خراج دینے کی شرط کے ساتھ قابض رہ گئے تھے حکومت سے ان کا رابطہ صرف نقدی یعنی لین دین تک تھا اور نہ انھیں حکومت کے برے بھلے سے کسی قسم کی دلچسپی نہ تھی۔

سولھویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے وسط میں اتر پردیش میں زمینداریوں کی جو تقسیم ہوئی اس کے اعداد و شمار سے ہندو زمینداروں کی غالب اکثریت عیاں ہے۔ اعداد و شمار بتلاتے ہیں کہ سلطنت کے وسطی حصہ میں جو علاقہ واقع تھا وہ زیادہ تر راجپوت زمینداروں کے ہاتھ میں تھا۔

سولھویں صدی میں پورے پورے ضلعے ان کے اقتدار میں تھے لیکن انیسویں صدی کے وسط تک جاٹ، گوجر، مسلمان اور دوسری ذاتوں نے بھی اپنے لیے جائداد بنالی تھیں اگرچہ اب بھی

غالب اکثریت میں ہندو ہی تھے[22]

یہ حیرت کی بات ہے کہ مسلمان زمیندار اس عہد کے آغاز میں بھی اور اس کے آخر میں بہت چھوٹی اقلیت میں تھے۔ چند مسلمان خاندان جنھوں نے زمینیں حاصل کر لی تھیں وہ یا تو مغل حکومت کی ماقبل سلطنتوں کے افسران کے ورثا تھے یا آزاد مہم باز تھے جنھوں نے زبردستی زمینوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ بابر کے ساتھ فوجوں کے جو کپتان آئے تھے ان میں سے کوئی بھی کسی زمین پر مستقلاً آباد نہیں ہوا مگر جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا اور حکومت کی نگرانی ڈھیلی ہوتی گئی عہدے موروثی ہوتے گئے اور جاگیرداروں کا تبادلہ بہت کم ہوتا گیا۔ اٹھارھویں صدی میں زمینداروں کا ایک پورا کارواں موروثی حقوق کا دعویدار بن کر نمودار ہو گیا۔ پرانے زمینداروں نے اپنی ریاستوں کو وسعت دے دی۔ کاشتکاران (اجارہ داران) نے اپنے کو مالگذاری وصول کرنے کے استمراری حق رکھنے والوں میں منتقل کر لیا اور جاگیرداروں کو جو جائداد سپردگی میں دی گئی تھی اس پر وہ مستقل حق قائم کر کے قابض ہو گئے۔

جب بنگال کی دیوانی ایسٹ انڈیا کمپنی منتقل ہوئی اس وقت بنگال کی جو حالت تھی وہ بھی ہندو زمینداروں کی غالب اکثریت ظاہر کرتی ہے اس سے یہ معقول نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ کل ہندوستان میں علاوہ مغربی پنجاب کے زمین پر بالاتر حقوق ہندوؤں کے ہاتھ میں ضم ہو گئے تھے۔

شروع شروع میں مغل امرا تدریجی مراتب والے یا تنخواہ دار افسران ہی تھے۔ یہ لوگ جاگیردارانہ نوابی کی شباہت جیسی کہ انگلستان میں تھی نہیں رکھتے تھے۔ موروثی امرا کے عدم وجود نے حکومت کو ایک مستقل اور استحکام دینے والی طاقت سے محروم کر دیا تھا۔ عوام کے پاس کسی جھکی گھمنڈی بادشاہ کے مظالم کو روکنے کے لیے کوئی سپر نہ تھی اور سلطان کے پاس تکلیف اور مصیبت کے اوقات میں کوئی قابل اعتماد سہارا نہ تھا۔

باشندے

رعایا دو قسموں میں بٹی ہوئی تھی اوپر کے درجے کے لوگ جن سے حکمران طبقہ بنتا تھا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کی اونچی ذاتوں پر مشتمل تھے۔ مسلمانوں میں سید، مغل، ایرانی، پٹھان (یا افغان) اور شیخ اور ہندوؤں میں راجپوت، برہمن، چھتری اور کایستھ اونچی ذات والے تھے۔ سید اور برہمن حکمران جماعت کے غیر فوجی بازو تھے۔ مغل حکومت اعلا طبقوں کی حکومت تھی جس کے

دو کمبے فوج اور ملازمتیں تھے۔ دونوں پر اعلا طبقہ کا فوجی گروہ یعنی مغل ایرانی پٹھان اور راجپوت۔ مکمل طور پر اجارہ داری رکھتے تھے۔ مملکت کے منصب داری کو فہرست کے تجزیے سے یہ بات صحیح ثابت ہوتی ہے۔ مآثر الامرا میں اعلا طبقہ کے منصب داروں کی جو فہرست اکبر کی حکومت سے لے کر شاہ عالم کے زمانے تک کی ہے اس میں 636 مسلمان اور 87 ہندو افسران شمار کیے گئے ہیں۔ مسلمانوں میں مغل اور پٹھان زبردست اکثریت میں یعنی 570 صرف چند سید ہیں (33) اور اس سے کم شیخ (25) اسی طرح ہندوؤں میں صرف نصف درجن استثنا کے ساتھ سب راجپوتانہ وسطی علاقہ۔ بند یلکھنڈ اور مہاراشٹر کے راجپوت ہیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کی پالیسی یہ تھی کہ صرف جنگ جو قبائل کو فوج میں ملازمت دی جائے یہ ایک ایسی پالیسی تھی جسے انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی حکمت عملی کا بنیادی پتھر قرار دیا۔

دوسری ہندو اور مسلمان ذاتیں جو آبادی کی زبردست اکثریت کی حامل تھیں۔ ایسے پیشوں میں لگی ہوئی تھیں جو اونچے طبقوں کے لیے باعث حقارت تھے۔ یعنی زراعت۔ صنعت۔ اور تجارت یہ حکومت کی ایسی رعایا تھے جن کو کوئی حقوق و مراعات حاصل نہ تھے اور جن کا کوئی حصّہ یا ثمرہ انتظام حکومت میں نہ تھا۔ قدرتی بات ہے کہ وہ حکومت کے معاملات میں کسی دل چسپی کا اظہار نہ کرتے تھے اور حکومت پر جو بھی پریشانیاں آتیں ان سے وہ لاپروا تھے۔

بادی النظر میں ہندو سماجی نظام کی روح حکومت کی کارروائیوں میں سرایت کر گئی تھی۔ کیونکہ مسلمانوں میں ذات کے تخیل نے گہری جڑ پکڑ لی تھی اور حکومت کے نظم و نسق کے محل کی بنیاد تھی۔ ہندو نظام میں چھتری سماجی نظام کے محافظ اور اس کے ترچ چلانے والے تھے یہاں تک کہ وہ یہ بھی دعوا کرتے تھے کہ وہ دوسری ذاتوں کی حیثیت کا تنسیخ بھی کر سکتے ہیں اور ان میں تبدیلی بھی۔ بہت سی ایسی مثالیں ہیں جب پنجاب کے پہاڑی علاقہ کے راجپوتوں اور مہاراشٹر کے حکمرانوں نے افراد اور طبقات کی حیثیت کو اونچا کر دیا یا گھٹا دیا ہے۔ برہمن مذہب کے دینی پیشوا تھے وہ سماجی نظام کے محافظ نہ تھے۔ ان کا یہ کام بھی تھا کہ اگر کوئی مرہٹہ سردار یا ان کے دوسرے موکل ان سے یہ چاہیں کہ یہ ثابت کر دیا جائے کہ ان کے آباد اجداد راجپوت تھے تو وہ ایک اچھی نسل سے ان کو ثابت کرنے کے لیے ان کو شجرۂ نسب سے مرتب کر دیں۔

شاہان مغلیہ چھتری بادشاہوں کی طرح تھے جن کا فرض یہ تھا کہ سماجی نظام کو برقرار رکھیں۔ ابوالفضل کے قول کے مطابق سوسائٹی چار طبقوں پر مشتمل تھی۔ لڑنے والے سورما۔ تاجر

اور صناع اہلِ علم اور کاشت کار۔ اس لیے بادشاہ پر یہ لازم ہے کہ ہر ایک کو اپنی جگہ پر رکھے اور ذاتی اہلیت کو دوسروں کے مناسب اکرام سے ملا کر دنیا کے پھلنے پھولنے کا سامان فراہم کرے اور جس طرح عظیم الشان سیاسی جماعت اپنا توازن آدمیوں کے ان چار درجہ بدرجہ رتبوں سے قائم رکھتی ہے اسی طرح سلطانی کو اپنا آخری رنگ و روپ اسی طرح کے چار قسموں سے حاصل ہوتا ہے (یعنی امرا۔ افسران محاصل اہلِ دماغ یا فلسفی اور ملازمین سے)[23]

ان چاروں اصناف میں جن کا ذکر ابوالفضل نے کیا ہے جنگی سورما حکومت کی ریڑھ کی ہڈی تھے ان کے بعد اہمیت میں اہلِ علم کا درجہ تھا اس طبقہ میں فضلاءِ عصر ماہرینِ قانون علما مذہبی، معلّمین مصنّفین اور شعرا آتے تھے حکومت کا یہ فرض تھا کہ ان کی کفالت کرے۔ سلاطین اپنے دربار کو علم کا مرکز بنانے میں فخر محسوس کرتے تھے وہ اسے پسند کرتے تھے کہ لوگ ان کو علم و فن کا سرپرست سمجھتے تھے اور اس بات کے متمنّی رہتے تھے کہ ان لوگوں کو جنھوں نے شاعری دینیات تاریخ یا ادب یا علوم میں شہرت حاصل کی ہے اعزاز اور عطیات دیں۔ قدرتاً اس سرپرستی کا بیشتر حصہ علمائے دین حاصل کرتے تھے لیکن ہندوؤں کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سنسکرت کے ممتاز فضلا اور ہندی کے شعرا ہر بادشاہ کے دربار سے وابستہ رہے اور شاہی لطف و کرم حاصل کیا۔ ہندو جوتشیوں اور ماہرینِ قانون کی برابر مانگ رہی۔

تعلیم یافتہ طبقہ گو بہت چھوٹا تھا لیکن اس نے عظیم اثرات ڈالے۔ یورپ کے متوسط زمانے کے پادریوں، راہبوں کی طرح علما، پنڈت اور ہندو مسلمان درویشوں کی بڑی عزت تھی۔ لیکن یورپ کے برعکس ان کی کوئی منظم جماعت نہ تھی نہ ہندوؤں نے اور نہ مسلمانوں نے کلیسا کی طرح کوئی نظام قائم کیا دونوں میں سے کسی نے اعلا یا اقتدار منصب کی ضرورت محسوس نہ کی جو نزاعی مسائل پر آخری فیصلہ دے سکے۔ مقررہ عقاید اور قوانین موجود تھے اور کوئی بھی بشرطیکہ وہ عربی کا ضروری علم رکھتا ہو اس کا اہل سمجھا جاتا تھا کہ ان کی تعبیر کر سکے کتبِ الہیہ اتنی جامع تھیں کہ ان میں جماعت اور فرد دونوں کے واسطے ہر شعبۂ حیات کے لیے ہدایت موجود تھی۔

ہندوؤں میں بھی حالات اس سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے۔ صرف فرق اتنا تھا کہ مسلمان قوانینِ مقدسہ کے مطالعے سے کسی کو روک نہ سکتے تھے اور ہندوؤں میں صرف برہمن کو حق تھا کہ الہامی کتابوں کے مضامین کی شرح کر سکے لیکن بہرحال مسلمانوں میں بھی عملاً تو یہ تھا کہ شرح کا حق صرف

اہل علم کو حاصل تھا جن میں زیادہ تر سید تھے۔ برہمن میں ایک قلیل تعداد مطالعہ اور تعلیم پر توجہ دیتی تھی اکثریت دوسرے پیشے کرتے تھے مثلاً زراعت، تجارت یا ملازمت۔

علما اور فقہا اپنا اثر دو طریقوں سے استعمال کرتے تھے قاضی اور مفتی کی حیثیت سے وہ عدلیہ کے نظام سے متعلق تھے اور قانونی نکات پر ان کے فیصلوں کو فوقیت دی جاتی تھی۔ قاضی جتنا ہی علم میں فائق ہوتا تھا اتنا ہی زیادہ اس کی عزت ہوتی تھی لیکن یہ لوگ عوام اور شاہی اعزازداروں کے رہنما اور مشیر بھی تھے۔ تنبیہہ اور نصیحت کرنے کے ان کے پاس دو راستے تھے یا تو مسجد میں منبر پر تقریر کے ذریعے یا حکمرانوں کے مشاورتی نشست گاہوں میں انفرادی باریابیوں کے ذریعے اس کے علاوہ وہ لوگ مدرسوں میں بچوں کے استاد اور کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ اور یہ دونوں پروپیگنڈہ کے قوی ذرائع تھے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں علم اور تعلیم دینیات ہی تک محدود تھی اور اساتذہ اور مصنفین مذہبی عقائد اور مسائل کے مبلّغ کی حیثیت سے عظیم اکرام سے مستفیض ہوتے تھے۔

علما ہی کی طرح عارفین تھے یعنی صوفی اور درویش۔ علما میں بہت سے لوگ پاکیزہ اور عاقبت بنانے والی زاہدانہ زندگیاں گذارتے تھے لیکن انہی میں دنیوی معاملات میں انتہائی چالاک بھی تھے۔ خود پسند اہل دماغ۔ منطق سے بال کی کھال نکالنے والے ماہرین قانون جن کو صرف اپنی ترقی سے مطلب تھا۔ بلبن نے ان کو علمائے ظاہر (یعنی سطحی خیال کے مفکرین) کہتا تھا۔ ان کے برعکس طبقے کو (یعنی روحانیت رکھنے والوں کو) ''علمائے باطن'' کہتا تھا۔ وہ مذہبی لوگ جنھوں نے دنیا ترک کرکے مراقبہ اور تزکیۂ نفس کی راہ اختیار کر لی تھی، ان میں بہت سے ایسے تھے جو بڑے عالم فاضل تھے۔ بہت سے اوباش اور رندمشرب بھی صوفیوں کے حلقے میں داخل ہو گئے تھے اور خرقہ سالوس پہن لیا تھا۔ خاص کر اٹھارھویں صدی میں صوفی باصفا بہت کم تھے۔ مکار اور لپاڑیے زیادہ اس گروہ میں تھے درحقیقت حقیقی تصوف کا زوال اٹھارھویں صدی کے اخلاقی اصول میں خلوص کی کمی کی نشان دہی کرتا ہے۔

ان صوفیوں کے کئی سلسلے تھے۔ چشتیہ۔ سہروردیہ۔ نقشبندیہ۔ قادریہ وغیرہ ہر اونچے طبقہ کا مسلمان اپنا یہ فرض سمجھتا تھا کہ ان سلسلوں میں سے کسی ایک سلسلے سے ضرور وابستہ رہے۔ اس کے علاقے میں اس سلسلے کے جو سربرآوردہ بزرگ ہوں ان کے سامنے سر اطاعت خم کرنے کا حلف لے (یعنی بیعت ہو) مذہبی مسائل پر ہی نہیں بلکہ زندگی کے عام کردار کے بارے میں

بھی ان کا مشورہ لیتا رہے۔

ہندو سوسائٹی میں بھی حالات اسی طرح کے تھے برہمن پنڈت سنیاسیوں کے سنتھاؤں کے گرو اور مذہبی فرقوں کے سربراہ وہی کردار ادا کرتے تھے جو مسلمانوں میں علما اور ان کے مذہبی پیشوا کا تھا۔

بدقسمتی سے یہ دونوں گروہ ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلک رہتے تھے مذہب زبان رسم و رواج اور عام حالات باہمی رابطہ میں حائل تھے یہ دونوں دو دنیا تھے ایک دوسرے سے جدا۔ ان کو ناقابل عبور دماغ کی دیواروں نے دو حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ کبھی کبھی کوئی زین العابدین کوئی اکبر یا کوئی دارا شکوہ اس دیوار کو توڑنے کی کوشش کرتا ہی تھا۔ اور کبھی کبھی ایک مسلمان درویش اور ایک ہندو جوگی مل بھی سکتے تھے اور تبادلۂ خیال بھی کرتے تھے ورنہ ان دونوں فرقوں کے مقدس گروہوں کے درمیان خلیج بہت چوڑی تھی۔

مثلاً ان مسلمانوں کی تعداد جو سنسکرت زبان پڑھتے اور سنسکرت ادب اور فلسفہ کا مطالعہ کرتے تھے۔ انتہائی محدود تھی اگرچہ فیروز تغلق کے زمانے سے آگے تک اور زیادہ تسلسل کے کے ساتھ مغل سلاطین کے زمانے میں سنسکرت کی کتابوں سے انھیں فارسی میں ترجمہ کر کے مسلمانوں کو ان سے مانوس کرانے کی کوشش کی گئی لیکن مسلمانوں کی تصنیفات میں ان سے کسی قسم کی مناسبت کا پتہ نہیں چلتا لیکن بہرحال بہت سے ہندوؤں نے فارسی اور کچھ عربی کی بھی لیاقت حاصل کی لیکن پنڈتوں نے بالعموم اپنے کو الگ ہی رکھا اور انھوں نے سنسکرت میں جو کتابیں لکھیں ان میں عربی اور فارسی ادب کو کلیتاً نظر انداز کیا۔ دونوں فرقوں کے اعلا خیال و فکر کے لوگوں کے درمیان دو پہاڑوں کے درمیان کی ایک کھائی منہ پھیلائے ہوئے تھی جس کو کود جانا مشکل نظر آتا تھا۔ یہ سخت تعجب کی بات ہے کہ محض غرور میں کسی طرف کے اہل دماغ نے اس بات کے جاننے کی جستجو نہیں کی کہ دوسرے کے خیالات کیا ہیں اس کے نہایت خطرناک نتائج جو بعد کے زمانوں میں منظر عام پر آئے۔

علما اور پنڈتوں کے تنگ دائرے کے باہر خیالات کے بین ذہن کی افراط تھی۔ ہندوؤں میں بھگتی کی تحریک کے لیڈر اور مسلمانوں میں صوفیا کے ایک طبقے اور دانشوروں نے مذہبی احکام و مسائل اور مراسم کو عبور کرنے کی خواہش کی اور اس بات کی کوشش کی کہ روحانی زندگی کی کوئی یکساں بنیاد تلاش کی جائے تنگ نظر ظاہری آداب کے پابند اصحاب جو عدم رواداری کے ساتھ اپنے کو

صدق و صفا کا اجارہ دار سمجھتے تھے ان کی علاحدگی پسندی اور غرور کے اوپر یہ لوگ اٹھنے کے طلب گار تھے۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ رواداری کے یہ مخلص پرچارک برہمنوں کے علاوہ دوسری ذاتوں کے تھے۔ کبیر جولاہے تھے نانک بیدی کھتری، رائے داس موچی دھنا جاٹ سینا حجام سندر داس بنیا، ملک داس کھتری، بیر بھنبہ بابالال اور پران ناتھ چھتری، دھرنی داس کایستھ جگجیون داس ٹھاکر، بلا صاحب کنبی وغیرہ وغیرہ۔ مہاراشٹر میں نا ناد یو ایک درزی تھا۔ جنیشور ایک ذات سے خارج کیا ہوا برہمن تھا چوکا میلا مہار تو کارام شودر تھا۔ بنگال میں اگرچہ چیتنیہ ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوا تھا لیکن اس کے چیلوں میں ہندو سوسائٹی کے پست ترین طبقوں کے لوگ تھے بلکہ مسلمان بھی تھے۔

مسلمانوں میں بھی ایسے گروہ اور افراد تھے جو ہندو فلسفہ اور ہندو مذہب کے سمجھنے کا اشتیاق رکھتے تھے۔ ان کے قلوب کے جام انسانی رحم و کرم کے دودھ سے لبریز تھے۔ کیونکہ یہ لوگ اپنی پارسائی محبت بے غرض خدمت سے اور اپنی زندگی عاقبت سنوارنے والی زندگی کے نمونہ کی بنا کر انسانوں کو اپنی جانب متوجہ کرتے اور اپنے مذہب کی جانب دعوت دیتے تھے چونکہ یہ لوگ ان تعصبات سے آزاد تھے جو پیدائش اور دولت کی بنا پر پیدا ہوتے اور غریبوں اور مظلوموں سے ہمدردی رکھتے تھے اس لیے ہر طبقہ اور ہر حال کے لوگ ان کی طرف راغب ہوئے ان سب میں سلسلہ چشتیہ کے لوگ سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ معین الدین چشتی جو ہندوستان میں اس سلسلہ کے بانی تھے۔ پرتھی راج چوہان کے زمانہ میں آئے اور اجمیر میں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ جب شمالی ہند کی ملتان حکومت ترکوں کے ہاتھوں میں چلی گئی اور دلّی دارالسلطنت ہو گیا تو سلسلۂ چشتیہ کا مرکز دلّی منتقل ہو گیا۔ اس سلسلے نے بعض بڑی نامور شخصیتیں پیدا کیں مثلاً قطب الدین بختیار کاکیؒ نظام الدین اولیاؒ، بابا فرید شکر گنجؒ اور شیخ سلیم چشتیؒ۔

یہ لوگ ہندو جوگیوں سے مذہبی امور میں تبادلۂ خیال کرتے تھے اور ان کے نقطۂ نظر کو سمجھتے تھے اس باہمی میل جول سے ہندو یوگ کے بہت سے عناصر اسلامی ذکر (مذہبی عبادت) کا جزو بن گئے کچھ لوگوں کو بت پوجتے دیکھ کر نظام الدین نے اس مکتبۂ فکر کا رجحان ان الفاظ میں ظاہر کیا۔ "ہر قوم کی اپنی راہ اپنا مذہب اور اپنا قبلہ ہے"۔ انھوں نے اپنے مرید نصیر الدین چراغ دہلوی کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ جاؤ عوام میں رہو ان کے مظالم اور ان کی مار کو برداشت کرو اور

ان سب کا جواب انکساری فیاضی اور مہربانی سے دو، پروفیسر حبیب نے کہا ہے کہ غیر مسلموں کو اپنا مذہب ترک کرا کے اسلام میں داخل کرنا چشتیہ مشن کا کوئی جزو نہ تھا۔[24]

شاہ ولی اللہ نے جو اٹھارھویں صدی کے علما کے امام تصور کیے جاتے ہیں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "سب کا مذہب ایک ہے فرق صرف قوانین اور ضوابط کا ہے۔"[25]

دوسرا گروہ قادری سلسلہ کا تھا اس سلسلہ کے بانی عبد القادر جیلانی تھے جو بارھویں صدی میں بغداد میں رہتے تھے ان کے عقاید مراسم مذہبی اور عبادت کے طور طریقوں کا نظام دوسرے سلسلوں سے مختلف ہے ان کے بعض پیرو ان کو خدا سمجھتے تھے۔ ہندوستان میں اسی سلسلے کا سولھویں صدی میں آغاز ہوا اور اس کے سب سے ممتاز معلم میاں میر (میراجی) تھے جنھوں نے داراشکوہ کو اپنے مریدوں میں شامل کیا تھا۔

ان منظم جماعتوں کے سوا بہت سے افراد ایسے بھی تھے جو کسی سلسلہ یا نظام سے متعلق نہ تھے اور ان کا رویہ دوسرے مذاہب کے ساتھ روادارانہ ہی نہیں بلکہ دوستانہ تک تھا۔ ان لوگوں میں شیخ نور الدین رشی، ابوالفضل فیضی، محب اللہ الہ باری مظہر جان جاناں اور بہت سے اور تھے۔

مسلم حکومت کے دوران محبت اور خلوص کے زوردار طور پر ابھرنے سے بہت سے اصلاح شدہ فرقوں کا قیام عمل میں آیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے توانائی کے تمام محصور ذرائع آزاد کر دیے گئے ہیں۔ انسان کے عزائم کو کسی زوردار طاقت نے ابھارا اور ان کے دماغ ارفع ہو گئے۔ شروع میں اس جذبہ نے جہاں اثر ڈالا وہ مذہب تھا جو تصوّف سے لبریز ہو گیا بعد ازاں یہ ابل کر سیاست کی نالیوں میں بھی داخل ہو گیا بہرحال اٹھارھویں صدی میں توانائی کا مذہبی اور اخلاقی امور کمزور ہو گیا اور پوری طاقت دنیوی شان و شوکت کے حصول پر زیادہ تر خرچ ہونے لگی اگرچہ اب بھی روحانی زندگی کے تذکرے لبوں پر باقی رہے ان زمانوں کا یہ عجیب و غریب منظر ہے کہ محبت الہی اور دنیوی بوالہوسی کا فرق تقریباً مٹ گیا تھا حتیٰ کہ عبادت الہی اور شہوانی لذات ساتھ ہی ساتھ جاری رہتے تھے اور بلند ترین فلسفہ کے اظہار میں بدترین توہم پرستی بھی شامل رہتی تھی۔

دو صدیوں سے زاید تک ایک عجیب قسم کے جوش اور احساس اطمینان نے قوم کو پُرمسرت رکھا۔ مغل سلطنت کے محیر العقول کارناموں میں یہ ایک اہم عنصر رہا۔ دھیرے دھیرے یہ جذبہ کمزور ہوتا گیا اور یہ جماعتی زندگی کے کسی نئے خیال کو جوش میں لانے میں یا سماجی تنظیم کی کسی نئی شبیہہ پیدا کرنے میں ناکام رہا۔

یورپ میں ریفارمیشن نے حکومت کے اقتدار اعلا اور جمہوری سوسائٹی کے اصولوں کو جنم دیا۔ ہندوستان میں بھگتی کی تحریک سیاسی طور پر بانجھ بن کر رہ گئی۔ افراد میں بہتر زندگی گذارنے کی امنگ پیدا ہوئی لیکن سوسائٹی بحیثیت مجموعی جامد و ساکت رہی جب مغلوں کی مرکزیت قائم رکھنے کی طاقت ختم ہوگئی تو سوسائٹی پرزے پرزے ہوگئی اس حالت میں ایک منتشر الخیال اور مضطرب بھیڑ جو اندرونی تنازعات سے چھنی تھی مغرب کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے باقی رہ گئی۔

از منہ وسطیٰ میں ہندوستان کے بسنے والوں نے اپنے سماجی نظام میں کسی قسم کی ترقی ظاہر نہیں کی۔ کسی اہم سماجی معاملہ میں جماعتی زندگی نے کوئی بلند درجہ حاصل نہیں کیا جہاں تک مذہب کا تعلق ہے جتھا بندی چھوٹے چھوٹے فرقوں اور برادریوں تک محدود رہی نہ تو ہندوؤں نے اور نہ مسلمانوں نے اپنے پیروؤں میں علاقائی سا تک بھی کسی حقیقی اور پراثر اتحاد کا احساس کا پیدا کیا صرف سکھ مستثنا تھے۔ سماج کی سطح پر ذات کے اندر ذاتیں اور قبیلے ہی بجائی چارہ کے حدود مقرر کرتے تھے مغل اور پٹھان ایرانی اور تورانی ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہتے تھے ہندوؤں کا حال بھی ان سے بہتر نہ تھا بلکہ اور بدتر ہی تھا دونوں کے لیے گاؤں ہی اقتصادی نظام میں ایک خود کفیل اکائی تھا اور محض نہایت کمزور دھاگے ہی سے گاؤں کے باہر جو قوم بستی تھی اس سے وہ جڑے ہوئے تھے۔

گاؤں کی سیاست میں دلچسپی انتہائی محدود تھی گاؤں کے لوگ حکومت کو اپنے سے الگ بلکہ ایک بیرونی چیز سمجھتے تھے اور بلا شبہ یہ تصور رکھتے تھے کہ یہ ایک اذیت ناک حقیقت ہے جس سے مفر نہیں ہے اس لیے مجبوراً اسے برداشت کرنا ہے لیکن اس سے متحد ہونا نہیں ہے اس کی طاقت ایک دودھاری تلوار کی طرح تھی یعنی یہ خوشحالی اور اذیت دونوں کا منبع ہے اس کی کمزوری ان کے لیے مواقع فراہم کرتی تھی۔ حکومت ان کی عقل اور سمجھ سے باہر بالکل ان سے الگ ایک چیز تھی۔ بادشاہ کی شخصیت ان کے اندر بادشاہ کی شکر گذاری کا جذبہ پیدا کرتی اگر وہ منصف فیاض اور رحم دل ہوتا اور اگر اس کے برعکس ہوا تو وہ اسے یہ سمجھ کر برداشت کرتے تھے کہ خدا کی جانب سے یہ ان کے گناہوں کی سزا ہے۔

سیاسی حیثیت سے ہندوستان کی بادشاہتیں ایک قسم کا اندرونی طور پہ آزاد ریاستوں کا گٹھ جوڑ تھیں حکومت کا عوام سے براہ راست رشتہ بہت ہی باریک تھا کیونکہ حکومت کا عمل دخل اور اس کی کارروائیاں محدود تھیں جب تک حکومت کی سربراہی طاقتور حکمران کے ہاتھ میں رہی اس نے تمام بسنے والوں کو وحدت عطا کرنے میں کامیابی حاصل کی اور امن و امان کے حالات

برقرار کیے جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام نے خوشنما تہذیب کا ڈھانچہ تیار کرنے کے لیے تیزی کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھایا لیکن اس طرح جب کوئی عظیم شخصیت ملکی معاملات کی رہنمائی کے لیے نہ رہی تو تیزی سے یہ قصر کھنڈر ہو گیا۔

حکمران جماعتوں کی ناکامیاں

اٹھارھویں صدی میں سلطنت مغلیہ کا زوال اور خاتمہ ہوا۔ اب اس کی وراثت لینے کے لیے کئی امیدوار مقابلے کے میدان میں تھے پہلی قسم میں صوبہ کے گورنران آتے ہیں ان میں اہم ترین نظام تھے۔ جو دکن کے چھ صوبوں پر حکومت کرتے تھے نواب بنگال تھے جن کی مملکت میں بنگال۔ بہار۔ اڑیسہ شامل تھے اور نواب اودھ تھے جن کا علاقہ دوابہ کے نچلے حصے دریائے گنگا کے اثر کا نیم کوہستانی خطہ تھا۔

اس کے بعد ہندو راجگان آتے تھے یعنی راجپوت جاٹ اور مرہٹہ سکھ میدان میں سب سے آخر میں ظاہر ہوئے اور یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا ان کے اندر دلی سے تمام ہندوستان پر حکومت کرنے کا کوئی جذبہ تھا بھی۔ اٹھارھویں صدی میں نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی تو تخت مغلیہ کے حصول کے خواہشمند ہو سکتے تھے۔ البتہ جس بات کا کوئی تصور نہ کر سکتا تھا لیکن جو واقعی پیش آگئی وہ یہ تھی کہ ایک بالکل بیرونی نسل میدان میں نمودار ہوئی جس کا وطن کئی ہزار میل دور تھا اور اس کے اور ہندوستان کے درمیان ایک عظیم سمندر حائل ہو کر ایک کو دوسرے سے جدا کیے ہوئے تھا یہ نسل دوسرے مقابلہ کرنے والوں کے ساتھ دوڑ میں شریک ہوئی اور مغلوں کی سلطنت کی جانشین ہو گئی۔

مغل سلطنت اپنی سالمیت قائم رکھنے میں کیوں ناکام رہی کیوں ہندوستان کے راجہ اور حکمران اس وراثت کے حصول میں ناکامیاب رہے کیوں ہندوستان کے قریب کے ممالک کے لوگوں نے اپنے پیش روؤں کی مہم بازیوں کے اعادہ کرنے کے مواقع کھول دیے یہ ہیں سوالات جن کو سمجھنا ہے قبل اس کے کہ یہ سمجھ میں آسکے کہ برطانیہ کی فتح کیوں اور کس طرح ہو سکی۔

یہ ایک بدیہی امر کا اظہار ہے کہ حکومتوں کے عروج اور زوال کا براہ راست تعلق حکمران عناصر کی اہلیت سے ہے جب تک یہ عناصر اپنے اوصاف حمیدہ قائم رکھتے ہیں حکومت کا جسم تندرست اور توانا رہتا ہے لیکن جیسے جیسے یہ اوصاف ضائع ہو جاتے ہیں کمزوری بیماری اور موت پیچھے لگ جاتی ہے۔ اوصاف حمیدہ کو ہی صحیح "تدبر کہا جا سکتا ہے" حقیقت میں یہ مخالفتوں کا مقابلہ کرنے اور ان پر قابو پانے ہی کا دوسرا نام ہے۔ یہ اپنے زمانے اور اپنے ملک کی توانائیوں کا صحیح تخمینہ

کرنے اور ہنرمندی کے ساتھ ان کا اس طرح استعمال کرنے کی صلاحیت جس سے جو پالیسی تیار کی جائے اس کی کامیابی میں وہ معین و مددگار ہو" ہر حکومت خواہ اس کا طرز کچھ بھی ہو۔ یعنی بادشاہت ہو یا چند سری یعنی عدیدیہ یا جمہوریہ اس کا بنیادی عنصر یہ ہے کہ ان سیاسی طاقتوں میں جو اسے مختلف سمتوں میں کھینچتی رہتی ہے توازن قائم رکھنے پر ہی قائم رہ سکتی ہے۔ جمہوریتوں میں حکومت کی بنیاد چوڑی ہوتی ہے اس لیے وہ حدود جن کے اندر توازن الٹ نہ جائے کافی وسیع ہوتے ہیں۔ ایک جمہوری حکومت ایک نہایت درجہ پیچیدہ نظام ہے وہ ایک ایسے جسم کے مانند ہے جس کی ایک دوسرے سے ملانے والی رگیں پورے سیاسی بدن میں قرینے سے جمی ہوئی ہیں۔ دباؤ اور بوجھ کے اثر کو وہ ایک وسیع رقبہ میں تقسیم کر دیتے ہیں اور یہ حکومت کے استقلال کے قیام میں مددگار ہوتے ہیں۔ جمہوریت نے پریشانیوں کا مقابلہ پرامن طریقہ سے کرنے کی راہ ڈھونڈ لی ہے اس لیے ایک حکومت بدل کر دوسرے کے لے آنے میں عام طور پر تشدد و کشت و خون اور حکومت موجودہ کا خوف شامل حال نہیں ہوتا۔

ہندوستان کے اندر ازمنہ وسطی میں جو حکومتیں قائم تھیں وہ اس طرح استقلال پیدا کرنے والی اور ہر طرح کے جھٹکوں کو برداشت کرنے والی تدبیر سے ناواقف تھیں ان کا سہارا تو صرف خوردبین سے نظر آنے والی ان کی رعایا کے اندر ایک چھوٹی سی اقلیت تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کا عہد غیر مستقل اور غیر محفوظ تھا۔ حالات اتنے خطرناک تھے کہ صرف اعلا سے اعلا اوصاف ہی کی موجودگی ان کے وجود کے قائم رہنے کے ضامن ہو سکتے تھے۔ لیکن یہ ایک ایسا مطالبہ تھا جس کا پورا کرنا آسان نہ تھا۔ وسطی زمانہ میں وراثت کو ان خصائص کا مالک بنانے کا یقینی طور پر تعین کرنا بار بار ناکامیاب ہو چکا تھا لیکن کوئی اور دوسرا پرامن طریقہ ضروری صلاحیت کا پتہ لگانے کا تھا بھی نہیں۔

یہ یقین کہ اوصاف خون میں رواں ہوتے ہیں اتنی گہری جڑ پکڑے ہوئے تھا کہ تاج و تخت کے مالک کے لیے مناسب آباؤ اجداد کی تلاش کے لیے افسانوں کی آڑ لینی پڑی۔ مغل شاہنشاہ اس پر فخر کرتے تھے کہ وہ ایسے لوگوں کی پشت سے ہیں جو فاتح عالم تھے یعنی چنگیز اور تیمور۔ شیواجی کے لیے ایک ایسا شجرہ تیار ہوا جس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ سورج بنسی نسل کے سسودیاس کی نسل سے تھا جاٹوں کا یہ دعوا تھا کہ وہ یادو نسل کے سر سری کرشن کی اولاد ہیں۔ سلاطین بہمن ایران کی عظیم تر نسل سے ہیں یعنی بہمن سے اسفندیار تک کے ذریعہ خاندان کے اوصاف کی منتقلی کے نظریہ کی تردید بار بار تجربوں سے ہوئی لیکن کسی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ حکمراں کے اوصاف یا دوسرے الفاظ میں حکومت کرنے کی اہلیت ہی حکومت کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں سب سے اہم عنصر تھا۔

دوسری اہم عنصر ان سہاروں کی نوعیت تھی جو حکمراں کو ان لوگوں سے ملتا تھا جو سیاست

میں حصہ لیتے تھے اوپر اس امر کی شرح کی جا چکی ہے کہ مغل حکومت اونچی ذات والوں کی حکومت تھی اس اونچی ذات میں اہل سیف بھی تھے اور اہل قلم بھی یہ دونوں مل کر حکومت کے لیے ایک بہت تنگ بنیاد کا کام دیتے تھے۔ ان زمانوں میں ان کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ آج وہ آبادی کا کل دس فی صد ہیں لیکن یہ تعداد بھی دھوکہ دینے والی ہے کیونکہ اس میں ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کا حکومت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

اٹھارھویں صدی میں زمینداری کی کیا تعداد تھی جن سے حکومت کی خدمت بجالانے کی امید کی جاتی تھی۔ اس کا کوئی پتہ نہیں لگتا۔ شرما[26] کے حساب کے مطابق 1690ء میں اورنگ زیب کے زمانے میں منصب داروں کی تعداد 14556 تھی۔ وہ نظم و نسق میں ملازمین کے اونچے درجہ (اپر کیڈر) میں تھے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے ایسے تھے جو منصب داروں کی فہرست میں شامل نہیں تھے۔ لیکن نیچے کے دفتروں میں حکومت کی ملازمت کرتے تھے یا غیر فوجی خدمات انجام دیتے تھے (قاضی وغیرہ) یہ سب آراضی دار تھے اور حکومت سے وابستہ تھے ان سب کے علاوہ بہت سے موروثی ہندو زمیندار تھے جو حکومت سے قریبی وابستگی نہ رکھتے تھے ان سب واقعات کا نتیجہ یہ ہے کہ مغل بادشاہ کسی بڑی فعال حمایت پر تکیہ نہ کر سکتے تھے اور ان کو سہارا دینے والے ایک مختصر جماعت پر مشتمل تھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زار دس تک کو ان سے زیادہ حمایتوں کی تائید حاصل تھی کیونکہ اسٹالن کے قول کے مطابق ایک لاکھ تیس ہزار مالکان اراضی امرا زار کی پشت پر تھے۔ برنیر کے قول کے مطابق دلی کے عوام میں بہتر قسم کے لوگوں کا تناسب دس میں دو یا تین تھا جب کہ ٹھیک اسی زمانہ میں پیرس کے اندر سات سے آٹھ تک تھا۔

اس ڈھانچے کی مخصوص نوعیت کے علاوہ اس کی کارکردگی کے ڈھنگ سے بھی جس کی بقا کا دور متعین کیا جاتا تھا۔ اگر صحیح حکمت عملی پر عمل کیا جائے تو حکومت مستحکم ہوتی تھی ورنہ کمزور ہو جاتی تھی۔

مغلوں میں کئی نسلوں تک مسلسل عنانِ حکومت لائق لوگوں کے ہاتھوں میں رہی۔ بابر جو اس سلطنت کا بانی تھا اس میں ایک ماہر سپہ گر ایک مدبر اور ایک دوردانش کے اوصاف جمع ہو گئے تھے جو ایک غیر معمولی بات ہے ہمایوں اپنے باپ سے مختلف تھا لیکن بڑا مخلص لائق اور اہل دماغ تھا اعلا درجے کا ایک ذہین انسان تھا۔ وہ عظیم صلاحیتوں والا ماہر تنظیم، دور اندیش، مدبر سپہ سالار نڈر اور حق کا مخلص متلاشی بھی تھا۔ جہانگیر اگرچہ آرام و عیش کا شیدائی تھا لیکن اپنے باپ کی پالیسیوں کو چلانے کی بخوبی صلاحیت رکھتا تھا شاہجہاں وہ اہلیتوں کو سمجھنے لائق آدمیوں کا انتخاب کرنے اور

درمیانی راہ اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا اورنگ زیب اپنی خوبیوں اور برائیوں دونوں میں عجیب و غریب تھا۔ جہاں تک ذاتی کردار کا تعلق ہے وہ پاکیزگی کا ایک نمونہ تھا وہی ایک بادشاہ ہے جو شراب عورت اور موسیقی کے شوق سے مبرا تھا۔ وہ ایک زاہد خشک کی زندگی بسر کرتا تھا۔ اور اپنے مذہبی فرائض کی ادائیگی میں نہایت مستعد اور پابند اوقات تھا جہاں تک حکومت کے کاموں کا سوال ہے وہ اپنے فرائض کو غیر معمولی محنت سے پورا کرتا تھا۔ وہ ایک ہمہ وقت ہوشیار اور تہ تک نظر کرنے والا دماغ رکھتا تھا اور اپنی مملکت کے کل معاملات پر بڑی گہری نظر رکھتا تھا اس کا عزم غیر متزلزل تھا اور اگر اس کی راہ میں رکاوٹیں آتیں تو وہ اس کے ذوق و شوق کو اور زیادہ مہمیز کرتی تھیں۔

لیکن اورنگ زیب کی پالیسیاں غلط تھیں وہ اس عظیم قصر کا مسمار کنندہ ثابت ہوا جو بابر اکبر اور شاہجہاں نے تعمیر کیا تھا اس کی دو بڑی غلطیاں تھیں (1) اس نے حکومت کی شہ رگ پر توجہ مبذول نہیں کی۔ خزانہ عامہ سے بے توجہی نے اس کی آمدنی اور خرچ دونوں پر معاندانہ اثر ڈالا۔ سپاہیوں کو تنخواہ دینے کے لیے اسے قرض لینا پڑا۔ خزانہ کے خسارے نے نظم و نسق کو مستقلاً متاثر کیا (2) اس نے اونچے درجے کے ہندوؤں کو جو حکومت کا سہارا تھے ناراض کر دیا۔

زمین آمدنی کا خاص ذریعہ تھی۔ یہ دو حصوں میں تقسیم تھی ایک حصہ براہِ راست حکومت کے انتظام میں تھا اور اسے خالصہ (ریزرو) کہتے تھے۔ خالصہ زمین کی مالگزاری حکومت کے ملازمین جمع کرتے تھے اور یہ زیادہ تر بادشاہ اور درباریوں پر خرچ کی جاتی تھی۔ دوسرا حصہ "جاگیر" کا تھا جس سے منصب داروں کی تنخواہیں اور ان کے الاؤنس ادا ہوتے تھے۔ افسران کو خزانہ سے نقدی کی صورت میں براہ راست ادائیگی کے بجائے جاگیر کے پروانے دے دیے جاتے تھے۔ اپنے عہد حکومت کے انیسویں سال میں اکبر نے کل زمین کو خالصہ زمین میں منتقل کر دیا تھا۔ بظاہر ان کا منشا یہ معلوم ہوتا تھا کہ اپنی مملکت کی کل آراضیات کا انتظام براہِ راست اپنے ہاتھ میں لے لیں اور محکمۂ مال سے جو سرمایہ جمع ہو اس کو ایک مجموعی سرمایہ قرار دے کر اس سے حکومت کے کل اخراجات کیے جائیں جن میں منصب داروں کی تنخواہیں بھی شامل ہوں یہ ایک نئی بات تھی جو اگر قائم رکھی گئی ہوتی تو ہندوستان کی کل تاریخ کو بدل دیتی۔

بد قسمتی سے دستور اور فوری ضروریات کے محرکات غالب آئے اور اکبر کے عہد حکومت کے اختتام تک خالصہ زمین کل کا صرف ⅕ رہ گئی۔ جہانگیر فضول خرچ بیدریغ اور لاپرواہ تھا۔ اس نے خالصہ زمین کو گھٹا کر کل رقبہ ½ کر دیا۔ شاہجہاں نے ان آراضیات پر از سر نو قبضہ کرنے کی کوشش کی اور اس کا

کل رقبہ ½ ہوگیا تھا۔ یکسے آیا اورنگ زیب کو ایک غلط وراثت ملی تھی لیکن اس نے خالصہ زمین کو ½ کیا ان کا منصوبہ یہ تھا کہ کل مملکت سے 80 کروڑ محاصل جو جمع ہوتے تھے اس میں سے خالصہ زمین سے چار کروڑ روپے جمع ہوں اور واقعی انھوں نے 3.3 کروڑ جمع بھی کیے۔

یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ لیکن ان کے دوسرے طریقہ کار غلط اندیشی پر مبنی تھے اور انھوں نے تشخیص مالگذاری کی شرح کو کل پیداوار کے ⅓ سے بڑھا کر ½ کر دیا جس سے کاشت کاران پر بوجھ بہت بڑھ گیا دوسرے انھوں نے جزیہ عاید کیا جو حقیقی معنوں میں غریبوں پر بڑی زیادتی تھی۔ ان چیزوں کے لگانے سے کاشت کار کے پاس بس اتنا بچ جاتا تھا کہ وہ سال بھر اپنی زندگی کسی طرح گذار سکے۔ اور اس کے پاس کھیتی کو ترقی دینے یا وسیع تر کرنے کے لیے کچھ نہیں بچتا تھا۔

جہاں تک جاگیر کی زمینوں کا سوال ہے ان کی مالگذاری اتنی گھٹا دی گئی کہ جاگیروں میں اب کوئی جاذبیت باقی نہ رہی۔ جاگیردار مجبور ہو کر انھیں کاشت کاروں کو اراضی سپرد کرنے لگے جو مالگذاری ادا کرتے تھے، محاصل کے وصول کے اس پیچیدہ طریقہ سے گاؤں اور حکومت کے لیے نئے نتائج پیدا ہوئے۔ کاشت کاروں پر ظلم کی راہ کھل گئی اور حکومت کے محاصل میں تغلب و تصرف کی راہ آسان ہوگئی۔

مالگذاری وصولی کے لیے ہندو عمال کے بجائے مسلم عمّال کی تقرری کرنے میں اورنگ زیب نے دوسری بھیانک غلطی کی۔ مال کے معاملات میں واقفیت اور تجربہ کا بدل عقیدہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس پالیسی کے بدلنے کے بعد بھی نہ تو انصاف کرنے کے معاملہ میں حکومت کی شہرت بڑھی اور نہ ہندو افسران کے اندر جو خوف پیدا ہو گیا تھا وہ دور ہو سکا کیونکہ جو افسران نکالے گئے تھے ان میں صرف نصف درجن دوبارہ بحال کیے جا سکے۔

ایک طرف ان کارروائیوں نے مالیاتی آمد پر اثر ڈالا تو دوسری جانب توسیع مملکت کا جو جذبہ مذہبی عدم رواداری کی بنا پر دکن کے شیعوں میں اور مہاراشٹر کے ہندوؤں میں پیدا ہوا اس نے حکومت کے خزانہ کو بالکل خالی کرادیا۔ ستائیس سال تک شہنشاہ کو ایک عظیم فوج کو ایک گراں مہم میں مسلسل مشغول رکھنا پڑا جس کا آخری نتیجہ مکمل ناکامیابی ہوا مرہٹہ جنگ کے کئی اثرات ہوئے۔ حکومت کی عزت کیچڑ میں پھینک دی گئی۔ برق رفتار مرہٹہ سپاہی، مغلوں کے مغل کے گراں بار، حرکت سے معذور اور عیش پسند فوجی کیمپوں پر ہنستے تھے۔ مرہٹہ ان کیمپوں کے گرد گھومتے رسد کاٹ دیتے افسران کو پست ہمت کرتے اور مغل مملکت میں خراج عائد کرتے تھے۔

دکن کے محاصل جن کا اندازہ اٹھارہ کروڑ کا ہے حقیقتاً بالکل ختم ہی ہو گئے جس سے خزانہ کو عظیم نقصان پہنچا۔ شہنشاہ کے آباو اجداد نے جو خزانہ جمع کیا تھا وہ بھی ختم ہو گیا ان کی موت پر صرف بارہ کروڑ کی ایک حقیر رقم باقی رہ گئی۔

اورنگ زیب کو ان کی اس متعصبانہ مذہبی پالیسی کے لیے بجا طور پر الزام دیا گیا ہے جو سیاسی نوعیت سے غیر دانشمندانہ اور مذہبی نقطۂ نظر سے جائز تھی۔ اس پالیسی نے بڑا نقصان پہنچایا۔ مذہبی جنون نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اعلا طبقوں کے اندر کی خلیج کو وسیع تر کر دیا اکبر کی پالیسی نے جن زخموں پر مرہم رکھنے کا رجحان ظاہر کیا تھا ان کے منہ پھر کھل گئے اور ہندوؤں کو یہ یاد دلایا کہ وہ ایک کمتر طبقہ کے شہری ہیں۔ اسی کے ساتھ کبیر اور نانک نے جو عوامی تحریک دونوں مذہبوں کو ملانے کی چلائی تھی اس میں اس نے رکاوٹ ڈال دی۔ لیکن یہ کہنا مبالغہ ہے کہ اس پالیسی نے مغل سلطنت کے خلاف عام بغاوت کا جذبہ پیدا کیا یا یہ کہ مسلم حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے لیے لوگوں کو ابھارا جو کچھ اس نے کیا وہ صرف یہ تھا کہ باغیوں کے سیاسی مقصد کی تائید میں پروپیگنڈہ کا مسالہ دے دیا۔ اور بے اطمینانی کی جو آگ جل رہی تھی اس میں ایندھن کا اضافہ کر دیا۔

ہندوؤں کے عام طور پر بغاوت کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کا کوئی سوال نہ تھا کیونکہ ہندو ایک متحد قوم کی شکل میں نہ تھے اور ایک واحد سماجی جماعت کے طور پر منظم نہ تھے اس کے علاوہ اورنگ زیب کی پالیسی ان کی موت کے ساتھ مر گئی اگرچہ اپنے پیچھے تلخ یادوں اور غم و غصہ کا ایک سلسلہ چھوڑ گئی۔

اس زمانہ میں جو بغاوتیں ہوئیں ان کا ایک سرسری تجزیہ اس دعوے کے ثبوت میں کافی ہے —

"ست نامی" ہندوؤں کا ایک آزاد خیال طبقہ 1674ء میں بعض چھوٹے چھوٹے ذاتی معاملات کی بنا پر حکومت کے افسران سے مقابلہ کر بیٹھا۔ انھوں نے مقامی پولیس اور فوج کو عاجز کر دیا اور اپنی خود حکومت قائم کر لی اورنگ زیب نے ایک بھاری فوج رونداز خان کی سرکردگی میں جس میں ایک راجپوت فوجی ٹولی بشنو سنگھ کچھواہا کی قیادت میں شامل تھی روانہ کی ستنامیوں کو تہس نہس کر دیا گیا مورخین عہد مغلیہ نے کیا ہندو کیا مسلمان ایشور داس ناگر مستعد خاں اور خافی خاں ستنامیوں کو ہندومت کا علم بردار نہیں قرار دیا ہے۔ ہندو مورخین کے مطابق ستنامی بہت ہی گندے اور بدمعاش تھے اپنے طریقۂ کار میں وہ ہندو مسلمان میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے سور اور دوسرے گندے جانوروں کو کھاتے تھے اگر ایک کتا پکا کر ان کے سامنے رکھ دیا جائے تو وہ کسی گھن کا اظہار نہیں کریں گے [27]

جاٹ زمینداروں نے دوابہ میں جو بغاوت کی وہ کوئی مذہبی یورش نہیں قرار دی جا سکتی۔

موروثی مالکان آراضی (زمیندار) اور حکومت میں مسلسل رشہ کشی جاری رہتی تھی۔ از منۂ وسطی کے وقائع نگاران کے حکایت ان واقعات سے بھرے ہوئے ہیں کہ سرکش اور ناراض سرداروں نے زبردستی کئے بغیر محاصل دینے سے انکار کیا ہے اور موقعہ ملا ہے تو اندر اندر سرکشی اور کھلم کھلا بغاوت بھی کی ہے۔ حکومت کی فوجوں کا کوچ اور بغاوت کے کچلنے کے واقعات تو روزمرہ ہی پیش آتے رہتے تھے۔ ہر سردار خواہ کتنا ہی چھوٹا ہو اقتدار اعلا کے معاملہ میں برابر کی حیثیت رکھتا تھا اگر چہ اس کے پاس فوجی طاقت بہت کمتر ہوتی تھی لیکن وہ ہمیشہ آمادہ رہتا تھا کہ اپنی ریاست کے حدود میں وسعت دے اور اگر قسمت یاوری کرے تو بادشاہ بن بیٹھے۔

جاٹ

جب اورنگ زیب دکن چلا گیا تو مہم باز اور منصوبہ پسند جاٹ زمینداروں نے دلّی میں اس کی غیر موجودگی کو غنیمت سمجھا اور اس سے فائدہ اٹھایا۔ راجہ رام نے راجپوت قبائل کے اندرونی تنازعات سے فائدہ اٹھا کر ایک قبیلے کو اپنے مقصد کے حصول کے لیے ملا لیا لیکن آپسی لڑائی میں وہ قتل ہو گیا اور مغل فوج نے جس میں امبر کے راجہ بشنو سندھ کچھواہا نے اہم حصہ لیا تھا اس سرکش کا سر کچل دیا۔

راجہ رام کے چھوٹے بھائی چرمان نے اورنگ زیب کی موت کے بعد جانشینی کی جنگ میں کامیاب ہونے والے کی طرف سے حصہ لیا اور منصب دار بنا دیا گیا۔ بہادر شاہ کے لڑکوں میں جب دوسری مرتبہ جانشینی کے لیے لڑائی ہوئی اور اس کی وجہ سے انتشار پھیلا اس میں چرمان نے اپنی پوزیشن کو بڑھا لیا جنگی اور ٹیکس لگا کر اس نے ایسی سختی سے وصول کرنا شروع کیا کہ ہنگامہ بپا ہو گیا دربار کی گروہ بندیاں اس کے خلاف کسی مضبوط کارروائی کرنے میں مانع رہیں لیکن خود اس کے لڑکوں میں جھگڑے اتنے بڑھے کہ اس کی زندگی تلخ ہو گئی اور اس نے زہر کھا کر خودکشی کر لی۔

چرمان کا جانشین اس کا بھتیجہ بدن سنگھ ہوا اس نے اپنے پیش رودں کی غارت گری کی کارروائیاں ختم کر دیں اور ایک مستقل ریاست کی بنیاد رکھی جسے ان تمام ساز و سامان سے مزین کیا جو دربار مغل کا عمومی دستور تھا۔ وہ اپنا دربار کافی تزک و احتشام سے منعقد کرتا تھا۔ کئی مسلمان افسران جن کو اس نے اپنی ملازمت میں شامل کیا تھا۔ دربار میں شائستگی اور اکرام لائے وہ وہاں درباری زندگی کے نمونے کا کام دیتے تھے اور کھردرے قبائلیوں کے لیے ادب اور تہذیب کے معلّم کا فرض انجام دیتے تھے[28] اس نے اپنے لڑکے کو ایک اعلا خاندان بلند مرتبہ مسلمان سے تعلیم دلوائی اس کے پوتے بہادر سنگھ نے شرح جامی تک عربی پڑھی۔[29]

جاٹ راج کی آئندہ کی تاریخ میں اور سلطنت مغلیہ کے شہزادوں نوابوں اور امراکی الجھی ہوئی سازشوں کو ناپاک حکایت میں جو اٹھارھویں صدی میں رونما ہوئی کوئی فرق نہیں ہے اس دیس میں کوئی اصول نمایاں تھا نہ کوئی دوراندیشی جو وہ اپنے ہندو اور مسلمان ہم عصروں کے ساتھ برتتے تھے۔ اذناترین شہادت بھی اس بات کی نہیں ملتی کہ اپنے خاندان کے فائدے کے باہر کوئی طے شدہ مقصد ہندو قوم کے مفاد کا بھی رہا ہو۔ کچھواہا اور راٹھور کی جنگ میں جاٹوں نے مقدم الذکر کا ساتھ دیا اور یہ بھول گئے کہ کچھواہا کے راجگان بشن سنگھ اور سورج سنگھ نے جاٹوں کے خلاف مہم کی قیادت کی تھی۔ انھوں نے روہیلوں کے خلاف شہنشاہ پسندوں کی مدد کی۔ جب نواب اودھ نے شہنشاہ دلی کے خلاف بغاوت کی تو نواب کی جب شاہ دلی نے مرہٹوں پر چڑھائی کی تو شاہ دہلی کی جب مرہٹے ابدالی کے مقابلے میں نکلے تو مرہٹوں کی مدد کی یہ انتظار کا کھیل کھیلتے رہے حالاں کہ یہ وقت تھا جب متھرا اور بندرابن جل رہے تھے اور تلوار کی دھار پر رکھ دیے گئے تھے ان کی اسکیم یہ تھی کہ وہ اپنے جاہ وجلال کو قایم رکھیں۔ لیکن مملکت کی طاقت کو قائم رکھنے پر ان کی نگاہ نہ تھی۔ پانی پت کے جنگ کے موقعہ پر انھوں نے مرہٹوں سے ناگواری کے ساتھ ایک صلح کر لی اور پھر دھوکہ کا خوف ظاہر کرکے ان سے الگ ہو گئے اور میدان میں مرہٹوں کو تنہا ابدالی کے مقابلے کے لیے چھوڑ دیا۔

یہ بے اصول ترکیب بازیاں قطعی ثابت نہیں کرتی کہ جاٹ ہندو مذہب کے محافظ تھے اور اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی نے جائز غصہ ان کے اندر بھر دیا تھا۔

مرہٹہ

جو گروہ مغل شہنشاہت کی جانشینی کے دعوے دار تھے ان میں مرہٹوں کو سب سے بہتر مواقع حاصل تھے۔ قدرت نے ان کو ایک پیوستہ رتبہ عطا کیا تھا جہاں تک کسی کا پہنچنا آسان نہ تھا مغربی گھاٹوں کی نیچی پہاڑیوں کا سلسلہ جو میدان اور سمندری ساحل کے بیچ ریڑھ کی ہڈی کی طرح چلا گیا ہے اور مغربی دکن کی سطح مرتفع اور کونکن کے ساحل یہ تھی مرہٹوں کی زمین۔ بحر عرب کا عظیم سمندر اس کے ساحل کو سیراب کرتا ہے۔ یہ اس علاقے پر حد سے زیادہ احسان نازل کرتا یعنی دھوم دھام کی بارش اور برّ اعظم کے ممالک سے تجارت۔ گھاٹ ایسے بنے ہیں کہ دشمن کے گھوڑوں کی ٹاپ سے بچ کر ان میں پناہ لی جاسکتی ہے ان کے تنہا پہاڑ کے ڈھلوان چٹان ان عجیب قلعوں کو مضبوطی سے قائم کرتے ہیں جو پیچھا کرنے والوں سے پناہ کا کام دیتے ہیں اور چاروں طرف کے میدانوں پر قبضہ قائم رکھنے کے لیے مفید ثابت

ہوتے ہیں سطح مرتفع میں کثرت سے وادیاں ہیں جن سے دریا پورب کی طرف بہتے ہیں۔ وادیوں کی زمین زرخیز ہے۔ بقیہ زمین عام طور پر کودوں اور موٹے اناج مثل باجرہ اور جو پیدا کرنے کے لیے موزوں ہے۔

ان ساحلوں پہاڑیوں اور ارض مرتفع کے علاقہ میں مرہٹے ایک محنت کش اور کفایت شعارانہ زندگی بسر کرتے تھے ان کے ماحول نے ان کے اندر آزادی مہم بازی اور بہادرانہ خود اعتمادی کے جذبات پیدا کیے دولت کا بڑا فرق جو شمال اور جنوب میں تھا وہ یہاں نہیں پایا جاتا تھا ان کی سوسائٹی کی ریڑھ کی ہڈی مالکان آراضی کاشت کاران تھے۔ ذات کا نظام دوسری جگہوں کی طرح یہاں بھی تھا لیکن برہمنوں کے تین گروہوں کی باہمی رقابت مرہٹوں کی مضبوط پوزیشن اور عوام میں اصلاحی تحریکات کی ہردلعزیزی نے ذات کی سخت گیریوں کو کم کر دیا تھا ایک ہی عوامی زبان۔ مرہٹہ۔ نے عوام کے عزائم کو ثقافتی پیوستگی اور جذبات اتحاد عطا کیا۔

احمد نگر اور بیجاپور کے نرم سلطانوں کی ماتحتی میں مرہٹوں کو خوشحالی حاصل کرنے اور اپنا اثر بڑھانے کے کافی مواقع ملے بہت سے مرہٹہ خاندان نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کرلیں بہت سے سلطان کی ملازمت میں شامل ہو گئے اور کچھ نے اعتماد اور ذمہ داری کے عہدے حاصل کیے سترھویں صدی میں جب سلطانی کی جانشینی کے لیے رقابتوں نے مرہٹہ والیان ریاست کے منصوبوں کو ابھارا۔ فضا میں مذہبی جوش نے کہربائی طاقتیں بھر دیں اور تقدیر کھڑی ان کو پکار رہی تھی۔

اس صحیح موقعہ پر ان کے اندر ایک لیڈر پیدا ہوا جو تدبیر اور سپہ گری کے اعلاترین صلاحیتوں سے لیس تھا۔ شیواجی ان لوگوں کو جو دیوگری کے یادووں کے زمانے سے اب تک اپنی خود منظم سیاسی جماعت کے وجود تک سے ناواقف تھے اور جو ساڑھے تین سو سال سے زاید سے ان خاندانوں کے حکمرانوں کے تحت رہتے چلے آرہے تھے جو شمال کے رہنے والے تھے ایک واحد سیاسی تنظیم میں منسلک کر دیا۔ بکھرے ہوئے عناصر کو ملا کر ایک مملکت بنا دیا جو واقعی حیرت انگیز کارنامہ تھا اس سے کم حیرت انگیز بات یہ نہ تھی کہ اس مملکت کو نظم ونسق کی ایک مشینری عطا کی گئی جو صحیح اصول پر تعمیر کی گئی تھی۔

شیواجی کی ذہانت تین رخ پر کمالات حاصل کرنے میں درخشاں نظر آتی ہے یعنی ایک ایسی فوجی طاقت کا پیدا کرنا جو اس قابل ہوئی کہ دکن کے سلاطین کے جوئے کو اپنی کندھوں سے اتار پھینکا۔ تمام مرہٹہ ریاستوں کو ایک مملکت کے چھتر شاہی کے نیچے منظم کرکے جمع کر دینا۔ اور روشن خیالی پر مبنی ایک مستحکم نظام حکومت قائم کرنا۔ مالیاتی پہلو ہندوستان کی حکومتوں کا ہمیشہ ایک کمزور پہلو لیکن شیواجی اپنے افسران کی تنخواہیں مقرر کرنے اور ادائیگی کے قواعد مرتب کرنے اور اپنے معاملات میں فضول خرچی

سے بچنے میں انتہائی احتیاط برتتا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے فوجی اخراجات اس کی فتوحات سے پورے ہوتے تھے۔ اس نے جاگیردارانہ نظام سے بالکل قطع تعلق کر لیا تھا اس کی ملازمتوں کا دروازہ تمام با اہلیت اشخاص کے لیے کھلا ہوا تھا خواہ وہ برہمن ہوں یا پربھوس (یعنی کایستھ) یا مرہٹہ یکساں مواقع سب کو حاصل تھے حتیٰ کہ مسلمان بھی اعلا عہدوں میں شامل کیے جاتے تھے۔

اس کی پالیسی کا آخری مقصد کیا تھا اس کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا مرہٹوں کے کچھ مورخین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے وہ ہندو پدشاہی قائم کرنا چاہتا تھا یعنی مغلوں کی شہنشاہیت کے بجائے ہندو راج۔ لیکن مرہٹہ کی پوری تاریخ میں "سوراج" "ملک گیری" سے نمایاں طور پر ممتاز نظر آتا ہے یعنی اس سرزمین پر جس میں مرہٹے آباد تھے ان کی ایک باضابطہ حکومت اور اس مملکت (سوراجیہ) کے باہر کی وہ مملکت جو مرہٹہ سواروں کے شکار کی مسرت بخش زمین تھی" اور مرہٹوں کے خراج عاید کرنے کا ایک جائز وسیلہ بھی تھی اس سلسلہ میں جدوناتھ سرکار لکھتے ہیں کہ "شیواجی کی خارجہ پالیسی اور قرآنی حکمرانی کی خارجہ پالیسی کی دررساں مماثلت اتنی مکمل ہے کہ شیواجی کے درباری مورخ کرشنا جی اننت اور بیجاپور کی سرکاری فارسی تاریخ دونوں نے ایک ہی لفظ یعنی "ملک گیری" کا لفظ ان حملوں کے لیے استعمال کیا ہے جو مرہٹہ آس پاس کے علاقوں میں ایک مستقل سیاسی مقصد کے طور پر کیا کرتے تھے ..... شیواجی اور ان کے بعد بیشوا بھی "ملک گیری" کی مہم تمام قریبی ریاستوں میں چلاتے رہے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان اور وہ ہندوؤں کو اسی طرح نچوڑ لیتے تھے جس طرح مسلمانوں کو نچوڑتے تھے[30]

شیواجی ایک مذہبی لہر کی چوٹی سے ابھرا تھا لیکن اس تحریک میں کوئی جنگجویانہ وطن پرستی نہ تھی تکارام اور دوسرے مرہٹہ رشی تنگ نظر متعصب لوگ نہ تھے اور ان کا بھگتی کا مذہب علاحدگی پسندی پر مبنی نہ تھا دراصل وہ ہندو مذہب اور اسلام کے پیروؤں کو ایک دوسرے سے ملانا چاہتے تھے وہ ہندو مذہب میں وہ موروثی پوجا تو ہم پرستی اور یاتراؤں وغیرہ کو ناجائز سمجھتے تھے اور مسلمانوں میں عدم رواداری کے جذبہ کی بھی مذمت کرتے تھے شیواجی ان کو اپنا گرومانتا تھا۔ اس لیے وہ زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کی پالیسی پر عمل کرتا تھا۔ وہ مسلمان بزرگوں اسلام کی کتاب مقدس اور مسجد پر اعزاز و اکرام کی بارش کرتا تھا اس بات کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے کہ اس نے اسلامی مذہبی مراسم اور رواج کے منانے میں کبھی کسی قسم کی رکاوٹ ڈالی ہو یا مسلمانوں کو ہندوؤں سے مختلف سطح پر رکھا ہو۔

لیکن شیواجی ہندوؤں کی مذہبی آزادی کا حمایتی تھا اس نے اورنگ زیب کو جزیہ نافذ کرنے کے خلاف آگاہی دے دی تھی اور اس نے اورنگ زیب سے اس لیے جنگ کی کہ وہ اسلام کی سیاسی برتری کے بہانہ ساز دعوے کو تسلیم نہیں کرتا تھا اور نہ یہ تسلیم کرتا تھا کہ ہندو کمتر ہیں جو اورنگ زیب جزیہ لگا کر ہندوؤں کو دبانا چاہتا تھا۔ اپنی سلطنت میں رواداری انصاف مساوات اس کی پالیسی کا اصول تھے اور وہ چاہتا تھا کہ یہی اصول مغل شہنشاہیت میں بھی اختیار کر لیے جائیں

شیواجی نسبتاً کم عمری میں مرگیا۔ اپنی موت کے وقت اس کی عمر صرف 53 سال تھی۔ یہ ایک مصیبت تھی کیونکہ نئی حکومت کی جڑیں ابھی زمین میں مضبوطی سے قائم نہیں ہوئی تھیں۔ حکمرانی کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں پرامن طریقے سے دینے کی تربیت بھی یہ نہیں کر پائی تھی دراصل سلطنت بادشاہ کا ایک باجگذار علاقہ خیال کی جاتی تھی نہ کہ کوئی کامن ویلتھ یا ری پبلک۔ نظام کی یہ خامی شیواجی کی آنکھ بند ہونے سے پہلے ہی ظاہر ہوگئی تھی اس کے آخری ایام مملکت کی وراثت کے جھگڑے کھڑے ہوجانے سے تلخ تھے اس کے سب سے بڑے بیٹے سمبھوجی نے بغاوت کردی اور ان سے الگ ہوکر مغلوں سے جاملا۔ کابینہ میں افتراق تھا اس کے دو طاقتور وزرا پیشوا اور سچیو کھلم کھلا ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ جب آخرکار شمبھوجی نے پھر اپنے باپ سے صلح کرلی اور تخت کا جانشین ہوا تو اس نے ان وزرا اور سرکاری افسران سے سخت انتقام لیا جن پر شبہ تھا کہ وہ اس کے مخالف تھے اس نے اپنی سوتیلی ماں سویرا بائی۔ اناجی دتا سچیو اور بہت سے لوگوں کو قتل کردیا برہمن وزرا کے خلاف خانگی جھگڑا شروع کیا گیا اس کا ظلم اس کا تشدد اور اس کی بدکاریوں نے کچھ برہمن لیڈروں کو اس پر آمادہ کیا کہ اس کو برباد کردیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے ساتھ لوگوں کے دغا دینے سے مغل افسر نے اس کو گرفتار کرلیا اور اپنے باپ کے مرنے کے نو سال بعد اورنگ زیب کے حکم سے اس کی گردن اڑا دی گئی۔

اس کے بعد اورنگ زیب کی افواج سے مرہٹوں کی بیس سالہ بہادرانہ کشمکش کا دور رہا — مرہٹوں کے فوجی افسروں کی بے دھڑک بہادری اور ان کی شاندار فوجی ترکیبوں نے شہنشاہ اورنگ زیب کو عاجز کردیا وہ ترک دنیا کرکے اورنگ آباد چلا گیا اور وہاں ایک غم ناک اور مایوسی کی موت مرا۔

اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ وفاقی طاقتیں ابھریں شیواجی نے ایک مرکزی حکومت قائم کرکے مرہٹہ سرداروں اور مرہٹہ قوم میں جو جذبۂ اتحاد پیدا کیا تھا وہ ختم ہوگیا۔ مرہٹہ سردار جو مغلوں کے خلاف گوریلا جنگ لڑ رہے تھے اپنے فیصلے اور مرضی پر اعتماد کرنے کے اس درجہ عادی ہوگئے

تھے کہ جب یہ کشمکش ختم ہوئی تو وہ آزادانہ کام کرنے کی عادت کے حد سے باہر نہ نکل سکے۔ جیسے جیسے وقت گذرتا گیا مرکزی حکومت سے ان کی وفاداری کا جذبہ کمزور ہوتا گیا اور آخر میں انھوں نے اپنے کو اپنے اپنے علاقے کا خود مختار حکمران بنا لیا۔ وہ اپنے کو پیشوا کے ماتحت تو سمجھتے تھے لیکن ان کے احکام کی پابندی کرنے سے گریز کرتے تھے حتیٰ کہ اگر وہ پیشوا کے فیصلوں کو ناپسند کرتے تھے تو ان سے انحراف کرنے کے لیے بھی تیار رہتے تھے۔

اس سے بھی زیادہ خراب نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اندر سے وہ اخلاقی جذبہ اڑ گیا جو شیواجی نے ان کے اندر جوش کے ساتھ داخل کیا تھا یعنی مرہٹہ دھرم کی پر زور حمایت کا وہ جوش جس نے ان کو مغل حکومت سے بیس سال تک ٹکر لینے پر اکسایا تھا اس کی جگہ اب زمین اور روپیہ کی لالچ نے لے لی۔ تقریباً نصف صدی تک پاکبازی اور آزادی کے تخیل کے پیچھے دوڑنے کے بعد اب آخر کار وہ مغلوں کے طور وطرز کی نقالی کرنے لگے جنگ نے ان کے اخلاق کو گندہ اور ان کے مقاصد کو برباد کر دیا وہ دلی دربار کی شاہی شان وشوکت عیش وعشرت اور نمائش کی تمنا کرنے لگے ان کے وطنی اوصاف کفایت شعاری سادگی اور فرض سے مگن۔ آہستہ آہستہ اندر سے کھوکھلے ہو گئے ایک عظیم مقصد کے لیے جینے اور مرنے کی مسرت کی جگہ انانیت اور ذاتی توسیع پسندی نے لے لی۔

نامناسب سیاسی رجحانات جن کو شیواجی نے روک رکھا تھا ظاہر ہوئے بادشاہ کی تخت کی وراثت کے لیے اور پیشوا کی گدی کی وراثت کے لیے بھی جھگڑے مرہٹہ سیاست کی تباہی کا سبب بن گئے۔ سمبھاجی کی ان کے سوتیلے بھائی راجہ رام نے مخالفت کی شاہو کی تخت کی واپسی میں تارابائی نے رکاوٹ ڈالی جو راجہ رام کی بیوہ تھیں۔ ساہو کی کوئی اولاد نہ تھی ان کی وراثت کے معاملہ پر اعلا عہدہ داران میں تقابلی و تخالف کی نوبت آئی جب راجہ کمزور ہو گیا اور پیشوا نے اس کے اختیارات چھین لیے تو پیشوا کے مرنے کے بعد تنازعات شروع ہوئے۔

پیشوا کی طاقت کے عروج پانے سے اندرونی رقابتوں نے جنم لیا ایک طرف راجہ اور دوسری طرف مرہٹہ سردار اپنی اہمیت پر گرہن لگ جانے کو ناپسند کرتے تھے اور سہ رخی سازشیں معاملات حکومت پر آسیبی سایہ ڈالتی رہیں۔ جب راگھوجی نے بھونسلہ بنگال پر حملہ کیا تو نواب الله وردی خاں کو پیشوا کی مدد بھونسلہ کے خلاف لڑی گئی اور نواب نے بھونسلہ کو تہس نہس کر دیا۔ 1743 داماجی گوائکوار اور داسھادے نے تارابائی کی حمایت میں پیشوا کی مملکت کو روند ڈالا (51-1750) چوتھے پیشوا مادھو راؤ اور ان کے چچا رگھوناتھ ایک خانہ جنگی میں مبتلا ہوئے جس میں ہولکر اور

بھونسلے کے علاوہ نظام علی والی دکن بھی چچا کے حمایتوں میں تھے۔ (1761ء) رگھوناتھ راؤ کی سازش سے پانچویں پیشوا قتل کر دیے گئے (1773ء) جب مہادجی بارہ سال تک شمال میں مہم چلانے کے بعد پونا پہنچا تو پونا میں خوفناک ڈر پھیلا ہوا تھا پونا کے اہل سیاست جن کی عنانِ قیادت نانا فرنویس کے ہاتھ میں تھی جو سندھیا سے نفرت رکھتا تھا اس درجہ خوف زدہ ہوئے کہ انھوں نے کارنوالس سے استدعا کی کہ وہ اس رجمنٹ کو جو میسور سے واپس ہوئی تھی ان کو عاریتاً دے دیے (1793ء) پورے ایک سال تک دونوں فریق ایک دوسرے کے خلاف اپنی تدبیریں کرتے رہے اور نانا ہولکر اور دوسرے لوگوں سے سندھیا کے زوال کے لیے سازش میں مبتلا تھے آخر کار سندھیا اور ہولکر میں کھل کر اختلاف ہو گیا، ہولکر کو لکھیری کے مقام پر فیصلہ کن شکست ہوئی (1793ء) مہادجی کا جانشین دولت راؤ اس حد تک چلا گیا کہ اس نے باجی راؤ کے اشارے پر دھوکے سے نانا کو قید کر لیا اور پونا کو جو مرکزی حکومت کا دارالسلطنت تھا لوٹتے چلا (1798ء) نانا ہولکر اور سندھیا کے تنازعات نے حکومت کی جڑ کو ہلا دیا۔ رگھوناتھ راؤ اور باجی راؤ دوئم کی ناعاقبت اندیشانہ پالیسی سے لڑائی کے افسانوی گھوڑے کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں مرہٹہ سیاست کے محل میں داخل کر لیا۔ لڑائیاں شروع ہوئیں مرہٹہ سردار اور وزرا اندرونی خانہ جنگیوں میں مصروف تھے جو خودکشی کے مترادف تھیں انگریزوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور 1802ء تک پیشوا کو مجبور کر دیا کہ وہ آزادی سے دستبرداری کی دستاویز پر دستخط کر دیں۔ دوسرے سرداران گرفتار کر لیے گئے اور ختم کر دیے گئے اور 1818ء تک مرہٹوں کی ایک خود مختار مالک اقتدار کل سلطنت کا خواب پگھل کر ہلکی ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

حکومت کے بانی شیواجی نے جو مضبوط ڈھانچہ تیار کیا تھا اس نے اورنگ زیب کے خلاف کشمکش کی حالت میں نظم و نسق میں مجبوراً تبدیلیاں قبول کیں جس نے اس کی کل طاقت کو سوکھ لیا مثلاً جاگیرداری نظام پھر سے قائم کیا گیا مقررہ اوقات پر باضابطہ محاصل کی وصول ممکن نہ تھی اور افسران کی تنخواہیں ادا کرنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ مالگذاری کی اسناد عطا کر دی جائیں سرانجام اس اورنگ زیب کے خلاف جنگ میں فوج کو مقدار ضروری سے بہت زیادہ پھیلا دیا گیا تھا اخراجات کو پورا کرنے کے لیے قریبی علاقوں سے سخت گیری کے ساتھ زبردستی رقم حاصل کرنے کی پالیسی اختیار کی گئی۔ ہر سال مہم کے آٹھ ماہ کے دوران اتر دکن پورب اور پچھم فوجی مہمیں لوٹنے کے لیے روانہ کی جاتی تھیں لیکن ان کا زیادہ تر حصہ سرکش فوجی افسران خود تغلب و تصرف کر لیتے تھے اور لوٹ یا محاصل کا بہت کم حصہ پونا کے خزانہ میں پہنچتا تھا۔ پیشوا ہمیشہ مقروض رہتے تھے اور انھیں روپے کی فوری ضرورت

لاحق رہتی تھیں۔

باجی راؤ اوّل (40 — 1920ء) ایک جنگجو پیشوا تھا اور فن سپہ گری کا بڑا ماہر تھا۔ اس نے نظام کے خلاف کرناٹک میں اور شمال میں بھی فوجی مہموں کی قیادت کی اس سے اگرچہ اس کو شہرت ملی اور اس کا علاقہ بھی وسیع ہوا لیکن وہ قرض میں مبتلا ہوگیا۔[32] ان کے فوجیوں کی تنخواہیں باقی تھیں اور ان کے ساہوکاروں نے (یعنی مہاجن) جن کا اس پر لاکھوں روپیہ کا ذاتی قرض تھا مزید رقم دینے سے انکار کر دیا وہ مسلسل شکایت کیا کرتا تھا کہ اس کی کیمپ میں بغاوت ہوتی رہتی ہے جس سے اس کو سخت پریشانی اور اذیت کا سامنا تھا۔[33] پیشوا نے لکھا ہے "میں قرض خواہوں کے تقاضوں کے جہنم میں پڑ گیا ہوں اور ساہوکاروں اور سلی داروں کو خاموش کرنے کے لیے میں ان کے پیروں پر اتنا گرا ہوں کہ اگڑ سے میری پیشانی کا چمڑا گھس گیا ہے۔[34]

باجی راؤ اوّل کے جانشین بالاجی راؤ دوئم نے 1740ء اور 1760ء کے درمیان ایک کروڑ پچاس لاکھ روپیہ قرض لیا جس پر ان کو بارہ سے اٹھارہ فی صدی تک سود دینا پڑتا تھا۔ اگرچہ 52-1751ء میں انھوں نے ½36 ملین روپیہ مالگذاری سے وصول کیا جو اس وقت تمام وصولیوں میں سب سے زیادہ تھا لیکن پھر بھی حکومت اس کے جانشین مادھوراؤ کی جانشینی کے وقت بہت مقروض تھی۔ بالاجی نے اپنے دوست نانا فرنویس کے نام ایک خط میں اپنے مالیات کی حالت ظاہر کی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اگرچہ سونے کا ایک دریا اتر سے بہہ کر مہاراشٹر میں آرہا ہے اور ایک دوسرا اسی طرح کا دریا دکھن سے آرہا ہے لیکن اور زیادہ کے لیے یہ ہماری پیاس بڑھتا جارہا ہے" کیونکہ جب یہ (یعنی سونے کا دریا) پونا کی بنجر زمین میں پہنچے گا تو مجھے خوف ہے کہ گھر پہنچنے سے پہلے یہ غائب ہو جائے گا۔"[35] پانی پت کی لڑائی نے خزانہ کو عظیم نقصان پہنچایا یا مادھوراؤ نے بڑے احتیاط سے وسائل کو کام میں لانا چاہا پھر بھی خزانہ خالی ہوگیا نانا فرنویس انتہائی سخت گیر تھا اور اگرچہ اس نے اپنے لیے ایک بڑی دولت اکٹھا کر لی لیکن وہ فوج کو فاقہ کراتا تھا یہاں تک کہ جب اس کی لاش داہ سنسکار کے لیے لے جائی جارہی تھی تو عرب گارڈ جو ڈیوٹی پر تھے انھوں نے اپنی بقایا تنخواہ مانگ کر شور وغل بپا کیا۔

مادھوراؤ (72 — 1761ء) پیشوا کی حکومت سندھیا کی طاقت کے زیر سایہ رہی لیکن سندھیا خاندان نے بھی نظم ونسق میں اسی کم نظری کو ظاہر کیا جو پیشوا نے ظاہر کی تھی انھوں نے بڑی بڑی فوجیں بھرتی کیں مغل بادشاہت کے معاملات میں مداخلت کی اور امرا کی سازشوں میں شریک

ہوئے اور جو کوئی بھی ان کے مطالبات پورے کرنے کے وعدے کرتا تھا اس کو وہ کرائے پر مل جاتے تھے یہ وعدے تو آسانی سے کر دیے جاتے تھے لیکن ان کو پورا کرنے کے لیے فوجی مہم کی ضرورت پڑتی تھی وہ تمام محاصل اور خراج جو اس طرح وصول کیے جاتے تھے اسی میں ختم ہو جاتے تھے اور نظم و نسق دست ودہن تک ہی زندہ رہتا تھا۔

اس کا ثبوت اس تحریر سے ملتا ہے جو مہادجی سندھیا کے ایجنٹ نے نانا فرنویس کو 1785ء میں لکھی ہے وہ تمام محاصل (جو ان کے زیر اقتدار صوبوں سے ملتے ہیں) پیدل اور توپ خانوں کی فوج پر خرچ ہو جاتے ہیں سواروں کا رسالہ فاقہ کر رہا ہے اور کثیر تعداد میں فوج کو ترک کر رہا ہے۔ مہاجنوں سے کثیر رقم قرض لے لی گئی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ تمام ساہوکار خواہ وہ مرہٹہ ہوں، گجراتی یا زمگدسب سے قرض لیا گیا ہے اس کے علاوہ لالسٹ کی لڑائی (1787ء) کے بعد سندھیا نے نانا پر مدد کے لیے زور ڈالا " اس نے کہا " خزانہ کے بغیر میں لاچار ہوں نانا کو کم از کم دس لاکھ میرے لیے نکالنا چاہیے چونکہ میرے وسائل ختم ہو چکے ہیں اب میں ہندوستان میں ذرا بھی نہیں ٹھہر سکتا ہوں"۔

1773ء میں کارنواس نے رپورٹ کیا کہ " اس کا (مہادجی سندھیا کا) خزانہ اس کے اتنے غیر حاضر رہنے کے دوران اس تیزی سے کم ہوا ہے کہ یہ لوگ اب کسی فوج کے اخراجات برداشت کرنے کے قابل نہیں ہیں اور ایم ڈی بوائن کی سرکردگی میں جو فوجی ٹولی ہے اس کے مطالبہ کی ادائیگی کے قابل نہ ہونے کی وجہ سے اس نے اس افسر کو جیادار تبدیل کر دیا ہے جو ایک ایسا ضلع ہے جس کی آمدنی کی وصولی کا تخمینہ پچیس لاکھ روپیہ سالانہ کیا جاتا ہے۔ یہ قدم اس کے اختیار اور حفاظت کے لیے ایسے خطرناک میلانات رکھتا ہے کہ دوسرے ذرائع آمدنی نہ ہونے کے علاوہ اور کسی وجہ سے یہ قدم ہرگز نہ اٹھایا جاتا"۔

میدان جنگ میں یورپ میں تربیت پائی ہوئی فوجوں کی برتری نے مہادجی سندھیا کو اس درجہ متاثر کیا کہ اس نے خود یورپین نمونہ کی ایک فوج تیار کرنے کا ارادہ کیا اس نے کئی فرانسیسی افسران کو فوج میں بھرتی اور ٹریننگ کے لیے نوکر رکھا۔ لیکن ان فوجوں پر خرچ بہت آتا تھا اور مہادجی ان کی تنخواہیں وقت کی پابندی کے ساتھ اسی حالت میں ادا کر سکتا تھا جب وہ اپنی دوسری فوجوں کو فاقہ کرائے بیرونِ ملک کے فوجی افسران کی وفاداری بھی ہمیشہ یقینی نہ تھی اور آخر کار یہ لوگ غدار ثابت ہوئے۔ ہندوستانی افسر خود تربیت یافتہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کی جگہ نہ لے سکتے تھے اور اخراجات پورے نہ کیے جا سکتے تھے کیونکہ مالیات میں انتشار تھا۔

مرہٹوں کی خارجہ پالیسی غلط تھی۔ اس نے حکومت پر ایسا بوجھ ڈال دیا جو وہ اٹھا نہ سکتی تھی ـــ شیواجی کی ملک گیری کو تو کسی حد تک جائز قرار دیا جا سکتا تھا کیونکہ اس کی شرح یوں کی جا سکتی تھی کہ یہ ظلم اور تعصب کا ردِّ عمل تھا جب تک اورنگ زیب کے خلاف اپنے کو باقی رکھنے کی جدوجہد جاری تھی اس کو مبنی بر انصاف کہا جا سکتا ہے لیکن پیشوا لوگوں کے دور میں تو اس نے عریاں جارحیت کی شکل اختیار کرلی اپنے حملوں میں وہ دوست اور دشمن کی کوئی تفریق نہ کرتے تھے وہ سب سے بلا کسی استثنا کے خراج وصول کرتے تھے اور اپنے ہم مذہبوں تک کو بھی نہ چھوڑتے تھے نہ مغل امرا کی ہندوستانی پارٹی ہی کو چھوڑتے تھے جو راجپوتوں اور جاٹوں سے معاہدہ کیے ہوئے تھی اس طرح اپنے محاصل عائد کرتے اور لوٹتے انھوں نے راجپوتوں، جاٹوں اور بندیلیوں کو اپنا دشمن بنا لیا اور ان کے مظالم نے بنگال اور دریائے گنگا کی وادی میں دہشت پھیلا دی ۔ مرہٹہ نظام اپنے علاقہ کے باہر محض لٹیرا پن تھا۔ ان علاقوں کے ساتھ بھی جن کو انھوں نے فتح کیا تھا۔ مدبرانہ عقلمندی کا برتاؤ نہیں کیا کاشتکاروں پر ظلم کیا گیا ان سے روپیہ کھینچنے کے لیے سخت کارروائیاں کی گئیں۔" دوسرے ہندو جن علاقوں کو فتح کرتے تھے وہاں کے خیالات سدھارنے میں فخر محسوس کرتے تھے وہ مندر، کنوئیں، نہریں، سڑکیں بناتے اور دوسرے عام ضرورت کے کاموں کو کرتے تھے مرہٹے اس قسم کا کوئی کام نہ کرتے تھے ان کے ملک گیر حملے صنعتوں کو برباد اور ملک کی دولت پامال کر کے اس مرغی کو ذبح کر دیتے تھے جو سونے کا انڈا دیتی تھی۔[36] راج واڈے تسلیم کرتا ہے کہ " پیشوا مفتوحہ علاقوں میں لوگوں کے دماغوں کو فتح نہ کر سکا کوئی ادارے ایسے نہیں بنائے گئے جو مرہٹہ عزائم و مقاصد لوگوں کو سمجھاتے اور مرہٹہ کاز کے لیے ان کی حمایت حاصل کرتے کنارا، اندھرا اور گجرات کے باشندوں اور سکھ اور بندیلے اور پوربیئے اور رنگاد جو نئی فتوحات میں آئے ان کے لیے ان کے مرہٹہ حکمران اجنبی ہی رہے اور جب باہر کے کسی دشمن کا خطرہ پیدا ہو تو ان کی حمایت پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پانی پت کے معرکہ میں مرہٹوں کو پرانے مقولہ کی صداقت کا احساس ہوا کہ ایک آدمی سنگین سے سب کچھ کر سکتا ہے سوائے اس کے کہ اس پر بیٹھ نہیں سکتا۔[37]

مرہٹوں میں قیادت کا فقدان ایک اوّلی درجہ کی تباہی تھی اس نے بیرونِ ملک کے لوگوں کے لیے دروازہ کھول دیا اور طویل مدّت کے لیے قلعہ بیرونِ ملک کے لوگوں کے حوالے کر دیا۔

سکھ

سکھ قوم کی تعمیر ایک ایسا سماجی واقعہ ہے جس کے چند اپنے خاص رنگ روپ ہیں۔ گرونانک

اس زمانہ میں تھے جب بھگتی کی تحریک اپنے عروج پر تھی راما نند۔ کبیر۔ نام دیو۔ تریلوچن۔ چیتنیا وغیرہ کھل کر انسان سے محبت اور خدا کی عبادت کی تعلیم کی اشاعت کر رہے تھے یہ لوگ ایک خدائے واحد کی پرستش گرو کا ادب و احترام اور جماعت کے ساتھ عبادت کی تعلیم دیتے تھے۔ وہ موروثی پوجا اور ذات کو ناجائز ٹھہراتے تھے اور ہندو مذہب اور اسلام کے اختلاف کو ہم رنگی میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ مساوات انسانی کی تعلیم دیتے تھے اور نیک نیتی اور خوش فہمی کو بڑھاوا دیتے تھے۔

گرو نانک ان تمام خیالات کے ماننے والوں میں تھے اور تمام طبقوں میں وہ ان کی تلقین کرتے تھے ان کی سادہ اور براہ راست تعلیم ان کی پاک اور خدا کارانہ زندگی خلوص اور ان کی سچی لگن ایسی باتیں تھیں جنھوں نے بے شمار لوگوں کو متاثر کرکے ان کا پیرو بنا دیا۔ ان لوگوں میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی اور کچھ تو عالی مرتبت لوگ بھی تھے لیکن زبردست اکثریت ان لوگوں کی تھی جو اصلاً کم حیثیت تھے۔ انھوں نے اپنے پیروؤں سے کہا کہ اس دنیا میں رہو اور کام کرو لیکن ان سب کی روح عبادت الہی کا جذبہ ہو۔

گرو نانک کا خرقۂ خلافت گرو انگد کو اور اس کے بعد ان کے جانشینوں کو ملا۔ ان میں سے اکثر ممتاز شخصیتوں کے مالک تھے جنھوں نے گرو نانک کا پیغام پھیلایا اور اپنے مذہبی پیروؤں کی جماعت کو ایک متعین شکل دے دی چنانچہ جب کہ دوسرے بزرگوں کے پیرو تو ہندو قوم کے ڈھانچے میں رہ گئے سکھوں نے اپنی ایک مخصوص انفرادیت قائم کرلی۔

یہ صحیح ہے کہ انھوں نے ہندو مذہب فلسفہ اور قانون کے بہت سے اجزا کو باقی رکھا لیکن ہندو دیوتاؤں اور دیویوں کے تقدس کا ہندوؤں کی مذہبی الہامی کتابوں کا ہندوؤں کے ذات کے نظام اور معاشرہ میں برہمنوں کی اوّلیت کا انکار کرکے انھوں نے اعلان کر دیا کہ وہ ایک الگ اور آزاد جماعت ہیں وہ تین گروہ جو خاص طور پر نشو ونما کے ذمہ دار تھے۔ گرو ارجن، گرو ہرگوبند اور گرو گوبند سنگھ تھے۔ ان میں ہر ایک نے اپنے مذہبی فداکاروں کو بدلنے میں نمایاں حصّہ لیا اس طریقہ کار کو آخری گرو نے مکمّل کیا جنھوں نے سکھوں (پیروؤں) کو دل خالصہ (منتخب لوگوں کا گروہ) میں تبدیل کر دیا۔

ایک صوفیانہ جماعت اور عبادت میں مست فرقہ کا سورماؤں کی ایک فوجی جماعت میں تبدیل ہو جانے کی کارروائی آہستہ آہستہ عمل میں آئی لیکن اس کا عمل میں آنا ناگزیر تھا۔ بابر اور اس کے دو جانشین مراعات برتنے والے تھے اکبر کا راز جو اور بچپن دماغ مذہب میں نئے تعقّبات کی تلاش اور نئے تجربات کے کرنے میں مسرت محسوس کرتا تھا۔ اس کی رائے میں لوگوں کے عقائد

میں ہلچل کا مچنا اور ابال کا آنا صحت مند علامت تھی اس لیے قدرتی بات تھی کہ اس نے سکھ مذہب کی تبلیغ واشاعت میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی لیکن سکھوں میں ایک تبدیلی نمایاں ہو رہی تھی اور اکبر کے جانشین اتنے وسیع الدماغ نہ تھے جہانگیر نے گرو ارجن کو اس شبہ کی بنا پر قید کر دیا کہ انھوں نے خسرو کی حمایت کی تھی ان کے بیٹے گرو ہرگو بند نے بھی جہانگیر کو ناراض کر دیا ان کے بعد اور پنجاب کے سرکاری افسران کے درمیان تصادم کی نوبت آئی۔ ان کی قیادت میں سکھوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا اور انھوں نے شاہی مملکت کے اندر اپنی خود ایک ریاست قائم کرلی۔

گرو گو بند سنگھ کے اقتدار کا زمانہ اورنگ زیب کے زمانہ سے مطابقت رکھتا ہے۔ سکھوں پر ظلم وستم کی بارش اور گرو تیغ بہادر سنگھ کی شہادت ان گے (گرو گو بند سنگھ) دماغ میں تلخی پیدا کرتی تھی ان کے پیرو ایک نئے راستہ پر قدم اٹھا چکے تھے جس میں مذہب اور سیاست کی آمیزش تھی۔ اورنگ زیب کی پالیسیوں اور اس کی تدابیر نے ان میں ایک عزائم راسخ پیدا کر دیا کہ وہ ایک پختہ ارادے کے ساتھ اس خطرناک راہ پر چلیں موت وحیات کی اس کشمکش میں سکھوں کا ایک مذہبی جماعت سے فوجی جماعت میں بدل جانا ناگزیر تھا اورنگ زیب نے جن مذہبی اصولوں کی تعلیم دی تھی اس کا ایک دلولہ تازہ دلوں میں پیدا کرکے اور ایمان لانے والوں کی جمیعتہ کے نمایاں نشانات اور اس کے خط وخال کی صفائی سے بیان کرکے گرو گو بند سنگھ نے سکھوں کو اس آویزش کے لیے تیار کیا اس طرح تصوف کا یہ مذہبی نظام خالصہ کے فوجی نظام میں تبدیل ہوگیا۔ گرو گو بند سنگھ نے سکھ برادری میں بعض نئے اور دلچسپ خیالات کا اضافہ کیا۔ انھوں نے گرو کا انسٹی ٹیوشن (ادارہ) ہی ختم کر دیا اور کہا کہ جہاں پانچ سکھ جمع ہوں گے گرو کی روح وہاں موجود ہوگی ان پانچ کو سکھوں کی کل جماعت انتخاب کرے گی اس طرح جماعت کی کل برادری ان کی (نمیتھ کی) رہنما اور ہادی بنادی گئی۔

بدقسمتی سے یہ خیالات پھل نہ لا سکے گورو گو بند اور اورنگ زیب کے انتقال نے خانہ جنگی حملہ اور تاراج کے ایک دور کا آغاز کیا اور پنجاب ایک پُر تشدد فسادات کے گرداب میں پڑ گیا سکھوں کو اس میں شریک ہونا پڑا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے پنجاب کے زرخیز صوبہ کو بدامنی اور تباہی کی آماجگاہ بنا دیا۔

اس تباہ وبرباد علاقہ میں صرف سکھ ایک منظم گروہ تھے جو اپنے اندر ایک طرح کا باہمی اتحاد باقی رکھے ہوئے تھے اس لیے جب حملے کا طوفانی سیلاب ہٹا تو انھوں نے سیاسی خلا کو پر کر دیا۔ لیکن اس آویزش کے درمیان خالصہ کا اتحاد بھی بدستور قائم نہ رہ سکا بالخصوص اس وجہ سے کہ

ان میں کوئی ایسا ممتاز لیڈر نہ اٹھا جو ان کو متحد رکھ سکتا سکھ بارہ گروہوں میں تقسیم تھے اور ہرایک اپنی بقا کے لیے لڑتا تھا تنگ نظری کے ساتھ فرقہ وارانہ مفاد کی پیروی کرنے کی عادت نے ان کو آپس میں ایک دوسرے سے متصادم کر دیا جو روح نانک اور گرو گو بند سنگھ نے پھونکی تھی یعنی مذہبی عبادتوں اور روحانی منزلت ۔ اور سکھ برادری کی قربانی اور خدمت کی اس کی جگہ حصول طاقت اور ذاتی خود غرضی نے لے لی ۔ گندی سیاست کے بوجھ کے نیچے مذہب کا نظام دب گیا ۔

اس کے بعد اس فرقہ میں ایک بڑا لیڈر پیدا ہوا لیکن سکھوں کا قانون اخلاق بدل چکا تھا اور سیاسی طاقت کی خواہش مذہبی پاکیزگی پر غالب آگئی تھی مہاراجہ رنجیت سنگھ ایک ہوشیار اور پرفن جنرل ایک عظیم ماہر تنظیم ۔ نظم ونسق کے معاملات میں باکمال اور ایک ہوشیار مدبر تھا ۔ اپنے مقاصد کے حصول میں وہ بے رحم تھا لیکن ظالم نہ تھا ۔ وہ فیاض مخیر اور مہمان نواز تھا اپنے زمانے اور اپنے فرقہ کی کمزوریاں اس میں بھی تھیں وہ بہت زیادہ مذہبی نہ تھا لیکن مذہبی پیشواؤں کے سامنے وہ باادب بلکہ منکسر بھی رہتا تھا ۔

رنجیت سنگھ ایک چھوٹی سی ریاست کا راجہ تھا لیکن اپنی بہادرانہ بلند ہمتی سے تمام سکھ فرقوں کو جو ستلج کے اس پار تھے اپنی حکومت کی ماتحتی میں لے آیا اور اس کے بعد جنگ اور تدبر سے وہ ایک وسیع رقبہ جس میں سندھ کے دوسری جانب پشاور، ملتان، کشمیر، کانگڑا اور قریب کی پہاڑی ریاستیں بھی شامل تھیں اپنے زیر اقتدار لایا ۔

ایک تنظیم کے ماہر کی حیثیت سے رنجیت سنگھ کا خاص کارنامہ فوج کی تشکیل تھی اس نے اپنا کیریر (سپاہیانہ زندگی) رسالوں کے ایک بے ضابطہ فوجی ٹولی کے کمانڈر کی حیثیت سے شروع کیا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس نے ایسی فوج تعمیر کر دی جس کی طاقت پیدل فوج میں جو یورپ کے نمونہ پر تیار کی گئی تھی تمام ضروری آلات سے لیس ایک توپ خانہ میں اور ایک باضابطہ سواروں کے رسالہ میں پنہاں تھی ۔ یہ سب سے زیادہ طاقت ور سامانِ جنگ تھا جو کسی ایشیائی دشمن کی طاقت سے زیادہ تھا ۔

فوجی تنظیم کی تعمیر میں اس نے اس امر کو نظر انداز کر دیا کہ فوج تو حکومت کا ایک آلہ ہے لیکن جب وہ مالک بن بیٹھے تو حکومت تباہی میں مبتلا ہو جاتی ہے اس کے علاوہ اس نے اپنے سول انتظامات پر اسی کے برابر توجہ مبذول نہیں کی اس کے مالی انتظامات کہنہ اور بھدے تھے اور دیوانی اور فوجداری کے مقدمات کا فیصلہ سرداروں کے سپرد تھا ۔

رنجیت سنگھ کا یہ ایک کارنامہ ہے کہ اس نے تاراج کی جگہ جو پنجاب میں پھیلا ہوا تھا ایک منظم حکومت کی عمارت کھڑی کر دی۔ بد قسمتی سے اس نے کمزور بنیادوں پر یہ تعمیر کی اس کی حکومت سکھوں کی مذہبی حکومت تصور نہیں کی جا سکتی تھی یہ عام سکھ فرقہ کے لوگوں کی رضامندانہ شمولیت پر مبنی نہ تھی کیونکہ ستلج کے اس پار کے سکھوں ( ) کے گروہ کو زبردستی شامل کیا گیا تھا اور ستلج کے اس پار کے سکھ گروہ نے ان کی طاقت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا بلکہ درحقیقت برطانیہ کی سربراہی کو تسلیم کر لیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جن سکھوں نے ان کی ماتحتی قبول کی تھی ان کی وفاداری بھی صدق دلی سے نہیں رہی۔

رنجیت سنگھ نے تمام مذاہب کے لوگوں کو اپنی ملازمتوں میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ اس کی ماتحتی میں ہندو مسلمان اور سکھ انتہائی ذمہ دارانہ جگہوں پر فائز تھے اور بلا تمیز سب پر وہ اپنا اعتماد ظاہر کرتا تھا اگرچہ ان لوگوں نے ذاتی طور پر وفادارانہ اور پرجوش خدمات انجام دیں مگر سلطنت سے قلبی تعلق نہ رکھنے کی بنا پر وہ ایک دوسرے سے کسی رشتے میں بندھے ہوئے نہ تھے اس کی لڑائیوں میں اس کے یورپین کمانڈر اور اس کے ہندو مسلم اور سکھ کمانڈر اور کپتان اپنے کمالات کے جوہر دکھاتے تھے لیکن وہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے لیے لڑتے تھے نہ کسی مذہب نسل یا ملک کے لیے۔

رنجیت سنگھ کا خاندان سالہا سال پنجاب پر حکومت کرتا لیکن بد قسمتی سے اس کے لڑکوں یا پوتوں میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کو اس کے اوصاف وراثت میں ملے ہوں۔ اس کے علاوہ سیاسی حالات میں انگریزوں کا ہندوستان پر تسلط قائم ہو جانے سے ایک انقلاب آگیا تھا۔ رنجیت سنگھ کے زمانے میں وہ پنجاب کے اردگرد فوجوں کا گھیراڈال رہے تھے انھوں نے رنجیت سنگھ کو ستلج پار بڑھنے سے روک دیا تھا سندھ پر قبضہ کر لیا تھا اور افغانستان پر اپنا اثر جما رہے تھے روس سے جو تیز قدموں سے ہندوستان کے شمال مغرب کے راستوں کی جانب مارچ کر رہا تھا۔ انگریزوں کی رقابت کا یہی نتیجہ ہونا تھا کہ پنجاب میں ایک آزاد ریاست کے لیے مشکلات پیدا ہوں جیسے کہ افغانستان کے لیے بعد میں پیدا ہوئیں یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا رنجیت سنگھ کے ورثا زیادہ عرصہ تک آزادی کا پھل کھا سکتے۔ ناگزیر تھا اور ایک مطلق العنان حکمران جس کی رعایا مختلف عناصر سے مرکب تھی اور ایک مضبوط جدید حکومت جس کی پشت پر ایک محب وطن قوم تھی جس کے افراد نیشنلزم کے جذبے سے ایک دوسرے سے متحد تھے ان دونوں کی لڑائی میں نتیجہ کے متعلق کسی قسم کا شبہ بھی نہ ہو سکتا تھا۔

اس کا پورا ثبوت اس وقت فراہم ہوا جب شیر پنجاب کے مرنے کے بعد انگریزوں اور

سکھوں میں لڑائیاں ہوئیں چشم زدن میں اس کا عظیم قصر مسمار ہو کر خاک میں مل گیا۔ کچھ لڑائیاں ضرور لڑی گئیں جن میں سے بعض غیر منفصل رہے لیکن جو نظام تھا اس نے کوئی پائیدار مقابلے کی طاقت کا اظہار نہیں کیا بہادری کی کمی کی وجہ سے شاندار فوج پرزے پرزے ہو کر برباد نہیں ہوئی کیونکہ سپاہی ہیرو کی طرح لڑے بلکہ وجہ یہ تھی کہ افسران بے ایمان اور رشوت خور تھے اور اپنی معمولی رقابتوں کم ظرفانہ خود غرضیوں اور غدارانہ ارادوں سے زیادہ متاثر تھے۔

سکھوں کی حکومت کا حادثہ کئی صحت مند سبق سکھاتا ہے۔ ایک بات تو یہ ظاہر ہوتی ہے کہ ہندوستان میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اسے ایسے با اہلیت لیڈر نصیب نہ ہوئے ہوں جو مضبوط کردار اور صلاحیت کے مالک ہوں دوسرے یہ کہ کوئی فرقہ یا طبقہ اہلیت اور شرف کا اجارہ دار نہیں ہے ستاروں کی وہ فہرست جو رنجیت سنگھ کے دربار کی زینت تھے دنیا کے کسی حصہ کی کسی گورنمنٹ کو چمک دمک بخش سکتی ہے اس میں وہ لوگ بھی تھے جو نیچے درجے سے اٹھے تھے اور وہ بھی تھے جو اونچے درجے کے تھے یعنی برہمن، راجپوت، جاٹ، کھتری، گوجر اور مسلمان۔ ان میں دکان دار خدمت گاروں اور تاجروں ادنا کام کرنے والے نوکروں کے لڑکے بھی تھے۔ اور انہی کے ساتھ دولت مند اور شاہی خاندان کے لڑکے بھی تھے۔ سکھوں کا زوال مرہٹوں اور مغلوں کی طرح اس وجہ سے نہیں ہوا کہ با اہلیت اور توانا انسانوں کا فقدان تھا بلکہ اس جذبہ کی کمی کی وجہ سے تھا جو انفرادی اہلیت اور توانائی کو بہ حیثیت مجموعی سوسائٹی کی خدمت اور اس مفاد کے تابع بنا دیتا ہے انسانوں کے اندر انتہائی اور چند روزہ زندگی کے احساس کو مٹا کر اسے عالمگیریت عطا کرتا ہے یہ تھا وہ محاذ جہاں منتخب روزگار ناکام ہوئے۔

اٹھارھویں صدی کے وسط میں ہندوستان تیزی سے تباہی کی جانب چلا جا رہا تھا سلطنت مغلیہ جس نے دو سو سال تک ہندوستان کے راجاؤں اور باشندوں کو ایک وحدانی مرکزی حکومت کے نظام میں منسلک کر کے متحد رکھا تھا وہ اندرونی اختلافات اور مغرب سے بیرونی حملے کے ہاتھوں زوال کا شکار ہوا تھا۔ مرکزی حکومت کے کمزور ہو جانے سے نہ صرف سیاسی اتحاد غائب ہو گیا اور خود پرستی نے اپنا گندہ سر اوپر اٹھایا بلکہ تہذیب اور اخلاق کا عام زوال بھی پھوٹ پڑا۔

سوسائٹی اور حکومت سے وفاداری کا جذبہ کمزور ہو گیا۔ انسانیت اور دولت اور طاقت کی طمع نے جماعتی زندگی کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا فوری نفع کی خواہشات نے انسانوں کو اندھا بنا دیا ہوشمندی اور دور اندیشی نے اس طرح ان کا ساتھ چھوڑ دیا کہ وہ اپنی پالیسیوں کے قریبی نتائج تک اندازہ نہ کر سکتے تھے اور نہ سچے دوست اور دشمن میں امتیاز کر سکتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تقدیر ان کو خود اپنے ہاتھ

سے اپنے کو تباہ کرنے کی جانب ڈھکیل رہی ہے۔

مغل حکومت کے خاتمہ سے کل طبقوں کا نقصان ہوا۔ کاشت کاروں کو افسران اور مالگذاری وصول کرنے والے مالکان فارم نے کچل ڈالا۔ اہل صنعت کو تکالیف کا اس لیے سامنا ہوا کہ ان کے سر پرست اقتصادی مشکلات میں پھنس گئے اہل فن اور تجار دونوں اس لیے نقصان میں پڑے کہ خشکی کے راستوں باہری ملکوں سے وہ جو تجارت کرتے تھے پنجاب کی بدامنی کی وجہ سے جہاں سے تاجروں کا کارواں گذرتا تھا رکاوٹ پڑ گئی اور سمندری راستے جو ہندوستان کو جاتے تھے وہ یورپین طاقتوں کے اقتدار کے نیچے چلے گئے جن کے جنگی جہاز برتری کے لیے مجادلہ و مقابلہ کرتے رہتے تھے اور جو مال تجارت کی غرض سے قانون اور ضابطے کے اندر باہر جاتا تھا اسے بحری ڈکیتی والے مال کے مترادف قرار دیتے تھے باہر کی تجارت تاجروں کے ہاتھ سے نکل گئی اور اندرونی تجارت خانہ جنگی اور امرا کے قلاش ہو جانے سے رک گئی۔

حوالہ جات

۱۔ ملاحظہ ہو زمینداری جہاں داری از پروفیسر حبیب اور ڈاکٹر افسر بیگم ان دی میڈیویل انڈیا کوارٹرلی جلد 3 نمبر 2-1 جولائی۔ اکتوبر 55 1951

2- نظام الدین احمد طبقات اکبری (ٹکسٹ ایڈیٹ بائی۔ بی۔ ڈے) جلد ا صفحہ 82۔

3- ضیا برنی تاریخ فیروز شاہی (ٹکسٹ)

4- ملاحظہ ہو۔ میڈیویل انڈیا کوارٹرلی اد۔ پی سٹ صفحہ 5۔

5- دیکھیے ٹدی دل انڈیا سہ ماہی ۔

6- ابوالفضل اکبر نامہ (ترجمہ بوریج) جلد 2۔ کلکتہ 1912ء صفحہ 42۔

7- ایضاً ۔ صفحہ 680۔

8- ابن حسن سنٹرل اکس ٹکچر آف دی مغل امپائر صفحہ 61۔

9- ملاحظہ ہو براؤن اس۔ جی۔ ہسٹری آف پرشین لٹریچر ان ماڈرن ٹائمس 1924ء صفحہ 494 اور لیوی وی سوشل اکس ٹکچر آف اسلام صفحہ 373۔

10- ابوالفضل آئین اکبری (مترجمہ پروفیسر بیواج مین) جلد اوّل (کلکتہ 1927ء)۔

11- تزک جہانگیری (مترجمہ اوجر) جلد اوّل صفحہ 51۔

12- ملاحظہ ہو ٹیو پرسی - ال - پنجاب کسٹمری لاز بران آر سنسس آف انڈیا 1901ء جلد 16 پارٹ 1 صفحہ 92-

13- شیروانی ایچ کے دی برہمنس آف دی دکن (1953 ایڈیشن) صفحہ 144-

14- ران ڈے ایم جی ای رائز آف مرہٹہ پاور صفحہ 31 - برگز جان ہسٹری آف ڈی محمڈن پاوران انڈیا جلد 3 (کلکتہ 1910) صفحہ 96-495 -

15- سرکار جدوناتھ ہسٹری آف اورنگ زیب جلد 2 صفحہ 163 فٹ نوٹ

16- تزک جہانگیری (مترجمہ روجر) جلد 2 صفحہ 181 -

17- تاریخ محمد شاہی حوالہ سردیسری - جی - سی - نیو ہسٹری آف مرہٹہ جلد 2 صفحہ 178-

18- ابو یوسف - کتاب الخراج صفحہ 73-72 -

19- فتوح البلدان (بلاذری) -

20- ملاحظہ ہو ماجد خدوری وار اینڈ پیس ان دی لا آف اسلام صفحہ 194

21- ملاحظہ ہو فتاویٰ عالمگیری بحوالہ بی - بی - احمد ان ایڈمنسٹریشن آف جسٹس ان میڈی ویل انڈیا۔ (1940ء ایڈیشن) صفحہ 101-

22- ملاحظہ ہو الیٹ اور بیمس میموائرس آف دی ہسٹری - فوک لور اینڈ دسٹری بیوشن آف ریسز آف این - ڈبلو - پی - جلد دوم بیمس ناردی - پیرس 1956 اینڈ 1844 صفحہ 3-202 -

23 آئین اکبری (مترجمہ بلوچ مین سیکنڈ ایڈیشن) جلد اوّل صفحہ 44-

24- دی اسلامک کلچر اپریل 1956ء صفحہ 940-

25- شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ مترجمہ عبدالحق حقانی صفحہ 182-

26- شرما - ایس - آر - دی ریلی جس پالیسی آف دی مغل امپررس صفحہ 32-131

27- بحوالہ جدوناتھ سرکار - ہسٹری آف اورنگ زیب جلد 3 - صفحہ 97-296 -

28- قانون گو کے - آر - ہسٹری آف دی جاٹس صفحہ 63 -

29- عماد السعادت (نولکشور ایڈیشن) صفحہ 56-

30. سرکار جدوناتھ شیواجی اینڈ ہز ٹائمس (ففتھ ایڈیشن) صفحہ 76-373 -

31- جدوناتھ سرکار ایف مارٹن میموائرس بحوالہ ان دی ہاوس آف شیواجی (1940ء ایڈیشن) صفحہ 4-203-

32- ڈف - گرانٹ ہسٹری آف مرہٹہ (ایڈیشن 1921ء) جلد اوّل صفحہ 390 -

33- ایضاً فٹ نوٹ۔

34 - سردیسی - جی - ایس نیو ہسٹری آف مرہٹہ -

35 - ہسٹریکل پیپرس ڈیلنگ مہادجی سندھیا (1937) صفحہ 9-887 -

36 - کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد چہارم (انڈین ایڈیشن) صفحہ 115-114 -

37 - ڈاے ویدس - راگنلز (ساہتیہ اکاڈمی ایڈیشن آف 1956ء صفحہ 90-989

چوتھا باب

اٹھارھویں صدی میں (اقتصادی حالات)

یورپ کی اقتصادی حالت ازمنہ وسطیٰ کے آخر میں تجارت کی توسیع سے ممتاز تھی۔ شہروں میں صنعت نے ترقی کی اور اس نے تجارت کو فروغ دیا چنانچہ ایک نیا طبقہ جس نے روز افزوں اہم کردار اقتصادی اور سیاسی میدانوں میں ادا کیا عالم وجود میں آیا یہ متوسط طبقہ تھا یہ نہ تو جاگیردارانہ امراسے تعلق رکھتا تھا نہ زرعی غلاموں کی جماعت سے اس طبقہ کے رونما ہونے سے جاگیردارانہ یورپ کا چہرہ بدل گیا اور ایسی طاقتیں متحرک ہوگئیں جن کے نتیجہ میں قوم پرستانہ (نیشنلسٹ) حکومتیں وجود میں آئیں۔ اس طرح متوسط طبقہ جو شہروں میں پیدا ہوا اس کے ذریعہ سے یورپ کا سماجی انقلاب تکمیل کو پہنچا۔

قصبات ان کی تجارت

دوسری جانب ہندوستان میں حالات مختلف تھے اگرچہ ہندوستان کے گاؤں کی اقتصادیات جو صرف اپنی ہی کفالت کے حدود کے اندر مقید تھی اور جس کی فارمنگ بس صرف زندہ رہنے تک عمل پیرا تھی وہ یورپ کے ازمنہ وسطیٰ کے زرعی نظام کے رنگ و روپ سے کچھ مماثلت تو رکھتی تھی لیکن ہندوستان کے قصبات اور شہر اور ان کے اندر حرفت اور تجارت کا نظام یورپ کے شہروں کے نظام سے دور کی بھی یکسانیت رکھتا تھا۔ ہندوستان میں قصبات کی کمی نہ تھی لیکن ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا۔ جس کا وجود محض صنعت اور تجارت کی وجہ سے ہوا ہو۔ بلکہ واقعہ یہ تھا کہ جس طرح قصبات کی آبادی بڑھتی گئی ان میں تجارت اور صنعت کو ترقی ہوتی گئی اس کے علاوہ یورپ کے شہروں کے برعکس ان کے اقتصادی معاملات ان کی شہری زندگی پر حاوی نہ تھے۔ ہندوستان کا تجار طبقہ اپنی نوعیت اپنے کاروبار اور اپنے مقاصد میں یورپ کے متوسط طبقے سے یکسر مختلف تھا۔ صنعتی ترقیات یا سیاسی معاملات میں

وہ اس طرح ذرا بھی اثر انداز نہ تھا جس طرح اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں یورپ کا طبقۂ تجار تھا نتیجہ یہ کہ ہندوستان میں نہ کوئی صنعتی انقلاب آیا نہ اقتدار اعلاکی حامل کسی قومی حکومت کا ارتقا ہوا۔ اور نہ طبقۂ تجّار نے ایک مہم باز اور احیاء جدید عطا کرنے والے فرقہ کو جنم دیا۔

جن علاقوں پر اکبر حکمران تھا ان میں یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ ایک سو بیس شہر اور تین ہزار دو سو قصبات تھے آگرہ کی آبادی کا تخمینہ پانچ لاکھ سے چھ لاکھ ساٹھ ہزار تک کیا گیا ہے، یہ اسی زمانہ میں لندن کی جو آبادی تھی اس سے زیادہ تھی دلّی کو پیرس کے مقابلہ میں بالاتر ہی کہا جا سکتا ہے احمد آباد تقریباً لندن کے برابر تھا لاہور یورپ کے تمام شہروں کے مقابلہ میں کسی سے دوئم درجہ پر نہ تھا پٹنہ کی آبادی دو لاکھ تھی لیکن باوجود اس کے کہ ان شہروں کی آبادی وسیع تھی لیکن یہ شہر اپنے یورپ کے مثل شہروں سے تاب مقابلہ نہیں رکھ سکتے تھے کیونکہ ان شہروں میں وہ آزاد ادارے نہیں تھے جو یورپ کے شہروں اور قصبات میں فرقہ تجار نے قائم کیے تھے۔

اٹھارھویں صدی میں جنگوں بیرونی حملوں اور دوسرے آفات نے سخت مصیبت پیدا کر دی تھی لاہور دلّی آگرہ متھرا جیسے شہر شمال میں اور ملک کے وسیع رقبے دکن میں تباہ و برباد کردیے گئے۔ بہرحال مصائب کا کچھ نہ کچھ ازالہ ہندوستان کے ساحل پر یورپی تجّار کے نمودار ہونے سے ہوگیا ان لوگوں نے ہندوستان کا مال سونا اور چاندی دے کر خریدا اور اس طرح صنعت کو ابھارا۔

ہندوستان کے فنون اور کاریگری کے کاروبار جو اعلا طبقہ کی ضروریات کو پورا کرنے کا مقصد رکھتے تھے وہ صرف شہروں ہی کے مخصوص خط و خال نہ تھے امرا کے لیے صنعتی اشیا تیار کرنے کے ماہرین فن دیہاتوں میں بھی اسی طرح موجود تھے جس طرح شہروں میں۔ کاریگروں کے مختلف قسم کی متعین چیزیں تیار کرنے کا کام کرتے تھے۔ اور ماہرین فن باہم تعاون سے مکمل شدہ شکل میں اشیا تیار کرتے تھے مثلاً سوتی کپڑوں کی تیاری میں دھننے والوں سوت کاتنے والوں جولاہوں رنگ سازوں کپڑے کو صاف کرنے والوں اور چھاپنے والوں کی الگ الگ جماعتیں تھیں صنعت کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ بعض متعین گاؤں اور قصبات مخصوص صنعتوں کی نشو و نما کی جگہ تھے مختلف اوصاف کے کام کرنے والے شہر کے مخصوص محلوں میں رہتے تھے مثلاً بڑھئی، صراف، سونار اور تیلی وغیرہ اپنے محلوں میں ایک جگہ بسے ہوتے کچھ گاؤں والے چھینٹ کچھ آب رواں اور کچھ پگڑی بناتے۔ حاشیہ پر کام کیا کپڑا (کمخواب) ریشمی کپڑے اور وہ کپڑے جو سونے اور چاندی کے تار

سے تیار کرائے جاتے تھے ان میں سے ہر ایک کسی خاص جگہ سے منسوب ہو کر وہیں کی خصوصی شے کہی جاتی تھی۔
کسی ایک فن میں خصوصی مہارت پیدا کرنے کی صفت نے فن کی نشوونما کی حتی کہ ہندوستان کی صناعی ایسے کمال تک پہنچی جو اس زمانے میں تمام دنیا میں بے مثال اور لاجواب تھی۔ صنعتی تنظیم میں اور تکنیک میں بھی ہندوستان مغرب سے کہیں آگے تھا۔ ہندوستانی صنعت کی تیار شدہ چیزیں نہ صرف ایشیا اور افریقہ کی ضرورت پورا کرتی تھیں بلکہ یورپ کے بازاروں میں بھی ان کی بڑی مانگ تھی۔ وہ مغربی ممالک کو بحری اور برّی راستوں سے پہنچتی تھیں۔

ہندوستان کے تجار جو مشرق کی اشیا کے سامان رساں تھے۔ خلیج فارس اور بحر احمر کے ساحلوں پر خوب اچھی طرح جانے پہچانے ہوئے تھے۔ اور ان کا کاروبار پوری طرح جما ہوا تھا۔ یہ لوگ قندھار۔ کابل۔ بلخ۔ بخارا کاشغر وغیرہ میں اور افغانستان اور وسط ایشیا میں اور مملکت ایران کے اندر شیراز، اصفہان، مشہد میں اور مملکت روس کے شہر باکو، استراخان، بخنی نووگراڈ وغیرہ میں بھی بکثرت پائے جاتے تھے۔ ہندوستان کی تجارت تمام دنیا کی تجارت ہے اور جو کوئی بھی اسے کل اپنے قابو میں کرے وہ یورپ کا ڈکٹیٹر ہے[1]''

ہندوستان کا مال مشرقی ایشیائی ملکوں کو بھی جاتا تھا جیسے برما، ملایا، انڈونیشیا، چین اور جاپان۔ کارومنڈل کے ساحل اور بنگال ان کے سپلائی سینٹر تھے۔

صنعتی نظام

ہندوستان کی صنعت کو دو مختلف قسم کی مانگیں پوری کرنی پڑتی تھیں ایک تو عام باشندوں کی ضروریات سے متعلق تھی جن کی زبردست اکثریت گاؤں میں رہتی تھی اور دوسری مانگ کا تعلق سوسائٹی کے اعلا طبقہ سے تھا۔

وہ صنعتی نظام جو تیار شدہ مال دیہات کے لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بناتا تھا۔ قدیم وضع کا تھا۔ صناع سال کا ایک حصہ زراعت میں لگاتے تھے۔ کیونکہ ان کی بنائی چیزوں کی مانگ اتنی کافی نہ تھی کہ وہ تمام سال اپنے صنعتی پیشہ میں لگے رہیں۔ مواضعات میں مال کا تبادلہ مال سے کرنے کے رسم و رواج کے ضوابط سے متعین تھا اور کاریگروں کو ان کی اجرت جو جنس میں ملتی تھی اس کا طریقہ یہ تھا کہ فارم میں جو کچھ پیدا ہوتا اس کا ایک حصہ ان کو ملتا تھا اور یہ حصہ قدیم رواج سے مقرر تھا اور مانگ اور مال کی مقدار کے بازاری قوتوں کا پابند نہ تھا۔

اوپر کے طبقے یعنی جاگیردارانہ رئیس اور دولت مند تجار کی مانگ عیش و عشرت کی اشیا تھیں۔ اس کی مقدار بہت زیادہ تھی۔ دولت مند لوگ اگرچہ تعداد میں نسبتاً بہت کم تھے لیکن تعیش کی اشیا کی ان کی مانگ بہت زیادہ تھی کیونکہ وہ زندگی کی عمدہ چیزوں سے لگاؤ رکھتے تھے اور اپنے استعمال اور نمائش کے لیے قیمتی چیزوں کی جو نفاست سے بنی ہوں خواہش رکھتے تھے۔

اعلا قسم کی تعیش کی اشیا بنانے والے اپنے گھروں میں یا حکومت کے ان کارخانوں میں کام کرتے تھے جو قصبات میں ہوتے تھے۔ گاؤں کے کچھ اہل فن جنھوں نے اپنی کسی مخصوص صنعت میں مہارت اپنے گاؤں کے اندر ہی حاصل کر لی تھی وہ بھی ان اشیا کو سپلائی کرنے میں حصہ لیتے تھے۔

صنعت کے نظام کا جہاں تک اس کی طاقت کا تعلق ہے مقابلہ یورپ کے انجمن تجار سے نہیں کیا جا سکتا جہاں تک باضابطہ منظم صناعوں کے وجود کا معاملہ ہے اس کا پتہ شہادتوں کی نشان دہی کی حد تک صرف گجرات کے علاقہ میں ملتا ہے صنعت ایک موروثی پیشہ تھا اور ہر صناع کسی خاص ذات کا ہوتا تھا۔ اس لیے ان کی انجمن ذات کے اختیارات پر بالاتر نہیں ہو سکتی تھی درحقیقت تجارت سے متعلق تمام معاملات پنچایت اور ذات کے چودھری کے سامنے پیش کر دیے جاتے تھے اس طرح یورپ کی انجمن تجار کے نظم و نسق کا کام ہندوستان میں ذات کے ذریعہ انجام پاتا تھا۔

دوسرا پہلو یورپ کے صنعتی نظام کا جسے بٹھا دینے والا نظام کہا جا سکتا ہے ہندوستان میں بھی نشو و نما پا گیا تھا، چونکہ زیادہ تر صناع غریب تھے ان تاجروں کے لیے کام کرتے تھے جو ان کو روپیہ پیشگی دلالوں کے ذریعہ دیتے تھے جسے دادنی کہتے تھے یا اپنے گماشتوں کے ذریعہ یہ معاملہ کرتے تھے دست کاروں کو روپیہ آلات اور کچے مال کے لیے دیا جاتا تھا۔ اور تیار شدہ مال کی اجرت پیشگی دے دی جاتی تھی جب تک کہ طے شدہ مقدار تیار نہ ہو جائے اور اس پر تاجر کی مہر نہ لگ جائے دستکار پر لازم تھا کہ اس کے لیے کام کرے۔ تیار شدہ مال عام طور پر درمیانی آدمی جمع کر کے بازار میں بیچنے کے لیے رکھ دیتا تھا۔ بعض اوقات امرا دست کاروں سے براہ راست معاملہ کرتے تھے اس سے ان کو غریب دست کاروں پر ظلم کرنے کا موقع فراہم ہوتا تھا۔

جو کارخانے حکومت کے دارالسلطنت پر قائم تھے ان کا نظم بہترین تھا۔ برنیئر[2] نے بڑے بڑے ہالوں کا ذکر کیا ہے جہاں مختلف کاریگر اپنی اپنی جگہوں پر کام کرتے تھے وہ مالکان (یعنی استادان فن) کی ہدایت پر داروغوں کی نگرانی میں رہتے تھے جو ان کو نوکر رکھتے تھے۔ کارخانے حکمرانوں یعنی بادشاہوں یا گورنروں کی براہ راست سرپرستی میں کام کرتے تھے جو ان کے کاموں پر

گہری دلچسپی لیتے تھے۔ کاریگروں کو خاص انعامات کے وعدوں سے یہ لوگ ان کی ہمت افزائی کرتے تھے اور جو اشیا تیار ہوتی تھیں ان کو زیادہ بہتر بنانے میں مدد دیتے تھے۔

لیکن بہرحال مجموعی طور پر اشیا کی تیاری کا نظام چھوٹے چھوٹے حلقوں یعنی کاریگروں کے گھروں کے اندر ہی تھا۔ ان کی آمدنی بہت کم تھی اور ان کے کام کا ضروری خرچ یا تو سوداگروں کی پیشگی رقوم یا سرپرستوں کی عنایت و نوازش سے پورا ہوتا تھا۔ صنعت پر جو سرمایہ لگایا جاتا تھا وہ بہت کم تھا اور اس لیے اس نے وہ جماعتی صورت اختیار نہیں کی جو یورپ میں نشوونما پائی۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ ہر پیشہ کسی ذات پر منحصر تھا جو ایک محدود برادری تھی اور اس کی وجہ سے مزدور کا ایک تجارت یا کاریگری سے دوسرے میں منتقل ہو جانا مختلف پیشوں کے گروہوں کا باہمی تعاون نہ صرف مشکل بلکہ قطعی ناممکن ہو گیا۔

ہندوستان کا گاؤں ایک خودکفیل اقتصادی خطہ تھا گاؤں والوں کی ضروریات بہت کم تھیں اور تقریباً وہ سب گاؤں کے اندر ہی سے پوری ہو جاتی تھیں۔ زراعت کی پیداوار کی بچت بادشاہ کو مالگذاری کی شکل میں چلی جاتی تھی اور گورنمنٹ کے مطالبات ادا کرنے کے بعد کاشتکار کے پاس کچھ بچتا ہی نہ تھا جس سے وہ شہر کی صنعت کی بنی ہوئی اشیا کو خرید سکے۔ ان حالات میں گاؤں اور شہر کے درمیان مال کے تبادلے کا نالہ بہت آہستہ بہتا۔ سرمایہ کی کمی ذات کی پابندیوں کی سختیاں اور شہر اور گاؤں کے اندر آپس میں تجارت کی کمی یہ تھے وہ واقعات جنھوں نے روایتی سوداگروں کے طبقوں کو جو تجارت اور مہاجنی کا کاروبار کرتے تھے یورپ کے طرز کے ایک مضبوط اور اچھی طرح آپس میں گندھے ہوئے متوسط طبقہ میں تبدیل ہونے نہیں دیا۔

سادہ اور خودکفیل یہی اقتصادیات اور عوام کا تارک الدنیا نظریہ ایک دوسرے پر عمل اور ردّعمل کا کام کرتا رہا۔ ان کے مذہبی نظریہ نے املاک دنیوی سے نفرت کی ہمت افزائی کی حیات کو آسودہ کرنا، نفسانیت اور خواہشات کا قابو میں لانا حسن سیرت تصور کیا جاتا تھا۔ جائداد کو ایک جال خیال کیا جاتا اور بہرحال یہ ایک عارضی اور وہمی چیز تھی اور ایک مردعاقل کے توجہ کے قابل ہرگز نہ تھی۔ بادشاہ اور امرا دولت اور طاقت کی نمائش میں خوشی محسوس کرتے ہوں گے اور شاید ایسا کرنا ان کے لیے مبنی برحق بھی ہو لیکن وہ لوگ بھی اگر اشوک اور اورنگ زیب کی تقلید کریں تو بہتر انسان ہوں گے بلکہ انسانیت کے لیے دنیا کا ترک اور راضی برضائے الٰہی ہونا ہی زندگی کا صحیح مقصد ہے۔ اس طرح اخلاقی ماحول و دولت جمع کرنے کے لیے موزوں نہ تھا اسی طرح مشترکہ خاندان اور ہندو

اور مسلمانوں کے اندر وراثت کے جو قوانین رائج تھے وہ بھی خاندانوں کے اندر دولت کے زیادہ عرصہ تک جمع رہنے کے لیے سازگار نہ تھے یہ رواج کہ مرنے کے بعد امرا کی جائداد بادشاہ کو منتقل ہو جاتی تھی امرا میں ایک موروثی دولت مند طبقہ کے نمودار ہونے میں حارج تھا۔ ہندوستان کے دانش وروں نے اقتصاریات کا علم حاصل نہیں کیا تھا۔

نتیجا ً:۔ مہاجن اور قرض دینے والے جو ہندوستان کے سوداگر طبقہ کے عناصر تھے اور جن کو ایک طرح سے اس زمانہ کا متوسط طبقہ خیال کیا جا سکتا ہے۔ خوب دولت کماتے تھے لیکن اپنا سرمایہ مال تیار کرنے والی صنعتوں میں نہیں لگاتے تھے ان لوگوں نے اپنے سرمایے کا مصرف یہ رکھا تھا کہ بہت اونچی سود پر یا تو حکمران جماعت کو قرض دیتے تھے یا کاریگروں کو پیشگی رقم کی صورت میں تاکہ وہ مال تیار کرکے سپلائی کریں، لیکن ان میں جرأت مندی اور تجربات کرنے کی وہ روح نہیں تھی جو یورپ کی صنعت کا مرکزی دھارا تھا۔ علاوہ ازیں یہاں افراد اور ان کے خاندانوں کے لوگ اپنا کاروبار الگ تھلگ کرتے تھے۔ برخلاف یورپ کے جہاں تجار نے جماعتی مجلسیں اور انجمن تجار قائم کرلی تھیں اور انہی کے ذریعہ کاروبار کرتے تھے۔

اگرچہ ہندوستان کی صنعت سرمایہ داری کی ماقبل منزل ہی میں رہ گئی اور اس سے صنعتی متوسط طبقہ کا ارتقا نہیں ہوا لیکن پھر بھی جو مال تیار کیا جاتا تھا اس کے تنوع اور تیار کرنے کی تکنک اس زمانہ کے یورپ سے صنعتی انداز میں زیادہ آگے تھی۔ وسطی زمانہ کی ہندوستان کی اقتصادیات کا مورّخ "مور لینیڈ"، جو ہندوستان کے کارناموں کے معاملہ میں کسی مبالغہ کا رجحان نہیں رکھتا، بہرحال تسلیم کرتا ہے کہ۔ "اب تک میرے دماغ میں یہ بات ناقابل تردید ہے کہ صنعت کے معاملہ میں ہندوستان بہ نسبت اس کے کہ جو وہ آج ہے اس زمانہ کے مغربی یورپ سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔"

ہندوستان کی صنعت اور کلچر کی عظمت اور ان کی جدت پسندی کے متعلق" پائی رارڈ" کی شہادت مستقل دل چسپی کا مخزن ہے وہ کہتا ہے "مختصراً یہ کہ جو بھی اشیا یہاں تیار ہوتی ہیں ان کے بے شمار اقسام اس کے علاوہ سونے چاندی لوہے تانبے اور دوسری دھاتوں سے جو چیز بنائی جا رہی ہیں اور قیمتی اور نادر مواد سے جو سامان تیار ہوتے ہیں ان سب کا تنوع بیان کرتے کرتے میں کبھی بھی حرف آخر تک نہ آسکا کیونکہ یہ ایک ہوشیار قوم ہیں اور مغرب کے کسی معاملہ میں احسان مند نہیں ہیں خود ان کو ذہن اس سے تیز تر بخشا گیا ہے جو بالعموم رکھتے ہیں اور ان کا ہاتھ اتنا ہی پُرفن ہے جتنا کہ ہمارا ہے کسی چیز کے دیکھنے سننے کے بعد جیسے ہی چیز ان کے سامنے آجاتی ہے اسے وہ جان اور پہچان لیتے

ہیں ایک نہایت ہوشیار اور چالاک قوم لیکن بہر حال دھوکہ باز نہیں ہیں اور نہ ان کو آسانی سے دھوکہ دیا
جاسکتا ہے اور جو صنعتی چیزیں وہ تیار کرتے ہیں ان میں کیا خاص چیز قابل ملاحظہ ہے وہ یہ کہ ان کی کاریگری
بہت اچھی اور چیزیں سستی ہیں میں نے کسی طرح کے رنگ کے انسانوں کو اتنا نفیس المزاج اور خوش وضع
نہیں پایا جیسے کہ یہ ہندوستانی ہیں ان میں بربریت اور وحشت ذرا بھی پائی نہیں جاتی جب کہ ہم فرض کرد
کرتے ہیں ۔ یہ ضرور صحیح ہے کہ وہ پرتگالیوں کے طور وطریق اور رسم و رواج کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں
ہوتے ہیں لیکن وہ ان کی فن کاری اور کاریگری کو بہت جلد سیکھ لیتے ہیں ۔ کیونکہ یہ لوگ سیکھنے کی بڑی
جستجو اور خواہش رکھتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ پرتگالی ان سے زیادہ حاصل کرتے ہیں بہ نسبت اس کے
کہ وہ پرتگالیوں سے کچھ مستعار لیں جو لوگ گوا پہلے پہل آتے ہیں وہ بہت سیدھے سادے ہوتے
ہیں جب تک جزائر ہند کے آداب و تہذیب کو سیکھ نہیں لیتے ہیں اس لیے اسے ذہن نشین کرلینا
چاہیے کہ دریائے سندھ کے علاقے کے تمام ممالک کامبے سورت اور تمام ممالک جو اس علاقے میں
اور مغل اعظم کے علاقہ میں ہیں، وہ جزائر ہند کے تمام علاقوں میں سب سے بہتر اور سب سے زرخیز ہیں
اور گویا وہ دائی دودھ پلائی ماں کی طرح ہیں جو بقیہ سب کو رسل و رسائل اور تجارت عطا کرتی ہیں اسی طرح
بنگال کی سلطنت ہے جہاں ان کے طور وطرز و رسم و رواج و تہذیب یہاں کے لوگ مرد بھی اور عورتیں بھی
دوسری جگہوں کی نسبت زیادہ تعلیم و تربیت یافتہ ہیں وہ ممالک ہندوستان کے تمام بحری جہازوں
کی منڈی ہیں اور ان کا طریقہ رہائش دوسری تمام جگہوں سے زیادہ بہتر ہے۔[3]"

ہندوستان کے کاریگروں کے فن کے بارے میں وہ آگے چل کر لکھتا ہے " دنیا کے کسی حصہ
کے لوگ موتیوں اور قیمتی پتھروں کے بارے میں اتنا نہیں جانتے جتنا یہ لوگ جانتے ہیں حتیٰ کہ گوا کے جو
نگینہ ساز اور سونار اور دوسرے کاریگر جو نفیس تر صنعتی کاروبار میں لگے ہوئے ہیں وہ کامبے کے
بنیے یا برہمن ہیں اور ان کا خود محلہ ہے اور اپنی دکانیں ہیں۔[4]

پیداوار

پیداوار ایک وسیع حلقہ پر محیط تھی یعنی ابتدائی زرعی پیداوار سے نفیس سوتی اور ریشمی کپڑے
لوہے اور اسٹیل پیتل اور تانبے سونے اور چاندی کے دھات کے کام اور مختلف مقدار کے جہاز تک
غذائی اجناس زراعت کی سب سے اہم پیداوار تھی جسے تقریباً ہر گاؤں اپنی خود کی ضروریات پوری
کرنے کے لیے تیار کرتا تھا۔ دوسری زرعی پیداوار میں روئی ۔ اوکھ ۔ تمباکو ۔ پوستہ اور نیل شامل تھے۔

بنگال اور اڑیسہ کے ساتھ ساتھ سندھ میں بھی مچھلی غذا کا ایک اہم جزو تھا بہت سے سیاحوں کا بیان ہے کہ مچھلی کو سکھا کر اور اس میں نمک لگا کر جہاز کے لوگوں کو کھانے کے لیے رکھا جاتا تھا۔ مچھلی کا تیل سندھ میں تیار کیا جاتا تھا اور مغربی ہندوستان میں مچھلی کی کھاد بنائی جاتی تھی ملک میں ایک نفع اندوز تجارت موتیوں کی تھی دکن میں صدف کا شکار پوری طرح جما ہوا تھا۔ کانوں کی صنعت زیادہ ترقی یافتہ نہ تھی اور معدنیات کی پیداوار بہت کم تھی لیکن لوہے کی پیداوار ایک چھوٹے پیمانے پر دور تک پھیلی ہوئی تھی اور ملک کا ہر حصّہ اپنے استعمال کے لیے لوہا پیدا کرتا تھا مغربی ایشیا کے کل حصّہ میں ہندوستان کی تلوار بڑی قدر و قیمت رکھتی تھی دھات کے علاوہ مغربی ایشیا میں ہیرا نمک اور نمک کے غار تھے۔

جو صنعتی اشیا تیار کی جاتی تھیں ان میں سوتی کپڑے سب سے زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ یہ صنعت تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی لیکن اس کے خاص مرکز ڈھاکہ، بنارس، آگرہ، ملتان، برہان پور، لاہور، احمد آباد، پاٹن، بڑودہ، بروچ اور سورت تھے اور دوسری صنعتی پیداوار میں ریشمی کپڑے اون کی گلناری پوشاک اور ان کے کپڑے اور بنگال میں سن اور جوٹ کے کپڑے شامل ہیں۔

چینی۔ سبزیوں کے تیل۔ رنگنے کے سامان افیون اور دھات کے برتنوں کی پیداوار اچھی طرح جمی ہوئی تھی۔ دیہات کے گھروں کے اندر کی صنعتوں میں صرافوں اور چاندی کے کام کرنے والے سناروں کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ پانی کے راستوں سے مال ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کا طریقہ اندرونِ و بیرونِ ہند دونوں جگہوں کی تجارت کے لیے رائج تھا اس لیے کشتیوں اور جہازوں کی بڑی مانگ تھی سوداگروں کے جہاز جو شہروں کے بندرگاہوں میں یا کشتیاں جو ملک کی دریاؤں پر چلتی تھیں۔ یہ سب ملک کے اندر تیار کی جاتی تھیں۔ ڈھاکہ، الہ آباد، ٹھاٹا، میسولی پٹم، پولیکاٹ، کلکتہ، سورت لبسین اور گوا میں کشتی بنانے کی صنعت کامیابی سے چل رہی تھی۔ کشتیوں کے بنانے کے کاروبار کی وسعت کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دریائے سندھ میں چالیس ہزار کشتیاں چل رہی تھیں چالیس ہزار سے پچاس ہزار تک چھوٹی کشتیوں یا چھوٹے جہازوں کا بحری بیڑہ ایک کمانڈر کی ماتحتی میں چلنے والا بنگال میں تھا اور ایک سو اسّی جنگی جہازوں کا بیڑہ ایک کمانڈر کی ماتحتی میں چلنے والا آگرہ اور ست گاؤں کے بیچ تھا اور سو ادھر سے ادھر پھرنے والوں کا اسی طرح کا بیڑا مالا بار میں تھا، یہ سب ان بے شمار جہازوں کے علاوہ تھا جو ہندوستان کے بندرگاہوں میں تھے تین سو سے چار سو تک سمندروں میں چلنے والے جہازوں کا بیڑہ کامبے اور گوا کے درمیان اور دوسرا ڈھائی سو

جہازوں کا ایسا ہی بیڑہ گوا سے جنوب کی طرف بادبانوں کے ذریعہ سمندر پر چلتا تھا ان کے علاوہ بے شمار جہاز بنگال اور اڑیسہ کے مشرقی ساحل پر چلتے تھے بال کرشن کا اندازہ ہے کہ جو جہاز ہندوستان کے بندرگاہوں میں سالانہ آتے یا جاتے تھے ان کا وزن اٹھارھویں صدی کے اوائل میں تین لاکھ پینتالیس ہزار ٹن تھا جس میں سے بچاسی ہزار ٹن بیرونی تجارت میں اور بقیہ ساحلی بیوپار میں لگے ہوئے تھے[5]

جہازوں کے بنانے کے فن میں ہندوستانی اقوام یورپ سے آگے تھیں۔ ہندوستان کے جہاز بنانے کی فن کی مہارت کے معاملہ میں پارکنسن کہتا ہے کہ جہازوں کے بنانے میں انھوں نے انگریزوں کو اس سے زیادہ سکھایا بہ نسبت اس کے جو ان سے سیکھا[6] سب سے زیادہ اہم جہازوں کے بنانے کے کارخانے گوا، لبسین، سورت، میسولی پٹم، ستگاؤں، ڈھاکہ اور چٹگانگ میں تھے۔ اس زمانہ میں جہازوں کی معیاری جسامت تین سو سے پانچ سو ٹن تک تھی اگرچہ پندرہ سو ٹن کے جہاز بھی معدوم نہ تھے۔ گوگھا جہاز رحیمی جس کو پرتگالیوں نے پکڑ لیا تھا اس کا وزن پندرہ سو ٹن تھا۔[7]

بیرونی تجارت

ہندوستان میں صنعتی پیداوار کا مقصد زیادہ تر اپنی گھریلو ضروریات پوری کرنا تھا۔ ملک مستغنوی المزاج اور عام طور پر زراعتی اور صنعتی مال کے معاملہ میں جو کل باشندوں کی ضروریات کے لیے درکار تھا خود کفیل تھا۔ تعیش کے سامان جن میں کچھ نادر عناصر ہوتے تھے باہر درآمد کیے جاتے تھے لیکن ان کی مانگ محدود تھی اور زیادہ دولت مند لوگ ان کو کسی واقعی ضرورت رفع کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے شوق کو پورا کرنے یا رعونت ظاہر کرنے کے لیے خریدتے تھے۔ جو چیزیں باہر سے درآمد کی جاتی تھیں ان میں کچا ریشم۔ ہاتھی دانت، مرجان کچھوے کا خول اور عنبر شامل تھے ان کے علاوہ دھات بھی ہوتے تھے یعنی سونا اور چاندی سیسا، ٹین، تانبا، جستا اور پارہ اور کچھ معدنیات جیسے کہ سہاگا اور گندھک۔

گھریلو ضروریات پوری کرنے کے لیے علاوہ ہندوستان کی صنعتیں بیرون ملک کے بازاروں کے لیے بھی کام کرتی تھیں۔ اس کی صنعتی فوقیت نے جو اٹھارھویں صدی کے آخر تک قائم رہی۔ ہندوستان کو تجارت اور صنعت کی دنیا میں ایک قابل رشک پوزیشن عطا کر دی تھی۔ سترھویں صدی کے آغاز میں دنیا کی دولت اور دنیا کی اشیا کی حرکت اور تقسیم کے لیے ہندوستان سانس لینے کی رگ تھا

یہ ایک سمندر تھا جہاں تجارت اور صنعت کے تمام دریا جا کر گرتے تھے اور اسی طرح باشندوں کو دولت مند بناتے تھے[8]۔"

سترھویں صدی میں یہ ملک دنیا میں سب سے زیادہ صنعتی پیداوار پیدا کرنے والا تھا۔ اٹھارھویں صدی کے آخر تک اس روئے زمین کا ہر ملک ہندوستان سے کثیر تعداد میں اعلا درجہ کے سوتی اور ریشمی کپڑے، مسالے، تیل، چینی، مرچ، دوائیں، قیمتی پتھر اور بہت سی انوکھی فنکارانہ چیزیں سونا اور چاندی دے کر لیتا تھا۔

ہندوستان مسلسل قیمتی دھاتوں کا مخزن رہا۔" وان ٹوسٹ" ہندوستان کے بادشاہوں کی املاک پر لکھتا ہے کہ "اگرچہ ہندوستان میں سونے اور چاندی کی کانیں نہیں ہیں لیکن بیرونی ممالک سے یہ دونوں دھاتیں کثیر مقدار میں درآمد کی جاتی ہیں اور ان کا باہر لے جانا ممنوع ہے[9]۔" ہاکنس" لکھتا ہے کہ "ہندوستان چاندی کے معاملہ میں بہت دولت مند ہے کیونکہ تمام قومیں سکہ لاتی ہیں اور اشیا یہاں سے لے جاتی ہیں اور یہ سکے ہندوستان میں دفن رہتے ہیں اور باہر نہیں جاتے[10]۔"

"ٹیری" کا اندازہ ہے کہ ہندوستان کا ایک جہاز۔ جو بحیرۂ احمر سے لوٹتا تھا عام طور پر اس میں دو لاکھ پونڈ اسٹرلنگ کی قیمت ہوتی تھی اور وہ سب زیادہ تر سونے اور چاندی کی شکل میں[11]۔" وہ آگے چل کر لکھتا ہے کہ "جس طرح تمام ندیاں بہہ کر سمندر میں گرتی ہیں اسی طرح خام چاندی کے چشمے ہندوستان میں آکر گرتے ہیں اور یہیں رہ جاتے ہیں کیونکہ ایک قوم کے لیے یہ تو جائز ہے کہ وہ چاندی لائے اور اشیا لے جائے لیکن یہاں سے کوئی بڑی رقم لے جانا ایسا جرم ہے جو ان جرم سے کم نہیں ہے جن میں سزائے موت ہو سکتی ہے[12]۔" مسالہ جو کثیر مقدار میں باہر جاتا تھا اس سے جو سونا چاندی ملتا تھا ان کا صرف ایک حصہ سکوں کے بنانے میں لگایا جاتا تھا بقیہ سب ذاتی ذخیرہ اندوزی اور زیورات کی تیاری میں صرف ہو جاتا تھا[13]۔ جو چیز کثرت سے باہر جاتی تھی وہ سوتی کپڑے تھے۔ ہندوستان اپنے نفیس سوتی کپڑوں کے تیار شدہ مال کی فضیلت کے لیے تمام دنیا میں صدیوں تک شہرت رکھتا رہا۔ قدیم زمانہ میں روم کے اندر ہندوستان کی بنی ہوئی چیزیں کثیر مقدار میں استعمال ہوتی تھیں ہندوستان کی ململ اور اور تنزیب کو یونانی "گینگئے تکا" نام دیتے تھے۔ ہندوستان میں روئی کاتنے اور کپڑے بننے کا کام دو ہزار سال ہوئے اپنے فن کے اعلا کمال کو پہنچ چکا تھا۔" پیریارڈ" نے نوٹ کیا ہے کہ ہندوستان کی دولت کا اصل حصہ ریشم اور سوت کے بنے ہوئے مال ہیں جس سے ہر شخص مرد ہو یا عورت کیپ آف گڈ ہوپ سے چین تک سر سے پیر تک ملبوس ہوتے ہیں[14]۔ یہ عالمگیر ہر دلعزیزی نفاست

کی وجہ سے تھی ۔ ویبر کے قول کے مطابق " نفیس بنے ہوئے کپڑے رنگوں کی آمیزش دھات اور قیمتی پتھروں پر کام کرنے کی کشیدہ کاریوں کی تیاری اور تمام تکنیکی فن میں ہندوستان کو ابتدا ہی سے عالمگیر شہرت حاصل رہی ہے"[15]۔ مورلینڈ[16] کا اندازہ ہے کہ سترھویں صدی میں سوتی سامان جو باہر جاتا تھا وہ آٹھ ہزار گانٹھ تھا جس میں سے چار ہزار سات سو ممالک یورپ کو جاتے تھے۔ اٹھارھویں صدی کے وسط میں صرف انگلستان دس لاکھ تھان ہندوستان کی تیار کردہ چھینٹ اور سوسی سالانہ استعمال کرتا تھا۔ جب شہنشاہ جیمس نے 1643ء میں دریافت کیا کہ انگلستان کیوں ہندوستانی چھینٹ اتنی کثیر تعداد میں درآمد کرتا ہے تو بیان کیا جاتا ہے کہ ٹامس من اور ڈپٹی گورنر مورس ایباٹ نے حسب ذیل دل چسپ جواب دیا کہ " یہ بہت کارآمد ہے اور انگلستان میں اس کی بڑی خریداری جس سے پادری کے آستینوں کی باریک ململ اور کیمرے کے سوتی کپڑے اور دوسرے لینن کپڑوں کے دام کو گرایا جا سکتا ہے اس کے علاوہ انگلستان کے لیے اب ان اشیا کا استعمال معمول ہو گیا ہے۔ یہ اشیا پہلے حضور شہنشاہ معظم کی مملکت کی ضروریات کو پوری کرنے کے بعد باہر اس نوعیت میں بھیج دی جاتی ہیں کہ یہ ہمارے وطن کی تیار کردہ ہیں"[17]۔

انگلستان جو سوتی کپڑے ہندوستان سے درآمد کرتا تھا اس سے نہ صرف اپنی محدود ضروریات پورا کرتا تھا بلکہ اس منافع سے جو اس مال کو باہر بھیج کر وہ حاصل کرتا تھا اپنے کو دولتمند بناتا تھا۔

دوسری چیزیں جو باہر بھیجی جاتی ہیں ان میں نیل کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ موسلی پٹم سے ایک محدود مقدار لوہے اور اسٹیل کی بھی برآمد تھی ۔ روئی سے کتا ہوا سوت کارومنڈل کے ساحلوں سے باہر جاتا تھا۔ گجرات سے جو اشیا باہر جاتی ہیں ان میں وان لوٹ سوتی سامان اور نیل کے علاوہ افیون ہینگ اس پودوں کے سہت رنگنے کے کام کے لیے اور مفرد دوائیں اور قیمتی پتھر اور سنگ جراحت اور سنگ مرمر کا بھی ذکر کرتا ہے۔

مالیاتی نظام اور تاجروں کا طبقہ

ان تمام کامیاب اور نفع بخش تجارت کی تنظیم اور ان کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کا کام ہندوستان کے تجار کرتے تھے ان کی مقدار اور ان کی صنعت سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی تعداد بہت بڑی تھی ان میں سے اکثر ملک کے بندرگاہوں کے شہروں میں مستقل اقامت اختیار کیے ہوئے تھے[18]۔ لنس کوٹن لکھتا ہے کہ " کافر ہندوستانی جو گوا میں رہتے ہیں وہ بڑے دولت مند تاجر ہیں اور ان کا تجارتی کاروبار

بہت پھیلا ہوا ہے۔ وہ آگے چل کر لکھتا ہے کہ" ان کی دُکانیں ریشمی کپڑوں مسائن مشجر اور چین کے برتنوں سے بھرے رہتے تھے اس کے علاوہ ان کی دُکانوں میں مخمل اور لیلین اور قمیص اور سلے سلائے کپڑے بھی ہر قسم کے لوگوں کے لیے ہوتے تھے۔ گواکے بنیے ہر قسم کے قیمتی پتھر اور سوداگری کے سامان بیچتے تھے۔ علاوہ ازیں صراف تھے اور وہ لوگ جو عام ضرورت کے سامان کا کاروبار کرتے تھے ڈبلوجی جانگھ گجرات رپورٹ (29-1628ء) میں لکھتا ہے کہ" ساحل پر جدھر نگاہ اٹھاؤ بنیے نظر آتے ہیں خواہ گوا ہو یا کارومنڈل یا بنگال وہ تجارت کا پیشہ گذر اوقات کے لیے رکھتے ہیں۔ دوسری جانب بہت سے ان میں سے دلاّل ہیں۔ ان بنیوں میں بہت سے ایسے ہیں جو بڑی مقدار میں تجارت کرتے ہیں حتیٰ کہ سب سے زیادہ اور سب سے بہترین تجارت انہی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تجارت کرتے ہیں یہ بڑے تیز رو کاروباری ہیں اور ادائیگی کے معاملہ میں بڑے ایماندار ہیں۔ ان میں سے بہت سے سکہ بدلنے والے بھی ہیں جو ان حصوں میں تمام مقامات پر پائے جاتے ہیں[19]۔ دوسرا سیّاح ڈاکٹر فرائرے سورت کی تجارت کی حالت بیان کی ہے" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے اسے برّی اور بحری دونوں ذرائع سے تجارت کا مرکز بنایا ہے اور کوئی چیز اسے تمام دنیا کی ملکہ بننے میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتی اور اکثر لوگوں کے کاروبار کا خیال کیا جائے تو یہ لوگ کیسے عجیب و غریب استاد اس معاملہ میں ہیں کہ چھوٹی قیمت پر اندرون ملک یا باہر کی چیز خریدتے پھر اسے بنا سنوار کر گراں قیمت پر بیچ دیتے ہیں وہ بنیے جو غریبی کی زندگی گذارتے اور بہت معمولی حیثیت میں رہتے ہیں ان کی ہر بہ تخیلانہ محتاجی کے باوجود ان میں سے ہر ایک بادشاہ کے خزانے سے کم دولت نہیں رکھتا۔ اگرچہ گورنر اکثر ان سے اس قدر روپیہ لیتے تھے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب وہ قلاّش ہو گئے ہیں لیکن سوداگری کی تیز رفتاری جو اس شہر میں جاری ہے وہ چشم زدن میں اپنی اس کمی کو پورا کر لیتی ہے[20]۔"

یہ طبقہ صرف ساحل کے شہروں تک محدود نہ تھا بلکہ ملک کے تمام تجارتی راستوں پر پھیلا ہوا تھا۔ پنجاب میں ملتان اور سندھ کے تین شہر بکر، سکر اور روہڑی شمال مغرب میں اندرون ملک تجارت کے اہم مرکز تھے اور ان میں خوشحال سوداگروں کا ایک طبقہ کام کرتا تھا جن میں کھتری[21] لوہانا لس اور بھاٹیا تھے، لاہور، دہلی اور آگرہ اندرون ملک تجارت کے دوسرے مرکز تھے جہاں آبی ذریعہ رسل و رسائل سے تجارت ہوتی تھی۔ مالدہ، رنگ پور اور قاسم بازار بنگال میں جودھ پور اور اجمیر قدیم مرکز تھے جنھوں نے اٹھارھویں صدی میں اپنی ہمت برقرار رکھی تھی گجرات میں احمد آباد اور پونا ناگپور مرہٹوں کے دیس میں کورومنڈل اور کونکن کے ساحلوں کے بندرگاہوں کے تجارتی مرکز تھے اور اندرون ملک

میں حیدرآباد، بنگلور اور تنجور خوش حالی سے بھرپور تجارت اور سوداگری کی جگہیں تھیں اتر پردیش اور بہار میں اصل تجارت کرنے والے بنیے تھے اگروال، اوسوال جین اور مسری (مہیشں ماری) جن کو کافی دولتمند طبقہ سمجھا جاتا تھا اٹھارھویں صدی کے دوسرے نصف حصّہ میں مہاراشٹر کے اندر راجستھان کے مارواڑی کافی تعداد میں پائے جاتے تھے۔

جنوب میں اندھرا پردیش کے کماٹی اور تامل ملک کے چٹی انتہائی اہم تجارتی طبقے تھے[22] لیکن بہرحال اس بات کا دعوا کرنا غلط ہوگا کہ تمام ہندوستانی تجار دولت مند تھے۔ ان میں بہت سے ایسے بھی تھے جن کی مالی حالت معمولی تھی اور پھر بہت سے ایسے بھی تھے جو غریب تھے۔

تاجروں کے علاوہ مہاجنوں کا ایک بڑا طبقہ تھا جن میں بڑے بھی تھے اور چھوٹے بھی جو زیادہ دولت منداور خوشحال مہاجن تھے ان میں بنگال کے جگت سیٹھوں گجرات کے ناتھ جی لوگوں اور دکن کے چٹیوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ بنگال کے جگت سیٹھوں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اللہ وردی خاں کے دورِ حکومت میں ان کے پاس دس کروڑ روپیہ کا سرمایہ تھا۔ بنگال پر مرہٹوں کے پہلے حملہ کے زمانے میں ان کی کوٹھی سے مرہٹے دو کروڑ ارکاٹ کا روپیہ لے گئے لیکن اس عظیم نقصان نے بھی ان کے وسائل پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا ان کے کاروبار کی وسعت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ وہ ایک کروڑ تک کی ایک ایک درشنی ہنڈی جاری کیا کرتے تھے اسی طرح سورت کے ناتھ جی لوگ عظیم وسائل رکھتے تھے سان کے کاروباری اداروں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس وقت قرض دیا تھا جب وہ ہندوستان کے راجاؤں سے برسرِ پیکار تھی۔

یہ امر دل چسپی سے خالی نہیں ہے کہ بنگال کے جگت سیٹھ لوگ ابتدا میں مارواڑ بنیے اور سورت کے ناتھ جی لوگ بنارس سے ترک وطن کر کے آئے تھے۔ مشرق میں بنگال اور مغرب میں گجرات تک کوٹے چٹی لوگ تھے جو کل تجارت پر اجارہ دارانہ قبضہ کیے ہوئے تھے اور سب سے زیادہ دولت مند خیال کیے جاتے تھے۔ ان کا کاروبار برما ملایا اور مشرقی جزائر تک پھیلا ہوا تھا۔ سیلون میں بہ زمانۂ ایسٹ انڈیا کمپنی چٹی مہاجن کا کام کرتے تھے اور انگریز سوداگروں کو مدراس بمبئی اور کلکتہ کے تبادلے کے بل ادا کرنے کے لیے نقد روپیہ قرض دیتے تھے۔ پریڈنسیوں کے اندر ان کی باضابطہ ایجنسیاں تھیں۔

یہ بنک کے نظام سیاسی معاملات پر بھی بہت بڑا اثر ڈالتے تھے۔ سیٹھ مہتاب رائے اور سیٹھ سروپ چند نے سرفراز خاں کو نکالنے اور اللہ وردی خاں کو تخت نشین کرانے میں بڑی مدد دی تھی۔

سراج الدولہ اس لیے برباد ہو گئے کہ جگت سیٹھ ان کے خلاف ہو گئے تھے۔ اورنگ زیب کے جانشینوں کو روپیہ کی کمی کے نقصانات اٹھانے پڑے جس کی فوجوں کو بھرتی کرنے میں ان کو ضرورت تھی کیونکہ مالکانِ بنک کا خیال یہ ہو گیا تھا کہ ان میں قرضہ واپس کرنے کی سکت اسی وجہ سے کم ہو گئی تھی کہ انھوں نے خالصہ زمینوں کو برباد کر دیا تھا اسی طرح کی قسمت کا سامنا بعد کے پیشوا کو بھی ہوا جو سرمایہ کی کمی کی وجہ سے ہمیشہ مصیبت میں مبتلا رہتے تھے۔

یہ بڑے بڑے مالکان بنک وہ تمام کام کرتے تھے جو آج کل کے ماڈرن بنک کرتے ہیں یعنی روپیہ جو جمع کیا جائے اس کا لینا قرض دینا اور ہنڈی جاری کرنا ان کے نیچے بے شمار چھوٹے چھوٹے بنک والے تھے جو تجارت اور صنعت کے کاروبار والوں کو روپیہ دینے کا روزگار کرتے اور کاریگروں اور دوسرے لوگوں کو جو اشیا تیار کرتے تھے قرض دیتے تھے اس کے علاوہ غیر معمولی اور ہنگامی اخراجات کے مواقع پر جیسے شادی غمی جانور خریداری اور دیگر ایسی ہی ضروریات کے لیے بھی قرض دیا کرتے تھے حقیقت تو یہ ہے کہ پوری قوم زیادہ تر روپیہ قرض دینے والے مہاجنوں کی مٹھی میں تھے۔

کاشتکار، کاریگر۔ صناع امرا اور بادشاہ اور شہزادے سب کے سب ان سے معاملہ کرنے پر مجبور تھے اور اپنے ذاتی اور قومی معاملات میں جو مالی امداد ان کو دی جاتی تھی اس کے لیے وہ لوگ سب ان کے مرہون منت رہتے تھے۔ "ہندوستان کے شہزادے اپنی ادائیگی بانڈ میں کرتے ہیں۔ اور یہ قرض دینے والے اور روپیہ دینے والے پر منحصر ہے کہ ایک بانڈ کی کیا قیمت لگائے"[23]۔ اگر تمام مالکان بنک مہاجنوں اور قرضہ دینے والوں کے مجموعی وسائل کو حساب میں لایا جائے تو یہ معلوم ہو گا کہ ملک کے مجموعی مالی وسائل کافی تھے لیکن یہ دور دور مختلف خاندانوں میں بکھرے ہوئے تھے اس لیے وسیع پیمانہ پر صنعت کی نشو ونما کے لیے ان کے اثرات بہت محدود تھے۔

زرعی پسماندگی

سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں صنعت اور تجارت میں جو خوشحالی پیدا ہوئی اس کا کوئی مقابلہ کسی طرح زراعت سے نہیں ہو سکتا جو بدستور جامد اور قدیمی رہی۔ کاشتکاروں کی جوت کا اوسط رقبہ معلوم کرنے کے لیے کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ رقبہ کی مقدار علاقے علاقے بلکہ گاؤں گاؤں زمین کی حالت اس کی زرخیزی اور آب و ہوا کے لحاظ سے مختلف رہی ہو گی چونکہ قابل زراعت زمین کا رقبہ کاشتکار کی زمین سے متعلق مانگ سے بہت زیادہ تھا اس لیے اغلب ہے کہ کاشتکار کی جوت کے

رقبہ کا تعین زمین جو مل سکتی تھی اس سے کہیں زیادہ سرمایہ اور کاشت کار خاندان میں زراعت کے کام کرنے والوں کی تعداد پر منحصر رہا ہوگا جوت کا رقبہ کم تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ کاشت کار کے پاس اس سے زیادہ رقبہ جوتنے کے لیے وسائل نہیں تھے۔ اسی طرح مغل ہندوستان کے زمانہ میں جوت کا رقبہ اس سے زیادہ رہا ہوگا جو انیسویں صدی کے نصف آخر میں تھا کیونکہ اول تو شروع زمانہ میں جتنے لوگ زراعت میں لگے ہوئے تھے ان کی مقدار نسبتاً بہت کم تھی دوسرے کل آبادی میں سے جو لوگ زراعت میں لگے ہوئے تھے ان کی تعداد بھی نسبتاً کم تھی عام طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مغلوں کے زمانہ میں ہر ایک جوت فارم کا رقبہ بس اتنا تھا جتنا کہ ایک خاندان آسانی سے اور نفع بخش صورت میں انتظام کر سکتا تھا اور اٹھارھویں صدی کے آخر تک جوت کے ٹکڑے ہو جانے ان میں بٹا پڑ جانے اور ان کے غیر نفع بخش جوت ہو جانے کے سوالات پیدا نہیں ہوتے تھے۔

سترھویں اور اٹھارھویں صدی کا کاشت کار انیسویں صدی کے اپنے وارثان سے زیادہ بہتر حالات میں نہ صرف اس معاملہ میں تھا کہ اس کی جوت کا رقبہ زیادہ تھا بلکہ اس وجہ سے بھی کہ مغل زمانہ میں زمین پیداوار بھی زیادہ دیتی تھی۔ اچھی اوسط درجہ کی اور خراب زمین کی ملا کر اوسط پیداوار اکبر کے زمانہ میں بارہ من اڑتیس سیر گیہوں اور اسی قدر دھان فی ایکڑ تھی یہ اندازہ اس علاقہ کے بارے میں ہے جو اب اتر پردیش کہلاتا ہے بیسویں صدی کے پہلے دس سالوں میں سرکاری تخمینوں کے مطابق اس علاقہ میں گیہوں کی اوسط پیداوار بارہ من اکتیس سیر، دھان کی دس من تیرہ سیر تھی[24] کچھ اور سرکاری اعداد و شمار اوسط پیداوار فی ایکڑ اس سے بھی کم ظاہر کرتے ہیں۔

بعد کے زمانہ میں پیداوار کم ہو جانے کے دو اسباب ہیں۔ (۱) آبادی کے دباؤ کے بڑھ جانے سے گھٹیا زمین بھی کاشت میں شامل کر لی گئی جو عمدہ زرخیز زمینوں سے بہت کم پیداوار دے سکتی تھی (2) اور بلا معقول طریقہ پر کھاد دیے صدیوں تک برابر فصل اگاتے رہنے سے یا اس کو بنجر چھوڑ دینے سے تاکہ ان کی اپنی پیداوار کی طاقت بحال ہو سکے زمین کی قوت نمو ختم ہو گئی تھی اس لیے پیداوار گھٹ گئی تھی۔

سب سے زیادہ اہم زرعی فصل کھانے کے لیے غلہ تھی دکن میں نونیز[25] کے قول کے مطابق (جو ملک کے اس حصہ میں چودھویں صدی میں آیا تھا) گیہوں اور چنا، دھان اور باجرہ اور کودو کی فصلیں اگائی جاتی تھیں جن میں سے آخری ذکر کی ہوئی فصل سب سے زیادہ کھائی جاتی تھی۔ دوسرے درجہ میں لوگ پان کھاتے ہیں اور برابر منہ میں رکھے رہتے ہیں۔ خافی خاں بھی کہتا ہے کہ کوکن کے لوگوں کی

خاص غذا جو اور باجرہ تھی اوران کو کثرت سے بویا جاتا تھا۔ شمال میں بھی لوگوں کی غذا میں سب سے بڑا حصہ باجرا اور کودو کا تھا اور یہی وہاں کی خاص فصل تھی۔ لیکن اودھ میں بہترین قسم کا چاول" جو اپنی سفیدی نفاست خوشبو اور صحت بخش ہونے میں بے مثال تھا" پیدا کیا جارہا تھا۔ اس وقت اتر پردیش میں گیہوں ایک اہم فصل نہ تھی حتیٰ کہ اکبر کے دربار آگرہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں چاول بنگال سے آتا تھا۔

غلّے کے بعد روئی اور اوکھ کی سب سے زیادہ وسیع پیمانہ پر کاشت کی جاتی تھی۔ "تھیونا ٹ" کہتا ہے کہ روئی تو ہر جگہ بوئی جاتی تھی اور اوکھ صرف چند مقامات پر۔ تمباکو کی کاشت جو ایک تاجرانہ فصل ہے۔ پہلے پہل پرتگالیوں نے گجرات کے اندر سترھویں صدی کے آغاز میں شروع کرائی۔ تمباکو کو لوگ تیزی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے لگے اس لیے ان کی کاشت بڑھتی گئی افیون اور نیل یہ دو اور تجارتی اغراض کی فصلیں ملک میں تھیں۔ ان کی کاشت بہار کے کچھ حلقوں تک محدود تھی روئی عام طور پر گھروں میں سوتی کپڑے بنانے کے لیے استعمال ہوتی تھی اور اوکھ کی کاشت گڑ اور سفید چینی تیار کرنے کے لیے ہوتی تھی۔[25]"

غلّے کی تجارت محدود تھی۔ اچھے سالوں میں کاشتکار شہروں کی ضروریات پوری کرنے کے بعد بچت غلّہ زمین کے اندر بڑے بڑے تہہ خانوں میں محفوظ رکھتا تھا۔ آب وہوا کے اثرات سے ذخیرے ایک دُہرے اسٹاک کا کام دیتے تھے انگریزوں کے مال کے کاغذات سے پتہ چلتا ہے کہ غلّے کی ذخیرہ اندوزی وسیع پیمانہ پر پھیلی ہوئی تھی اور انگریزوں کے زمانہ کے پہلے یہ عمل بہت عام تھا در حقیقت یہ طریقہ 1860ء کے بعد ہی بند ہوا جب ملک میں غلّے کی برآمد تجارت ریلوے کی تعمیر اور نہر سویز کے کھل جانے کی وجہ سے تیزی کے ساتھ ابھری جو گڑھے غلّے کے رکھنے کے لیے بنائے جاتے تھے وہ اس طرح تعمیر کیے جاتے تھے کہ غلّہ چالیس پچاس سال تک صحیح سالم اور اچھا ہے[26]۔" ایسے گڈھوں کے وجود کی شہادت ایسے مقامات سے ملتی ہے جو ایک دوسرے سے دور دراز ہیں۔ جیسے کہ شمال میں پنجاب[27] اور جنوب میں میسور۔

ملک قحط کے خطرے سے محفوظ نہ تھا بلکہ اس کے برخلاف 1595ء سے 1794ء تک کے دوسو سال کے اندر چوبیس مرتبہ قحط اور کمی بارش کا ریکارڈ ملتا ہے ان میں اکثر معمولی قسم کے تھے۔ لیکن بوے بڑے قحط جیسے کہ 1630ء کے قحط جس سے وجیا نگر دکن اور گجرات متاثر ہوئے بڑے تباہ کن تھے۔ ان قحطوں نے ناقابل بیان مصیبت نازل کی اور کثرت سے لوگ مرے۔ وان ٹوسٹ ان کی ہولناکیوں کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے" اتنا کم پانی برسا کہ بیج جو ڈالا گیا تھا وہ بھی برباد ہوا اور

گھاس تک نہیں اُگی۔ جانور مر گئے۔ شہروں اور گاؤں میں کھیتوں میں اور سڑکوں پر کثیر تعداد میں انسان مرے پڑے تھے جن سے اس قدر بدبو آتی تھی کہ راستہ چلنا دشوار تھا۔ گھاس نہ ہونے کی وجہ سے جانوروں کو انسانوں کی مردہ لاش کھلائی جاتی تھی لوگ جنگلی جانوروں کی مردہ لاشوں کو کھاتے تھے کچھ لوگ ان ہڈیوں کی تلاش کرتے رہتے تھے جن کو کتوں نے نچوڑ ڈالا تھا۔[28]

ظاہر ہے کہ ان زمانوں میں قحط کی حالت اس لیے پیدا ہوتی تھی کہ قحط زدہ علاقوں میں کھانے کا سامان نہیں مل پاتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی جو مصائب نازل ہو جاتے ان سے یہ نتیجہ نکالنا چاہیے کہ ملک میں غذا کی کمی تھی۔ 1630ء اور 1647ء کے بھیانک قحطوں کے زمانہ میں بھی ملک کے دوسرے حصوں میں کافی سامان تھا۔[29] لیکن متاثر علاقوں کو سہولت اس لیے نہیں پہنچائی جا سکتی تھی کہ اس زمانہ میں حمل ونقل کا واحد ذریعہ بار برداری والے جانور تھے جن کو ایک جگہ سے دوسری جگہ دور تک کثیر مقدار میں چارہ اور پانی کے بغیر نہیں لے جایا جا سکتا تھا جن کا خرچ اس قدر زیادہ تھا کہ کوئی کر نہیں سکتا تھا قحط کی ہولناکیوں کو کم کرنے میں جو چیز سدراہ تھی وہ سستی اور تیز رفتار رسل ورسائل کے ذرائع کی کمی تھی نہ کہ ملک کے اندر غلّے کی کمی۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے قحطوں کی ہولناکیاں بہرحال اس سے بنیادی طور پر مختلف تھیں جو 1860ء کے بعد آئے کیونکہ ان کی وجہ یہ تھی کہ عام زمانوں میں غلّہ اس کثرت سے باہر بھیج دیا جاتا تھا کہ جب بارش کم ہوتی تھی تو غلّے کی غیر معمولی کمی اور گرانی سے تباہی پیدا ہوتی تھی موخر الذکر حالت میں غلّے کی کمی اصل وجہ تھی نہ کہ نقل وحمل کے ذرائع۔

سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں معمول کے زمانوں میں غلّہ ملک کی ضروریات کے لیے کافی تھا یہ ان حالات سے جو انیسویں صدی کے آخر میں پیش آئے بالکل برعکس ہے جب کہ بہتر بن اسناد کے مطابق ہندوستان کی چالیس ملین آبادی کا $\frac{1}{5}$ کمی غذا پر اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔[30] سر چارلس ایلیٹ انیسویں صدی کے آخر نصف کا حال بیان کرتے ہوئے تسلیم کرتا ہے کہ مجھے اس بات کے کہنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں ہے کہ ہماری زرعی آبادی کا نصف حصّہ ایک سال کے آخر سے دوسرے سال کے آخر تک یہ جانتا ہی نہیں کہ شکم سیر ہو کر کھانا کسے کہتے ہیں۔[31] " اس طرح باوجود بار بار اور ہولناک قحطوں کے آنے کے ماقبل برطانوی راج کے دور میں زرعی آبادی کی حالت بہ نسبت انیسویں صدی کے عموماً زیادہ بہتر تھی۔

قیمتیں اور مزدوریاں

چونکہ رسل ورسائل اور نقل وحمل کے ذرائع ناکافی تھے نیز غلّہ اور دوسری زرعی پیداوار میں

تجارت محدود تھی اس لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ قیمتوں میں بڑا تفاوت تھا عام طور پر بیان کیا جائے تو غلہ بنگال میں شمالی ہندوستان سے زیادہ سستا اور شمالی ہندوستان میں گجرات سے سستا تھا لیکن ان علاقائی اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ برطانوی حکومت سے قبل موجودہ زمانہ کے مقابلہ میں اناج بہت سستا تھا۔ مثال کے طور پر گیہوں شمالی ہندوستان میں 1600ء میں ایک روپیہ میں 90 سیر 1650ء میں 107 سیر اور 1729ء میں (بنگال کے اندر) 131 سیر۔ جوار 1600ء میں 108.5 سیر فی روپیہ اور 1650ء میں 128 سیر باجرہ 1600ء میں 181 سیر فی روپیہ اور 1650ء میں 214 سیر چنا 1600ء میں 130 سیر 1650ء میں 160 سیر اور 1729ء میں (بنگال کے اندر) 171 سیر۔ اناج میں چاول سب سے زیادہ گراں تھا لیکن پھر بھی 1600ء میں ایک روپیہ میں 54 سیر 1650ء میں 64 سیر اور 1729ء میں (بنگال کے اندر) 135 سیر فی روپیہ بکتا تھا حتیٰ کہ 1887 کے ایسے بعد کے زمانہ میں شمالی بنگال میں ایک روپیہ کا 120 سیر چاول کا نرخ بیان کیا گیا ہے۔

روزمرہ کے کھانے کی چیزوں میں گھی تیل چینی اور نمک کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ گھی 1600ء میں شمالی ہندوستان کے اندر 10.3 سیر فی روپیہ 1661ء میں 7 سیر اور 8.75 سیر فی روپیہ اور 1729ء میں 9.6 سیر تھا، تیل 1600ء میں فی روپیہ 13.5 سیر 1661ء میں 20 سے 25 سیر تک اور 1729ء میں 21 سیر فی روپیہ کے حساب سے بکتا تھا 1600ء میں چینی کا نرخ فی روپیہ 19.3 سیر اور 1661ء میں 14 سیر فی روپیہ تھا۔ نمک 1600ء میں فی روپیہ 67 سیر ملتا تھا۔

ہندوستان میں چیزوں کے دام دو طرح سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے تھے ایک تو علاقے علاقے کا فرق تھا دوسرے موسم موسم پہلی بات تو اس وجہ سے تھی کہ بھاری زرعی پیداوار کا ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا مشکل بھی تھا اور اس پر خرچ بھی بہت پڑتا تھا جب تک ریلوے کی تعمیر نہیں ہوئی تھی یہ ایک عام صورت حال تھی کہ قحط کے زمانوں میں گیہوں ایک روپیہ میں 3 یا 4 سیر اور دوسری جگہ جو سو میل سے زیادہ دوری انہیں ایک روپیہ میں 30 سے 40 سیر تک بکتا تھا۔ مغلوں نے ملک کو سیاسی وحدت عطا کی لیکن اس وسیع برّاعظم کے مختلف حصوں کو ملک کی پیداوار کے لیے ایک ایسے مشترکہ بازار میں تبدیل کر دینے میں ناکام رہی جہاں قیمتوں کی سطح برابر ہوتی اور پورے ملک میں دام قائم کرنے میں یکساں مقابلہ ہوتا۔ یہ بات تو انگریزوں کے حصہ میں آئی کہ انہوں

نے ملک کے مختلف حصّوں میں ایک اقتصادی اتحاد پیدا کیا جو ایک ایسے بڑے ملک کے بسنے والوں میں قومی اتحاد پیدا کرنے اور اس اتحاد کی بیداری لانے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ ایک ترقی یافتہ بازار اور غلّہ کی تجارت کی عدم موجودگی میں یہ بالکل فطری تھا کہ ہر علاقہ اور ہر گاؤں غلّہ کی سپلائی کے معاملہ میں بس اپنے ہی تک محدود رہے۔ یہی حالت درحقیقت ہندوستان کی تھی لیکن اس حالت کے اندر رہی اس کے مضرات پنہاں تھے اور وہ اس طرح کہ جب غلّہ بہت کافی پیدا ہوتا تھا تو کسان اپنا غلّہ بیچ نہیں سکتا تھا اور وہ مجبور تھا کہ یا تو وہ ذخیرہ جمع کرے یا سستے داموں بیچے دوسری طرف جب بارش کم ہوئی اور فصل خراب ہوگئی تو وہ اسٹاک میں دوسری جگہوں سے خرید کر اضافہ کر ہی نہیں سکتا تھا سوائے اس کے کہ وہ تباہ کن قیمتیں ادا کرے۔ ایک ہی حلقہ کے اندر قیمتوں میں اختلاف سال بہ سال واقعی بہت زیادہ تھا۔ مثلاً مرشد آباد میں گیہوں ایک روپیہ کا 20 سیر 1712ء میں تھا اور 1729ء میں تین من تیس سیر، جَو 1712ء میں 27 سیر فی روپیہ اور 1729ء میں 8 من فی روپیہ تھا۔ چاول 1712ء میں 10 سیر فی روپیہ اور 1729ء میں موٹا چاول 4 من 15 سیر تھا۔

مزدور کے لیے نرخ کی سطح بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ہندوستان کے اندر سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں مزدور کی اجرت کا سوال صرف شہروں تک محدود تھا دیہاتوں میں تو ادنا خدمتگار زرعی مزدور اور کاری گر سب کو ان کی اجرت صرف اس شکل میں دی جاتی تھی کہ فارم کی پیداوار میں اُن کا ایک حصہ مقرر ہوتا تھا۔ سکّے میں مزدوری تو صرف شہروں میں معمولی اور اہل فن دونوں طرح کے مزدوروں کو اور گورنمنٹ ملازمین کے نچلے طبقے کو دی جاتی تھی۔

اکبر کے زمانہ میں غلاموں اور نیچے درجہ کے مزدوروں مثل بانس کاٹنے والوں، اینٹ پاتھنے والوں آرہ چلانے والوں، وارنش کرنے والوں، بہشتیوں، اصطبل کے قلیوں اور غیر ہنرمند مزدوروں کو تمام دن کام کرنے کے لیے 3 سے 4 پیسہ یومیہ مزدوری دی جاتی تھی البتہ اہل فن کاریگروں، کھتونیوں، اور چونے کا کام کرنے والوں کو 4 سے ½ 10 پیسہ تک ملتی تھی[32]۔ جہانگیر کے زمانہ کی رپورٹ یہ ہے کہ غیر ہنرمند مزدور کو 5 سے 6 پیسہ تک اور ہنرمند کاریگر کو اس کی دُگنی رقم مقرر تھی۔

اٹھارھویں صدی کے وسط میں کلکتہ میں مزدوری کا جو رواج تھا وہ معمولی مزدور کو 6 پیسہ اور ہنرمند مزدور کو دس پیسہ تھا یعنی عملاً وہی جو جہانگیر کے زمانہ میں تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مغل حکومت کے دوران سب سے زیادہ مزدوری جہانگیر کے عہد حکومت میں دی جاتی تھی۔

اگر موجودہ زمانہ سے مقابلہ کیا جائے تو جو مزدوری جہانگیر کے زمانہ میں دی جاتی تھی وہ بہت کم

معلوم ہوگی لیکن اس کا بہر حال مطلب یہ نہیں ہے کہ جہانگیر کے زمانہ کا مزدور برطانوی حکومت کے زمانہ کے مزدور سے زیادہ غریب تھا۔ ضروری اشیا اور غلّہ کے دام مغلوں کے زمانہ میں اس درجہ سستے ہونے کے پیش نظر وہ اس سے کہیں زیادہ تھی جو اس کے دو سو سال بعد ان کے جانشینوں کو ملی۔ زرعی مزدوروں کا حال یہ تھا کہ سوائے کم پیداوار کے زمانہ کے مغلوں کے زمانہ میں اس کے پاس کھانے کو اس سے کہیں زیادہ ہوتا تھا جو انگریز راج میں رہتا تھا۔

اس طرح شہروں کا ایک معمولی مزدور بھی اپنی روزمرہ مزدوری کے بدلہ میں جو غلّہ پاتا تھا اس کی مقدار انگریز کے زمانہ سے کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ اس طرح اگر جنس میں حساب لگایا جائے تو ایک معمولی مزدور جہانگیر کے زمانہ میں 12.5 سیر جو یا 10.23 سیر جوار یا 16.7 سیر باجرہ ہوگی لیکن انیسویں صدی کے پہلی چوتھائی میں اس کی مزدوری گھٹ کر 2.3 سے 2.9 سیر جو، 2.1 سے 2.6 سیر تک جوار اور 2 سے 2.5 سیر تک باجرہ رہ گئی۔ جہانگیر کے زمانہ میں ایک تندرست مزدور ایک دن کی مزدوری میں 4 سے 5 آدمیوں تک کا بوجھ سنبھال سکتا تھا ڈیڑھ سو سال کے بعد اگرچہ روزمرہ کی مزدوری میں ایک پیسہ یومیہ کا اضافہ ہوگیا لیکن اصل مزدوری اتنی گھٹ گئی تھی کہ خاندان کے سربراہ کی تنہا مزدوری کل خاندان کی پرورش کے لیے ناکافی تھی اور سوائے چھوٹے بچوں اور بہت بوڑھے آدمیوں کے خاندان کے ہر فرد کو روزمرہ کی زندگی گذارنے کے لیے مزدوری کرنا ضروری تھا۔

عوام کی غذا اور معیار زندگی

اس وقت بھی غریب آدمی تھے جیسے کہ آج ہیں اور ان کا معیار زندگی پست تھا لیکن غریب لوگوں کے پاس ضروریات زندگی مغلوں کے زمانہ میں برطانوی راج سے زیادہ تھیں اسی طرح وہ زیادہ طاقتور غذائیں بھی پاتے تھے۔ بدقسمتی سے جس زمانہ میں یورپ کے غریب لوگ اپنا معیار زندگی اپنے ملک میں اقتصادی ترقی کی وجہ سے اونچا کر رہے تھے ہندوستان کے غریب آدمیوں کا معیار حیات ملک میں اقتصادی زوال کی وجہ سے پست تر ہوگیا تھا۔[33]

ضرورت کی چیزوں میں سب سے زیادہ کمی غذائی چیزوں کی ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سترھویں صدی میں عام باشندے بالعموم گھی استعمال کرتے تھے۔ پیلسرٹ اور ڈی لیٹ کے مطابق عام آدمیوں کے شام کے کھانے میں کھچڑی ہوتی تھی جو وہ گھی یا مکھن سے کھاتے تھے۔ شمالی ہندوستان میں لوگ گیہوں اور باجرہ کی روٹی بھی کھاتے تھے لیکن یہاں بھی دودھ اور گھی زیادہ مقدار میں میسّر تھا بہ نسبت

شمالی بہار اور بنگال کے اور یہ لوگ یہ چیزیں اس سے زیادہ مقدار میں کھاتے ہیں جتنی آج کھاتے ہیں مولینڈ
جو یوں تو اس نظریہ کا مخالف ہے کہ سترھویں صدی میں ہندوستان کے غریب آدمیوں کا معیار حیات
انیسویں صدی کے لوگوں سے بلند تھا بہرحال یہ تسلیم کرتا ہے کہ روغن یعنی مکھن اور گھی اور وہ بیج جس سے
بناسپتی تیل نکالا جاتا تھا غلے کے دیکھنے کے مقابلے میں زیادہ سستے تھے اس لیے اس پہلو سے نیچے کے
درجہ کے لوگ اشیا استعمال کرنے والوں کی حیثیت سے بہتر حالت میں تھے اگرچہ اشیا پیدا کرنے
والوں کی حیثیت سے ایسے نہیں تھے[34] اجناس کے مختلف اقسام جو یہ باشندے کھاتے تھے وہ اس
بنیاد پر جگہ جگہ مختلف ہوتے تھے اور سال کے ایک حصہ کے مقابلہ میں دوسرے حصے اس بنا پر مختلف
تھے کہ اس موسم میں کونسی فصل کٹتی ہے اس لیے شمالی ہندوستان میں لوگ مکئی باجرہ اور چنا جاڑے میں کھاتے
تھے لیکن موسم بہار اور گرمیوں میں وہ گیہوں کی روٹی استعمال کرتے تھے۔

ٹری کے قول کے مطابق ہندوستان کا گیہوں یورپ کے گیہوں کے مقابلے میں بہت عمدہ ہوتا تھا
"لوگ اس سے ایسی خوش ذائقہ روٹی تیار کرتے ہیں جو میرے بیان کے باہر ہے ایسی جیسی کسی نے "لی مینچ"
کے بارے میں کہا تھا کہ ظاہر بھی چمکدار باطن بھی خوشنما۔ لاہور کے بازاروں میں تین قسم کی روٹیاں ملتی تھیں
چپاتی۔ کلچہ اور روغنی۔ جس طرح چاول کھانے والے لوگ کھچڑی گھی سے کھاتے تھے اسی طرح شمالی ہندوستان
کے لوگوں کے پاس بڑی کثیر مقدار میں دوسری اچھی چیزیں جیسے مکھن اور پنیر؛ اس وجہ سے رہتے تھے کہ ان
کے پاس کثیر تعداد میں جانور بھیڑیں اور بکریاں ہوتی تھیں[35]"۔ اجناس اور گھی دونوں معاملوں میں کیا بہ لحاظ
مقدار اور کیا بہ لحاظ عمدگی۔ اس میں شک نہیں کہ سترھویں صدی کے عوام انیسویں صدی کے عوام سے کہیں
بہتر حالت میں تھے۔

ضروریات زندگی کے استعمال کی دو اور چیزوں یعنی شکر اور نمک کے بارے میں کسی قطعی نتیجہ تک
لے جانے والی کوئی شہادت دستیاب نہیں ہے[36] مورلینڈ کے قول کے مطابق سفید چینی، مغلوں کے زمانہ میں
تعیش کی چیز تھی جس تک عام آدمی کی رسائی نہیں ہو سکتی تھی اور نمک کی قیمت کا اندازہ جنس کو حساب
میں رکھ کر کیا جائے تو اس کا نرخ آج سے دگنا تھا[37]۔ لیکن ان اشیا کے استعمال کے بارے میں ان کی
قیمتوں سے اندازہ لگانا غلط ہوگا کیونکہ مورلینڈ کی رائے کے خلاف اِٹری کی شہادت موجود ہے جو بیان کرتا
ہے کہ ہندوستان میں نمک کا ایک بڑا ذخیرہ تھا اور چینی وافر تیار ہوتی تھی ہو سکتا ہے کہ سفید چینی گراں رہی ہو
اس لیے غربا اسے روزمرہ کی ضرورت کے لیے استعمال نہ کر سکے ہوں لیکن گڑ اور پیلی شکر غریبوں کے گھروں میں
بھی کثرت سے استعمال میں رہتی تھی اور عام مغلوں کے زمانہ میں عام آدمی کے پاس غالباً آج سے کم یہ چیزیں نہ ہوتی

ستیں (جہاں تک نمک کا سوال ہے مورلینڈ کی بات زیادہ تر دکن کے بارے میں زیادہ مضبوط ہے مثلاً ڈاکٹر فرائڈ کہتا ہے کہ ...

دکن میں نمک ملک سے بالائی حصوں کے اندر اتنا قیمتی ہے کہ نمک کو روٹی پر ترجیح دینے کی مثل بن گئی ہے مثلاً یہاں کہتے ہیں کہ "کس کا نمک وہ لوگ کھاتے ہیں جیسے ہم لوگ کہتے ہیں کہ کس کی روٹی"۔[38]

اس طرح یورپ کے سیاحوں اور دوسروں نے سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں ہندوستان کے عوام کی غریبی کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کی بنیاد زیادہ تر کپڑے کی کمی بہت خراب رہائشی مکانات حقیر قسم کے برتنوں اور فرنیچر کے نہ ہونے پر ہے نہ کہ طاقت ور غذاؤں کے معقول مقدار کی کمی۔ "اینج" کہتا ہے کہ شمالی ہندوستان میں "لوگ زیادہ تر ننگے پھرتے ہیں سوائے اس کے کہ ایک چٹ اپنے جسم کے آدھے پر باندھ لیتے ہیں۔ سردیوں میں لوگ روئی بھرے لبادے پہنتے ہیں اور ایک روئی دار کنٹوپ سر پر اوڑھتے ہیں جس سے کان بھی ڈھکا رہتا ہے اور ایک ذرا شگاف باہر دیکھنے کے لیے ہوتا ہے"۔[39] پندرھویں صدی میں "نکیتن"[40] نے دکن کے تمام ہندوؤں کو "بدن سے ننگا اور ننگے پیر پایا۔" 'باربوسا' کے قول کے مطابق یہ لوگ "کمر سے اوپر بالکل ننگے رہتے تھے" اور "سروں پر چھوٹی چھوٹی پگڑی" باندھتے تھے۔ گجرات کے ہندوؤں کے بارے میں وہ لکھتا ہے "کچھ لوگ ان میں ننگے رہتے ہیں اور دوسرے لوگ صرف اپنے اعضاء مخصوص کو ڈھانکتے ہیں" اور وجیانگر کے لوگوں کا حال یہ ہے کہ عام آدمی ننگے ہی رہتے ہیں سوائے چند لوگوں کے جو اپنی کمر سے ایک چٹ باندھ لیتے ہیں"۔

رہائشی مکانات اور فرنیچر کے بارے میں بھی اسی طرح کی تصویر ابھرتی ہے۔ "پلسارٹ"[41] کہتا ہے "ان کے مکانات مٹی کے بنے ہوتے ہیں جن پر چھپر کا چھاجن ہوتا ہے۔ فرنیچر یا تو ہے ہی نہیں یا بہت ہی کم ہے۔ یعنی کچھ گھڑے پانی رکھنے کے لیے کچھ مٹی کے برتن کھانا پکانے کے لیے اور دو چار پائیاں کیونکہ یہاں میاں اور بی بی ایک چارپائی پر نہیں سوتے ہیں۔ ان کے پلنگ کی چادریں بہت کم ہیں یعنی صرف ایک یا دو ٹکڑے جو بچھانے کا بھی کام دیں اور اوڑھنے کا بھی"۔ 'مینرک' بنگال کے بارے میں لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ "لوگ عام طور پر جھونپڑیوں میں رہتے ہیں جو کیچڑ اور مٹی کی بنی ہوئی ہوتی ہیں اور ان پر چھاجن پھوس یا گھاس کا ہوتا ہے وہ اپنے مکانات بہت صاف ستھرے رکھتے ہیں اکثر ان پر مسلسل گائے کے گوبر میں مٹی ملا کر اس سے لیپتے رہتے ہیں اور وہ جگہ جہاں وہ کھانا کھاتے ہیں وہ تو روز ہی لیپا جاتا ہے بعض لوگ ہر کھانے کے پہلے لیپتے ہیں۔ ڈاکٹر فرائر کرناٹک اور مالابار کے غریبوں کے مکانات کے بارے میں کہتا ہے کہ "وہ چھوٹے چھوٹے تنگ و تاریک گھر یا سور بارے ہیں ان میں سے بہترین بھی اس قابل نہیں ہیں ان کو مکان کا نام بھی دیا جاسکے۔

حتیٰ کہ دارالسلطنت شہر آگرہ میں بھی جاڑ دین کو یہ ملا کہ "شہر کے زیادہ تر حصّہ میں مکانات چھپّر کے ہیں جو ایک سال میں ایک یا دو مرتبہ جل کر راکھ ہو جاتے ہیں"۔ اس کے بعد فرنیچر کے بارے میں ڈی لائٹ کی شہادت ہے کہ فرنیچر بہت کم رہتا ہے جس میں چند مٹی کے برتن چارپائی او پیڑھے اور بہت معمولی بچھونے شامل ہیں[43] "لنسن کوٹن" مغربی ساحل کے بارے میں لکھتے ہوئے اسی طرح کہتا ہے کہ "لوگوں کے گھروں کا سامان پھوس کی چٹائیاں ہوتی ہیں انہیں پر بیٹھنا انہیں پر لیٹنا اور انہی پر کھانا میز اور میزپوش اور چھوٹے رومال سب تاڑ کے درخت کی پتّیاں ہی پتّیاں[44]"۔

اگرچہ ان بیانات کی صحت کے بارے میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں کیا جاسکتا لیکن ان کیوں کی بنا پر جو نتیجہ عام طور پر مصیبت زدگی کا نکالا جاتا ہے اس میں دو اہم پہلوؤں سے ترمیم کی ضرورت ہے اول تو یہ سب باہر کے مصنّفین کے بیانات ہیں جن کے اپنے ملک میں عام آدمیوں کا طرز رہائش اور طرز لباس ہندوستان سے قطعی مختلف تھا اس لیے قدرتی بات تھی کہ وہ ہندوستان کے لوگوں کی سادہ طریقہ پر رہنے سہنے اور بہت کم لباس پہننے پر تنقید کریں دوسرے رسم و رواج اور روایات سے الگ ہر ملک میں طرز لباس اور مکانات بنانے کے طور طریق اس کی آب و ہوا پر منحصر ہوتے ہیں[45]۔ ہندوستان کی آب و ہوا بہت ہے یورپی ممالک کے مقابلے میں گرم ہے اور کم لباس کا پہننا خاص کر گرمیوں کے زمانے میں موسم کے تقاضے سے ہے جس طرز کی شدید سردی یورپ سے محسوس کی جاتی ہے وہ بجز انتہائی شمال کے علاقوں کے ہندوستان میں ناپید ہے اس لیے سال کے زیادہ حصّہ میں لوگوں کو کپڑے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ اپنی عریانیت کو چھپالیں اور دیہاتوں میں آج بھی لوگوں کے لباس کا طرز اور رہنے کا طریقہ کل ملک میں بالکل وہی ہے جو سترھویں صدی میں تھا۔ ان کے جسم پر کم لباس کا ہونا اور ان کے مکانات کا مٹی کا ہونا بہت زیادہ غریبی کو ثابت نہیں کرتا بلکہ یہ طرز زندگی کو نمایاں کرتا ہے جو ہندوستان میں صدیوں سے چلا آرہا ہے جو تاریخ کے اوراق پر ثبت ہے اور جو اب بھی جاری و ساری ہے۔

اس لیے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جہاں تک غریب عوام کا سوال ہے ان کی ضروریات بہت مختصر تھیں اور وہ سب ملک کے اندر کی پیداوار سے معقول طور پر پوری ہو جاتی تھیں کوئی عام بھکمری یا ناکافی غذائیت بجز ایام قحط کے نہیں تھی۔ ان کے پاس معمول کے سالوں میں بھی اتنی بچت نہیں ہوتی تھی کہ وہ جمع کریں اور قحط کے ایسے مصائب کے لیے بچا کر رکھ لیں۔ ان کے کپڑے کم اور ان کے مکانات غریبانہ تھے لیکن ان امور کے بارے میں غالباً ان کو اس سے زیادہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی اور انھوں نے کبھی بھی اپنی حالت میں ترقی دینے کی کوشش نہیں کی۔ زندگی سادہ اور قناعت پر مبنی تھی اور چند ضروریات جو ان کی تھیں وہ آسانی سے پوری ہو جاتی

تھیں۔ اس لیے متنازعہ طبقا کا جو مسئلہ آج اتنا سخت ہوگیا ہے اس وقت نہ تھا۔ اس سادگی اور قناعت کے فوائد تھے لیکن ان میں ایک خرابی بھی تھی ہندوستان کے آدمی کے اندر ترقی کا وہ تقاضہ بیدار نہیں ہوتا تھا جو سولھویں صدی اور اس کے بعد کی صدیوں میں اس کے ہم عصر مغربی ممالک میں تھا اور اس نے اقتصادی ترقی کے لیے وہ جدّوجہد نہیں کی جو یورپ کے لوگوں نے کی۔

واقعات جو ہندوستان کی اقتصادی ترقّی میں حائل ہوئے

اعلا طبقہ کے لوگ جس طرح کی چیزیں استعمال کرتے تھے ان کا تجزیہ کرنے سے ایک اور حقیقت سامنے آتی ہے جس نے اقتصادی میدان میں ملک کی ترقی میں رکاوٹ ڈالی۔ قرونِ وسطیٰ کے راجگان امرا اور صوبوں کے حکام بڑی شان و شوکت سے رہتے تھے اور خوب تعیش کی زندگی گذارتے تھے۔ اس کا نمونہ بادشاہ فراہم کرتے تھے اور ان کے طریقۂ رہائش اور طرز زندگی کی امرا اور درباری اس حد تک تقلید کرتے تھے جہاں تک ان کے وسائل اجازت دیتے تھے نفیس غذاؤں مثلاً بیرون ملک سے درآمد کیے ہوئے پھلوں پر کثیر رقوم خرچ کی جاتی تھیں۔ اسی طرح نوکروں، مصاحبوں، مکانوں، ہاتھیوں، شادیوں اور جہیزوں اور قلعہ کے مانند مکانات بنانے پر روپیہ صرف کیا جاتا تھا آمدنی کا بڑا حصّہ زیورات اور قیمتی لباسوں پر خرچ کر دیا جاتا تھا۔ ہاتھیوں اور گھوڑوں پر خرچ زیورات کے بعد ہی دوسرے نمبر پر تھا۔ ہر امیر اپنے اصطبل اور گھر کے لیے سیکڑوں کی تعداد میں نوکر رکھتا تھا۔ ایک بڑی رقم تحائف پیش کرنے میں خرچ کر دی جاتی تھی سربرآوردگان بادشاہ کو تحائف پیش کرتے تھے اور اس کے بدلے میں جو ان کے نیچے ہوتے وہ ان کو تحفے دیتے تھے اور اسی طرح بالترتیب یہ سلسلہ جاری رہتا۔ ڈیسی لائٹ کے مطابق مغل دربار کی تعیش پسندی بس ناقابل بیان تھی کیونکہ زندگی میں ان کا ایک ہی مقصد تھا وہ یہ کہ ہر قسم کے عیش کو انتہا درجہ حاصل کرلیں۔ سرٹامس او اسی طرح مغل امرا کی حالت بیان کرتے ہوئے "انتہائی بدترین قسم کی عیش پرستی اور دولت کا بلا امتیاز استعمال ظاہر کرتا ہے۔" بہت سے وجوہات میں سے ایک وجہ اس اسراف بیجا کی یہ تھی کہ ہر امیر الامرا کے مرنے کے بعد اس کی کل دولت بادشاہ کے خزانے میں داخل ہو جاتی تھی اس لیے ہر امیر کے دل میں یہ تقاضا ہوتا تھا کہ جو کچھ بھی وہ زندگی بھر میں کمائے وہ کل خرچ کر ڈالے اسی کے ساتھ غیر معین اوقات میں غیر معین مقدار میں آمدنی کا یہ نتیجہ تھا کہ یہ لوگ اپنی آمدنی سے زاید اپنی طرز زندگی پر خرچ کرنے کے عادی ہو گئے تھے اس معاملہ میں لوگ اپنے یورپ کے ہم عصروں سے زیادہ مختلف تھے جو ازمنۂ وسطیٰ میں اس کی شہرت رکھتے تھے کہ وہ مصاحبوں کی فوج رکھتے تھے اور بڑے اسراف بیجا کی زندگی گذارتے تھے۔ جہاں تک ہندوستان کے امرا کا معاملہ ہے ان پر اس فرض کا بھی اضافہ تھا کہ بہت سے مواقع پر وہ بادشاہ کو بیش بہا تحائف دیں۔ تحائف

دینے کے اس رواج میں اتنی کثیر رقم صرف ہوتی تھی کہ برنیئر[25] کا خیال ہے کہ یہی وہ وجہ تھی جس کی بنا پر یہ لوگ مقروض رہتے تھے۔ان حالات میں سرمایہ کا جمع ہونا آسان نہ تھا اور نہ اس کا کوئی کافی موقع حاصل تھا کہ بچت کو منافع بخش کاموں میں لگایا جائے۔ کچھ امراء ضرور کفایت شعاری کی زندگی گذارتے تھے اور بڑی بڑی دولت جمع کر لیتے تھے لیکن آخر کار اس کو شادیوں جہیزوں اور تعمیرات پر خرچ کر دیتے تھے بجائے اس کے کہ رقم کاروبار یا صنعت میں لگائیں۔

صرف ایک طبقہ تھا جو دولت جمع کرتا تھا اور وہ تھے تاجر اور ان میں صرف چند بڑے خاندان تھے۔اس طبقہ کے بقیہ لوگوں کے پاس اتنا بڑا سرمایہ نہ تھا کہ جسے وہ تجارت یا صنعت میں لگا سکیں۔بنکوں میں روپیہ جمع کرنے کے نظام نے ابھی نشوونما نہیں پایا تھا۔اس طرح ہندوستان سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے نصف تک اقتصادی ترقی کے لیے دو بڑے عناصر سے محروم تھا یعنی ایک تو عوام کی طرف سے ان کے اندر کا تقاضا کہ وہ اقتصادی ترقی کریں اور دوسرے دولت مند اور متوسط طبقہ کی طرف سے صنعت اور تجارت اور زراعت کی ترقی کے لیے سرمایہ کا جمع کرنا۔

اس لیے ترقی پسند یورپ کا جب جامد مشرق سے ٹکراؤ ہوتو اس کے آخری نتیجہ کی بابت کسی کو کوئی شبہ نہیں ہو سکتا تھا ایک پھٹنے والا مادہ اور ترقی پسند تھا۔اور دوسرا جامد اور دقیانوسی۔اس لیے ہندوستان کے ازمنہ وسطیٰ کی سوسائٹی اس جمود کی حالت میں عرصہ تک نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ اس نے تو زوال کے نشانات ظاہر کرنے شروع کر دیے تھے بیرونی حکومت کے قیام نے اس زوال کی رفتار کو تیز کر دیا اور ایک جدید معاشرے کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔

حوالہ جات

1۔ ہیملٹن پرابلمس آف دی مڈل ایسٹ (لندن) 1909ء صفحہ 62۔

2۔ برنیئر۔ایف۔ٹریولز ان دی مغل امپائر (کانسٹیبل ایڈیشن) وی۔اے۔اسمتھ کا نظرثانی کردہ) آکسفورڈ 1934ء صفحہ 59-258۔

3۔ مورلینڈ۔ڈبلو۔ایچ۔انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر صفحہ 56-155۔

4۔ دی ہسٹری آف ایف۔بائی راکرڈ آف لیول آف دی ایسٹ انڈیا جلد دوم حصہ اول (رائل ایشیاٹک سوسائٹی) صفحہ 47-243۔

5۔ بالکرشن کمرشل ریلیشنس بٹوین انگلینڈ اینڈ انڈیا (1600ء - 1757ء) صفحہ 81-279۔

6- پارکنسن ٹریڈ آف ایسٹرن صفحہ 58

7- مکرجی اکنامک ہسٹری صفحہ 124۔

8- بالکرشن کمرشیل ریلیشنس اوپی سٹ صفحہ 308 ۔

9- واخلہ برج موہن انڈین اکنامکس وانفلا لاہور 1929ء صفحہ 57-56۔

10- ایضاً صفحہ 57

11- ایضاً۔

12- بالکرشن کمرشیل ریلیشنس اوپی سٹ صفحہ 208 ۔

13- یہ شکایت کہ ہندوستان دنیا کے سونے کی سپلائی کو جمع کرتا ہے اتنا ہی پرانی ہے جیسا کہ "پلنی" (ہندوستان نیچورلسٹ جلد 6 صفحہ 26) قدیم مسلمان مؤرخین مثل شہاب الدین نے اس کا نوٹس لیا تھا (ایسٹ انڈیا ڈاؤن ہسٹری آف انڈیا جلد 3 صفحہ 563) برنیر شکایت کرتا ہے کہ یہ بات اندازمیں کی جا سکتی ہے کہ سونا اور چاندی دنیا کے تمام حصوں میں حرکت کرنے کے بعد ہندوستان میں آتے ہیں تو وہ ان کو کھا لیتا ہے وہ یہیں غائب ہو جاتے ہیں (ٹریولس اوپی سٹ صفحہ 202) ڈاکٹر پرائز۔

14- واچ آف پریارڈ جلد 2 پارٹ 1 صفحہ 247 -

15- پنڈت مدن موہن مالویہ نے اپنی اختلافی، نوٹ میں جو انھوں نے انڈین انڈسٹریل کمیشن کے رپورٹ پر دیا تھا اس کا حوالہ دیا ہے۔ 16-1918ء

16- مورلینڈ انڈین اکسپورٹ آف کاٹن گڈس ان دی سوئنٹینتھ سنچوری انڈین جرنل آف اکنامکس جلد 4۔

17- تریاترا کاردمنڈل صفحہ 176 بحوالہ برج موہن انڈین اکنامکس لائف صفحہ 55-54 ۔

18- دیکھو برج نراین اوپی سٹ صفحہ 59 ۔

19- ایضاً صفحہ 61-60 ۔

20- فرانسڈ ڈاکٹر جان۔ اے نیو اکاونٹ آف انڈیا اینڈ پرشیا جلد اوّل صفحہ 302۔

21- ایک ڈچ رپورٹ مئی 1618ء میں یہ صاف صاف تحریر ہے کہ بنیے اور کھتری کثیر تعداد میں ساحلی شہروں میں تجارت میں حصہ لینے کے لیے چلے آرہے تھے۔ آگرہ۔ دہلی اور دوسرے مقامات سے۔ پیٹر ولیم سن نے جس نے یہ رپورٹ لکھی ہے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر پرتگالیوں کو بھگا دیا جائے تو بنیے جو عظیم اور طاقت ور ہیں وہ ڈچ کو کثیر مقدار میں نیل فراہم کر دیں گے۔"

22- گیڈگل ڈی۔ آر۔ آریجن آف دی ماڈرن انڈین بزنس کلاس صفحہ 1 ۔

23- ڈان ایس۔ سی۔ بلز نو ی فرینچ مین ان بنگال صفحہ 84 ۔

24- ڈام۔ کے۔ ایل۔ رپورٹ آن دی رائز آف پرائز (1914ء) صفحہ 70-69۔

25- ملاحظہ ہو سیول اے فارگاٹن امپائر صفحہ 386

25- ضلع آگرہ میں اورنگ زیب کے عہد میں بائن کے مقام پر سفید چینی تیار ہوتی جالون کے قریب کالپی کی مشہور قند کا ذکر ہے۔ بوچانن دکن میں شکر تیار کیے جانے کا ذکر کرتا ہے۔

26- ایف۔ سی۔ اے فیبین رپورٹ آف میسور P-8، ایٹ ریمارکس (صفحہ 8) ۔ گذشتہ زمانوں میں قحط کا مقابلہ اسی طرح کیا جاتا ہے کہ ایک جنس بنام ارگی (باجری) زمین کے اندر کے تہ خانوں میں رکھی جاتی تھی اور کمی کے زمانہ میں نکالی جاتی تھی کیونکہ یہ جنس 40-50 سال تک ٹھیک ٹھاک رہتی تھی۔

27- راس۔ ڈی لینڈ آف فائیو ریورس اینڈ سندھ صفحہ 118۔ راس کہتا ہے کہ ان زمانوں میں جب غلہ کی مانگ نہیں ہوتی ہے تو یہ دس فیٹ گہرے غاروں میں زمین کے اندر رکھ کر اوپر سے مٹی کا پلاسٹر کر دیا جاتا ہے غلہ اس طرح بیس سال تک رکھا جاسکتا ہے جب یہ کھولا جاتا ہے اور اسے ہوا لگتی ہے تو دیکھا جاتا ہے کہ یہ بالکل ٹھیک اور کھانے کے قابل ہے۔

28- دیکھیے مورلینڈ فرام اکبر ٹو اورنگ زیب صفحہ 212 ۔

29- ایضاً صفحہ 210۔

30- ہنٹر انگلینڈس ورک ان انڈیا پرنٹیڈ ان دی انڈیا آف دی کونسل۔ 1888ء میں لارڈ ڈفرن نے ایک مکمل تحقیقات کا حکم دیا۔ اس تحقیقات کی رپورٹ جو شائع نہیں ہوئی 900 چھپے ہوئے صفحات پر مشتمل ہے اور ان سے عام طور پر اس رائے کی تصدیق ہوتی ہے جو ہنٹر اور ایلیٹ نے ظاہر کی ہیں (قیمتیں پروسیڈنگ آف دی گورنمنٹ آف انڈیا دسمبر 1888ء نمبر [39] ۔

31- ملاحظہ ہو مدراس کرشچین کالج میگزین اکتوبر 1887ء صفحہ 251 کوٹڈ ان مدراس بورڈ آف ریونیو پروسیڈنگز نمبر 184۔ 27 اپریل 1888ء

32- اکبر کے زمانہ میں ایک روپیہ۔ برابر تھا 80-90 پیسے کے جہانگیر کے زمانہ میں ایک روپیہ 45-59 پیسے کے برابر تھا۔

33- آدم اسمتھ دلیل دیتا ہے مزدور کی اجرت بڑھتی ہے یا قائم رہتی ہے گھٹتی ہے اسی اعتبار سے جس اعتبار سے کہ قومی آمدنی گھٹتی قائم رہتی ہے اٹھارھویں اور انیسویں صدی ہندوستان میں زوال کے عہد میں اس لیے یہ قدرتی بات ہے کہ اس زمانہ میں مزدوروں کو اپنے معیار حیات میں زوال سے دوچار ہونا پڑا۔ (ولتھ آف نیشنس بک نمبر 1 باب 8 ڈان 8 بمبرری ایڈیشن صفحہ 69-73)

34- این اکاونٹ آف دی لائف ایٹ آگرہ (1626ء) جس کا مورلینڈ فرام اکبر ٹو اورنگ زیب میں حوالہ دیا ہے صفحہ 199 ۔

35- فرائمجان۔ اے نیو اکاؤنٹ آف ایسٹ انڈیا اینڈ پرشیا جلد اوّل (ایڈیٹ بائی ولیم کروکس لندن 1909 صفحہ 345 ۔

36- بکر جی اکنامکس ہسٹری اوپی سسٹم صفحہ 60 ۔

37- ملاحظہ ہو موریلینڈ انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر۔

38- ایضاً۔

39- ایضاً۔

40- ملاحظہ ہو میکلین فرام اکبر ٹو اورنگ زیب صفحہ 199۔

41- ٹی سوورس آف بیشنس مارکوس 1623-24 جلد اوّل صفحہ 64۔

42- ایضاً۔

43- ایضاً۔ لباس کا تحفظ جو ایک ملک میں مزدوری ہے وہ دوسری جگہ مزدوری نہیں بھی ہو سکتا ہے۔

44- اور ہندوستان کا ایک مزدور پوری قوت سے صرف اپنے بدن کو چھپانے بھر کے کپڑے کی مزدوری لے کر کام کر سکتا ہے ایسا کپڑا جو روس میں ایک مزدور کو موت کے چنگل سے نہیں بچا سکتا۔ ٹارلسن۔ این۔ اے آر کا نسا ٹریڈر صفحہ 68

45- برنیر۔ الف، ٹریولس ادبی سٹ پارلی صفحہ 71-265۔

پانچواں باب

کلچرل زندگی — تعلیم فن اور ادب

اٹھارویں صدی کے حالات کا تجزیہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کسان خیالات کے پھیلاؤ کا ذکر نہ کیا جائے جو ان زمانوں میں چالو تھے۔ کس طرح خیالات سیاسی تبدیلیوں کو لاتے ہیں اور کہاں تک خیالات بذات خود زندگی کے مادی حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں یہ ایسے مسائل ہیں جن کو ایک دوسرے سے الگ کرنا دشوار ہے بہرحال یہ تو آسانی سے فرض کیا جا سکتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے ہیں اور یہ بھی بطور حقیقت مانا جا سکتا ہے کہ تاریخ کی سمجھ بوجھ دونوں ہی کے مطالعہ سے نشو و نما پا سکتی ہے

بات یہ ہے کہ ہر ملک کی تاریخ نے ایک مختلف راہ اختیار کی ہے۔ کچھ ممالک ایسے ہیں جو دوسرے ملکوں کے بالمقابل متعدد دوروں میں سیاسی تبدیلیوں کا شکار رہے ہیں اور کچھ دوسرے ملکوں کے معاملہ میں زندگی زیادہ ہموار طریقہ پر چلتی رہی ہے یورپ میں اٹلی مقدم الذکر نمونہ کا ہے اور انگلستان موخرالذکر نمونہ کا۔ ایام قدیم میں اٹلی نے ابھر کر عظمت حاصل کی جو سات سو سال تک قائم رہی۔ اس کے بعد تیزی سے اس میں زوال آیا اور اس کے غیر متمدن اقوام نے فتح کر لیا اور روند ڈالا۔ اس سرزمین پر دوبارہ ایک تہذیب ابھری جو نشاۃ ثانیہ کے دور میں برگ و بار لائی۔ لیکن پھر اسے فرانس کے حملہ آوروں نے آکر اکھاڑ پھینکا۔ اس کے بعد ایک وقفہ گرہن کا سا ہے جس سے اٹلی پھر ابھرا اور میزنی کیوور اور گیری بالڈی جیسے بزرگوں، مدبروں اور سپاہیوں کی کوشش کے نتیجہ میں پھر ارفع مقام حاصل کیا۔

انگلستان کلچر کی یکسانیت کی ایک تابناک مثال پیش کرتا ہے۔ نارمن فتح کے بعد سے اس کا ارتقاء مسلسل بلا کسی بیرونی حملے کی مدافعت کے جاری رہا۔

ہندوستانی فکر اور کلچر

ہندوستان کی تاریخ انگلستان کے بجائے اٹلی کے نمونہ کی پیرو نظر آتی ہے البتہ دونوں میں فرق

اٹلی میں سوسائٹی اور سیاست اور کلچر سب کے سب انقلابی تبدیلیوں میں ملوث رہے ہیں۔ اس کے برعکس ہندوستان میں جو تبدیلیاں آئیں وہ انتہا پسندانہ دتھیں اور انھوں نے صرف حکمرانوں کو متاثر کیا۔

ہندوستان کی فتح نے نظم و نسق میں جو تبدیلیاں پیدا کیں وہ محض سطحی تھیں۔ سوسائٹی کا غیر غیر مبدل رہا سنے مذاہب اور نئی زبانیں، پرانے مذاہب اور مقامی زبانوں میں محض اضافہ تھے ہندو اور مسلم کلچر میں ایک قابل لحاظ یکسانیت قائم رہی ان کے اونچے طبقے کے لوگوں نے اپنی اپنی پرانی روایات کی پیروی کرنا جاری رکھا۔ عقاید۔ طبقہ عبادت، پرسنل لا۔ اور کلاسیکی زبانوں کی استعمال میں۔

لیکن بہر حال یہ عام اظہار خیال ہے جو تفصیل اور ترمیم کا محتاج ہے۔ اوّلاً جسے ہندو مسلم کلچر کہتے ہیں ان میں سے کوئی بھی اپنے طور طریقوں میں گنجلک نہیں تھا یعنی ان دونوں میں سے کوئی بھی ایک ہی طرز کا مکمل اور سادہ اپنی علاحدہ انفرادیت رکھنے والا نہ تھا۔ ہندو سوسائٹی سالم نہ تھی یہ بہت سے مختلف النوع انسانوں کی بھیڑ کا مجموعہ تھی جن کا کلچر ایک دوسرے سے کافی مختلف تھا۔ مختلف علاقوں میں مختلف زبانیں تھیں۔ گذشتہ زمانہ میں جب کہ تعلیم چند اونچی ذات کے ہندوؤں تک محدود تھی اوپر کے درجے کے دس آدمیوں کا کلچر اکثریت کے کلچر سے جن کا ایک بڑا حصہ جہالت، توہم پرستی اور افلاس میں ڈوبا ہوا تھا قطعی مختلف تھا۔ اس کے علاوہ عقائد قوانین حیثیت کی درجہ داری ترتیب پیشہ اور دولت میں اختلافات تھے اور یہ اختلافات متوسط طبقوں اور مذہبوں میں بھی تھے۔ ہندو مذہب اس طرح عقائد اور اعمال کا ایسا چترمالا پیش کرتا تھا جس کے ماننے والے ایک طرف فلسفے کے عظیم حقائق سے ملتے تھے تو دوسری جانب بدترین قسم کی توہم پرستی کے طور طریقوں سے۔

مسلمانوں میں جو اختلافات تھے وہ اتنے تیز اور جامد نہ تھے جتنے کہ ہندوؤں میں تھے۔ مگر ان میں اونچے اور نیچے طبقے یعنی شریف اور اخلاف یعنی رذیل تھے شریف وہ جو حکمران طبقہ تھا اور ماہرین فن سپہ گری اہلِ دانش اور علما پر مشتمل تھا اور دوسرے رذیل کمینے وہ نچلے طبقہ کے لوگ جو ایسے پیشے اختیار کیے ہوئے تھے جو اعلا طبقہ کی شان کے خلاف تھے۔ مسلمانوں کے ہر طبقہ میں مختلف تعداد میں ایسے لوگ تھے جو اپنا مذہب ترک کرکے اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ جن کی عادتیں جن کے رسم و رواج اور جن کا طریقہ رہائش اور جن کے معتقدات تقریباً وہی تھے جو اس گروہ کے تھے جہاں سے وہ آئے تھے۔ مسلمان ملکوں سے جو لوگ تازہ تازہ ہندوستان آتے تھے ان کا اور ایک دو پشت تک ان کے خاندان کا کلچر نئے مسلمانوں اور قدیم خاندانوں سے مختلف ہوتا تھا اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ اورنگ کی موت تک تارکین وطن کے قافلے مسلسل دریا کی موجوں کی طرح چلے آرہے تھے۔ ان لوگوں میں اہل دانش بھی تھے تلوار کے دھنی بھی اور ایران افغانستان اور ماوراء دریائے آکسس (روسی آمو دریا) کے تجار بھی۔ یہ تارکین وطن سلطنت مغلیہ کی شہرت

اور شان وشوکت سے متاثر ہوکر اور یہ سمجھ کر کہ ملازمت اور دولت کمانے کے مواقع فراہم ہیں یہاں آگئے تھے۔
ان لوگوں نے سب کے ایک دوسرے میں جذب ہوجانے اور متحد ہونے کی طاقتوں کو کمزور کیا۔

لیکن پھر بھی صدیوں کے باہمی میل جول کا لازمی نتیجہ جو ہونا تھا وہ ہوکر رہا۔ پندرھویں صدی سے شروع ہوکر ہندو مصلحین مثل کبیر اور نانک نے ہندو اور مسلمانوں کے افتراق کو کم کرکے دونوں میں یکتا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مسلم صوفی اور درویش خاص کر وہ لوگ جو ابن عربی کی تعلیمات کے پیرو تھے ویدانت فلسفہ اور یوگ کے عملی طریقوں سے دلچسپی لینے لگے اور ان سے متاثر ہوئے ہندو اور مسلمان مصنفین نے موجودہ ہندوستانی زبانوں اور ان کے ادب کے نشوونما میں حصہ لیا۔ فن کاروں نے عمارت کی تعمیر مصوری اور موسیقی کے نئے اسلوبوں کو ترقی دیا۔ جن میں اسلامی عناصر کو ہندوستانی اجزا میں تحلیل کیا گیا تھا لیکن اصلاح شدہ مذاہب جو عبادت کی بنیاد پر قائم کیے گئے تھے انھوں نے متوسط طبقہ کو اپنی جانب راغب کیا۔ اگرچہ اونچے اور نچلے طبقوں کے بھی بہت سے لوگ اس کی کشش میں آئے فن اور علم وادب کی سرپرستی بادشاہ، راجگان اور تعلقداران کرتے تھے یہ لوگ اہل دانش سے ہندوستانی تصانیف کا ترجمہ فارسی میں اور فارسی کی تصانیف کا ہندوستانی زبانوں میں کراتے تھے اور ماہرین فن کو جو ان کے درباروں سے متعلق تھے ترغیب دیتے تھے۔ کہ وہ مشترکہ اسلوب میں تعمیرات کے کام کو ابھار دیں۔

ہندو بھگتی کا نقطۂ فکر تمام ہندوستان میں پھیل گیا اور بھگتی کے عقیدے نے اپنے ماورائی الذات اور ذاتی دونوں شکلوں میں عوام کے دماغوں پر قبضہ جمالیا۔ اگرچہ اس کے عقیدت مندوں کی تعداد کا صحیح صحیح پتہ لگانا ناممکن ہے لیکن یہ بات حقیقت سے بہت دور نہ ہوگی اگر کہا جائے کہ سوسائٹی کی متوسط سطح پر جس میں تجار، اہل فن، کاریگر اور کاشت کار شامل ہیں یہ سب سے زیادہ غالب تھی۔

اسی طرح تصوف نے بھی بہت وسعت حاصل کی اور نیچے طبقے کا ہر مسلمان اپنے اوپر یہ لازم سمجھتا تھا کہ وہ تصوف کے کسی ایک طریقہ کو اختیار کرکے ایک پیر کی تلاش کرے تاکہ وہ اس کو تصوف کی راہ میں رہنمائی کا کام کرے۔ تصوف کے بہت سے طریقوں میں چشتیہ جس کے بانی خواجہ معین الدین تھے سب سے زیادہ ہردلعزیز تھا۔ اور اپنے روحانی تصورات اور صوفیانہ طرز عمل میں ہندو فلسفہ بھگتی کے بہت قریب تھا۔ دونوں اپنے عقائد کی بنیاد اس اصول پر رکھتے تھے کہ ایک خدا کا وجود ہے باقی اس عالم کا کوئی وجود نہیں (یعنی عقیدہ ادویتا یا وحدت الوجود) اور دونوں کے ضبط نفس اور تزکیۂ نفس کے طریقۂ عمل ایک ہی طرح کے تھے (یوگ اور 226) دونوں کا نظریہ یہ تھا کہ موسیقی اور مضراب روحانی حالت یعنی استغراق اور فنافی اللہ کے حصول میں مددگار ہوتے ہیں۔ مسلمان اہل دانش اور علمائے شریعت (قانون) اور طریقت

رتصوف اور دونوں کا مطالعہ کرتے تھے اسی طرح ہندو دانشور دھرم شاستر اور دیانت دونوں کا علم حاصل کرتے تھے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے اعلا تعلیم یافتہ لوگوں میں سطحی طور پر تین نقطۂ خیال رکھنے والے لوگ تھے۔ ایک طبقہ تو روایات کی پیروی کرنے والوں کا تھا یعنی قدامت پرست لوگ جو کتب مقدسہ کی تعلیمات کے سختی کے ساتھ لغوی معنی اور بلا حیل و حجت احکام مذہبی کے سامنے جو بذریعۂ الہام آئے ہیں سر تسلیم خم کر پر اصرار کرتے تھے وہ احکام اور مسائل پر عقلی بحث کرنے کی مذمت کرتے تھے اور مطالبہ کرتے تھے کہ جو حکم ہے اس کی مکمل اطاعت کی جائے۔ چونکہ یہ لوگ احکام کے الفاظ کی سختی سے پابندی کرتے تھے اور عقلی دلائل و مباحث کو ناقابل اعتماد مانتے تھے اس لیے ان کا نام علمائے ظاہر پڑ گیا تھا۔ احکام مذہبی کے مطابق جو کتب مقدسہ میں محفوظ تھے عمل کرنے پر اصرار کرنے کی وجہ سے ان کا شمار اس دصف میں ہو سکتا ہے جو لوگ یہ مانتے ہیں کہ عمل ہی حق ہے۔

دوسرے نقطۂ فکر کے ماننے والوں کے گروہ میں وہ لوگ شامل تھے جو ظاہری عبادت کے طریقوں اور بلا سمجھے بوجھے اوامر اور نواہی کے احکام کی تعمیل کرنے پر چیں بجبیں ہوتے تھے ان کے نزدیک مذہب کی روح خدا اور انسان سے محبت حقیقۃ الحقائق اعلا و ارفع ہستی کی عبادت اپنے کو کامل بنانے کی تلاش اپنے نفس پر غلبہ اور نور باطن حاصل کرنے میں ہے ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ عقیدہ حق ہے۔

تیسرا نقطۂ فکر ان لوگوں کا تھا جو ان کے درمیان جو خلیج حائل تھی اس کو پاٹ دینا چاہتے تھے وہ قانون کے مطالبات اور محبت کے تقاضوں میں ہم آہنگی لانے کے خواہاں تھے۔ مذہبی احکام کو عقلی دلائل سے مبنی بر حق قرار دیتے اور اپنے مذہب کے بنیادی اصولوں کو ترک کیے بغیر عدم رواداری کو رد کرتے تھے۔

مغل بادشاہوں میں اکبر دوسرے نقطۂ نظر کا جہانگیر اور شاہ جہاں تیسرے اور اورنگ زیب پہلے نقطۂ نظر کا حامی تھا۔ داراشکوہ جس نے "اوپنشد" کا ترجمہ کیا تھا دوسرے اسکول کا سب سے نمایاں علمبردار تھا۔ شاہ ولی اللہ تیسرے طبقہ کے اور شیخ احمد سرہندی پہلے طبقہ کے اسی طرح ممتاز رہنما تھے۔

داراشکوہ ملا شاہ بدخشانی کا مرید تھا جو مشہور صوفی میاں میر قادری (وفات 1635ء) کے شاگرد تھے جس نقطۂ نظر کی یہ لوگ حمایت کرتے تھے وہ استاذ اعظم ابن عربی (1165ء تا 1246ء) کے تعلیمات کی صدائے بازگشت تھی جنھوں نے اسلامی تصوف پر سب سے بلند و بالا اثر ڈالا ہے مذہبی قوانین کے مطالعہ

میں ابن عربی ظاہرین کے نقطۂ نظر کی پیروی کرتے تھے جو متبع قوانین طبقہ کی کتاب پرستی اور علمائے علم کو ناپسند کرتے تھے اور اظہار عبودیت کے لیے منطقی طریقوں کو ترجیح دیتے تھے۔ احکام کے معاملات میں انھوں نے تقلید کو ماننے سے انکار کر دیا اور انسان کو صراط مستقیم پر ہدایت پانے کے لیے اپنے باطنی نور پر اپنا عقیدہ ثبت کیا۔ وہ خداوند تعالیٰ کی وحدت کے وجوب یعنی وحدت الوجود پر اعتقاد رکھتے تھے یعنی خدا جو ہر قسم کی صفات تخصیص اور تعلق سے مبرّا ہے۔ ان کا یہ پختہ خیال تھا کہ کائنات زمان و مکان اور سبب و مسبب سب مظاہر قدرت سے متعلق ہیں یعنی صرف ایک حقیقتہ الحقائق کے ظہور کا کرشمہ انسان میں حق اور دنیا میں آنے جانے والی ناپائداری دونوں آکر ملتے ہیں اور اس کے اندر الوہیت کا جوہر ہے اور جو متاثر ہونے والی طاقتوں سے چھپا ہوا ہے وہ ہستی برحق کا علم حاصل کرنے کی جدوجہد کرتا ہے ابن عربی وحدت ادیان کے قائل تھے اور ان کا خیال تھا کہ تمام مذاہب کے عقائد نسبتاً صحیح ہیں انھوں نے بتلایا کہ قرآن کی تعلیم ہے کہ "جدھر بھی تم گھومو اور جدھر بھی تمہارا منھ ہے بس وہی اللہ برحق ہے"۔ انھوں نے کہا کہ میرا قلب عبادت کے تمام طریقوں کو قبول کرتا ہے یہ ایک کا میدان ہے یعنی محبت کرنے کے لیے اشیا عیسائی راہبوں کے رہنے کا مکان، بتوں کا مندر، حاجیوں کا کعبہ، یہودی قوانین اور قرآن کے قوانین کا دستاویز ہے۔ میں محبت کے مذہب کا پیرو ہوں محبت کا اونٹ جدھر بھی مجھے لے جائے وہی میرا مذہب ہے اور میرا ایمان محبت ہے[2]۔"

ان کے عقیدہ کے مطابق ایک بزرگ انسان (یعنی ولی) جس نے یہ حسین نظر حاصل کر لی وہ نبی سے افضل ہے۔ اور اللہ کے ایلچی (یعنی رسول) سے بھی افضل ہے کیونکہ ولی الوہیت کی صفات حاصل کر لیتا ہے اور ولایت دائمی اور لا فانی ہے اس لیے تصوف کا راستہ جو اس منزل تک لے جاتا ہے وہ قانون سے لاپرواہ ہے۔

دارا شکوہ کے پیر ملا شاہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اصل عقیدہ اور ظاہری عبادت میں امتیاز کرنے کے لیے انھوں نے کہا کہ "اے وہ لوگو جو حق پر عقیدہ رکھتے ہو رسمی عبادت (یعنی نماز) کے قریب مت جاؤ جب کہ تم نشہ (سکر) کی حالت میں ہو یا مستی کی حالت میں ہو۔ کچھ حدود کے ماتحت حالت مستی نماز کی ادائیگی سے بلند و بالا چیز ہے۔ کیونکہ اگر مستی دنیوی اور معصیت کے اغراض کے لیے ہے تو نماز منع کی گئی ہے تاکہ نماز ناپاک نہ ہو جائے اور یہ ایک طریقہ نماز کے اعزاز کا ہے لیکن اگر مستی سماوی ہے تو اس حالت میں بھی نماز منع ہے کیونکہ ایسی حالت میں مستی کو اعزاز دیا گیا ہے جب نمازی چلے جاتے ہیں اور نماز کی چٹائی اٹھالی جاتی ہے تو پھر کون نماز پڑھتا ہے[3]۔"

داراشکوہ نے ان تعلیم کی اشاعت اپنی تصنیفات کے ذریعہ کی جن میں مجمع البحرین (دو لت مندوں کا ملاپ) اور سر اکبر (یعنی سر عظیم۔ جو اپنشدوں کا ترجمہ ہے) بہت زیادہ مشہور ہیں۔ ابن عربی اور داراشکوہ دونوں کو ان کے ہم مذہبوں کے ایک خاص طبقہ نے کافر قرار دیا اور دارا کو اپنے عقائد کے لیے اپنی جان گنوانی پڑی۔ داراشکوہ کی شکست اور ان کے قتل سے ان کے نقطۂ نظر کو بھیانک دھکا لگا۔ حکمراں بادشاہ کی مخالفت اور اورنگ زیب کی موت کے بعد خلفشار کا جو زمانہ آیا وہ ایک ایسے سنجیدہ منطقی عقیدے اور وسیع النظر رواداری کے لیے موزوں نہ تھا اس لیے داراشکوہ کے خیالات صرف بعض بعض افراد کی زندگیوں میں اثر انداز ہے یا شعرا کے کلام میں ظاہر ہوتے تھے۔

تصوف کے آزادانہ نقطۂ فکر کے سب سے بڑے انکاری اور مخالف شیخ احمد سرہندی تھے جو اس سے کسی طرح کی صلح پر تیار نہ تھے۔ ان کی تعلیمات کا سلسلہ ابن تیمیہ (1263-1328ء) سے تاریخی طور پر ملتا ہے جو دمشق میں حنبلی قانون کے پروفیسر تھے۔ ابن تیمیہ ایک عالم محدث اور تابع رواۃ تھے جو نئی باتوں (بدعات) کی مذمت کرتے تھے۔ وہ مذہب تشبیہ کے ماہر تھے اور قرآن کی تفسیر اس کے ظاہری الفاظ کے لغوی معنی سے کرتے تھے وہ ایک افسر تھے جو فلسفہ یونان کی تردید کرتے اور فرماتے تھے کہ یہ کفر کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔

شیخ احمد سرہندی (پیدائش 1536ء وفات 1624ء) جن کو امام ابن تیمیہ کا مبا ایک طرح سے ورا ثتہً ملا تھا وہ دو چیزوں پر حد سے زیادہ زور دیتے تھے (1) قانون احکام اور احادیث کی مکمل اتباع (اتباع سنت) (2) نئی باتوں سے دور رہنا (رفع بدعت) عقائد کے معاملات میں عقل کی دخل اندازی کو وہ منع کرتے تھے اور ان کی رائے یہ تھی کہ "اگر دلائل کافی ہوتے تو بڑے بڑے فلسفی جنھوں نے عقل کو اپنا رہنما قرار دیا تھا وہ اغلاط کے کھوتے برتن میں نہ گرے ہوتے۔ ان کو خداوند تعالیٰ کی شان ارفع کا عرفان دوسروں سے زیادہ ہوا ہوتا۔ لیکن جہاں تک انسان کی تعبیری خیر کا سوال ہے اس کے اور مہتم بالشان مالک الملک کی صفات کے بارے میں وہ سب سے زیادہ ناواقف ہیں۔[4]"

ان کی تھیوری (اصول موضوعہ) یہ تھی کہ "جس طرح دلائل کے طریقے حسیات سے ماورا ہیں اس لیے جس کا بھی پتہ حسیات انسانی سے نہیں لگتا اس کو عقل سے معلوم کر لیا جاتا ہے اسی طرح علم باطن کا طریقہ عقل کے طریقوں سے ماورا ہے کیونکہ جو کچھ بھی عقل سے معلوم نہیں کیا جا سکتا ہے وہ الہام ربانی کے ذریعہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اور جو کچھ بھی عقل کی بنیاد پر عبادت کے تصور کے ماورا ہو کر حقیقت الٰہیہ کا ادراک و اظہار نہ کر سکے تو وہ الہام ربانی کے طریقے کا انکار ہوگا۔[5]" ان کے نزدیک جو کوئی بھی یہ چاہتا

ہے کہ وہ فلسفی ہے تو ضرور شیطان کا ساتھی ہوگا۔ اس لیے گھاٹے اور ٹوٹے میں رہے گا اور مایوس ہوگا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ "خدا اپنا پیغام پیغمبروں کے ذریعہ اپنی ذات اور صفات کے بارے میں اور اعمال کے بارے میں بھی کہ کیا اس کی مرضی کے مطابق ہے اور کیا اس کی مرضی کے خلاف ہے بھیجتا ہے وہ غزالی کے اس قول کے مؤید تھے جو انھوں نے اپنی تصنیف "المنقذ من الضلال" میں لکھا ہے یعنی یہ کہ فلسفیوں نے ادویہ اور ستاروں کا علم پیغمبروں کے صحیفوں کے اوراق سے اخذ کیا ہے۔ اور پھر اور اخلاق صوفیوں سے سیکھا ہے (جو ہمیشہ پیغمبروں کے متبع رہے ہیں)۔

چونکہ پیغمبر احکام الٰہیہ لانے کا وسیلہ ہیں اس لیے پیغمبر کی اطاعت عین خدا کی اطاعت کے مترادف ہے اس لیے سچے مومن کا فرض ہے کہ وہ خیال الفاظ اور عمل میں پیغمبر کے احکام اور اعمال کی اتباع کرے۔ ایک مسلمان کے لیے اس سے سرمو انحراف جائز نہیں ہے۔ شیخ اچھی اور بری نئی باتوں (یعنی بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ) میں جیسا کہ بعض علما کا خیال ہے امتیاز نہیں کرتے تھے۔ وہ یہ سوال کرتے تھے کہ "اگر ہر نئی چیز بدعت ہے تو کیسے کوئی نئی چیز اچھی یا مناسب ہو سکتی ہے کیونکہ روایات (یعنی حدیث یا اقوال پیغمبر) کے مطابق ہر نئی چیز بلا کسی استثنا کے قانون اور احکام ربانی کو منسوخ کرتی ہے اس لیے ہر نئی چیز خراب (ضلالت) ہے۔[6]"

شیخ احمد نے بدعت کی جو مذمت کی وہ ہمہ گیر تھی اور اس میں کسی استثنا کی گنجائش نہ تھی۔ شیعہ ازم کو بھی ایک ایسی بدعت قرار دیا گیا جو کفر سے بھی بدتر ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ شیعوں سے کوئی میل جول نہ رکھا جائے۔ ایک خط بنام شیخ فرید میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ "یہ قطعی ہے کہ ایک بدعتی سے میل جول رکھنے کی بداعمالی ایک کافر سے میل جول رکھنے کے فسق سے بدتر ہے۔ بدترین قسم کے بدعتی وہ لوگ ہیں جو رسول اللہ کے صحابیوں سے نفرت رکھتے ہیں اور خود قرآن عظیم ان کو کافر قرار دیتا ہے۔[7]"

انھوں نے ایک کتاب "رد روافض" کے نام سے لکھی تھی جس میں شیعوں کے اس عقیدہ کی تردید کی ہے کہ حضرت علی رسول اللہ کے دوسرے اصحاب سے افضل تھے۔ انھوں نے گانے اور ناچنے (یعنی رقص و سماع) کو ناجائز قرار دیا ہے۔ بڑے معاملات میں اسی طرح جس طرح چھوٹے معاملات میں انھوں نے سختی سے اتباع پر زور دیا مثلاً انھوں نے عمامہ کے اس حصّہ کو جو باندھنے کے بعد بچ جاتا ہے (یعنی شملہ) بائیں طرف رکھنا ناجائز قرار دیا ہے کیونکہ یہ پیغمبر صاحب کے طریقے کے خلاف ہے جو شملہ کو دونوں کندھوں کے بیچ میں رکھتے تھے۔

شیخ احمد ہندوؤں کے سخت مخالف تھے ان کو وہ کافر قرار دیتے تھے ان کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی چیز اس سے زیادہ ناپسند نہیں کہ ان کو ذلیل و رسوا کیا جائے وہ "جزیہ کی وصولی کو کفار پر اندھے ضعف

ضرب لگانے اور نفرت دلانے کا ایک وسیلہ تصور کرتے تھے"

مسلمانوں نے ہندوؤں کے بہت سے مراسم اور طور طریق اپنائے تھے مثلاً شادی کے اور موت کے مراسم۔ مافوق الفطرت وسائل کے سامنے جھکنا اور ان سے مدد مانگنے کے طریقے۔ ذات پات کی تفریق، ذبیحہ گاؤ اور شادی بیوگان سے نفرت۔ شیخ احمد نے ان سب کو قطعی ناجائز اور رد کرنے کے لائق قرار دیا۔ ان کی خواہش تھی کہ مسلمان پیغمبر اسلام کے زمانے کے عربوں کی طرح زندگی گذاریں اور ہندوستان کی عظیم تعداد والی غیر مسلم آبادی کے طور و طرز کو اپنے اندر شامل کرنے سے گریز کریں۔

جہاں تک تصوف کا تعلق ہے ان کو تصوف کے تمام نمایاں سلسلوں سے روشناس (بیعت) کیا گیا تھا۔ لیکن انھوں نے نقشبندی طریقہ کو ترجیح دی کیونکہ یہ سلسلہ جزئیات تک میں احکام ظاہری شریعت کی اتباع کو تصوف کے طریقوں اور عرفان سے بہتر قرار دیتا تھا۔ وہ صوفیوں کے اس دعوے کی سختی سے تردید کرتے تھے کہ ایک روشن ضمیر کامل فقیر (یعنی ولی، پیغمبر (نبی) سے اعلیٰ منصب پر فائز ہوتا ہے۔

اسی طرح انھوں نے وجیدی وحدت یعنی یہ عقیدہ کہ مادہ اور روح کی تفریق غلط ہے یہ دونوں ایک ہیں (وحدت الوجود) کے اصولوں کو رد کیا اور اس کے بجائے انھوں نے صفات میں وحدت (وحدت الشہود) کی عام تبلیغ کی۔

مختصر یہ کہ ان کا خیال یہ تھا کہ قرآن اور حدیث کے ذریعہ جب کہ علمائے حق نے ان کی تفسیر کی ہے اپنے عقائد کو پاک کرنا شرع کے احکام کی سختی سے پابندی اور تمام بدعات کا ترک یہ اسلام کے بنیادی اصول ہیں اور ہر مسلمان کا فرض اولین ہے کہ وہ ان کی مکمل پیروی کرے۔

شیخ احمد سرہندی اپنے بلند پیغام کا بہت احساس رکھتے تھے انھوں نے بہت سے ممتاز لوگوں اور مغل امراکے ذی اثر حضرات سے جو مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھتے تھے کثرت سے خط و کتابت کی اور ان کے اندر اپنے خیالات پھیلانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ جن لوگوں کو انھوں نے مکتوبات لکھے ان میں خان خاناں، سکندر خاں لودی، مہابت خاں، خان اعظم، مرتضیٰ خاں، شیخ فرید بخاری خان جہاں، قلیچ خاں، صدر خاں، لالہ بیگ اور ان کے علاوہ قریب پانچسو ممتاز لوگ شامل ہیں۔ انھوں نے اپنے مبلغ ہر شہر میں بھیجے اور نگرانی رکھتے تھے کہ یہ لوگ اپنے فرائض پوری اہلیت سے ادا کریں۔

شیخ احمد کا یہ یقین تھا کہ " ان کو صرف اس لیے نہیں پیدا کیا گیا تھا کہ وہ صراط مستقیم کا راستہ دکھائیں اور حق کی تکمیل کریں بلکہ کچھ اور غرض کے لیے اور کسی اور منصوبہ کے ماتحت " انھوں نے کہا " میں ابوبکر و عمر

کے منصب سے گذرا اور ان سے بھی بلند ہوا " انھوں نے دعوا کیا کہ " وہ فقیری (ولایت) کا دروازہ کھولنے والے اور تصوف کے طبقہ کے آخری پیر تھے " مذہب اسلام کے دوسرے ہزار سال کے مجدد تھے۔ اور محمد صاحب کو حبیب اللہ از خلیل اللہ کے رتبہ تک عروج دینے والے۔ ان کے ان غیر معمولی دعووں پر مسلم علما کی توجہ مبذول ہوئی جنھوں نے جہانگیر سے شکایت کی۔ بادشاہ نے تحقیقات کرائی اور مقدمہ چلایا اور ان کو سزا دے کر گوالیار کے قلعہ میں بند کر دیا۔ جہاں خطرناک سیاسی مجرمین بند تھے۔ بعد کو جہانگیر نرم ہوا اور کچھ دنوں اپنی فوج کے ساتھ زیر نگرانی رکھ کر رہا کر دیا۔

لیکن اس کارروائی کے باوجود جہانگیر اور شاہ جہاں کی ڈھیلی ڈھالی حکومت میں ان کا مشن ترقی کرتا گیا۔ ان کے صاحبزادے محمد معصوم نے زور شور سے تبلیغ (پروپیگنڈہ) شروع کی اور بیان کیا جاتا ہے کہ اورنگ زیب جو ان دنوں ملتان کا گورنر تھا ان کے مواعظ میں شریک ہوا کرتا تھا محمد معصوم نے حج بیت اللہ جاتے ہوئے پیشین گوئی کی تھی کہ تخت کی لڑائی میں اورنگ زیب فتحمند ہو گا اور نگ زیب جب شاہی افواج کے ساتھ سردار کی حیثیت سے بلخ کی مہم پر روانہ ہوا تو محمد معصوم نے اورنگ زیب کو ایک خط لکھا تھا جس میں مقدس جنگ (جہاد) کے فضائل بڑے شرح و بسط سے بیان کیے تھے انھوں نے لکھا کہ "اگر ہم درویش لوگ جو دنیا سے کنارہ کش ہو چکے ہیں لذات دنیوی سے پرہیز کریں اور روزے رکھیں تب بھی ہم جہاد کے اجر کے آخری اور سب سے پیچھے کی حد تک بھی نہیں پہنچ سکتے[8]۔ "کیونکہ حرم نبوی میں جو نماز پڑھی جاتی ہے اس کا ثواب دس ہزار گنا ہے اور جو نماز حرم کعبہ میں پڑھی جائے اس کا ثواب ایک لاکھ گنا ہے[9]۔ "

محمد معصوم کے صاحبزادے شیخ سیف الدین (پیدائش 1049 ہجری مطابق 40-1639ء) کو اورنگ زیب نے اپنا روحانی معلم اور رہنما قرار دیا۔ ان کے اثرات کے ماتحت شیخ احمد سرہندی کے خیالات کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ سلطنت مغلیہ کے زوال میں ان خیالات کا حصہ کچھ کم نہ تھا پھر بھی شیخ احمد سرہندی کے حامیوں کے نزدیک سلطنت اگرچہ چلی گئی مذہب تو بچ گیا' یہ ایک ایسا خیال ہے جس کا ثابت کرنا یا رد کرنا دونوں ہی مشکل ہیں۔ بہر حال نتیجہ یہ ہوکہ ہندوستان اندرونی اختلافات کے حوالے ہو گیا۔ بیرونی خطرات کے لیے اس کا دروازہ کھل گیا اور وہ مزاج میں ڈوب گیا۔ اورنگ زیب کی موت کے ایک صدی کے اندر ہی ہندوستان بیرونی حکومت کے زیر نگیں چلا گیا جو دو سو سال تک قائم رہی اور آخر کار جب آزادی ملی تو ملک دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔

جو تحریک اکبر نے چلائی تھی وہ دارا شکوہ کے زمانہ میں اپنے عروج پر آئی لیکن مسلمانوں کے

دماغوں پر اپنا قبضہ نہ جما سکی۔ اکبر کے خیالات کا جو اس زمانہ کی رائے عامہ سے بہت آگے تھے ایک ردّعمل وہ ہوا جس کے شیخ احمد سرہندی سب سے بڑے مبلّغ تھے۔ اورنگ زیب نے ان کی تقلید کی۔ امرا اور زیادہ عیش وعشرت اور بے عملی میں ڈوب گئے اور عام باشندے جن میں کسان، کاریگر اور تجار شامل تھے حکومت کے حد سے زیادہ مطالبوں کے نیچے پیس دیے گئے۔ فوج طبقہ پست ہمت ہوگئی اس کے سربراہ بدچلن ہوگئے ریاکار علما کی تعداد نے ترقی کی جن میں سب سے زیادہ ممتاز شیخ احمد سرہندی کے پوتے شیخ سیف الدین تھے جن کے شان وشوکت کی نمائش بادشاہوں کو دعوت مقابلہ دیتی تھی۔ سوسائٹی کے اتحادی دھاگے کمزور ہوگئے قبیلہ پرستی اور فرقہ پروری میں اضافہ ہوا اور حکومت کے ساتھ وفاداری کا جذبہ ناقص ہوگیا ان حالات کے وجوہ پر بحث کرتے ہوئے ایک مسلمان مصنّف لکھتا ہے کہ "شریعت اور فقہ کے لیے جوش وخروش، امراض باطنی کا تدارک نہیں کیونکہ ان کا تعلق تو کردار کے ظاہری حصّے سے ہے (محتسب را درون خانہ چہ کار) ان کا مقصد تو صرف اسلام کے ظاہری احکام واعمال کا قیام ہے مثلاً جوا کھیلنے شراب پینے کو روکنا جزیہ لگانا نئے مندروں کی تعمیر کو ممنوع قرار دینا اور گناہ کبیرہ اور گناہ صغیرہ پر سزا اور دکنا، فقہا صرف ان ہی امور پر زور دیتے ہیں لیکن روحانی اور اخلاقی کمزوریوں کا ان کے پاس کوئی علاج نہیں ہے کیونکہ یہ امور ان کے دائرۂ اختیار سے باہر ہیں[19]۔"

1625ء میں شیخ احمد سرہندی کے انتقال اور 1707ء میں اورنگ زیب کے انتقال کی درمیانی مدت میں ان دونوں مکتب خیال کی ناکامی نمایاں ہوکر منظر عام پر آچکی تھی۔ اورنگ زیب کے بعد ہندوستان کے حالات تیزی سے مزاج کی طرف متحرک ہوئے مایوسی کی گھنگھور گھٹا اور رنج وافسردہ دل شکستگی کی فضا میں اسلام کے ایک تیسرے مکتب خیال کی بنیاد رکھنے والا نمودار ہوا۔ ان کا نام شاہ ولی اللہ تھا۔ وہ دلّی میں 1703ء (1114 ہجری) میں پیدا ہوئے ان کے سامنے سماج حکومت، مذہب، اخلاق اور سیاست کے چند نہایت پیچیدہ مسائل تھے۔ فرقہ پروری اور اختلافات بھی اس زمانہ میں عام تھے۔

علما جو احکام اور رسم عبادات کو بنیاد قرار دیتے تھے اور وہ لوگ جو باطنی اصول کو ماننے والے تھے اور جو باطن کے تزکیہ پر زور دیتے تھے ان دونوں میں اختلافات تھے اسی طرح فقہا کے چار مسلکوں اور شیعہ اور سنی میں اختلافات تھے۔ مسائل کو سوچنے اور رائے قائم کرنے کے طریقوں میں بھی اختلافات تھے کچھ لوگ آنکھ بند کرکے احکام فقہ کی اتباع یعنی تقلید کے قائل تھے۔ جب کہ دوسرے ایسے لوگ

تھے جو احکام الہیہ کی شرح کے لیے وسیع میدان رکھتے تھے یعنی اجتہاد کے قائل تھے۔ کچھ لوگ اسلام کے احکام کی شرح فلسفہ یونان سے کرنے کی مذمت کرتے تھے دوسرے لوگ عقل اور منطق کے استعمال کو احکام الٰہی کے فہم و ادراک کے لیے ضروری قرار دیتے تھے۔ ان باتوں کے علاوہ مسائل اصول اخلاق و سیاست میں اور اس بارے میں کہ سلطنت کے زوال اور اخلاق کی گراوٹ کے کیا اسباب ہیں باہم اختلافات تھے۔

ولی اللہ نے ان تمام مسائل پر ایسے انداز سے بحث کی جو طبع زاد اور انوکھا تھا ان کی خواہش تھی کہ اختلافات کی جڑ پر ضرب لگائیں۔ ذاتی مخالفتوں سے لوگوں کو ماورا کریں۔ اور مختلف نقطۂ خیال میں ہم آہنگی پیدا کریں۔ مذہبی احکام کے معاملات میں ان کا خیال تھا کہ بحث اور ثبوت کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا اور عقل کل رکھتا ہے یعنی عالم اور حکیم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ہر فعل لازمی طور پر مبنی بر عقل ہوتا ہے اور انسان کا کام ہے کہ وہ دلائل سے ان کا پتہ لگائے۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کے ذریعہ جو وحی نازل کی ہے وہ اس کی مرضی کے سمجھنے میں مدد دیتی ہے "قرآن کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ کسی شخص کو سوائے صاف صاف دلائل کے اور کسی طرح قائل کرے" انھوں نے یہ قرار دیا کہ قانون (شریعت) کی راہ اور تصوف (یعنی طریقت) کی راہ، یہ دونوں راہیں متضاد نہیں ہیں بلکہ ایک ہی درخت کے دو قسم کے پھل ہیں انھوں نے اس نزاع کو اس طرح ختم کرنے کی کوشش کی جو دو گروہ کے فلسفیوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کے وجود کے بارے میں تھی جس میں ایک گروہ تو صرف وجود الٰہی کو مانتا تھا اور دوسرا اس کی ذات و صفات دونوں کا قائل تھا۔ انھوں نے ان دونوں میں ہم آہنگی ان کی مشترک باتوں پر زور دے کر پیدا کی۔ اسی طرح انھوں نے فقہ کے چار مسلکوں میں جو بنیادی یکسانیت تھی اس پر زور دے کر اور موطا امام مالک سے ان کا سلسلہ ملا کر اختلافات کو دور کیا۔

اٹھارھویں صدی کی باہمی خانہ جنگیوں میں اصل معاملہ تورانی نسل سنی امرا اور ایرانی نژاد شیعوں کا جھگڑا تھا۔ ولی اللہ نے ایک کتاب ازالۃ الخفا لکھی جس میں انھوں نے چاروں خلفا کے فضائل و کمالات کا اس انداز میں تذکرہ کیا جس سے دونوں میں اتحاد کی شکل پیدا ہو جائے۔

تاہم ان کی اس خواہش کا کہ وہ ہر فرد کو عقل سے کام لینے پر آمادہ کریں اور جس رسی میں باندھ کر علما عوام کو گھسیٹ رہے تھے اس سے ان کو آزاد کریں اس سے زیادہ بہتر مظاہرہ کسی اور بات سے نہیں ہوا کہ انھوں نے قرآن کا ترجمہ فارسی میں کر دیا۔ یہ لوتھر کے طرز کا ایک بیباکانہ فعل تھا جس کا منشا تھا کہ انسان کو مقدس احکام الہیہ کے فہم کے لیے خود اپنے عقل و دلائل کو استعمال کرنے کا حق ہے۔

سیاست کے میدان میں غالباً وہ واحد مسلم مفکر تھے جو اس امر پر صاف دماغ رکھتے تھے کہ اخلاق، سیاست اور اقتصادیات میں کتنا گہرا رشتہ ہے ان کے نزدیک اخلاق کے دو پہلو ہیں۔ ایک پرائیویٹ یا انفرادی اور دوسرا پبلک یا معاشرتی۔ لیکن دوسرے کی قیمت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ معاشرتی اخلاقیات میں وہ عدل کو سب سے اونچا مقام دیتے ہیں جو ہمارے ذاتی کردار میں مہذب برتاؤ، خوش خلقی اور آداب گفتار کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے اور جو مالی معاملات میں اقتصادی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور اجتماعی زندگی میں شہری آزادی کو جنم دیتا ہے اور جب یہ صفت مساوات انسانی لباہمی محبت اور انسانی برادری کی بنیاد بن جاتی ہے تو معاشرتی نیکی کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ جب انسان عدل اختیار کرتے ہیں تو وہ ایک نیک کردار سوسائٹی کی تعمیر کرتے ہیں جو عین مرضی الہی ہے۔

یہ نیک کردار سوسائٹی اس وقت خراب ہوجاتی جب دولت کی فراوانی ہوتی ہے اور اپنی بھوک کو پورا کرنا انسانی زندگی کا مقصد بن جاتا ہے۔ جب دولت مندوں پر غرور و نخوت غالب آجاتا ہے اور عیش و عشرت اور اصراف بے جا زندگی کے خاص مقاصد بن جاتے ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کمزوروں کو کچل کر اور کسانوں، تاجروں اور کاریگروں کا خون چوس کر دولت میں اضافہ کیا جائے اس طرح ملک کی اقتصادیات غلط راستوں پر پڑ جاتی ہے۔ اس بات پر زور دیا جاتا ہے۔ آخر کار بیکار پرورش پانے والوں کے مطالبات کے اضافے سے جن کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے لیکن جو کوئی مفید کام انجام نہیں دیتے شاہی خزانہ خالی ہو جاتا ہے۔

ان حالات کا علاج ان کے نزدیک یہ تھا کہ پورے نظام کو توڑ دیا جائے (فک کل نظام) انسانی معاملات میں عدل کو قائم کیا جائے اور باہمی میل جول کو پھر سے قائم کیا جائے۔

ولی اللہ کے فلسفہ میں ان تصورات کے قیمتی عناصر موجود تھے جن کی اگر قاعدے سے نشوونما کی جاتی تو وہ ہندوستان کے زندگی کے پے چیدہ مسائل کو حل کر دیتے لیکن بد قسمتی سے زمانہ خلاف تھا اور فلسفی کے ذرائع و وسائل ناکافی تھے۔ جن ہتھیاروں پر وہ اصلاح لانے کے لیے بھروسہ کرتے تھے وہ یا تو نااہل تھے یا نالائق۔ انھوں نے نجیب الدولہ نظام الملک اور احمد شاہ ابدالی سے اپیل کی کہ وہ دخل دیں اور اسلام کے قرون اولی کی عظمت کو واپس لائیں۔ حالانکہ تینوں اسی مذموم نظام کے علمبردار تھے۔ جن بڑے لوگوں کو انھوں نے خطاب کیا تھا ان کی مایوس کن نااہلی کا اندازہ لگانے میں وہ قاصر رہے۔ یہ سخت تعجب کی بات ہے کہ انھوں نے احمد شاہ ابدالی پر اعتماد کیا جنھوں نے سلطنت مغلیہ کے زرخیر علاقوں کو تاخت وتاراج کیا تھا اور جنھوں نے بلا تمیز کسی اد نا خلش کے ہندو اور

مسلمان دونوں کو لوٹا تھا۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ جو ایک نو بڑھوا تھا جس کی کوئی جڑ خود اپنے وطن میں
نہیں تھی۔ ان کے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ صرف وہ عدل جو عقیدے اور فرقے کے ماورا ہو کر ہندوستانی
سوسائٹی کے تمام عناصر کو ایک متحدہ اور یکساں کل میں جمع کر دے اور تمام باشندگان ہند کو برابر
مانے۔ وہی اس طاقت کو پیدا کر سکتا تھا جو ایک ایسی سوسائٹی کو جنم دے کر اس کی نشو و نما کر سکے جس
کا خواب انھوں نے دیکھا تھا۔ وہ بنگال کے واقعات کی اہمیت کا بھی اندازہ نہ لگا سکے۔ جو ہندوستان
کی بنیادی سیاست میں انقلاب لا رہے تھے۔

ان کے صاحب زادے شاہ عبدالعزیز (1823-1746ء) کا جو 1803ء میں انگریزوں
کے دلی پر قابض ہونے کے عینی شاہد تھے یہ انکشاف تھا کہ اسلام کی بنیادیں یقیناً ڈھا دی گئی ہیں کیونکہ
آزادی ضمیر آزادی رائے اور شہری آزادی سے ابنائے ملک کو محروم کر دیا گیا ہے اور اس لیے ہندوستان
اب دارالحرب (جنگ کی زمین) ہو گیا ہے لیکن نہ والد ماجد نہ فرزند ارجمند اس تبدیلی کی حقیقت
کو سمجھ سکے جو آئی تھی اور نہ اندازہ کر سکے کہ نئے خطرات کا مقابلہ پرانے ہتھیاروں سے نہیں ہو سکتا اور
نہ کوئی ایک فرقہ اپنے کو دوسروں سے علاحدہ ہو کر اور دوسروں کو غلامی، مایوسی اور بے چینی میں
چھوڑ کر سربلند ہو سکتا ہے۔

ہندو فکر

دکن میں وجیا نگر کی سلطنت کے خاتمہ کے بعد ہندوؤں میں طبع زاد فکر اور ذہنی تشکیل نو کا دور
ختم ہو گیا تھا۔ فکر کا جو دھارا زمانہ قدیم میں اُپنشد سے چلا اور جو شنکر رامانج، مدھوا اور نمبارکا
کے تخیلات سے طاقت پکڑتا گیا وہ آخری آچاریہ (معلّم) ولبھ پر آکر ختم ہو گیا۔ رادھا کرشنن کے
الفاظ میں ''اس زوال کے زمانہ کے فلسفی یا فلسفہ پر تحریر میں اظہار خیال کرنے والے دعوا تو یہ کرتے
تھے کہ وہ سچائی کے زبردست حامی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس سے صرف یہ سمجھتے تھے کہ وہ اس
یا اُس نقطۂ فکر کے احکامات کے تقدس مآب غلط استدلال کی شرح کریں یا متبرک انداز میں بال کی
کھال نکالیں۔ یہ پیشہ ور منطقی مناظرین یہ خیال کرتے تھے کہ ان کی بغل میں جو چھوٹا سا نالہ ہے جو ریت
میں جا کر ختم ہو جاتا ہے یا کُہرہ بن کر ہوا میں اڑ جاتا ہے وہی ہندوستان کے فلسفہ کا بحر ذخار ہے''
رامانج، رامانند اور ولبھ نے بھگتی کے مسلک کی فلسفیانہ بنیاد کو قائم کیا۔ جو تمام ہندوستان
میں ہر دلعزیز ہو رہی تھی جس اصول کی ولبھ نے تعلیم دی اس کا نام ''پشتی مارگ'' ہے یہ خدا سے محبت

اور تعلق پر زور دیتا ہے جس کے فضل کے سوا اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو انسان کو خدا رسیدہ بنا سکے۔ ولبھ کا کوئی جانشین نہ تھا جس نے علم فلسفہ کی تحصیل میں امتیاز حاصل کیا ہو لیکن ان کے خیالات نے خدا پرستوں کے ایک پورے گروہ کو راغب کیا جو مقامی زبانوں کو استعمال کر کے خدا کی محبت اور اس کے فضل کے نغمے گاتے تھے۔

بھگتی کی تخلیق اور اس کی نشو و نما میں ایک دوسرا تعمیری اثر "بھگوت پورانا" کی عوامی مقبولیت کا تھا۔ پرانے آچاریہ لوگوں نے اپنی توجہ صرف تین قدیم صحائف تک محدود رکھی تھی (پرستان تریا) یعنی اپنشد، برہم سوترا اور بھگوت گیتا۔ لیکن ولبھ نے ان میں ان تین صحائف کے علاوہ بھگوتیہ کا بھی اضافہ کر دیا جس پر شرحیں تصنیف ہونے لگیں۔

خیالات و جذبات کے یہ لہریں سورداس اور تلسی داس کی لافانی نظموں میں نمودار ہوئیں یہ دونوں مختلف طبقوں کے فلسفیانہ خیالات و افکار سے متاثر ضرور تھے۔ مگر وہ فرقہ وارانہ اختلافات، تنگ نظری اور محدود خیالی سے اوپر اٹھے۔ سولھویں صدی میں شمال کی مادری زبانیں تخلیقی افکار کے اظہار و بیان کا ذریعہ بن گئیں اور انھوں نے سنسکرت کی جگہ لے لی۔

دھرم شاستر کا مطالعہ وسیع سے وسیع تر پیمانہ پر ہونے لگا۔ لیکن پندرھویں صدی کے "وچاس پتی معرا" کے بعد سولھویں صدی کے رگھو نندن اور سترھویں صدی کے "کمل کارا" اور "مترا معرا" کے بعد کوئی اہم شرح تصنیف نہیں ہوئی۔ بالکرشن پنچ گندا" کی "بلم بھٹی" اٹھارھویں صدی میں لکھی گئی اور اسے "متاکشرا" کی شرح تسلیم کیا گیا۔ جگن ناتھ پنچانن نے ہندو لا پر کتاب تیار کرنے میں وارن ہسٹنگز کی مدد کی۔

"نیایا" اور فلسفہ کے دوسرے طریقوں کی بھی تعلیم دی جاتی تھی لیکن ان میں کوئی نمایاں ترقی واقع نہیں ہوئی۔ علم سیارگان اور علم ریاضی پر کچھ توجہ ہوئی اور خاص کر جنم پترا بنانے مبارک تاریخوں کے تعین کرنے اور تیوہاروں کے دن مقرر کرنے پر کام کیا گیا۔ علم طب کا قدیم طرز پر پڑھایا جانا اور علم الاعضا یا علم افعال اعضا میں کسی قسم کی ترقی کے بغیر جاری رہا۔

مجموعی طور پر "کیتھ" نے بعد کے زمانہ کے سنسکرت ادب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ موزوں ہے وہ بیان کرتا ہے کہ "مصنفین صرف مستند امور کو ماننے پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں اور وہاں استاد کے بارے میں کوئی آزاد رویہ اختیار نہیں کر پاتے۔ زیادہ سے زیادہ وہ اضداد میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں اپنی بڑی سے بڑی لیاقت ظاہر کرتے ہیں اور اپنے اضداد کے کسی مروجہ رسم کے لیے قدیم استاد کو ذمہ

کرکے جواز تلاش کرتے ہیں حالاں کہ ان قدیم مقدس کتابوں کے مضمون کا مطلب کچھ اور تھا۔

تعلیم

ہندو اور مسلم دونوں کے کلچر کا بنیادی نقص یہ تھا کہ ان کا نظام تعلیم قدیم اور غیر ترقی پسند تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں تعلیم کے معاملہ میں پسماندہ تھے ان دونوں میں سے کسی کے دماغ میں اعلیٰ ترین روشنی اس ترقی کے بارے میں نہ تھی جو مغرب نے سائنس میں کی تھی اور اسی طرح مشاہدات، تجربات اور تنقیدات کے جو نئے طریقے نکلے تھے ان کے بارے میں وہ کچھ علم نہ رکھتے تھے۔ یہ سخت حیرت کی بات ہے کہ اگرچہ اکبر نے اپنے دربار میں بہت سے یورپین پادریوں کو باریابی دی اور ان سے ان کے مذہب اور علم دین کے بارے میں بحثیں کیں لیکن یورپ کے فلسفے سائنس اور تکنیک میں کسی دل چسپی کا اظہار نہیں کیا گیا۔ جے سنگھ کے کیمپ میں شیواجی نے "منوکی" سے دو گھنٹہ گفتگو کی لیکن اس کے دل میں یہ جاننے کی کوئی خلش نہیں ہوئی کہ اٹلی کس کلچر کی نمائندگی کرتا ہے۔ یورپ کے لوگوں نے ہندوستان کے اردگرد کے سمندروں پر قبضہ کر لیا اور مغربی اور مشرقی دونوں ساحلوں پر جہازوں کے اتارنے کے پھاڑے بنائے اور فیکٹریاں قائم کیں۔ لیکن گجرات، کونکن، کیرالا، کولامنڈل، اڑیسہ اور بنگال کے ہندوستانی ذہنی طور پر ان کے وجود سے قطعی متاثر نہ ہوئے۔ شہزادگان اور امرا نے یورپ کے جانوروں، چڑیوں، آئینوں، کھلونوں، مشروبات اور بادۂ ناب میں ضرور کچھ دل چسپی ظاہر کی لیکن ان کے معاشرتی، اقتصادی اور ثقافتی معاملات میں قطعی کسی قسم کی دل چسپی نہ لی۔

یہ اور بھی تعجب کی بات اس لیے ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ کے تاریکی سے نکلنے کے بہت قبل ہندوستان نے سائنس کے میدانوں میں قابل لحاظ ترقی کر لی تھی۔ ریاضی کے میدان میں انھوں نے علم الحساب، الجبرا جیومیٹری، علم مثلث حتیٰ کہ صفاری احصا تک ترقی کر لی تھی انھوں نے صفر کے انتہائی مجرد خیال اور لامحدود کے تصور کی بھی نشو و نما کی تھی اور موجودہ زمانے کے سائنسی فکر کے تقریباً بالکل کنارے پہنچ گئے تھے سائنس کے دوسرے علوم کے ساتھ انھوں نے علم الافلاک، علم الادویہ، علم جراحی، فلسفۂ فطرت کے مبادیات، علم نباتات اور علم الحیوانات کو بھی ترقی دی تھی۔ وہ اپنے نتائج پر تحقیق، مشاہدے، تجربات، تجزیے اور سبب اور نتیجہ کے باہمی تعلق کو قائم کر کے پہنچے تھے۔

سائنسی علوم کے نشو و نما میں مسلمانوں نے بھی بہت آگے قدم بڑھایا تھا انھوں نے یونان اور ہندوستان کی تصنیفات کا عربی میں ترجمہ کر کے ان کا مطالعہ کیا تھا۔ اور علم کی ترقی میں قابل تعریف

حصّہ لیا تھا۔ درحقیقت بہت سے علوم سائنس میں وہ ہندوؤں سے آگے نکل گئے تھے مثلاً ریاضی، الجبرا
جیومیٹری، کرۂ ارض و افلاک کے علم مثلث، حساب کے قاعدہ لوگارتم میں اور علوم نجوم میں لوح کی تعمیر کرنا
اور علم سیارگان میں مثلاً اجرام فلکی کے ارتفاع وغیرہ معلوم کرنے کا طریقہ اور خطِ استواء و سرطان کے گوشے کی
جانچ اور مشاہدۂ افلاک کے لیے عمارتیں تعمیر کرنا۔ علم طبیعات میں ایسڈ یعنی تیزاب مثلاً شورے کا تیزاب
یا شور، گندھک کا تیزاب اور کیمیا کے اجزائے ترکیبی کا علم حاصل کرنا۔ نمک تیار کرنا اور ان کے اندر سے
انجن اور سنکھیا کو الگ کرنا۔ اور چند علم الادویہ کی شاخوں میں بھی۔ دنیا کی جغرافیہ کے لیے انھوں نے
بڑی اطلاعات فراہم کرلی تھیں۔ تاریخ کے علم کو انھوں نے خصوصیت سے ترقی دی۔ دراصل علوم سائنس
کے معاملہ میں وہ یورپ کے اوّلین معلّم ہیں۔ ان کی درسگاہیں یورپ کے مختلف ملکوں کے عیسائی طالبعلموں
کو تربیت دیتی تھیں اور ان کی عربی کی کتابوں کے لاطینی زبان میں جو تراجم ہوئے وہ یورپ کے علوم
کی بنیاد ہیں۔

ان سب باتوں کے باوجود واقعہ یہ تھا کہ اگرچہ مسلمانوں کے علوم کی ہر شاخ اسپین، اٹلی اور فرانس
کی عیسائی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی تھی اور یورپ کے کلچرل ورثہ میں ہضم کرلی جاتی تھی لیکن پھر
بھی پندرھویں صدی اور اس کے آگے کے زمانہ میں یورپ میں جو نئی دریافتیں ہوئیں ان سے
ہندوستان اٹھارھویں صدی کے آخر تک لاعلم رہا۔

یہ تغافل اس لیے نہ تھا کہ مدرسے نہ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مدرسے بڑی کثرت سے تھے۔ بنگال
اور بہار کی تعلیمی حالت جو 1835ء سے 1838ء تک تھی اس کے بارے میں آدم اپنی رپورٹ میں
یہ اندازہ پیش کرتا ہے کہ "ایک لاکھ پچاس ہزار مواضعات پر تقریباً ایک لاکھ ابتدائی مدرسے تھے!!
آبادی کی بنیاد پر حساب لگانے سے اس کے اندازے میں ہر چار سو آدمیوں پر ایک اسکول تھا۔ جہاں تک
ثانوی سطح کی تعلیم کا سوال ہے بنگال کے ہر ضلع میں اوسطاً ایک سو اسکول تھے۔ کل ملاکر صوبہ کے اندر
اٹھارہ سو اسکول تھے۔ مدراس کے علاقوں میں تقریباً بارہ ہزار پانچسو اسکول تھے۔ جن کا خرچ یا تو
راجگان برداشت کرتے تھے یا عوام الناس"[12]۔

اصل دقت تعلیم کے معیار میں تھی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تعلیم کی تنظیم فرقہ وارانہ بنیاد پر تھی۔
دراصل "ایک دوسرے سے مختلف نظام قائم تھے ایک تو تنہا ہندوؤں کے لیے تھا جن کا ذریعہ تعلیم
ابتدائی درجات میں وہاں کی علاقائی زبان اور ثانوی سطح پر سنسکرت تھی اور دوسرا نظام مسلمانوں
کے لیے تھا اور ان ہندوؤں کے لیے جو گورنمنٹ کی نوکری کرنا چاہتے تھے۔ ان اسکولوں کا ذریعہ تعلیم

فارسی زبان تھی۔

ہندوؤں کے اسکول علاحدہ علاحدہ حصّوں میں بٹے ہوئے تھے ایک حصّہ تو وہ تھا جو ابتدائی تعلیم دیتا تھا۔ یہ مدرسے ان طالب علموں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے تھے جو زراعت یا تجارت کا پیشہ اختیار کرنے والے ہوتے تھے۔ قدرتاً یہ طالب علم ضلع کے ہر ذات کے لوگ ہوتے تھے مثلاً مرشد آباد شہر اور ضلع کے ابتدائی اسکولوں میں پچاس ذاتوں اور ذاتوں کے اندر کی ذاتوں کے لڑکے پڑھ رہے تھے۔ 998 طلبا میں سے 181 برہمن 129 کایستھ اور بقیہ دوسری ذاتوں کے تھے۔ 82 مسلمان طلبا بھی تھے۔

جنوبی بہار میں دو ہزار نو سو اٹھارہ طلبا، اڑتالیس مختلف ذاتوں کے تھے سب سے زیادہ تعداد گانده بانک لگادی اور تیلی کی ذاتوں کی تھی۔اس کے بعد برہمنوں اور کایستھوں کا نمبر آتا تھا اور اس کے بعد راجپوت، کمہار وغیرہ۔ مسلمان طلبا کی تعداد ایک سو اٹھہتر تھی۔

لیکن ان اسکولوں میں پڑھانے والے زیادہ تر مستثنیٰ ذاتوں کے تھے مرشد آباد میں 67 اسکولوں میں 67 استادوں میں سے 39 کایستھ 14 برہمن اور 14 دوسری ذاتوں کے تھے۔ جنوبی بہار میں 285 اسکول تھے اور 285 پڑھانے والے بھی تھے ان میں سے 278 کایستھ اور سات دوسری ذاتوں کے تھے۔ برہمن ذات کا کوئی مدرس نہ تھا۔

ابتدائی اسکولوں کے طلبا کو اپنا کورس پورا کرنے میں پانچ سے دس سال تک لگتے تھے جس میں لکھنے پڑھنے کی اور ریاضی حساب کی ابتدائی تعلیم شامل ہوتی تھی۔ لکھنا سیکھنے میں بڑا وقت لگتا تھا شروع اس طرح کیا جاتا تھا کہ زمین پر ریت بچھادی جاتی تھی اور انگلی سے الفاظ ٹریس کیے جاتے تھے۔ اس کے بعد کھجور کے پتے کلک کا قلم اور لکڑی کے کوئلے کی سیاہی استعمال ہوتی تھی۔ پھر جھاڑیوں کے پتے اور آخر میں کاغذ کا نمبر آتا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ حروف کا لکھنا اور کاروبار کے خطوط کا مسودہ مثلاً عرضداشتیں عطایا اور پٹے وغیرہ کے مسودے تیار کرنا آجائے۔ ریاضی میں مقصد یہ تھا کہ حساب کرنا آجائے۔ خواہ وہ زراعت سے متعلق ہو یا تجارت سے۔ زور نقشوں پر دیا جاتا تھا جو یا تو اعداد سے متعلق ہوتے تھے یا ضرب کے طریقے یا وزن پیمانہ اور ان کے اعشاریہ وغیرہ بتلاتے تھے۔ پڑھنا علاقائی زبانوں میں رامائن جیسی کتابوں کے مطالعہ تک محدود تھا۔

تعلیم بالکل افادیت پسندانہ اور انتہائی محدود دائرہ کے اندر تھی۔ یہ دماغ کو بیدار نہیں کرتی تھی۔ اور نہ روایات قدیمہ کی بندشوں سے اسے آزاد کرتی تھی۔ آدم کا اعتراض یہ ہے کہ" ہاتھ آنکھ استعمال

کیے جاتے ہیں حافظہ کو کثرت سے کام میں لایا جاتا ہے۔ امتیاز حق و باطل کی قوت کو بالکل نظرانداز نہیں کیا جاتا ہے اور مذہبی جذبات کی شروع سے اور استقلال سے پرورش کی جاتی ہے خواہ وہ کسی قدر غلط راہ پر ہوں لیکن احساسات اور طبعی میلانات کو جنگلی گھاس کی طرح اُگنے دیا جاتا ہے۔ کاٹ چھانٹ کر استوار کرنے یا ان کو نیک اغراض کے حصول کی طرف لے جانے کا کوئی خیال نہیں ہے[13]"

ثانوی سطح کے اسکولوں کی حالت اور بھی بدتر تھی یہاں طلبا اور اساتذہ کل کے کل برہمن ذات کے ہوتے تھے کیونکہ ان کے کورس زیادہ تر مذہبی تھے صرف چند ضمنی مضامین ان کے ساتھ شامل کر دیے گئے تھے۔ مثلاً مرشد آباد میں اس طرح کے 24 اسکول تھے جن میں 24 ماسٹر اور 153 طلبا تھے کل ماسٹر برہمن تھے اور طلبا میں صرف ایک کایستھ تھا بقیہ سب برہمن تھے۔ جنوبی بہار میں 27 اسکولوں میں 27 ماسٹر تھے اور یہ کل برہمن تھے اور 437 طالب علموں میں ایک بھی برہمن کے سوا کسی دوسری ذات کا نہ تھا۔

بنگال اور بہار میں خاص طور پر تین طرح کے کورس پڑھائے جاتے تھے (1) قواعد اور عام ادب (2) قانون (3) منطق۔ ان کے علاوہ چند اسکول فلسفہ (ورشنا اور ویدانت)" پلوران" تنترا علم نجوم اور علم الادویہ کی تعلیم کے لیے بھی تھے۔ یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ "ایک لاکھ برہمنوں میں سے ایک ہزار تو سنسکرت کی گرامر پڑھتے تھے۔ چار یا پانچسو نظم میں ادب کا اور پچاس شاستروں کی لسانی خطابت کا مطالعہ کرتے تھے۔ اس ایک ہزار میں سے چار سو سمرتی (قانون کی کتابیں) پڑھتے ہوں گے۔ لیکن دس سے زیادہ ماڈرن ہندو مذہب کے صوفیانہ اور جادوگرانہ فنون کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ تین سو کے قریب منطق کی تعلیم میں لگے ہوں گے لیکن 5 - 6 سے زیادہ ویدوں کے احکام مذہبی کی شرح یا فلسفیانہ مادہ پرستی یا ویدوں کی روحانیت آموز اجزا یا فلسفیانہ رہبانیت یا فلسفیانہ مقر مادیت یا بلاشبہ خود ہندوؤں کی سب سے قدیم اور مقدس کتاب میں روحانیت کی تعلیم ہے ان کو نہیں پڑھتے تھے۔ ان برہمنوں میں سے ممکن ہے کہ دس علم نجوم کے جو شاستروں میں ہے ماہر ہو جائیں۔ اور دس اور ایسے ہوں جو اس مضمون کو سمجھتے ہوں لیکن نہایت نامکمل طور پر ایک ہزار میں پچاس برہمن ایسے ہوں گے جو شری بھگوت کو پڑھ لیں اور چند پرانوں کو بھی پڑھ سکتے تھے[14]"

تعلیم دو سال کی عمر سے شروع ہوتی تھی اور بارہ سال تک اور کبھی کبھی بائیس سال کی عمر تک جاری رہتی تھی۔ اسکول میں ایک ٹیچر ہوتا تھا اور کچھ طلبا ہوتے تھے جو ٹیچر سے متعلق ہوتے تھے۔ تعداد کی نسبت یہ تھی کہ ہر چھ طالب علم پر ایک ٹیچر ہوتا تھا۔ پڑھائی ٹیچر کے مکان میں ہوتی تھی اور اس کا آغاز علی الصباح سے ہوتا تھا اور دوپہر میں تھوڑا وقفہ دینے کے بعد شام کو دیر تک جاری رہتی تھی۔

تمام مضامین کے ابتدائی کورس میں سنسکرت کی تعلیم حاصل کرنا شامل تھا عام ادب کے سلسلہ

میں قواعد لسانی خطابت اور زبان کی لغت پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ ادب میں بھی شاعر سے ابتدا کی جاتی تھی اور اس کے بعد رگھو نیش اور دوسرے شاعروں کے کلام پڑھائے جاتے تھے۔

قانون کے طلبا کو ہندو لا اور احکام کی بہت سی شاخوں کے مطالعہ میں آٹھ سے تیئس سال تک لگتے تھے۔ بنگال میں دیابھاگا اور دیا نتوا پر کتابیں پڑھی جاتی تھیں جب دوسرے اسکولوں میں منوسمرتی اور متاکشرا کی تعلیم دی جاتی تھی۔ منطق کی تعلیم میں بارہ سال سے بائیس تک کا وقت لگتا تھا۔ اس کی ابتدا الفاظ خصائص اور اشیا کی تعریف سے ہوتی تھی اور اس میں قضیہ یعنی مسائل اور قیاس منطقی صغرا اور کبرا سے نتیجہ نکالنا استنباط و استخراج نتائج سفسطہ (مغالطے) اور وجود باری تعالیٰ کے دلائل شامل تھے۔

علم الادویا اور علم ہیئت یہی دو سائنس تھے جن کی تعلیم دی جاتی تھی اور ان کی تعلیم پرانی کتابوں اور ان کی شرحوں پر مبنی تھی۔

یہ ظاہر ہے کہ علم کی ایک شاخ سے اتنی طویل مدت تک کی مناسبت اور جزئیات تک مہارت ذہن کو تیز اور دقیقہ رس تو ضرور کر دیتی تھی لیکن اس سے تنگ نظری بھی پیدا ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں قواعد ادب قانون اور منطق کی تربیت زیادہ تر رسمی اور لفظی تھی آدم کے الفاظ میں یہ تعلیمات "طالب علم کو قواعد ادب کی دقیقہ سنجیوں میں ماہر کامل ملکی قانون، ادب کے تمام تنوعات اور ان کے تضاد سے روشناس بھی بنا دیتی تھی اور منطق اور فلسفہ مادر ا الطبیعات کے نازک اور نہایت سنجیدہ مسائل سے لیس کر دیتی تھی[15]۔" "لیکن وہ دماغ کو خوابیدہ رکھتی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ زمانہ قدیم کے فسانوں اور تخیلات کے تجزیہ تعلق اور ان کی از سر نو تعبیر میں وہ ایک طرح کی خواب کی سی زندگی رکھتے تھے[16]۔"

اسلامی تعلیمات میں بھی جو نظام رائج تھا وہ کسی طرح اس سے بہت بہتر نہ تھا۔ یہ صرف اعلا طبقہ تک محدود تھا۔ مسلم عوام کے لیے تعلیم کا کوئی انتظام ہی نہ تھا۔ اس نظام میں ہندوؤں کے ابتدائی اسکولوں کی طرح جن میں مادری زبان کے ذریعہ تعلیم ہوتی تھی کوئی اسکول نہ تھے۔ تمام مسلم اسکولوں میں فارسی ذریعۂ تعلیم تھی۔ لہٰذا اردو یا اور کوئی بول چال کی زبان استعمال نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے مسلم عوام ہندو عوام سے زیادہ جہالت کی تاریکی میں گھرے ہوئے تھے۔

مسلمانوں میں تعلیم کے تین قسم کے طریقے تھے۔ اوّل طریقہ تو قرآن پاک کی ناظرہ تعلیم تھی۔ یعنی الفاظ کو بلا معنی سمجھے رٹ لینا۔ یہ تعلیم ملاؤں کے ہاتھ میں تھی جو حصول علم میں سب سے نچلے طبقہ میں تھے آدم اس کی تعلیم کو "انتہائی مضحکہ خیز[17]" قرار دیتا ہے۔ "یہ بالکل ناقابل لحاظ اور بیکار تھی۔"

دوسرا طبقہ فارسی کے اسکولوں میں تعلیم دینا تھا۔ اس میں صرف ادب، قواعد، انشاپردازی اور معمولی ریاضی کی تعلیم ہوتی تھی۔ نظم میں فردوسی، سعدی، حافظ، عرفی، جامی، خاقانی وغیرہ اور نثر میں گلستاں، وقائع نعمت خاں عالی، بہار دانش وغیرہ۔ مکتوبات میں ابوالفضل، عالمگیر، مادھورام برہمن وغیرہ۔ قواعد اور خطابت میں حدائق البلاغت، دستور المبتدی وغیرہ پڑھائے جاتے تھے۔ کورس میں ریاضی اور جیومیٹری کے اصول کی تعلیم بھی شامل تھی۔

فارسی کی تعلیم کے بعد عربی کی تعلیم شروع ہوتی تھی اور یہیں طالب علمی کی فضیلت کا اتمام ہوتا تھا۔ عربی کی تعلیم گرامر کی تعلیم میں بس جانے سے شروع ہوتی تھی۔ جس میں علم صرف، علم گردان، علم عروض اور علم نحو شامل تھے۔ زبان پر عبور حاصل کرنے کے بعد اعلا تعلیم کا دروازہ کھلتا تھا۔ فضیلت کے درجے دو حصوں میں منقسم تھے۔ منقولات (یعنی مبنی بر روایات) اور معقولات (عقلی) پہلے حصہ میں اخبار اور حدیث (تاریخ اور روایات) تفسیر (شرح) ادب (لٹریچر) فقہ (قانون) شامل تھے دوسرے حصہ میں منطق، حکمت، طب، ریاضی اور ہیئت کی تعلیم ہوتی تھی۔

زبان اور ادب، علوم کی بنیاد مہیا کرتے تھے اس لیے قواعد یعنی صرف و نحو اور نظم و نثر کے منظور شدہ اسباق کی تعلیم پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ حدیثوں کو جن چھ کتابوں میں جمع کیا گیا تھا ان کا انتخاب فقہ اور اصول فقہ ان سب کی وسیع پیمانہ پر تعلیم دی جاتی تھی۔ منطق کی بنیاد ارسطو کی کتابیں تھیں۔ اور فلسفہ یونانی اور مسلم تصورات کا مجموعہ تھا۔ علم الادویہ ریاضی اور ہیئت کی بنیاد ہندو اور یونانی سائنس پر تھی۔

لیکن عقلی علوم کی جن میں علم الادویہ اور علم ہیئت بھی شامل تھے۔ تعلیم بس کتابوں تک محدود تھی نہ تو کوئی لیبارٹری تھی اور نہ کوئی مشاہدہ کرنے کی جگہ اور تعلیم میں تجربات کے طریقوں کا دخل نہ تھا۔ سب سے زیادہ زور مذہب اور قوانین کی تعلیم پر تھا اور قدیم زمانہ کے معلمین علما کا قول بے چون و چرا سند تسلیم کیا جاتا تھا۔

مسلم دماغ متوسط زمانہ کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا اور ذہنی طور پر یہ مغرب کے حملے کے مقابلے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ سخت تعجب کی بات ہے کہ اس طریقۂ تعلیم کی سب سے زیادہ برباد کن مذمت اورنگ زیب کی جانب سے آئی جن کو جب ان کے استاد ملا صالح نے حصول انعام کے لیے بہت پیش کیا تو انھوں نے ان کو بحیثیت استاد خدمات کے بارے میں اپنا خیال ذرا صفائی سے ظاہر کیا۔ برنیر نے اس تقریر کی مکمل رپورٹ دی ہے۔

اورنگ زیب نے ملا صالح سے پوچھا "لیکن آخر وہ کیا تعلیم تھی جو جناب کی استادی کے تحت میں نے حاصل کی"؟ اور شکایتاً کہا "کیا میرے معلم کا یہ فرض نہ تھا کہ وہ مجھے اس روئے زمین کی تمام قوموں کے امتیازی نشانات، ان کے وسائل و ذرائع، ان کی قوت و شوکت اور ان کے طریقہ جنگ کو بتلاتا اور تاریخ کی تعلیم کے ایک باضابطہ کورس کے ذریعہ اس سے آگاہ کرتا کہ حکومتیں کیسے وجود میں آتی ہیں کس طرح ترقی کرتی ہیں اور کیسے ان کا زوال ہوتا ہے" آگے چل کر وہ مزید اضافہ کرتا ہے کہ " ہمسایہ قوموں کی زبانوں سے واقف ہونا ایک بادشاہ کے لیے ناگزیر ہے لیکن آپ نے مجھے صرف عربی پڑھنا اور عربی لکھنا سکھایا یہ بھول کر کہ ایک شہزادے کی تعلیم میں کتنے اہم مضامین کو شامل ہونا چاہیے۔ آپ نے اس طرح عمل کیا گویا کہ خاص ضروری چیز یہ تھی کہ میں قواعد میں بڑی دستگاہ حاصل کر لوں۔ اور ایسا علم حاصل کر لوں جو ایک ماہر قانون کو ہوتا ہے" آگے چل کر اورنگ زیب نے کہا کہ "کیا ہم اپنی دعائیں صرف عربی میں کر سکتے ہیں اور قانون اور سائنس کا علم صرف عربی کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے خوب یاد ہے کہ آپ سالہا سال تک بیکار اور احمقانہ مسائل سے میرے دماغ کو روندتے رہے جن کے حل سے دماغ کو کوئی سکون حاصل نہیں ہو سکتا یہ وہ مسائل تھے جو زندگی کے کاروبار میں کبھی پیش ہی نہیں آتے۔ جب آپ نے میری تعلیم ختم کی تب میں اس بات پر فخر نہیں کر سکتا تھا کہ میں نے سائنس میں کوئی کمال ایسا حاصل کر لیا ہے جو چند فرسودہ اور غیر مستعمل الفاظ کی ترکیب جاننے سے زیادہ ہوا اور جو ایک نوجوان تنومند دماغ کے لیے ہمت شکن، پریشان کن اور نفرت انگیز ہی ہو سکتا تھا۔ اگر آپ نے مجھ کو اس فلسفہ کی تعلیم دی ہوتی جو دماغ کو جو ہر عقل سے مطابق کرتا ہے تاآنکہ انتہائی قوی دلائل سے کم پر وہ مطمئن نہ ہو سکے۔ اگر آپ نے مجھ کو انسان کی فطرت سے واقف کیا ہوتا اور میری یہ عادت بنائی ہوتی کہ میں بنیادی اصول پر نظر رکھتا اور آپ نے مجھ کو اس کائنات اور اس کے اجزا کی ترکیب اور ان کی حرکات کا ایک ارفع اور بھرپور تصور دیا ہوتا تو میں آپ کا اس سے زیادہ ممنون ہوتا جتنا سکندر اعظم ارسطو کا تھا۔[18]"

جو تعلیم پنڈت لوگ بنارس میں دے رہے تھے اس کے متعلق "برنیر" کا بیان بھی اسی طرح واضح ہے۔ "برنیر" نے ہندوستان کے اس ایتھنز میں اسی طریقۂ تعلیم کو رائج پایا جو قدیم یونان میں رائج تھا ماسٹر لوگ درجات کی تعلیم اپنے گھروں میں قریب کے دیہات کے باغوں میں دیتے تھے ہر ماسٹر کے پاس چار سے پندرہ تک طالب علم ہوتے تھے۔ جو ان کے ساتھ دس سے بارہ سال

تک رہتے تھے فضا یکسر تعلیمی ہوتی تھی اور طلبا روکھا سوکھا کھا کر پرہیزگارانہ زندگی گذارتے تھے۔

کورس جو پڑھایا جاتا تھا اس میں سنسکرت' ایران' ادب' نا رفلسفہ کے چھ اصناف' طب' ہیئت اور جغرافیہ کے مضامین شامل تھے۔ طب کے بارے میں برنیر کی نکتہ چینی یہ ہے کہ اگرچہ جس طرح مریض کا علاج کیا جاتا تھا وہ کامیاب تھا لیکن ڈاکٹر لوگ جسم کے اعضا کا کوئی علم نہیں رکھتے تھے کیونکہ وہ انسان یا حیوان کسی کے بدن کو چیر پھاڑ کے کھولنے کا کام نہیں کرتے تھے۔ ان کے پاس نقشے تھے جن سے سورج گرہن اور چاند گرہن کے بارے میں نہایت صحیح پیشین گوئی کی جاسکتی تھی اور زمین سے چاند کا کیا فاصلہ ہے اور وہاں انسانی آبادی ہے یا نہیں ان امور میں ان کے خیالات بالکل فضول تھے۔ اسی طرح جغرافیہ میں ان کا یقین یہ تھا کہ زمین چپٹی ہے اور مثلث ہے اور سات علاقوں میں تقسیم ہے اور ہر علاقہ اپنے مخصوص سمندر سے گھرا ہوا ہے جو کہیں دودھ کہیں شکر کہیں مکھن اور کہیں شراب وغیرہ کا ہے [19]"

ان قطعی وہمی تصورات کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہ تھا وہ لوگ جو یہ خیالات رکھتے تھے ان لوگوں کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے جو فطرت کا صحیح علم حاصل کرنے میں کامیاب ہو رہے تھے اور فطرت کی طاقتوں پر غلبہ حاصل کر رہے تھے۔

فن تعمیر عمارات اور ادب

اٹھارھویں صدی کے ہندوستان کے دماغ کا مطالعہ فن اور ادب میں اس کے کارناموں کے ذریعہ بہترین طریقہ پر ہوتا ہے۔ ان سے پتہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک ناقابل بیان الجھن ہندوستان کی روح پر طاری ہوگئی تھی۔ ایک اخلاقی اور ذہنی روگ اس کی کل توانائی کو چوس رہا تھا جو اچانک گراوٹ اخلاقی اور دماغی توانائی میں نظر آتی ہے وہ سب سے زیادہ عملی سیاست اور اس صدی کے ممتاز رہنماؤں کے کردار میں نمایاں ہے۔ اورنگ زیب نے مرض کا پتہ لگالیا تھا اور علاج بھی دریافت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن علاج مرض سے بھی زیادہ بدتر ثابت ہوا۔

فنون اور بالخصوص فن تعمیر میں منزل کی کیفیت کی بولتی ہوئی مثالیں ملتی ہیں۔ ونسنٹ اسمتھ نے نشان دہی کی ہے کہ "اورنگ زیب عالمگیر (1659ء تا 1707ء) کی طویل اور ناگوار حکومت میں خصوصیت سے فن اور خاص کر فن تعمیر کا زوال نمایاں ہے [20]"

ایک خاص وجہ جس کی بنا پر زوال شروع ہوا یہ تھی کہ حکومت اور فن کے درمیان بڑا قریبی رشتہ

تھا۔ فن کا خاص مربی بادشاہ ہوتا تھا اور فن کے اسٹائل کے طے کرنے میں فطری رجحان رغبت اور مقاصد مضبوط عوامل تھے۔

اکبر ایک تصورات میں ڈوبا ہوا انسان تھا جو عالمگیر امن اور یک جہتی کے خواب دیکھا کرتا تھا یہ خواب فتح پور سیکری کے شہر کی تعمیر میں حقیقت بن کر ظاہر ہوا۔ ابوالفضل کے الفاظ میں "شہنشاہ معظم شاندار محلات کے پلان بناتے ہیں اور اپنے دماغ اور دل کے کارناموں کو پتھر اور مٹی کا جامہ پہناتے ہیں۔[21]"

جہانگیر ایک خوش وضع عیش پرست اور ایک حساس عیاش تھا۔ اس کے جمالیاتی نظریوں نے دربار کے مصوروں اور رنگ سازوں کو جو اس زمانہ کے بڑے بڑے فن کاروں کو دعوت مقابلہ دیتے تھے شدت سے متاثر کیا۔ اعتماد الدولہ کا مقبرہ جو ان کی ملکہ نور جہاں نے تعمیر کرایا تھا اپنے آرائش و تزئین کے گراں بہا ہونے اور اپنے نقش و نگار کی نفاست کے لحاظ سے دربار کے مذاق کی ایک بہت عمدہ مثال ہے۔

شاہ جہاں عظمت و شان کا دلدادہ تھا ان کے رومانی تغزل نے تاج محل میں اپنے کو پورے طور پر ظاہر کیا۔ محبت کی ایک ایسی یادگار جو ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔

شاہ جہاں کا تخت سے اتار اجانا ایک عصر کے خاتمہ کا نشان ہے اورنگ زیب ایک حد درجہ جچا تلا مذہبی دیوانہ تھا۔ اس کے مذہبی جوش کے خشک کر دینے والے منہر برف سے فن کا چشمہ سوکھ گیا۔ رابعہ درّانی کا جو مقبرہ اورنگ آباد میں 1678ء میں بنا اس کے بارے میں پرسی براؤن کا نوٹ یہ ہے کہ "ان روحانی اور انسانی ترغیبات کا فقدان ہے جنھوں نے مغل کاریگروں کو اکسایا تھا۔[22]" لاہور کی بادشاہی مسجد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "معمار کی فطرت کے لیے جو کچھ ضروری ہے وہ نکل چکا ہے۔ جوہر سوکھ رہا ہے اور وہ بے لچک اور بے روح ہو رہا ہے۔[23]"

اورنگ زیب کے بعد مغل بادشاہوں نے بڑی بڑی یادگاروں کی تعمیر بند کر دی یہ کام صوبہ کے گورنروں کے ذمہ آگیا۔ ان میں نوابان اودھ سب سے زیادہ ممتاز تھے لیکن جو عمارتیں انھوں نے تعمیر کیں ان کے بارے میں ونسنٹ اسمتھ نے یہ فیصلہ دیا کہ "اورنگ زیب کے زمانہ کی ایرانی وضع کی عمارتیں چونکہ مسلسل زوال کے نمونہ کو ظاہر کرتی ہیں وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کا مفصل مطالعہ کیا جائے یا ان کی مثال پیش کی جائے۔ نواب صفدر جنگ کا مقبرہ جو دلی میں بنا، 1754ء وہ ہمایوں کے مقبرہ کی ایک سرسری نقل تھا اور جس کے پلاسٹر کی نمائش اندر سے بھی کی گئی تھی۔ نواب صفدر

لکھنؤ کی گھٹیا عمارتیں محض بیکار قسم کی نقالی ہیں۔[24] بمارؤن عظیم الشان امام باڑے کو "صرف ظاہری زیب و زینت" کا کام قرار دیتا ہے جو بھڑک دار اور بھدا ہوتے ہوئے محض آرٹ کا ایک بہانہ ہے جس کے شائل میں کوئی روحانی قدریں نہیں ہیں۔[25]

عمارتوں کی تعمیر کا فن جو شہادت مہیا کرتا تھا اس کی تائید دوسرے فنون سے بھی ہوتی ہے۔ بابر اور ہمایوں جنھوں نے مصوری کی بنا دلّی کے دربار میں ڈالی اور اس کی نشو و نما کی تھی وہ لوگ تھے جنھوں نے قسمت کے مدّ و جزر کو دیکھا تھا اور سالوں تک مصیبت، تباہی اور مہم جوئی کے بعد فتح اور سلطنت حاصل کی تھی۔ جس فن کی انھوں نے پرورش کی اس سے ان معاملات کی روح ظاہر تھی۔ ان کی سرپرستی میں جو فن کینوس کی زینت بنا اس میں محاصرے لڑائیاں، شکار حویلیوں کی تعمیر اور باغات کی ترتیب کے مناظر تھے۔ یعنی جرأت مندانہ مہم بازیوں کے مناظر اور تخلیقی اعمال۔ اکبر نے جو مصوری کو خدا کے فضل کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ تصور کرتا تھا۔ اس اعلا جذباتی اسٹائل کو فروغ دینے میں قوت محرکہ فراہم کی اور اس کے طور و طریق اس کے مافی الضمیر اور اس کے انداز تصویر کشی کو ہندوستانی بنانے کی ہمت افزائی کی۔ جہانگیر کے زمانہ میں جو نادر بصیرت کا خزانہ رکھتا تھا فن اپنے کمال کو پہنچ گیا۔ اگرچہ شاہ جہاں کا کل لگاؤ تعمیرات تک مرکوز تھا۔ لیکن مصوری بھی نشو و نما پاتی رہی۔ اس کے بعد اورنگ کا زہد خشک اور ان کے جانشینوں کے مصائب اور کمزوریوں نے فن پر بُرا اثر ڈالا۔ فن نے اپنی مردانگی، لچک، یقین اور مسرت انگیزیاں کھودیں۔ اس کا نقش و نگار اور اس کا رنگ زوال پذیر ہوگیا، نسوانیت ظاہری نمود و نمائش اور فرادیت پسندانہ ناز و نیاز اور سطحی جذباتیت اس کی نمایاں خصوصیت بن گئے۔ صرف ان ریاستوں میں جو مرکزی حکومت سے دور دراز مقامات پر واقع تھیں اور جہاں بیرونی حملہ آوروں کے حریصانہ تنگ و تاز کا کوئی خطرہ نہیں تھا مصوری اپنی زندگی اور دم خم کو برقرار رکھ سکی۔

ادب زندگی کا آئینہ ہے وہ سوسائٹی کے تبدیل ہوئے خط و خال کے عکس کو ظاہر کرتا ہے۔ دوسرے فنون کی طرح وہ بھی انسانی دماغ کی خواہشات اور اس کی تمناؤں اس کی امیدوں اور اس کے خوف اس کی روشنیوں اور اس کی پرچھائیوں کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی ادب دوسرے فنون سے مختلف ہے کیونکہ یہ بدترین مخالفانہ اور ناموزوں حالات میں بھی حسن پیدا کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ ہندوستان میں بڑے بڑے فنون کے بقا کا مدار حکومت کی سرپرستی پر تھا۔ جب حکومتیں سرسبز تھیں تو فن تعمیر فن مجسمہ سازی فن مصوری اور موسیقی اسی مقدار میں ترقی کرتے۔ مغل حکمران اپنی کثیر وسائل آمدنی کو قلعے محل قلعوں، مسجدوں، مقبروں اور محلات کی تعمیر پر صرف کرتے تھے۔ انھوں نے حسن اور شان و شوکت

کی عظیم یادگاریں اپنے پیچھے چھوڑی ہیں۔ وہ مصوروں پر جو کارخانوں سے متعلق تھے اکرام کی بارش کرتے تھے اور ان مصوروں نے حسن کی ایک دنیا تخلیق کی ہے جو نقش ونگار اور رنگوں کی آمیزش کی یکسانیت میں ایسی ہے جس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بادشاہوں اور شہزادوں کی روشن خیالانہ فیاضیوں نے دلّی گوالیار اور آگرہ کے موسیقی کے طریقوں کی امداد کی جہاں امیر خسروؔ، تان سین، بیجو وغیرہ نئے راگ اور نئی راگنیاں دریافت کر رہے تھے اور نئے نئے ساز (ستار) ایجاد کر رہے تھے۔ لیکن جب مزاج کے روز افزوں ترقی اور خزانہ کے گھٹ جانے سے یہ سرپرستی کم ہونے لگی تو فنون پر سیاہ بادل چھا گئے اور اٹھارھویں صدی نے ایک نمایاں زوال کا نمونہ پیش کیا لیکن ادب کے میدان میں ایسا نہیں ہوا کیونکہ شاعری بطور تجربہ اور بطور اظہار بیان بالکل ذاتی ہے۔ یہ بالکل ظاہر ہے کہ شاعرانہ ذہانت بیرونی واقعات وحالات سے آزاد ہے۔ اس اندھیری رات میں جس نے اورنگ زیب کے ہندوستان کو اس تیزی کے ساتھ گھیرنا شروع کر دیا جو گرم ممالک کا خاصہ ہے ادبی ستاروں کی چمک دمک نے آسمان کو اس کے ہر حصہ میں بقعۂ نور بنا دیا۔ تمام ہندوستانی زبانوں نے اپنے غیر معمولی ادبی ذہن والوں کی تخلیقات میں اس زوال کا نظّارہ پیش کیا ہے۔

اس کی بہترین مثال ہندی اور اُردو ادب سے پیش کی جا سکتی ہے۔ سترھویں صدی کا وسط ان دونوں زبانوں کی ترقی کے لیے ایک طرح کا دھارا تھا جو دو دریاؤں کو ایک دوسرے سے جدا کرتا تھا۔ پہلے عصر میں ادب کا استعمال کیا جانے لگا۔ عظیم شاعری جس میں انسان کے اندر بلند تر زندگی کا ذوق اور اس کی جستجو نمایاں ہو یا انسان کے اس عزم کا اظہار ہو کہ وہ بے عیب ذات حقیقی کے جمال کا نظّارہ کرے یا مالک الوہیت سے مل کر ایک ہو جانے کے جذبے یا اس غم ومسرت کے تجربات جو ایک رہرو راہ معرفت آخری منزل کے سفر کی جانب راہ میں محسوس کرتا ہے یا بڑے بڑے مقاصد کے حصول کی عظمت یا رومان یا محبت اور عبادت ان سب کی کلام شعرا میں موجودگی سترھویں صدی کے وسط کے قبل کی ڈھائی صدی کی ملکیت ہے۔

ہندی میں بھگتی کے تین مکتبۂ خیال نے اعلا قسم کی شاعری کو جنم دیا۔ ان کے ممتاز رہنما کبیر، سورداس اور تلسی داس تھے ان کے ساتھ وہ لوگ تھے جو تمثیلات کے ذریعہ رومانی نظمیں کہتے تھے مثلاً ملک محمد جائسی جنھوں نے دوہا اور چوپائی کے طرز کی نظم اختیار کی بعد کو ''رام چرتر من'' کی نظموں میں ان کا اتباع کیا گیا۔

اس کے بعد ایک عصر آیا جس کو ''رتی'' طرز کی شاعری کہا جاتا ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس موقع

پر شاعری کے ذہن رسا نے یہ کروٹ کیوں بدلی۔ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ صرف یہ کہ فن اور ادب دونوں نے پرانے صحت مند راستوں کو ترک کر دیا اور پیچھے کی راہ پر ان قدموں سے اترے جن سے تھکاوٹ، غیر ذمہ داری اور خفیف الحرکتی ظاہر ہوتی ہے وہ شعرا جو درباروں سے وابستہ تھے وہ اپنے سرپرستوں کے فضول کھیل تماشوں اور سطحی اعمال میں شریک ہوتے تھے۔ وہ شہزادوں اور درباریوں کی سازشوں، شرارتوں اور عیاشیوں کے عینی شاہد تھے اور ان کی شاعری اپنے مالکوں کے ناپاک جذبات کی دلالی کرتی اور ان کے شہوت کو بھڑکاتی تھی۔ ان کے نزدیک عورت کھیلنے کے لیے ایک گڑیا تھی اور انسان کی شہوت کو آسودہ کرنے کا ایک ذریعہ۔ وہ اپنی خود انفرادی شخصیت رکھنے والی ہستی نہ تھی اس لیے سچی محبت کی چیز نہیں بن سکتی تھی۔ جسے گرم جوشی سے منت سماجت کر کے راضی کیا جائے اور نہ وہ ایسی ہستی تھی جس سے ملنے پر اس کے احترام و اکرام کا لحاظ رکھا جائے اور قربانی دے کر اور خطرات کی مہم میں پڑ کر اسے حاصل کیا جائے۔ ان شعرا کی عورت ایک خوبصورت شہزادی تھی جو شاہی محل میں رہتی تھی اور جو عیش و عشرت کے سامانوں سے گھری تھی جو ریشم، سونا اور کم خواب میں لپٹی ہوئی تھی اور جو زیورات اور قیمتی جواہرات سے مزین تھی۔

یہ مصنفین ایک ایسے معاشرتی دور میں رہتے تھے جہاں جوش کی جگہ محرومی نے لے لی تھی۔ مقاصد سے لگاؤ ٹوٹ گیا تھا۔ پاکبازی کی جگہ منافقت نے لے لی تھی اور خود پرستی اور خود پروری سر بلند ہو گئی تھی اس لیے نہ تو خیالات میں گہرائی باقی رہ گئی تھی اور نہ احساسات میں امنگ۔ بلکہ دماغ کا خصوصی رجحان یہ ہو گیا تھا کہ شعرا زندگی کے دھاروں پر سمت کا خیال کیے بغیر بس بہتے چلے جا رہے تھے لوگ عیش و آرام چاہتے تھے نہ کہ پسینا اور محنت، اصلاح اور ترقی۔

شاعری زندگی سے اخذ نہیں کرتی تھی بلکہ روایات اور کتابوں سے خیالات تشبیہات استعارے اور مضامین سنسکرت کی پرانی کتابوں سے مستعار لیے جاتے تھے۔ یعنی یا تو کام شاستر (فلسفۂ جنسیات) سے یا نائک تائکیہ بھید (یعنی ہیرو اور ہیروئن کی ممتاز خصوصیات) سے اور النکار (یعنی علم بیان) سے۔

لیکن اس شاعری میں ایک ناپسندیدہ وصف بھی تھا۔ الفاظ میں یہ کامل تھی متناسب کا وازن دینے والے الفاظ، برمحل اور قابل فہم استعارے اور دلآویز ترنم سے یہ تخلیقات بھری ہوئی ہیں جو غیر معمولی طور پر دل کو لگتی ہیں۔ جو کچھ نفرت انگیز ہے اس کا بہت سا حصہ دلکش قوس و قزح کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔ اس کا بہت سا جادو فارسی اور اُردو ادب کا مرہون منت ہے۔ یعنی جذبات کی فراوانی۔ طرز کلام کا تنوع۔ چھوٹی نظموں میں غنایت اور خطابت الفاظ کے لحاظ سے۔

چنتامنی ترپاٹھی سے جس نے "کوئی کل پدروما" 1650ء میں تصنیف کی۔ تحریک شروع ہوئی اور انیسویں صدی کے آغاز تک بے شمار شعرا نے اس کی نشوونما میں حصّہ لیا، ان میں ماتی رام۔ دیو۔ رسلن داس پدماکر سب سے زیادہ ممتاز تھے۔

اردو ادب نے اس کے متوازی راستہ اختیار کیا۔ اس زبان نے دلّی کے گردونواح میں ارتقائی نمو حاصل کیا۔ لیکن اس کے ادب کا اوّلین گہوارہ دکن تھا۔ پاکیزہ نفس صوفی جن میں اسلامی تعلیمات کے پھیلانے کا جذبہ تھا۔ اردو ادب کے پیش رو تھے۔ بہت جلد تعلیم یافتہ لوگوں میں شعرگوئی کا فیشن پھیل گیا جنھوں نے اس کو نفاست بخشی اور اپنے کلام سے توانا کیا۔ شروع زمانہ کی شاعری کی زبان گھریلو تھی یعنی اسی سرزمین کی تھی اور بولنے والی زبان "پراکرت" سے جس سے نکلی تھی بہت قریب تھی۔ اس کے مضامین زندگی سے اخذ کیے گئے تھے اور ان پر اظہار خیال فطری انداز کا تھا۔ اور کلام زور سے بھرپور تھا۔ نصیحت آموز مذہب صوفیانہ سفر معرفت کے تمثیلی افسانے۔ تنائی نظمیں اور رزمیہ شاعری، رومان محبّت اور مہم جوئی۔

اس کے بعد مغلوں نے دکن پر چڑھائی کر دی اور آخرکار برہمن سلاطین کی حکومت کا چراغ گُل ہو گیا۔ سرپرستی سے محروم ہو کر شعرا نے ترک وطن کر کے شمال کی طرف جانا شروع کیا۔ وہ دلّی اس وقت پہنچے جب مغل سلطنت کا آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ لیکن عام اخلاقی گراوٹ کے باوجود شاعری وطن کی سرزمین میں خوب پھلی پھولی۔ اٹھارھویں صدی میں اردو ہندوستان کے ہر گوشہ میں پھیل گئی اور اردو کے ادبی حلقے ہندوستان کے ہر صوبہ میں قائم ہو گئے۔ جب انگریزوں کا تسلّط شمالی ہندوستان میں بڑھ کر چھا گیا تو اردو عام زبان بن گئی جسے مہذب سوسائٹی۔ مسلمان اور ہندو ادب کے اظہار کے لیے اور سوسائٹی میں باہمی گفتگو کے لیے استعمال کرتی تھی۔

لیکن اس زمانہ میں جس ادب کی تخلیق ہوئی اس میں وہ تمام برائیاں تھیں جو سوسائٹی کو ورثہ میں ملی تھیں۔ شاعری عطائیوں کی سی تھی جو صنعت گری اور خودنمائی سے بوجھل تھی۔ اس کی روح پر مصنوعی عروض قافیہ کے حدود کی بیڑیاں لگی ہوئی تھیں اور اس کا مزاج کبھی تو حواس خمسہ سے متعلق ہوتا تھا اور کبھی روحانیت سے اور دونوں میں سے کسی میں تجربہ کی گہرائی نہ تھی۔ مایوسی اور محرومی کے بادل اس پر منڈلاتے رہتے تھے حقیقت سے فرار ہی میں اس نے عافیت سمجھی لیکن بہرحال اپنے ہمعصر ہندو شعرا کی طرح اردو مصنّفین نے الفاظ کی بندش اور ترتیب میں حیرت ناک فن کاری ظاہر کی۔ اور اردو زبان کو اظہار و بیان کا ایک حیرت ناک بلکہ لطیف آلہ بنا دیا۔ وہ ستارے جو غیر معمولی روشنی سے چمکے

وہ سودا، میر، مومن اور غالب تھے۔

مگر اس عصر کے ہندی اور اردو کے شعرا فنون لطیفہ کے خاص فنی اوصاف پر زور دینے والے تھے جو اپنی کل لیاقت ناکندہ الفاظ کو کاٹنے اور پالش کرنے پر صرف کرتے تھے۔ ان کے رنگوں کو ایک دوسرے سے ملانے اور اس کی چمک دمک کو یکسانیت دینے میں ویسا ہی کام کرتے تھے جو سنار ان ہاروں کے لیے کرتا ہے جو پہنے جاتے ہیں۔ وہ اپنے ان کاموں میں اس درجہ منہمک تھے کہ زندگی کے کیا معنی ہیں اور ادب کا کیا اعلا مقصد ہے ان کے احساس سے بھی وہ بیگانہ ہو چکے تھے۔

جو کچھ ہندی اور اُردو کے لیے صحیح تھا وہی شمال اور جنوب کی دوسری زبانوں کی بھی حقیقت تھی۔ یہ بہت قابل غور بات ہے کہ زبانوں، نسلوں اور عقائد کے اختلافات کے پیچھے کس طرح ایک گہرا کلچرل اتحاد تمام ہندوستان کے باطن میں بسا ہوا تھا۔ دو عہدوں میں سے جن میں متوسط زمانہ کے ہندوستان کی ادبی تاریخ تقسیم کی جاسکتی ہے۔ ہر ایک میں کائنات کے بارے میں نظریات، انسانی مسائل پر سوچنے کے انداز، مضامین زیر بحث اور نظریہ الوہیت ان سب میں زبردست یکسانیت ہے۔

اس عصر کے پہلے حصہ میں رامائن، مہابھارت اور پران خزانوں کے گھر تھے جن کی پوری تلاشی مضامین حاصل کرنے کے لیے کی جاتی تھی اور اپنشد، بھگوت گیتا اور بھگوتا زندگی کے فلسفہ کے چشمے اور منبع کو فراہم کرتے تھے ان کو تمام زبانوں میں ترجموں کے ذریعے یا حوالوں کے ذریعے دُہرایا جاتا تھا۔ ہندی میں تلسی داس، بنگلہ زبان میں کری تبواس اوجھا، تامل میں کامبان، تیلگو میں 'بھاسکارا' ملیالم میں 'اُتتاچن'، مرہٹی میں 'مکتیشور' گجراتی میں 'گردھر' آسامی زبانوں میں 'مدھوا کندالی' اوڑیہ زبان میں 'بلرام' نے یا تو بالمیک رامائن کا ترجمہ اپنی زبان کے محاوروں اور استعاروں کے ساتھ کیا۔ یا انھوں نے اسی کہانی کو ایسی ترمیمات کے ساتھ پیش کیا، جو ان کے تصورات اور عقاید کا تقاضہ تھا۔ اس کے علاوہ اردو اور فارسی میں بھی رامائن کے ترجمے ہوئے۔ مہابھارت اور پرانوں نے ان تمام زبانوں کے شعرا کو اُکسایا کہ یا تو وہ ان کا مکمل ترجمہ کریں یا ان کے محض اجزا کو اپنی زبان میں بیان کریں۔

اُپنشد، بھگوت گیتا اور بھگوتا نے لاکھوں انسانوں کو بلاتفریق مذہب جس کے وہ پابند تھے۔ نیک زندگی گذارنے پر راغب کیا۔ تمام ہندوستان کے ہندو ان کو یا تو اصل سنسکرت زبان میں پڑھتے تھے یا علاقائی زبانوں میں ان کا ترجمہ پڑھتے تھے۔ مسلمانوں کا بھی ان تک گذر ان صوفیوں کے ذریعہ تھا جو ان کی تعلیمات سے ہندو سادھوؤں کے میل جول بذریعہ تراجم آشنا ہوئے تھے۔ فیضی نے گیتا کا ترجمہ فارسی اشعار میں کیا تھا۔ داراشکوہ نے پچاس اپنشد کو نثر میں ترجمہ کیا اور

انہی کے اشارے پر بھگونتا کا دسواں باب فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ بنواری داس ولی نے کرشن مصرا کی تصنیف "پربودھ چندرودایہ" کا ترجمہ فارسی میں کیا۔

دوسرے حصہ میں بھی اسی طرح کا کردار نمایاں ہے ڈاکٹر "ورا دھاراجن" نے تامل کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کی صدائے بازگشت کل زبانوں کے مؤرخین کے ہاں گونج رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "اس زمانہ کا ادب عریانی، خودسرائی (تعلّی) اور زبان کے قواعد کی انتہائی پابندی کے عمل سے بھرا ہوا ہے۔ سادگی، برجستگی اور ضبط و تحمل جو شروع زمانہ کے ادب کا شعار رہا ہے اب ناپید ہے۔ اس زمانہ کے بہت سے شعرا یا تو تقلید کرتے ہیں یا پامال مضامین دُہراتے رہتے ہیں اور نہ صرف تفصیلات میں بلکہ ہر طرح کے اظہار و بیان میں شاعری کا ذوق مردہ ہو گیا تھا۔ شعرا کے کلام کی داد الفاظ کی ترتیب اور اس سے پیدا شدہ موسیقی اور بحر کے انتخاب میں فن کاری پر دی جاتی تھی۔ ہاں ہم کو ایسے بھی مصنفین ملتے ہیں جو طبع زاد تخلیقات پیش کرتے ہیں لیکن وہ بہت کم ہیں۔ لیکن ان عظیم شعرا کے کلام کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی جذبات کے ہنگاموں اور مبالغوں کے اظہار پر طفلانہ مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس زمانہ کی بہت سی تصنیفات میں فن کے بجائے مصنوعیت ہے۔ اور اس لیے اس کی بہت سی تصانیف گلدستہ طاق نسیاں ہو گئیں[26]"

ڈاکٹر سیتاپتی اس زمانہ کے تیلگو ادب کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "اچھی شاعری غائب ہو گئی اور ایک ازوال کا زمانہ آکر چھا گیا[27]"

شری آدیا رنگا آچاریہ کے قول کے مطابق "اٹھارھویں صدی کے وسط میں کنادا کا وجود باقی نہ تھا[28]" مرہٹی میں "عاشقانہ شاعری عام ہو گئی اور روحانی محبت اور عبادت کا اظہار بھی شہوانی جذبات کے طور و طرز میں ہوتا تھا" سشریمتی ولیش پانڈے کہتی ہیں کہ "یہ بالکل ظاہر ہے کہ زوال آ گیا تھا۔ مابعد الطبیعات کا فہم و ادراک کند ہو رہا تھا۔ کام اعلیٰ سے قلبی لگاؤ کا تقاضہ تنزل کی طرف جا رہا تھا اور ایک سپاہی کی زندگی کی بہادری اور عزیمت بھی گم ہوتی جا رہی تھی۔ ادب کا یہی پر مبنی عشرت پسندی اور فاضلانہ تکلفات پر اسی طرح جم تا جا رہا تھا جب کہ بعد کے پیشواؤں کے زمانہ میں ہوا[29]" ترویدی کے قول کے مطابق "گجرات میں زندگی 1790ء سے انگریزوں کے ورود تک برابر تنزل کی طرف کھسکتی جا رہی تھی اور دیارام کے حسن بیان سے بھی اس کا کوئی ازالہ نہ ہو سکا[30]" ڈاکٹر ایس کے بینرجی کی رائے میں "اٹھارویں صدی کے بنگال کی شاعری اپنے کو پرانے نمونوں کے بے رنگ انداز میں گھسیٹ رہی تھی۔ مضامین اور طرز کلام دونوں لحاظ سے[31]" آسامی ادب میں "سیکولر ذوق غالب نظر آتا ہے اور آسام کے باشندگان کے اس سست زمانہ میں عاشقانہ اور مزاحیہ نظمیں لکھی گئیں[32]" ہندی اور اُردو دونوں زبانیں یکساں

ہماری کاشت کار تھیں۔

اس تمام ہمہ گیر تاریکی میں روشنی کی جو ایک کرن نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں علم عروض و قافیہ، اسلوب بیان اور طرز کلام کے استادان فن پیدا ہوئے جن کے کلام میں خیالات میں بلندی نہ ہونے کے باوجود زبان پر بڑی قدرت کا اظہار ملتا ہے۔ انھوں نے زبان کو جس میں وہ اپنا کلام پیش کرتے تھے صیقل کر کے اتنی ترقی دے دی کہ وہ اس قابل ہوگئی کہ مستقبل کے تقاضوں کو پورا کر سکے اس لیے یہ لوگ اس زمانہ کے نمائندے بھی تھے جو گذر رہا تھا اور جو زمانہ آئندہ آرہا تھا اس کے اوّلین رہنما بھی تھے ان کی ادبی تخلیقات ہندوستان کی کلچرل وحدت کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ یہ اور بھی زیادہ پُر اثر ہوتا اگر خیالات کے دائرے میں ہندو اور مسلمانوں کی تعلیمات کے اندر ایک ناقابل عبور خلیج حائل نہ ہوتی اور عمل کے دائرے میں احساس قومی کا فقدان نہ ہوتا۔

حوالہ جات

1- قرآن 11 109-

2- ابن عربی۔ ترجمان الاشواق۔ نکلسن آر۔ اے۔ اے لٹریری ہسٹری آف عربی (کیمبرج 1930ء صفحہ 403 -

3- داراشکوہ حسنات العارفین (قلمی نسخہ) صفحہ 32 -

4- مکتوبات امام ربانی جلد 3 مکتوب 23-

5- ایضاً۔

6- محمد میاں۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی جلد اوّل صفحہ 174 -

7- امام ربانی۔ مکتوبات جلد اوّل خط نمبر 54 -

8- محمد میاں۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی جلد اوّل صفحہ 340-

9- ایضاً۔

10- شیخ محمد اکرام (رود کوثر) (اُردو) مرکنٹائل پریس لاہور صفحہ 309-

11- آدم ڈبلیو رپورٹ آف دی اسٹیٹ ایجوکیشن ان بنگال (اڈیٹیڈ بائی اے باسو 1941ء صفحہ 7-6-

12- ایضاً دیباچہ صفحہ 25 -

13- آدم ڈبلیو رپورٹ آن ایجوکیشن او۔ پی سٹ صفحہ 147-

14- ایضاً۔

15- ایضاً صفحہ 170۔

16- ایضاً صفحہ 276۔

17- ایضاً صفحہ 150۔

18- برنیر ایف ٹریولس او۔پی۔سٹ صفحہ 160-155۔

19- ایضاً صفحہ 340-334۔

20- اسمتھ وی۔ اے ہسٹری آف فائن آرٹ ان انڈیا اینڈ سیلون (سکنڈ ایڈیشن آکسفورڈ 1930ء) صفحہ 185۔

21- ابوالفضل آئین اکبری ترجمہ بلوچ مین کلکتہ 1927ء صفحہ 252

22- براؤن پرسی انڈین آرکی ٹیکچر۔ اسلامک پیریڈ صفحہ 120۔

23- ایضاً صفحہ 121۔

24- اسمتھ وی۔ اے ہسٹری آف فائن آرٹ ان انڈیا سیلون او۔پی۔سٹ صفحہ 186۔

25- براؤن پرسی آرکی ٹیکچرس۔ دی اسلامک پیریڈ صفحہ 128۔

26- انڈین لٹریچر ایڈیٹ بائی ڈاکٹر نگندرا اینڈ ادرس صفحہ 47۔

27- ایضاً صفحہ 96۔

28- ایضاً صفحہ 166۔

29- انڈین لٹریچر ایڈیٹ بائی ڈاکٹر نگندرا اینڈ ادرس صفحہ 252۔

30- ایضاً صفحہ 234-232۔

31- ایضاً صفحہ 386۔

32- ڈاکٹر بروس اینڈ کاسطالی ایضاً صفحہ 439۔

چھٹا باب

ہندوستان پر برطانیہ کا تسلّط

ہندوستان تک سمندر کے راستے

واسکوڈی گاما کی ہندوستان تک سمندری راستہ کی دریافت نے ایشیا اور یورپ کے تعلقات کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ اس کا فوری اثر تو یہ ہوا کہ اس سمندر سے جو پوربی افریقہ اور ایشیا کی زمینوں (یعنی عرب، ایشیا اور ہندوستان کی زمینوں) کو چھوتے تھے ترکی کا اقتدار ختم ہوگیا۔

لیکن اس دریافت کے دو سو سال بعد تک مغربی لوگوں کی بحری تجارت کی سرگرمیاں صرف ساحل تک محدود رہیں۔ انھوں نے سمندروں پر تو غلبہ حاصل کرلیا لیکن اناطولیہ، ایران اور ہندوستان کے اندرون آلِ عثمان صفویوں اور مغلوں نے رعب ڈالنے والی شان وشوکت کے جو شاہانہ نظام تیار کر لئے تھے وہ مغربی مہم بازوں کے حوصلوں کو آگے بڑھنے سے روکتے تھے۔

ان دو صدیوں، سولھویں اور سترھویں صدی میں، ہندوستان اپنی عظمت اور شان کے عروج پر پہنچا مگر اس کا عروج ہی اس کی تباہی کا باعث ہوا۔ اچھی طرح آزمائے ہوئے راستے کو بدلنا ناممکن ہوگیا۔ روایتیں جامد تھیں اور دماغ اپنی ہی چہار دیواریوں میں قید۔ اس کا اقتصادی ڈھانچہ سماج کو ریزہ ریزہ کردینے والا تھا جس سے انسانی برادری تنگ دیواروں کے اندر قید ہو جاتی تھی اندرونی آزادی، بیرونی اقتدار اور احکام کے تابع تھی۔ نکتہ چینی اور اختلاف کو ایسی نظر سے دیکھا جاتا تھا کہ جیسے یہ گناہ ہوں۔

دوسری طرف یورپ میں پندرھویں صدی کے جاتے جاتے آزادی کی ہوا چلنی شروع ہو گئی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ وسعت اور طاقت میں ترقی کرتی گئی۔ نشاۃ ثانیہ نے دماغ کی بیڑیوں کو توڑ دیا۔ اصلاحات (ریفارمیشن) نے کلیسا کے ظلم سے دماغ کو نجات دلا دی۔ تجارتی اور صنعتی انقلابوں نے سماج کی بنیادوں کو چوڑا کر دیا اور سیاسی انقلابات نے قومی حکومتوں کی جدید لمبائی چوڑائی کو ظاہر کیا۔ جاگیردارانہ انجماد سیلاب کی نذر ہو گیا۔ قوت متحرکہ زندگی میں داخل ہوئی اور انسان اپنے کو اونچا محسوس کرنے لگا۔

مسلمان ترکوں کا عیسائی یورپ میں مشرق سے داخلہ اور افریقہ کے گرد و نواح سے عیسائیوں کا مسلمانوں کو بھگانا اور تعاقب کرنا پندرھویں صدی کی دو متوازن تحریکات تھیں جن کا یکساں عالمگیر اثر ہوا وہ مشرق کی منجمد سوسائٹیوں کو مغرب کی ترقی یافتہ ریاستوں سے ہنگامہ خیز ٹکراؤ میں لائیں دو سماجی طریقوں کے تصادم سے جس میں ایک کی دماغی، اقتصادی اور سیاسی طاقتیں دوسرے سے برتر ہوں۔ دونوں کی سطحوں میں جتنا فرق ہوگا اسی حساب سے توانائی کے ظہور کو طے کیا جا سکے گا۔

واسکوڈی گاما اس تحریک کی نشانی تھا۔ وہ ایک جارح یورپ کا ہراول تھا لیکن وہ ملک جس کا وہ باشندہ تھا یعنی پرتگالی وہ اس تحریک کا خرچ زیادہ عرصہ تک برداشت کرنے کے قابل نہ تھا اس لئے یہ دوڑ میں پیچھے رہ گیا اور قیادت دوسرے مضبوط ہاتھوں میں چلی گئی۔ ہالینڈ، فرانس اور انگلستان پرتگال اور اسپین کے رقیب بن گئے۔ انھوں نے اتنا دباؤ ڈالا کہ یہ دونوں اکھاڑے سے ہٹ گئے۔ قیمتی انعام حاصل کرنے کے لئے اب رقابت ان تین کے اندر شروع ہوئی، ہالینڈ، فرانس اور انگلستان۔ آخرکار انگلستان اس میں کامیاب ہوا کہ اس نے ہالینڈ اور فرانس کو ہندوستان سے نکال باہر کیا اگرچہ ہالینڈ، انڈونیشیا کے جزیروں پر برابر قابض رہا اور فرانس انڈوچائنا (ہند وچین) کو اپنے تسلط کے اندر لے آیا۔

جس ڈھب سے انگریز ہمت کر کے ہندوستان کے ساحلوں تک آئے ڈیڑھ سو سال تک صبر سے انتظار کرتے رہے اور بہت معمولی سوداگروں کی طرح اپنی تجارت کرتے رہے حتٰی کہ ان کی سیاسی قسمت کا پانسہ پلٹنے لگا تب وہ ملک کو اپنی غلامی میں لے آئے۔ یہ انسانی تاریخ کا ایک عجوبۂ روزگار واقعہ ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس زمانہ کے مقاصد اور اس کے اداروں پر نظر ڈالی جائے۔

یورپ میں تجارتی روزگار

سولہویں صدی میں یورپ نے اپنے ازمنۂ وسطیٰ کے زرعی نظام کو پیچھے چھوڑ دیا تھا اور بنیاپن کے زمانہ میں داخل ہو گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرمایہ دار تاجروں یا متوسط طبقہ کے سوداگروں کا گروہ مالداروں کی حکومت کا نظام لے کر اٹھا۔

یہ تجارت یا بنیاپن کوئی اقتصادی ماحول نہ تھا بلکہ ایک دماغی نقطۂ فکر یا زندگی کا ایک فلسفہ تھا۔ سماج کا یہ ایک نمونہ تھا۔

یہ تاجرانہ نظام قدامت سے جدت کی جانب اور جاگیردارانہ مزاج سے قومی سالمیت کی طرف قدم اٹھانے کی علامت تھا۔ اس نے زراعت، صنعت اور تجارت میں امداد باہمی (کوآپریٹیو) کی رغبت کو فروغ دیا۔ امراء کے محلات ماتحت ہونے والی زراعت کا زوال اور انجمن تجار کے فرسودہ آئین و ضوابط سے صنعت اور تجارت کی آزادی کا نتیجہ پیداوار کی ترقی اور کوآپریٹیو تجارت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ مقامی اور فرقہ وارانہ مفاد کی جگہ پورے ملک کے وسیع تر مفادات نے لے لی۔ جگہ جگہ شہروں اور قصبوں نے چنگی کے جو قوانین بنا رکھے تھے اور جو علیحدہ علیحدہ قاعدے جاری کر رکھے تھے ان سب کی جگہ تمام ملک کے لئے یکساں معیار کے قواعد و ضوابط تیار ہوئے۔ مواضعات اور قصبات کی خود کفالتی قوم کی خود کفالتی میں ضم ہو گئی۔ سوداگری نے ایک طرف تو افراد میں اپنے کو نمایاں کرنے کے جذبے کو ترقی دی دوسری جانب اس نے افراد میں باہمی امداد و تعاون کی نشو و نما کی۔ اس دوہرے نشو و نما کا نتیجہ یہ ہوا کہ درآمد و برآمد کی منڈیوں کے منتظمین کا ایک طبقہ پیدا ہوا جن کی فنی مہارت پیش بینی اور نئے تجربات نے وسائل اور ذرائع کو زیادہ بہتر طور پر استعمال کرنے کی راہ نکالی۔ نئے نئے طریقے ترقی پذیر ہوئے اور نئے قسم کے معاہدے اور نئی طرز کے بازار وجود میں آئے۔ یہی نہیں بلکہ مشترکہ کاروبار میں نئے تجربات کا دروازہ کھلا اور بیرون ملک میں سوداگری کے لئے سرمایہ کو ایک جگہ جمع کرنے کی راہ نکلی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بینک کے کاروبار، قرض کے لین دین، قومی صنعت اور بیرون ملک کی تجارت کے نشو و نما کے لئے سامان فراہم ہوا۔ مزدوروں کی ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت بڑھ گئی اور محنت اور صنعت میں خصوصیت حاصل کرنے کو ترقی ملی۔ چھوٹے چھوٹے کاروباروں کی جگہ بڑی بڑی صنعتوں کے مالکان تجار شہزادوں اور مہاجنوں نے لے لی۔ سوداگری نے ایک جدید ضابطۂ اخلاق مرتب کیا۔ ازمنۂ وسطیٰ میں اقتصادیات، مذہب

اور اخلاق سے جدا نہیں تھے اور ان کی رہنمائی کلیسا کے احکامات سے ہوتی تھی۔ اب روشن خیالی پر مبنی ذاتی مفاد نے مذہب اور اخلاق کی جگہ لے لی۔ اس یقین نے کہ سماجی اسباب و نتائج کے قوانین غیر مبدل ہیں۔ (یعنی ایک ایسا عقلی اصول جو بسا اوقات سماجی زندگی سے غیر اخلاق اور غیر انسانیت نواز طریقوں سے ہم کنار رکھتا ہے) گرجا کے قانون اور اقتدار کو منسوخ کر دیا۔ اس کے بعد تجارت میں حکومت کی عدم مداخلت اور آزاد تجارت کی تبلیغ ہوئی جو آدم اسمتھ کی مشہور تصنیف "دی ویلتھ آف نیشنس" میں مرقوم ہے آدم اسمتھ کہتا ہے کہ "یہ بوچڑ، شراب بنانے والے اور نانبائی کی فیاضی نہیں ہے جس سے ہم اپنے رات کے کھانے کی امید رکھتے ہیں بلکہ ان کی نظر خود اپنے مفاد پر ہم ان سے بات کرتے ہیں تو ان کی انسانیت کا حوالہ نہیں دیتے بلکہ اس کو دماغ میں رکھتے ہیں۔ خود ان کو اپنے آپ سے محبت ہے اور ہم اپنی ضروریات کے بارے میں ان سے گفتگو نہیں کرتے بلکہ ان کو خود ان کے فوائد بتلاتے ہیں"[4] اس طرح خود اپنے آپ سے محبت کو بلند کر کے انسانی سماج میں ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ کا یہ ایک لازمی اصول بنا دیا گیا۔ آدم اسمتھ آگے چل کر لکھتا ہے کہ "خود اپنے آپ سے محبت انسان کو خدا کا عطیہ ہے" اس نئے قانون اخلاق نے بطور نتیجہ ہر طریقے کو جائز قرار دے دیا اور اس نے ان لوگوں کو یعنی سوداگروں کو مدت دراز کے بنے ہوئے رسم ورواج اور انسانی ضروریات کو نظر انداز کرنے پر اصرار کرنے میں اور زیادہ بے رحم کر دیا۔ ان لوگوں نے زمانۂ قدیم کے ستانے کے جتنے طریقے رائج تھے ان سب کو اپنایا۔[5]

صاحبانِ اقتدار کی پابندیوں سے مذہب کے رہائی پانے کے بعد فرد کو اپنی انفرادی حیثیت میں حکومت کے اقتدار کی بے چون وچرا اطاعت کرنی پڑی جب کہ وسطیٰ زمانہ کا خیال یہ تھا کہ انسان کی تمام کوششوں کی منزل یہ ہونی چاہئے کہ وہ اپنی روح کے لئے نجات حاصل کرے اور جب کہ اقتصادی آزادی کا منشا انسان کی دنیوی فلاح وبہبود تھا۔ سوداگری کے حلقہ کے مدبرین اور مصنفین نے حکومت کی رعایا کو حصول مقصد کا ذریعہ سمجھا اور وہ مقصد خود حکومت تھا۔[6]

اس طرح سوداگری نے حکومت کے اقتدار پر کلیسا کی پابندیوں کو دور کرنے میں مدد کی اور آزاد خیالی عالم وجود میں آکر مسند نشیں ہوئی۔ یہ نہایت مناسب موقع تھا جب ٹامس ہابس اسی وقت منظر عام پر آیا تاکہ وہ اس کی پیدائش کو برکت دے اور اس کی جنم کنڈلی تیار کرے۔

متوسط طبقہ اپنی اقتصادی ضروریات پوری کرنے کے لئے جس سیاسی نظام کا طلب گار

تھا وہ وہی تھا جس کی تفصیل ہابس نے دی۔ اس نظام میں حکومت کو اقتدار اعلیٰ حاصل تھا۔ ایسا اختیار جو ازمنۂ وسطیٰ کے دو رقیب طاقتوں، یعنی کلیسا اور امرا پر فائق رہے۔ کلیسا کا اقتدار اس لئے ختم ہو گیا کہ ان کے ضوابط سخت گیر تھے جو افراد کی حوصلہ مندیوں کو روکتے تھے۔ اور امرا کا اقتدار اس لئے ختم ہو گیا کہ وہ امن وامان میں خلل ڈالتے تھے جس سے کاروبار سوداگری کے جدید تجربوں میں مداخلت ہوتی تھی۔ ایک سیکولر حکومت جس کو لامحدود اختیارات ان حالات کو قائم رکھنے کے لئے حاصل ہوں جن میں متوسط طبقے اپنے مادی اغراض کو وطن میں اور بیرون وطن ملکوں میں حاصل کر سکیں۔ یہ تھا ہابس کا نظریہ اور یہی وقت کی ضرورت بھی تھی۔

یعنی ایسا بنیا پن جس میں صرف اپنے نفع کے پیسے پیسے پر نظر رکھی جائے اور جسے مرکنٹائلزم کہا جاتا ہے اس کا خاص مقصد قوم کی مادی خوش حالی تھا اس کا رخ سیکولر اور اس کا نظریہ سائنسی تھا۔ اس میں اردگرد دنیا کی ایک نئی بیداری مضمر تھی یعنی جغرافیائی دریافت علم ہیئت اور فطرت کے مظاہر اور اس کی طاقتوں میں ایک جدید طرز کی دلچسپی۔ یہ خیالات اور اعمال دونوں میں عقل کے استعمال کی حامی تھی۔

1645ء میں "رائل سوسائٹی" کا قیام اس طرز فکر کے اظہار کا بہترین طریقہ تھا۔ اس کے مورخ ٹامس اسپریٹ جو روچیسٹر کے بطریق تھے ایسا اظہار خیال کرتے ہیں "اب انسان قدامت کے نمونے سے تھک گئے ہیں اور مذہبی مباحث سے عاجز آچکے ہیں۔ اب حصول علم کی ایک عالمگیر تمنا اور بھوک ہے۔

متوسط طبقہ جو اس بنیا پن کے فلسفہ پر عمل درآمد کرتا تھا وہ اس زمانہ کے سیاسی اور اثر ڈالنے والے عناصر میں سب پر غالب عنصر تھا۔ یہ لوگ اپنے دہرے اغراض یعنی طاقت اور دولت کے مقاصد کے حصول کے لئے حکومت کی پالیسیوں کو ڈھالا کرتے تھے۔ صنعت کی وسعت کو نشو ونما دینے، پیداوار میں اضافہ کرنے، باہر سے برآمد روک کر اور مقابلہ ختم کر کے اسے ترقی دینے اور اندرونی مداخلتوں کو دور کرنے کے لئے حکومت کی طاقت کی ضرورت تھی۔ مقصد یہ تھا کہ تیار شدہ مال کی باہر سے درآمد روکی جائے۔ اپنا مال باہر بھیجنے کی ہمت افزائی کی جائے۔ البتہ سوداگروں نے قیمتی دھات مثلاً سونا اور چاندی کی درآمد کی ہمت افزائی کی کیوں کہ اس سے اشیا کے دام بڑھا کر منافع زیادہ حاصل کیا جاتا تھا۔ اسی کے ساتھ حکومت کی اس طاقت میں اضافہ ہوتا تھا کہ وہ زیادہ مقدار میں اور بہتر سامان حرب سے مسلح افواج کا خرچ برداشت

کر سکے اس لئے یہ نظریہ عام ہوگیا کہ سکۂ رائج الوقت ہی دولت ہے اس لئے جو اشیا باہر بھیجی جائیں ان ہی کی قیمت کے برابر سونے چاندی کی سلاخوں کو ملک کے اندر آنا چاہئے۔ سوداگری کے اس نظریے کے معتقدین یہ یقین کرتے تھے کہ دنیا کی تجارت کی مقدار معین ہے اور ایک قوم کی دولت کا لازمی نتیجہ دوسری قوموں کی عسرت ہے۔

بین الاقوامی تجارت کے معاملہ میں وہ کل پر قبضہ جمائے رکھنے کے قائل تھے۔ رقیبوں کا بازار اُجاڑنے کے لئے وہ جنگ تک کرنے سے ذرا بھی نہ ہچکچاتے اور نہ تو وہ اس لئے تیار تھے کہ اپنی قوم کے لوگوں میں بھی مقابلہ کی اجازت دیں کیوں کہ مقابلہ کا نتیجہ منافع کی کمی ہوتا تھا اس کا انجام یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے لئے بلا شرکت غیرے حقوق مخصوص مراعات اور اجارہ داری حاصل کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ اس خواہش نے کہ بازاروں میں تیار شدہ مال گراں بکے اور کچا مال سستے داموں خریدا جائے قدرتاً نوآبادیات کے قیام فتح اور غلبہ کی جانب رہنمائی کی۔

اس سوداگرانہ اقتصادی سرگرمیوں نے اس فلسفہ کا خیر مقدم کیا جو ہابس نے نیچر کے معاملات وکیفیات کا اس میں رچا دیا تھا۔ چنانچہ تجارت شمشیر بکف کی جاتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سولھویں صدی سے اٹھارھویں صدی تک مسلسل تجارتی جنگیں تمام مغربی طاقتوں میں ہوتی رہیں۔ انگریز سمندری کپتان تھے انھوں نے جن سمندروں پر پرتگالی اور اسپینی اپنا حق جتاتے تھے ان کو ان سے صاف کر دیا اور بحر اٹلانٹک میں چور بازاری کرتے اور سمندری ڈاکے ڈالنے لگے۔ خزانے اور مالِ تجارت لوٹ لئے جاتے اور قبضہ میں کر لیے جاتے تھے۔ اس طرح دولت کی کثیر مقدار تشدد کے ذریعہ مہم سے چھین لی گئی۔ ہاکنس افریقہ کے مغربی ساحل پر غلاموں کی تلاش کرتا تھا۔ ڈرک پرویشر گلبرٹ اور ریلے سمندروں میں جہاز چلاتے اور ناجائز تجارت کا کام کرتے تھے۔ جہازوں کو لوٹتے اور اپنے قبضہ میں کر لیتے تھے اور ریاستوں کا الحاق کر لیتے تھے تاکہ وہاں انگریزکی نوآبادی قائم کریں۔

نوآبادیات کے قیام نے سوداگری کے مقصد کو پورا کیا کیوں کہ بعض مخصوص صنعتوں مثلاً جہازوں کی تعمیر میں انگلستان کے کچے مال کے معاملہ میں ناکافی وسائل میں اضافہ کرنے کے لئے اس کی ضرورت تھی۔ عام رائے یہ تھی کہ نوآبادیات کا قیام اس لئے ہے کہ وہ مادر وطن کے لئے کبھی نہ ختم ہونے والے خزانے کے کان کا کام کرتی رہیں۔ نوآبادیاں مادر وطن کی

تیار شدہ چیزوں کو استعمال کریں اور ایسی اشیا برائے فروخت تیار کریں جو باہر سے سامان منگا کر روپیہ باہر کھینچ جانے کو روکیں۔

امریکہ اور انگلستان میں نوآبادی نظام کی بہترین مثالیں ہیں۔ وہ مقصد جو اس نظام کی بنیاد تھا وہ خود کفالتی کا اصول تھا یعنی ایک ایسی حکومت جس میں اس کی ضروریات کی کل چیزیں اس طرح موجود ہوں کہ مرکزی (مادر) ملک ہر ضرورت کی چیزیں تیار کرتا تھا اور نوآبادیات تمام کی تمام کچا مال فراہم کرتیں اور گرم ممالک کے لئے سامان عیش بناتیں جو تیزی کے ساتھ مہذب زندگی کے لئے ضرورت کے سامان بنتے جا رہے تھے۔[7]

اس مقصد کے پیش نظر برطانوی پارلیمنٹ نے مسلسل کئی قانون ایسے منظور کئے جن سے نوآبادیات سے تجارت پر پابندیاں عائد کی گئی تھیں۔ ...... یہ کہ صرف انگریزوں کے جہاز اور انگریز رعایا نوآبادیات سے تجارت کرنے کے مجاز ہیں۔ نوآبادیات جو مال باہر بھیجنا چاہیں یا منگانا چاہیں ان کے بیشتر حصہ پر یہ پابندی تھی کہ وہ صرف انگریزوں کے بندرگاہوں سے بھیج سکتے ہیں یا منگا سکتے ہیں۔ اور یہ کہ بین الاقوامی تجارت پر کچھ محاصل بھی عائد کئے گئے تھے۔[8] امریکہ کی نوآبادیات میں سیاسی پابندیاں بھی لگائی گئیں۔ نمائندگی سیلاب کی نذر کر دی گئی اور کل نظم و نسق اور ٹیکس کا اختیار گورنر اور ان کی کونسل کو دے دیا گیا۔[9] گورنر کو شاہ انگلستان نامزد کرتے تھے اور کونسل میں جو جگہیں خالی ہوتی تھیں ان کو بھی وہی پر کرتے تھے۔

آئرلینڈ میں حالات اور بھی بدتر تھے۔ 1494ء میں "پوآئینگز لا" کی مشتہری کے بعد آئرلینڈ کی پارلیمنٹ دبا دی گئی۔ ٹیوڈر کی حکومت کے ماتحت اصلاحات جبراً رائج کیے گئے اور جس نے اختلاف کیا وہ زیر کر دیا گیا۔ جب بغاوتیں ابھریں تو ان کو بے رحمی سے کچل دیا گیا۔ باغیوں کی زمینیں ضبط کر لی گئیں اور پروٹسٹنٹ مذہب کے ماننے والے انگریزوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ آئرلینڈ سے انگلستان میں مویشیوں کی درآمد بند کر دی گئی اسی طرح سوت، چمڑا اور پنیر کی بھی درآمد بند کی گئی۔ آئرلینڈ کو یہ اجازت نہ تھی کہ وہ اونی کپڑا باہر بھیجے کیوں کہ خطرہ یہ تھا کہ وہ انگلستان کے کپڑے کا مقابلہ کرے گا۔ آئرلینڈ کے کاری گر تباہ اور برباد ہو گئے۔ السٹر کے چھ حلقے انگلستان کی جائداد بن گئے اور آئرلینڈ انگلستان کے قدموں پر خون سے نہایا چت پڑا تھا۔ بنیا پن کی سوداگری جو سماجی اقتصادی ارتقا کی ایک بلند منزل کی نمائندہ تھی ایک قطعی اور نظری خود غرضی اور انتہائی تشدد کے ماحول میں

آگے بڑھتی رہی۔ آدم سمتھ کے قول کے مطابق "کل جاگیردارانہ نظام مجموعی طور پر وہ تشدد کبھی دلا سکتے تھے جو بیرونی تجارت اور تیار شدہ مال کا ایک خاموش اور غیر محسوس عمل بتدریج بروئے کار لایا۔" انگریزی کی ایسٹ انڈیا کمپنی اسی بنیاپن کی ایک مثالی پیداوار تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی

کمپنی کا قیام سوداگرانہ مہم جوئیوں کی طویل کارروائیوں کا آخری نتیجہ تھا۔ بہت قبل 1313ء میں "فیلوشپ آف دی اسٹیپلس (اون وغیرہ کو درجہ بدرجہ ترتیب کرنے کی انجمن) قائم ہوا تھا جس نے اون کی اجارہ داری حاصل کی تھی ایک صدی بعد 1407ء میں "کمپنی آف مرچنٹ ایڈونچررس" یعنی "انجمن تجار مہم جو" قائم ہوئی جو اون کے بجائے اون کے بنے ہوئے کپڑوں کی تجارت کرتی تھی اور یہیں سے تیار شدہ مال کے عہد میں انگلستان کے داخلے کا بگل بجا۔

سولہویں صدی کے آغاز میں کمپنیوں کے نظام میں تیزی کے ساتھ ترقی شروع ہوئی۔ اس صدی کے وسط میں اپنی نوعیت کی پہلی کمپنی "مسکوائے کمپنی" کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے بعد تجارت کے نئے متعدد کمپنیوں نے شاہانہ چارٹر حاصل کئے جیسے کہ 1567ء میں افریقن کمپنی، 1577ء میں اسپینس کمپنی، 1578ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور 1581ء میں ٹرکی کمپنی۔ مؤخر الذکر 1592ء میں لیوانٹ کمپنی میں شامل ہوگئی۔ آخرکار 1600ء میں ملکہ الزبتھ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو چارٹر دیا " اپنی قوم کی غربت کے لئے اور اپنے ابنائے ملک کی دولت کے لئے " چارٹر میں یہ طے کیا گیا تھا کہ کمپنی اپنی خود جماعت منتظمین (گورننگ باڈی) رکھے گی جس میں گورنر، ڈپٹی گورنر اور چوبیس ممبرانِ کمیٹی ہوں گے لیکن اندرونی انتظام پر اقتدار تاج نے اپنے اور پریوی کونسل کے ہاتھ میں رکھا تھا۔ چارٹر نے جو مخصوص شاہی اختیارات کے ماتحت جاری کیا گیا تھا کمپنی کو پندرہ سال تک جائداد حاصل کرنے، اپنے ممبران اور ملازمین میں ڈسپلن قائم کرنے اور تجارت کے لئے بالکل تنہا حق رکھنے کے اختیارات دیئے تھے۔

الزبتھ نے اس کمپنی میں بڑی دلچسپی ظاہر کی اور اس کے سرمائے میں اپنی طرف سے اضافہ کیا۔ جو کمپنی اس طرح میدان عمل میں آئی وہ اس زمانہ کے سوداگرانہ بنیاپن تخیلات کی سچی نمائندہ تھی۔ ہندوستانی تجارت پر اس نے مسلح اور قانونی دونوں طرح کی اجارہ داری

قائم کی۔ مسلح سمندری تجارت وسیع سے وسیع پیمانہ پر پھیلنے اور اپنی مدافعت کرنے کے پورے اختیارات کے ساتھ۔"

ایسٹ انڈیا کمپنی کی تاریخ رنگ برنگ رہی ہے۔ پہلے سو سال میں اس کو تین طرح کے مخصوص اختیارات تھے اور اس کے قائم ہونے کے بعد شاہی سلسلۂ وراثت بدل گیا اور اسٹیوواٹ کے تخت نشین ہونے کے بعد عوام اور بادشاہ میں کشمکش شروع ہو گئی۔

پہلا مسئلہ :۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اندرونی دشواریاں

جیمس اول (1603 الغایۃ 1625) نے کمپنی کی حمایت اور اس کی سرپرستی کی جانب قدم بڑھایا۔ اس نے 1609ء کے چارٹر کی تجدید کی اور میعاد پندرہ سال سے بڑھا کر دائمی بنا کر اس کی پوزیشن کو مضبوط کر دیا۔ بعد کو اس نے یہ پیش کش کی کہ وہ خود بھی اس میں حصہ دار بن جائے۔ اور اپنے شاہانہ اختیار سے اس کی حمایت کرے لیکن کمپنی اس پریشان کن ساجھے داری پر ٹال مٹول کرتی رہی۔

جیمس اول ہی کے زمانے میں کمپنی کی اجارہ داری کو توڑ دینے کی کوششیں شروع ہو گئی تھیں۔ چارلس اول (1625 تا 1649) نے پارلیمنٹ سے جھگڑا کیا اور کمپنی کی حمایت میں متردد رہا۔ روپیہ کی شدید ضرورت کے ماتحت اس نے ایک رقیب کمپنی (کورٹنس ایسوسی ایشن) کی ہمت افزائی کی اور ایسٹ انڈیا سے تجارت کے لئے اسے ایک لائسنس دیا۔ اس کے بعد ایک طویل کشمکش چلی جسے آخر کار کرامول نے 1657ء میں ایک نیا چارٹر دے کر طے کیا۔ جس نے کمپنی کو ایک یونائیٹڈ اور مسلسل جوائنٹ اسٹاک کارپوریشن بنا دیا اور اس کے تمام رقیبوں کا صفایا کر دیا۔

اگرچہ کرامول کے الطاف واکرام کمپنی کے لئے اس وقت تشویش کا باعث ہوئے جبکہ چارلس دوئم پھر تخت پر واپس آیا لیکن کمپنی نے نئے عہد سے حد درجہ وفاداری ظاہر کی اور بادشاہ کو قرضہ کی شکل میں بڑے بڑے تحائف دے کر اس کی نیک خواہشات حاصل کر لیں۔ تحائف کے جواب میں چارلس نے متعدد چارٹر جاری کئے جن سے کمپنی کی اجارہ داری کی مکمل گارنٹی ہو گئی۔ اس نے کمپنی کے وہ مقبوضات جو سیاسی تدبر یا جنگ سے اس نے حاصل کیں محفوظ کر دیئے اور اس کے اختیارات میں اضافہ کر دیا جن میں سب سے زیادہ نمایاں یہ اختیار تھا کہ اس کو

قلعے تعمیر کرنے اور ان میں فوجیوں کو رکھنے کے لئے آدمیوں کو لے جانے کی اجازت حاصل ہوگئی۔ لیکن اس کا سب سے بڑا اکرام یہ تھا کہ بمبئی کی بندرگاہ اس نے کمپنی کو دے دی یہ بندرگاہ کل مغربی ساحل پر اقتدار رکھتی تھی۔ بمبئی ایک نو آبادی بن گیا اور اس کو ایک فوجی اڈہ میسر آگیا جس سے کمپنی خلیج بنگال سے وسط اٹلانٹک تک مسلح اقتدار قائم کرنے کے قابل ہوگئی۔

اسٹوارٹ کی حکومت کے اختتام تک کمپنی ایک ایسی جماعت بن گئی تھی جو پوری نیشن سے جداگانہ تھی لیکن پھر بھی ہندوستان میں سکہ بنانے، ٹیکس لگانے، بندرگاہ تعمیر کرنے، فوجوں کا خرچ چلانے اور جنگ اور صلح کرنے کے لئے نیشنل اختیارات رکھتی تھی[14]۔ اس کی حالت میں تیزی سے ترقی ہوئی تھی۔ اس کا منافع بہت زیادہ بڑھ گیا تھا اور اس کے اسٹاک کی قیمت فی حصہ سو پونڈ سے بڑھ کر 360 اور 1683ء میں 500 پونڈ ہوگئی تھی۔ اس کی تجارت کی قیمت میں بھی اتنا اضافہ ہوگیا تھا کہ اس پر یہ الزام تھا کہ کمپنی کل قوم و ملک کی تقریباً آدھی تجارت تنہا ہضم کر رہی ہے[15]۔

1688ء کے انقلاب میں بادشاہ کے اختیارات پارلیمنٹ کو منتقل ہوگئے۔ اب کمپنی کے خلاف جو پرانی شکایت تھی وہ پھر تازہ ہوئی۔ اس کے ڈائریکٹروں نے بڑی زبردست کوشش کمپنی کو ٹوٹنے سے بچانے کی کی اور وزرا اور دربار کو رشوت کی کثیر رقمیں دیں پھر بھی 1698ء میں پارلیمنٹ نے ایک قانون منظور کر کے ایک جدید ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کر دی۔ اس نے ایک عجیب صورت حال پیدا کر دی کیوں کہ اس نے دونوں کمپنیوں کو کھلم کھلا ایک دوسرے سے ٹکرا دیا جس میں ایک کا انحصار چارٹر پر اور دوسرے کا پارلیمنٹ کے ایکٹ پر تھا۔ دونوں میں لڑائی دس سال تک جاری رہی۔ آخر کار "گوڈالفن اوارڈ" کے ذریعہ 1708ء میں دونوں کمپنیاں ایک میں شامل کر دی گئیں۔

یونائیٹڈ کمپنی میں سوداگرانہ بنیاپن کی تمام خصوصیات جمع تھیں یعنی اجارہ داری، تجارت بزور اسلحہ اور نو آبادیاتی طرز۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی صرف برطانوی تجارت کو وسیع تر کرنے کے لئے نہیں بنائی گئی تھی بلکہ حقیقت یہ تھی کہ اس سلطنت کی طاقت اور اقتدار اعلیٰ کی قوت کا ایک وفد مشرق میں بھیجا گیا تھا۔

دوسرا مسئلہ:۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے رقیب

اگر اس کی اول مشکلات کی گرہیں اس وجہ سے تھیں کہ کمپنی ہندوستان کی تجارت

پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنا چاہتی تھی۔ اس کی دوسری قسم کی مشکلات کمپنی کی اس پوزیشن سے پیدا ہوئیں کہ وہ تجارت بزور اسلحہ کرنا چاہتی تھی۔ مسلح تجارت کا تخیل اس یقین میں مضمر تھا کہ ایک ملک کی یہ خواہش کہ وہ دولت مند بنے دوسروں کے سرکچل کر ہی پوری ہو سکتی ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقابلہ میں پرتگالی سب سے پہلے میدان میں آئے۔ انھوں نے ہندوستان تک سمندر کا راستہ دریافت کر لیا تھا اور بحیرۂ ہند سے مسلم ممالک کے تجار اور جہازوں کو باہر کھدیڑ دیا تھا۔ علاوہ ازیں وہ تجارت کے فن کے ہراول بھی تھے ان لوگوں نے قلعے بنائے اور ان کو ایسے فوجیوں سے مسلح کر کے ان کا خرچ برداشت کیا جن کے پاس بارود اور سامان جنگ بخوبی فراہم تھا۔ انھوں نے مملکتوں پر قبضہ کیا۔ ان کو نوآبادی بنایا۔ غیر عیسائیوں کے خلاف لڑائیاں چھیڑیں اور ان کو یہ پیش کش کی کہ یا تو مذہب مسیحیت کو کو قبول کریں یا تلوار کی دھار کو۔ ان لوگوں نے بربریت آمیز اور انسانیت سوز مظالم کئے۔ مثلاً لوگوں کو توپ کے دہانے پر رکھ کر اڑا دیا۔ عورتوں کے ہاتھ اور کان کے زیورات چھیننے کے لئے ان کے ہاتھوں اور کانوں کو کاٹ ڈالا اور تمام لوگوں کو بے دریغ قتل کیا۔ عورتوں اور بچّوں کو بھی نہ چھوڑا۔ ان لوگوں نے اپنی خون سے رنگی ہوئی تجارت تشدد اور تھدیر سے جاری رکھی تھی۔ ان لوگوں نے ہندوستانی سپاہیوں کو اپنی افواج میں بھرتی کرنے اور ان کو ٹریننگ دینے اور اپنی سلطنت قائم کرنے کے لئے ایشیا کے راجاؤں کی اندرونی رقابت سے فائدہ اٹھانے کے راستے بھی دکھائے۔ یہ لوگ مغرور، نمائشی شان دکھانے والے اور بدکردار تھے۔ جو مغرب کے اولین اور اسی کے ساتھ بدترین نمائندے تھے جنھوں نے مشرق میں آنے کی جسارت کی۔ "ابی رنیال" نے ان کے متعلق "ایک زوال پذیر نسل" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مذہبی دیوانگی میں بڑھے ہی خوف ناک اور ان تمام قوموں کے لئے جو سمندر کے ساحلوں کے پاس رہتی تھیں ایک قطعی بے اصول اور خدا کی لعنت تھے۔ یہ لوگ فرقہ پرست، حریص، ظالم اور بدچلن تھے۔" ان کی فوجوں میں نسوانیت سرایت کر گئی۔ نہ ڈسپلن، نہ ماتحتی کے اصول، نہ عزت سے محبت کا جذبہ کہیں بھی سپاہیوں یا افسروں میں پایا جاتا تھا۔[19] " یہ لوگ اسی کے مستحق تھے کہ بہت جلد پاداش عمل کی گرفت میں آگئے اور شمال کے پروٹسٹنٹ قوموں نے ان کی سلطنت کا بخیہ اُدھیڑ دیا اور ان کو مشرقی سمندروں سے باہر بھگا دیا۔

1590ء میں فلپ دوئم نے اسپین کے تخت پر قبضہ جمالیا اور قریب ساٹھ سال تک یہ دونوں سلطنتیں ایک واحد وفاق میں ایک واحد تاج کی ماتحتی میں رہیں۔ دونوں مل کر رومن کیتھلک عقیدے کے تھے پشتے بنی رہیں۔ اور قدرتاً یورپ کی پروٹسٹنٹ حکومتوں کے حملوں کا نشانہ بنی رہیں۔ ہالینڈ اصلاحات (ریفارمیشن) میں سب سے آگے تھا۔ اس نے اسپین کے اقتدار کے خلاف بغاوت کی اور 1579ء میں آزادی حاصل کر لی مگر عداوت بدستور قائم رہی۔ ہالینڈ اس وقت یورپ کی مملکتوں میں سب سے زیادہ سمندری طاقت رکھتا تھا۔ اسپین اور پرتگال متحدہ قوت کے خلاف اس کی حمایت دوسری پروٹسٹنٹ حکومتوں خاص کر انگلستان نے کی۔ ایک موت وزیست کی لڑائی شروع ہوگئی جس میں فوجیں بحری بیڑے اور تجارتی جہاز سب شامل تھے۔ آخر کار کیتھولک سلطنتیں شکست کھا گئیں اور ان کی تجارتی اجارہ داری تباہ و برباد ہوگئی۔

لڑائی کا سب سے بڑا بوجھ ڈچ پر پڑا۔ انھوں نے پرتگالیوں کو اسپائس جزائر ایتائے ملائے لنکا اور کیپ آف گڈ ہوپ سے نکال کر باہر کر دیا۔ لیکن جب انھوں نے اپنا اقتدار جمالیا تو تجارتی معاملات میں انھوں نے بھی اجارہ داری سستا خریدنے اور مہنگا بیچنے اور رعایا پر بے محابا لوٹ کھسوٹ اور ظالمانہ طرز کی حکومت قائم کرنے کا وطیرہ اختیار کر لیا۔
ڈچوں نے پرتگالیوں کا خاتمہ کر دیا تھا اور انگریزوں کو بھی کسی طرح اس معاملہ میں برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے جسے وہ اپنا تنہا تجارتی علاقہ سمجھتے تھے۔ اس لئے یورپ میں مقاصد کی یکسانیت اور ایک جھلملاتے ہوئے اتحاد کے باوجود انھوں نے انگریزوں کو نکال باہر کرنے کی طرف قدم اٹھایا۔ یہ کشمکش نام نہاد "امبوائے نا" کے قتل عام (1623ء) پر ختم ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز اس بات پر مجبور ہوگئے کہ مجمع الجزائر سے ہٹ جائیں اور اپنی پوری توجہ ہندوستان پر مرکوز کر دیں۔ ڈچوں کو مجمع الجزائر اور ہندوستان دونوں میں اپنے مفاد کی حفاظت کا کام اپنی طاقت سے بہت زیادہ مشکل معلوم ہوا اور انھوں نے اپنی توجہ اسپائس آئی لینڈ تک محدود کر دی۔

یورپ میں جو حالات پیدا ہوئے وہی اس پسپائی کا سبب تھے۔ ڈچ چاروں طرف رقیبوں اور دشمنوں سے گھرے ہوئے تھے اور جیسے ہی مشرقی مجمع الجزائر کو وہ اپنے تنہا قبضہ و تصرف میں لائے وہ براعظم میں جنگوں میں ڈوب گئے۔ پہلے لڑائی اسپین سے ہوئی جس کا خاتمہ

ویسٹ فیلیا کی صلح سے 1648ء میں ہوا۔اس کے بعد 1652ء اور 1665ء میں انگلستان سے جنگ ہوئی اور آخر میں فرانس سے 1672ء سے 1713ء تک لڑائی ہوتی رہی۔ انسانی اور مالی طاقتوں کا مسلسل خرچ ہالینڈ جیسے چھوٹے ملک کو تھکا دینے کے لئے کافی تھا۔ جب تک انگلستان اپنی باہمی خانہ جنگی اور سیاسی انقلاب کی مشکلات سے نکلے ہالینڈ ایسی طاقت رہ ہی نہیں گیا تھا جو اس کا اہم رقیب بن سکے۔

تیسرا مسئلہ :- ایسٹ انڈیا کمپنی کا بندوبست

مسلح مقابلہ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کو پرتگالیوں اور ڈچوں کے خلاف جنگ آزما ہوکر کرنا پڑا اُس نے اُسے مجبور کردیا کہ وہ ہندوستان کی سرزمین پر اپنی قسمت آزمائی کرے۔ ان کی قدم جمانے کی ابتدائی کوششیں ناکام رہیں۔ نہ تو ہاکنس اور نہ سرٹامس روئی کوئی زیادہ کامیابی حاصل کرسکے۔ شروع میں پرتگال کے ان یسوعیوں نے جو مغل دربار میں تھے انگریز کمپنی کی اس کوشش کو کہ وہ فیکٹری قائم کرنے کا شاہی فرمان حاصل کرسکے ناکام بنادیا۔ بعد میں جب جہانگیر سے 1608ء میں یہ اجازت ملی تو مقامی گورنر نے دشواریاں پیدا کیں۔

مڈلٹن نے جو کمپنی کے جہازوں کے چھٹے سفر کا کپتان تھا گجرات اور بحیرۂ احمر کے درمیان آمد ورفت کا راستہ 1611ء میں بند کرکے ان (گورنر) پر دباؤ ڈالا۔ پرتگالیوں پر سوئیلے کے اردگرد بسٹ اور ڈاون ٹن کی 15-1612 کی فتوحات نے گورنر کی ہچکچاہٹ کو دور کردیا اور انگریز سورت میں جم گئے۔

لیکن رعایت ان کو دی گئی تھی اس کا انھوں نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ انگریز سمندر پر پورا اقتدار رکھتے تھے انھوں نے اس طاقت کا استعمال اس طرح کیا کہ بحیرۂ احمر کی تجارت سے گجرات کو خارج کردیا جس سے شہنشاہ معظم کی مخالفت ابھری۔ روئی نے کمپنی کو جو نصیحت کی وہ یہ تھی " میں ان لوگوں (مغلوں) کو جانتا ہوں۔ان سے برتاؤ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایک ہاتھ میں تلوار ہو اور دوسرے میں سونے کی تھیلی"۔ جو کچھ 'ایڈورڈ ٹیری' ان کے پادری نے ڈچوں کے متعلق کہا تھا وہ انگریزوں کے لئے بھی صحیح ہے یعنی یہ کہ "جہاں وہ مقیم ہوتے ہیں وہاں اپنے کو قلعہ بند اور مسلح کرکے اور اپنی محافظت کا بندوبست کرکے مقامی باشندوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنی تیارشدہ اشیاء سستے داموں بیچیں"۔

اسی پالیسی کے ماتحت 1611ء میں مڈلٹن نے گجرات اور بحیرۂ احمر کا راستہ بند کر دیا اور 1616ء میں کپتان کیلنگ نے مالابار کے ساحل پر کالی کٹ کے راجہ سے ایک بندرگاہ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن سلطنت مغلیہ اب تک اتنی کافی مضبوط ہو چکی تھی کہ گجرات کے ساحل پر کسی فوجی اڈہ بنانے کی کوشش فضول تھی اور پرتگالی گوا کے اردگرد کسی مداخلت کو کب گوارہ کر سکتے تھے۔

اس طرح مغربی ساحل پر علاقہ حاصل کرنے اور فوجی اڈہ بنانے کی کوشش میں انگریز ناکام رہے۔ مغل حکومت نے ان پر سختی سے نگرانی جاری رکھی۔ 1625ء میں انگریزی فیکٹری کا افسر اعلیٰ ہتھکڑیوں میں جکڑ کر قید کر دیا گیا۔ اس کے بعد پھر جب کورٹیس ایسوسی ایشن نے سمندری ڈاکے ڈالے تو سورت کے گورنر نے 1636ء میں اس کے صدر مقیم ورلڈ اور ان کی کونسل کے ممبران کو قید کر دیا جہاں سے وہ اٹھارہ ہزار پونڈ فدیہ دے کر چھوٹے۔

جس وقت انگریز ان ذلتوں کو برداشت کر رہے تھے دکن مغل سواروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے روندا جا رہا تھا۔ 1636ء میں اورنگ زیب دکن کا گورنر تھا۔ اس وقت سے برابر مغل سلطنت بہمنی سلطنت کے جانشین بادشاہ اور شیواجی کی ماتحتی میں مرہٹے ایک خوفناک جنگ میں مشغول رہے جس نے سمندر کے ساحلی علاقوں کو انگریزوں کے قیام کے لئے غیر محفوظ بنا دیا تھا۔

شیواجی کی فتوحات کا دور 1647ء سے شروع ہوا جب اس نے تورنا کے قلعہ پر گولہ باری کی۔ 1664ء اور پھر 1670ء میں اس نے سورت پر حملہ کیا۔ ان حملوں نے حالات کو ناممکن بنا دیا۔ مغربی رقیبوں اور ہندوستانی راجاؤں کے مقابلے میں اپنی محافظت کے مکمل انتظام کے بغیر تجارت کی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ اس کے لئے علاقے محفوظ قلعے، فوجی سپاہی اور فوجی سامان ضروری تھے۔ لیکن ان چیزوں کے لئے مغل شہنشاہ سے اجازت آسانی سے نہیں ملتی تھی۔ خوش قسمتی سے بادشاہ چارلس دوئم نے 1668ء میں کمپنی کو بمبئی منتقل کر دیا اور اس کی فوجی محافظت کے لئے فوری قدم اٹھایا گیا۔ لیکن مغلوں اور مرہٹوں کے بیچ مغربی ساحل پر انگریزوں کی فیکٹریاں اورنگ زیب کی موت تک خطرے کے بالمقابل رہیں۔

اس مشکل حالت سے نجات مشرقی ساحل پر جا کر تلاش کی گئی جہاں حالات زیادہ سازگار تھے کیوں کہ 1569ء میں تالی کوٹ کے میدان جنگ میں وجیانگر کی سلطنت کے قلع

قمع کے بعد مملکت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گئی اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے فرماں روا گولکنڈہ کے قطب شاہی خاندان کی ابھرتی ہوئی طاقت سے خطرے میں تھے۔ اُڑیسہ سے نیچے کارومنڈل ساحل تک متعدد بندرگاہیں مثلاً بالا سور، پیلی پولی کاٹ، پٹاپولی، میسولی پٹم پر آزمائش کی گئی۔ ان میں سے چند مقامات پر فیکٹریاں تعمیر کی گئیں لیکن ان میں سے کوئی بھی قابل اطمینان نہ پائی گئیں۔ آخر کار 1639ء میں مدراس پر قبضہ ہو گیا۔

لیکن مدراس گنگا کے ڈیلٹا سے جہاں شمالی ہندوستان کی تجارت کے چشمے کرتے تھے بہت دُور تھا اس لئے انگریزوں نے اپنی توجہ بنگال کی جانب مبذول کی۔ یہاں دریائے ہگلی پر ڈیلٹا کا دکھنی پچھمی دریائی راستہ تھا وہاں پرتگالیوں نے اپنی ایک فیکٹری عرصہ ہوا قائم کرلی تھی لیکن شاہجہاں نے 1631ء میں ان کو نکال باہر کیا۔ 1650ء میں کمپنی نے گورنر بنگال سے وہاں تجارت کرنے کی اجازت مانگی اور اس کو لائسنس مل گیا۔ بنگال میں کمپنی کے تجارتی ادارے مدراس کے قلعہ سینٹ جارج کی سپردگی میں دے دیے گئے۔

1649ء سے 1689ء تک کمپنی کی تجارت نے بڑی ترقی کی لیکن جوں جوں تجارت ترقی کرتی گئی اور منافع بڑھتا گیا اس کے حوصلے بھی بلند ہوتے گئے۔ 1661ء کے چارٹر سے کمپنی کو صلح اور جنگ کرنے اور انصاف کرنے کے لئے عدالتیں قائم کرنے کا حق مل گیا۔ گورنمنٹ کے اختیارات سے مسلح ہونے کے بعد کچھ تجار اقتدار اور مملکت کے خواب دیکھنے لگے۔ 1674ء میں "سر جوسیا چائلڈ" کمپنی کا ایک ڈائریکٹر مقرر ہوا اور 25 سالوں تک ان کمپنیوں پر اس کا غیر معمولی غلبہ رہا۔ اس کی ہدایت کے ماتحت کمپنی نے اول بار حریفانہ جوش کے ساتھ سیاسی اہمیت اور اقتدار کی جانب دوڑنا شروع کیا۔[1] ان کا ایک دُور کا رشتہ دار سر جان چائلڈ جس نے ہندوستان میں اس وقت ملازمت کی تھی جب کہ وہ محض ایک لڑکا تھا 1692ء میں بمبئی اور سورت کی کمپنی کی فیکٹری کا صدر ہو گیا۔ یہ دونوں چائلڈ قصد مصمم کیے ہوئے تھے کہ کمپنی کے اختیارات کو انگریزوں کے رقیبوں سے جو ان کی تجارتی اجارہ داری کو توڑ دینے کی دھمکی دیتے تھے اور مغل حکمرانوں سے جو اپنے محاصل آمدنی میں اضافہ کرنے کے لئے ان کے انتظامات میں دخل دیا کرتے تھے بلند و بالا کر کے رہیں گے۔

ابھالتناً یافتہ انگریز تاجروں کے خلاف ان لوگوں نے فوری احکام جاری کیے کہ ان کو ہندوستان کی تجارت سے الگ کر دیا جائے۔ اپنے ابنائے وطن کو کچل دینے کے لیے انھوں نے

کسی قسم کی سختی استعمال کرنے سے گریز نہیں کیا اور اصول یہ قرار دیا کہ "انگلستان کے قوانین مہملات کا ایک انبار ہیں جن کو چند جاہل دیہاتی افراد نے بنایا تھا جو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ خود اپنے خاندانوں کی بھلائی کے لئے کس طرح کے قوانین بنائیں چہ جائیکہ وہ لوگ کمپنیوں اور ملک کے باہر کی تجارت کے متعلق قوانین بنائیں۔"[18]

اجازت نا یافتہ تجار پکڑے گئے اور گھسیٹ کر امیر البحر کی عدالت کے سامنے پیش کیے گئے۔

ہندوستان میں سر جان چائلڈ کا حوصلہ یہ تھا کہ سول اور ملٹری طاقت کی ایک سیاسی تنظیم قائم کی جائے اور اتنی کثیر مقدار میں محاصل پیدا اور حاصل کئے جائیں کہ یقینی طور پر ایک عظیم اور مستحکم بنیاد والی انگریز حکومت ہندوستان میں قائم ہو سکے جو ہمیشہ ہمیشہ تک باقی رہنے والی ہو۔[19] جس پالیسی کو سر جوسیا نے مرتب کیا تھا سر جان اس کو عملی شکل دینے کے لئے تیار تھا۔ وہ ایسا کرنے پر اس لئے اور بھی آمادہ تھا کہ کمپنی پر سورت کے اصلی باشندوں کا دو لاکھ اکیاسی ہزار دو سو پچاس پونڈ قرض تھا اور اتنی بڑی رقم کا سود بھی ادا کرنا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ اس لئے وہ پرانے قسم کے طریقے کو اپنانے اور ادا کرنے کے بجائے ایسی دوسری تدبیر تلاش کر رہا تھا جس سے ذمہ داریاں پوری ہی نہ کرنی پڑیں اور ادائیگی سے بچت ہو جائے۔[20] اس لئے ایک ایسے نظام کے ایجنٹوں نے جو بنیادی طور پر بے ایمانی پر بنی تھے کمپنی کو سلطنت مغلیہ سے جنگ میں الجھا دیا۔ "کمپنی کورٹ نے نمائشی شان کے ساتھ اعلان کیا کہ وہ نہ صرف نواب بنگال کے خلاف بلکہ اس سلسلہ میں خود شہنشاہ کے خلاف جنگ کرنے کا پورا پورا عزم رکھتی ہے۔"[21]

تیاریاں بڑے وسیع پیمانے پر کی گئیں۔ مسلح جہاز جن پر توپیں چڑھی ہوئی تھیں حاصل کیے گئے پیدل افواج کی متعدد کمپنیاں تیار کی گئیں اور ایک باضابطہ پیدل فوج کی کمپنی مع ان کے افسران کے انگلستان سے طلب کی گئی۔ مدراس میں مورچے بنائے گئے اور اسے دیواروں سے گھیر دیا گیا۔ بنگال میں "چٹاگانگ" پر زبردستی قبضہ کر کے اسے مستحکم کرنا تھا۔ ہُگلی اور سمندر کے قریب ایک بندرگاہ حاصل کرنا تھا۔ مغربی ساحل پر ہندوستان کی جہاز رانی کو تباہ برباد کر دینا تھا اور سلطنت مغلیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دینا تھا۔ اس طول وطویل پروگرام کی جو جغرافیائی فاصلوں کی مضحکہ خیز ناواقفیت اور مخالف طاقتوں کو

حیرت انگیز طور پر نظر انداز کرنے پر مبنی تھا ایک مد بھی پوری ہو سکی[22]۔ کمپنی کی اس قسم کی مرکنٹائل پالیسی کے اس طرح کامیاب ہو جانے کے لئے یہ موقعہ قبل از وقت تھا اور مغل شہنشاہیت بھی اس وقت مضبوط تھی۔ کمپنی کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ اس پروگرام میں کامیاب نہیں ہو سکتی ہے۔

بنگال میں نواب شائستہ خاں کی افواج نے انگریزوں کو "ہگلی" سے جہاں وہ جاکر چھپے تھے مار کر کھدیڑ دیا اور چٹاگانگ پر ان کو قبضہ نہیں کرنے دیا۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں مغلوں کا ردعمل فوری اور شدت آمیز تھا۔ سورت، میسولی پٹم اور وزیگاپٹم کی فیکٹریاں چھین لی گئیں۔ "بمبئی" پریسیڈی" کے بحری بیڑہ نے حملہ کیا اور پورا جزیرہ باستثناء قلعہ قبضہ میں لے لیا گیا۔ انگریز ذلیل ہو گئے اور خود ان کے مورخ مل کے قول کے مطابق "ان کو ذلت کی انتہائی پست سطح تک اتر ناپڑا۔[23] انھوں نے عجز وانکساری کے ساتھ ایک درخواست پیش کی کہ " ان کے انتہائی مذموم جرائم کو معاف کر دیا جائے۔" شہنشاہ نے ان کے سفیروں کی التجاؤں کو سنا اور اس پر راضی ہو گئے کہ 1690ء میں ایک نیا فرمان اس شرط پر جاری کیا کہ کمپنی ہندوستانی تاجروں کے کل مطالبات ادا کرے۔ سلطنت کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کا معاوضہ دے اور سر جان چائلڈ کو انگلستان واپس بلا لیا جائے۔ ان شرائط کے پورا ہونے پر بمبئی کو خالی کر دیا گیا اور مغربی ساحل اور بنگال میں تجارت کا جو پرمٹ تھا اس کی پھر تجدید کر دی گئی۔

کمپنی پھر بنگال واپس آئی اور تین مواضعات سوتنٹی، گوندپور اور کلکتہ نواب سے لگان پر لیے اور زمین دار بن گئی۔ اس نے اپنی تجارت کی حفاظت کے لئے کلکتہ میں فورٹ ولیم کی تعمیر کی۔

کمپنی والوں کو اپنے کیے کا اچھا سبق مل گیا تھا اسی لئے آئندہ پچاس سال تک انھوں نے ہندوستان کے حکمرانوں کو کوئی وجہ شکایت فراہم نہیں کی۔ اس کے برخلاف انھوں نے چاپلوسی اور خوشامد کا وطیرہ اختیار کیا تاکہ مغل شہنشاہ کے نگاہ لطف وکرم سے وہ حقوق اور رعایتیں حاصل کر سکیں۔

1707ء میں مصائب کا باب ختم ہو گیا۔ کیوں کہ کمپنی کی ان کوششوں پر کہ ان کو تنہا تجارت کرنے کا حق رہے کامیابی کا تاج رکھ دیا گیا تھا اور ان کے دو دیرینہ رقیب

پرتگالی اور ڈچ خارج از بحث ہو چکے تھے اور کمپنی والوں کو ہندوستان کے حکمرانوں سے معاملہ کرنے کے بیش قیمت تجربات حاصل ہو چکے تھے۔ کمپنی کو اس میں کامیابی ہو گئی تھی کہ وہ ہندوستان کے تین اہم مرکزوں یعنی مغربی ساحل پر بمبئی، کارومنڈل ساحل پر مدراس اور بنگال کے اندر کلکتہ میں مضبوطی کے ساتھ جم گئی۔ ان تینوں میں مرکزوں میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جہاں تک مغل فوجوں کی رسائی آسان ہو اور ان سب مرکزوں کا دفاع کم و بیش وہ طاقت کر سکتی تھی جو ہندوستان کے ارد گرد سمندروں پر اقتدار رکھتی تھی۔

ان بندرگاہوں پر کمپنی نے ہندوستان سے انتہائی منافع خیز تجارت کی بنا ڈالی تاہم ان کا راستہ ہموار اور آسان نہ تھا۔ بنیاپن کے سوداگرانہ اصول کی پیروی کرتے ہوئے کمپنی کے ڈائریکٹروں نے دو اصول اپنائے تھے، "سیاسی حقوق حاصل کرنا ان کا پہلا منصوبہ تھا۔ دوسرا یہ تھا کہ جہاں تک ممکن ہو کم سے کم اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔"[24] ان اغراض کو حاصل کرنے کے لیئے ان کو خوشامدی ہونے کے ساتھ مکار ہونا بھی لازمی تھا۔ وہ جبری لوٹ کھسوٹ میں خوش الفاظی اور لالچ میں خوشامد کو ملا دیتے تھے۔ وہ ایک سود خوار کی سنگدلی کو ایک فیاض کا عطیہ بنا دیتے اور اس کی کچھ پروا نہ کرتے کہ جو معاملہ انھوں نے کیا ہے وہ غلام سے تعلق رکھتا ہے کہ ہاتھی کے دانت سے، اون سے یا اون سے بنے کپڑوں سے، چلمن سے یا سونے سے، بشرطیکہ معاملہ ان کے لئے زیادہ سے زیادہ منافع بخش ہو۔[25] ان طریقوں کی آزمائش اپنے وطن اور ہندوستان میں دونوں جگہ وہ کرتے تھے اور اگر نتیجہ کو کوئی مناسب معیار تسلیم کر لیا جائے تو یہ طریقے کافی کارآمد ثابت ہوئے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی وسعت ملکی

دونوں کمپنیوں کے مل جانے کے بعد سے ہندوستان سے برطانیہ کے تعلقات کا ایک نیا عہد شروع ہوتا ہے۔ مل تنقید کرتا ہے کہ "اس عہد کے پہلے ان لوگوں (کمپنی) نے محض تاجروں کا کردار قائم رکھا تھا اور انکساری اور عاجزی کو کام میں لاکر اس دور دراز ملک میں جہاں کے راجاؤں کی حفاظت یا ان کے مظالم کے تحت قدم جمانے کی کوشش کی تھی اب ہم ان کو مسلسل لڑائیوں میں داخل ہوتے اور انہماک کے ساتھ راجاؤں کی باہمی لڑائیوں میں شریک ہوتے دیکھیں گے۔"[26]

سیاسی حالات ساز گار تھے۔ معاہدہ اُٹ رچیٹ، 1713ء سے تخت آسٹریا کی جانشینی کی جنگ 1740ء تک یورپ لڑائی سے بیمار رہا۔ اسپین، ہالینڈ اور فرانس سب کے سب لوئی چہاردہم کی لڑائیوں کے بعد تکان سے چور چور تھے اور ان لڑائیوں کے نتائج سے اپنے کو بحال کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ اس لئے ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارت میں جو اجارہ داری حاصل کرلی تھی اس کے مقابل کوئی آنے والا نہیں تھا۔ ہندوستان میں مغلوں کی شہنشاہیت سر کے بل مزاج کی طرف چلی جارہی تھی اور صوبوں کے گورنروں اور مرہٹوں کے راجہ اور افسران ہر جانب ہراس اور تباہی پھیلا رہے تھے۔ مرشدآباد، لکھنؤ اور حیدرآباد اب دلّی سے زیادہ اہم ہوگئے تھے اور ہندوستان کے ہر حصے میں پونا کا اثر بڑھ رہا تھا۔ کمپنی کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ مغل سلطنت پر براہ راست حملہ خطرناک ہے۔ لیکن یہ کسی طرح نہ سمجھنا چاہئے کہ کمپنی اس پالیسی سے ہٹ گئی تھی جو اس نے 1699ء میں تیار کی تھی یعنی یہ کہ "محاصل میں اضافہ ایک طرف اور دوسری طرف تجارت میں اضافہ ہمارا اصل مطمح نظر ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی فوج رکھ کر اس کا خرچ برداشت کریں جب کہ بیسوں حادثات ہماری تجارت میں مداخلت کریں۔ اس فوجی طاقت سے ہم ہندوستان میں ایک قوم بن جائیں گے۔ اور بغیر اس کے ہماری حیثیت یہ ہے کہ ہم بلا اجازت تجارت کرنے والے چند افراد ہیں اور صرف اس وقت تک جب تک کہ با اقتدار یہ خیال نہ کرے کہ اس تجارت کو روک دینا اس کے مفاد میں ہے۔"[27]

کس طرح آمدنی میں اضافہ کی پالیسی پر عمل درآمد ہوا اس کا ثبوت کمپنی کے 'تنجور' معاملات میں مداخلت سے فراہم ہوتا ہے۔ اس کا بہترین اظہار 'مل' کے الفاظ میں ہوگا۔ وہ لکھتا ہے کہ "تنجور کے راجہ پرتاپ سنگھ سے سالہا سال تک خط و کتابت کرنے اور ان کو انگریز قوم کی دوستی کی پیش کش کرنے اور فرانسیسیوں کے خلاف ان کی امداد حاصل کرنے کے لئے ان کی خوشامد کرنے کے بعد انگریز حکمرانوں نے بلا کسی اشتعال کا بہانہ بنائے دیوی کوتا پر قبضہ کرلیا۔ اس کے علاوہ کوئی وجہ ظاہر کئے بغیر ایک فوج اس لیے بھیج دی کہ راجہ کو تخت سے اُتار دیا جائے۔"[28]

دیوی کوتا کا قلعہ جو 9 ہزار پگوڈا سالانہ کی آمدنی دیتا تھا اس طرح ہتیا لیا گیا۔ اسی دوران بہت محتاط کوششیں علاقوں پر قبضے کرنے اور قلعے تعمیر کرنے کے سلسلے

میں جاری رہیں۔ 1716ء میں فرخ سیر سے اس بات کی اجازت مل گئی کہ کمپنی سورت میں
زمین خریدے اور کلکتہ کے قریب کے مواضعات کو لگان پر لے لے۔ مدراس کے قریب
جن پانچ مواضعات کو بطور عطیہ دیا گیا تھا اس پر بھی مہر تصدیق ثبت ہو گئی۔

مغربی ساحل پر سمندر میں مرہٹہ بحری بیڑے کے خلاف مسلسل جنگ ہو رہی تھی۔
بنگال میں کمپنی نے نواب سے کھلم کھلا مخالفت کا خطرہ مول لینا مناسب نہ سمجھا ان لوگوں
کو نواب کے مزاج کو ہموار رکھنے کے لئے اور اپنے ان قبیح جرائم پر پردہ ڈالنے کے لیے جو انھوں نے
کیے تھے (مثلاً دستکوں کا ناجائز استعمال اور کثیر تجارتی مال چوری سے بچا لانا جس سے بادشاہ
کو دھوکہ دے کر کسٹم کی ایک کثیر رقم سے محروم کر دیا گیا تھا) کثیر رقمیں ادا کیں۔[3] اللہ وردی خاں
نے ان پر کڑی نگرانی رکھی اور اس کا کوئی موقع نہیں دیا کہ جو کچھ انھوں نے دکن میں کیا تھا اس کا
اعادہ بنگال میں بھی کریں اور نہ اس نے اس کی ہمت افزائی ہونے دی کہ وہ کلکتہ میں اپنے استحکامات
کو اور زیادہ مضبوط کریں۔

اس طرح اس صدی کے وسط تک کمپنی محاصل مالگذاری دینے والے علاقوں کے حصول میں
زیادہ کامیاب نہیں ہوئی لیکن تجارت کے معاملات میں اس کی کامیابی بڑی ہمت افزا تھی۔
1708ء میں جو تیار شدہ مال انگلستان کے باہر ہندوستان کو بھیجا گیا اس کی قیمت صرف
61 ہزار پونڈ تھی۔ 1738ء میں ایسے مال کی مقدار بڑھ کر ایک لاکھ اٹھائیس ہزار پونڈ قیمت
تک پہنچ گئی تھی۔ اسی طرح ہندوستان سے انگلستان نے جو مال درآمد کیا پانچ لاکھ پونڈ سے
ترقی کر کے دس لاکھ پونڈ کی قیمت تک کا ہو گیا تھا۔ اس زمانہ میں کمپنی نے حصہ داران کو
8 سے 10 فی صد تک منافع ادا کیا۔ اس کی خوش حالی اتنی ترقی کر گئی تھی کہ اس نے 1744ء
میں گورنمنٹ کو دس لاکھ پونڈ اور 1750ء میں چالیس لاکھ پونڈ قرض دیئے۔

انگلستان اور فرانس کی رقابت

انگریزوں کی کامیابی نے ان کے مغربی رقیبوں کی بھوک کی آگ کو تیز کر دیا۔ پرتگال
اسپین اور ہالینڈ دوڑ میں پیچھے رہ گئے تھے اور اب اس حالت ہی میں نہ تھے کہ انگلستان
کے مقابلہ میں خم ٹھونکتے۔ البتہ فرانس نے اس بات کی بڑی کوشش کی کہ ہندوستان کی
تجارت پر قبضہ کرے اور مشرق میں اپنے اثر کو وسعت دے۔ 1664ء میں کالبرٹ نے

فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کر ہی دی تھی۔ لیکن لوئی چہار دہم کی حکومت کے دوران 1643ء تا 1715ء) بوجہ اس کے کہ اسپین، ہالینڈ اور برطانیہ سے فرانس برسرپیکار تھا۔ کمپنی کا کام کچھ آگے نہ بڑھ سکا۔ 1720ء میں "جان لا" نے فرانس کی مالیات کی جدید تنظیم کی اور کمپنی کی تنظیم کو از سر نو قائم کیا۔ اب ترقی کی رفتار تیز ہوگئی۔ ماریشس پر جو ہندوستان کے آدھے راستہ پر جزیرہ ہے 1721ء میں قبضہ کر لیا گیا اور بالترتیب 1745ء اور 1739ء میں 'ماہے' اور 'کریکال' پر قبضہ و تصرف جما لیا گیا۔ 'پانڈی چیری' جو فرنچ کمپنی کا مخصوص مستقر بنایا گیا اسے ڈچوں نے کھو دیا تھا لیکن پھر 'ایوک' کے صلح نامہ کے تحت 1697ء میں ان کو واپس مل گیا۔

نئی تنظیم شدہ فرنچ کمپنی نے پوری قوت سے اس دُہری پالیسی پر عمل درآمد شروع کیا کہ سیاسی اقتدار حاصل کرے اور سوداگرانہ مہم بازیوں کو بزور قوت آگے بڑھائے۔ ہندوستان کے راجاؤں کے خلاف اس نے اپنے قیام کے مرکزوں پر استحکامات قائم کئے۔ فرانسیسیوں کا عقیدہ تھا کہ "خوش حالی، مستقر اور چند مسلح استحکامات کی جگہیں ان لوگوں کے درمیان کمپنی کو بہت بڑی پوزیشن عطا کر دیں گی[31] لیکن انھوں نے اس پالیسی کی باگ ڈور 1740ء کے بعد ہی پوری طور پر ڈھیلی کی۔

ہندوستان میں ایک شہنشاہانہ سلطنت قائم کرنے کا خیال پہلے پہل "ڈوپلے" کے دماغ میں آیا۔ فرنچ کمپنی کے حالات کے تقاضوں نے اس کو اس نتیجہ پر پہنچایا تھا جس کی تجارت کو فروغ دینے کی تمام کوششیں اس وجہ سے ناکام ہو رہی تھیں کہ فرانس سے معقول مالی امداد نہیں مل رہی تھی۔ ڈوپلے نے یہ محسوس کیا کہ ضروری سرمایہ کے مہیا کرنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ محاصل ادا کرنے والے علاقے حاصل کیے جائیں اور سیاسی طاقت کے حصول کا ہی صرف ایک طریقہ ہے جس سے مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

آیا اس نے امریکہ اور تمام دنیا کی طرح ایشیا کو اس نگاہ سے دیکھا تھا یا نہیں کہ اس کی قسمت میں ہے کہ یورپین اقوام کے قوانین کے سامنے وہ گردن جھکا دے بہرحال وہ اس کا عزم رکھتا تھا کہ ہندوستان فرانس کو دیدے۔

ڈوپلے پانڈیچری کی فرانسیسی کمپنی کی سپریم کونسل کے کونسلر کے عہدے پر 1720ء میں نامزد ہوا۔ دس سال کے بعد وہ چندر نگر کے تمام استحکامات کا نگران اعلیٰ قرار پایا۔

1742ء میں ہندوستان کے اندر تمام فرانسیسی استحکامات کا گورنر جنرل مقرر ہوا۔ 1734ء میں کرناٹک کے نواب سعادت اللہ خاں کی موت پر ان کے بھتیجے دوست علی نے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اس نے فرانسیسیوں سے دوستی کی اور فرانسیسی گورنر ڈوس کی درخواست پر اس نے مغل شہنشاہ سے سکہ ڈھالنے کا اختیار ان کو دلا دیا جو عظیم منافع کا ذریعہ تھا۔ دوست علی کے داماد ’چندا صاحب‘ نے جو بلند حوصلہ نوجوان تھا اپنے مفاد کے لئے فرانسیسیوں کی طاقت و رحمایت حاصل کرنا چاہی اور پیشکش یہ کی کہ وہ تنجور کی حکومت پر حملہ کر کے کریکال پر قبضہ کرے گا اور پھر اسے فرانس کو دے دے گا۔ یہ کام ہو گیا اور فرانسیسیوں کو کریکال اور اس کے اردگرد کے اضلاع پر 1739ء میں قبضہ بھی مل گیا۔

کرناٹک کے پیچھے بہتے ہوئے ساکن پانی اور راجاؤں کی ذلیل سازشوں کے درمیان پچاس ہزار سواروں کی مرہٹہ فوج کا راگھوجی بھونسلہ اور ان کے نائب نراین راؤ کی سرکردگی میں اچانک ظاہر ہونا بم پھٹنے کے مصداق تھا۔ دوست علی جس نے ان کو روکنے کی کوشش کی میدان جنگ میں مارا گیا اس کے وارث صفدر علی اور چندا صاحب اپنے خاندانوں کو حفاظت کے لئے پانڈیچری لے گئے۔ راگھوجی نے ترچناپلی کا محاصرہ کیا قلعہ پر قبضہ کیا اور چندا صاحب کو قید کر لیا۔ اس کے بعد اس نے پانڈیچری کی جانب کوچ کیا۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ فرانسیسی ان سے مقابلہ کے لئے پوری طرح تیار نہیں واپس پیچھے پلٹ آئے۔

فرانسیسی گورنر ڈومس نے جس بے خوفی کا مظاہرہ کیا تھا اس سے دکن کے راجگان کی ستائش اور عزت اس کو حاصل ہوئی۔ شہنشاہ محمد شاہ نے اس کو نواب کے خطاب اور ایک منصب سے سرفراز کیا۔ نظام الملک نے ان کو ایک اعزاز کی خلعت بھیجی اور کرناٹک کے نواب صفدر علی نے بیش بہا تحائف روانہ کیے۔ اس موقع پر ڈومس ریٹائر ہو گیا اور ان کے عہدے کا چارج ”ڈوپلے“ نے لیا۔ (جنوری 1742ء)۔

چارج لینے کے بعد ڈوپلے کو محسوس ہوا کہ حالت انتہائی غیر اطمینان بخش ہے۔ نظام کرناٹک کے نواب کو بقایا محاصل کے ادا کرنے کے لئے دھمکیاں دے رہے تھے اور فرانسیسیوں کا پروردہ چندا صاحب مرہٹوں کے یہاں قید تھا۔ مرہٹہ سردار بالکل تیار تھے کہ اپنے حملے پھر جاری کریں اور کرناٹک میں خراج عائد کرنے کی تجدید کریں۔ فرنچ کمپنی کی حالت بھی تشویش سے خالی نہ تھی۔ اس کے ڈائریکٹروں کے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ جہاں جہاں

انھوں نے مراکز و استحکامات قائم کئے تھے ان سب کا خرچ برداشت کر سکیں۔ انگلستان اور فرانس میں جنگ ہو رہی تھی اور کمپنی اپنی فیکٹریوں کے استحکامات کے لئے باقی سرمایہ مہیا کرنے کے قابل نہ تھی۔ ان مشکلات میں ڈوپلے کا عزم، اس کی حب الوطنی اور اس کے وسائل و ذرائع اس شان سے ابھرے جو وقت کا تقاضہ تھا۔

جب مارچ 1740ء میں آسٹریا کی تخت نشینی کی جنگ یورپ میں شروع ہوئی اور جب فرانس و انگلستان اس میں ملوث ہوئے اس وقت ہندوستان میں جو دو سوداگرانہ کمپنیاں کام کر رہی تھیں ان کے ایجنٹوں نے یہ محسوس کیا کہ ایک کمپنی کا وجود دوسرے کے لئے بے جوڑ اور متضاد ہے۔

چنانچہ حکام وطن کی ہدایت کے باوجود دونوں ایک دوسرے سے اپنا تنہا حق تجارت حاصل کرنے کے لئے گتھ گئے۔ ڈوپلے وہ پہلا شخص تھا جس نے یہ دیکھا کہ اس مقصد کے حصول کے لئے سیاسی اثر اور علاقائی اقتدار حاصل کرنا ضروری ہے۔ وہ نہایت مشکل حالات میں کام کر رہا تھا۔ فرانس کی حکومت نہایت سست تھی اور لوئی پانزدہم اور ان کے وزرا اپنے ہم وطنوں کو جو ہندوستان میں فرانس کے عزت و شرف کے لئے لڑ رہے تھے امداد دینے میں ناکام رہے۔ فرانسیسی کمپنی کا زیادہ تر انحصار گورنمنٹ پر تھا اور اس کی تنگ نظرانہ، بودی اور غیر مستقل پالیسیوں سے اس کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ اگرچہ کمپنی کی تجارت ترقی کر رہی تھی لیکن اس کے اخراجات اتنے اونچے تھے کہ اس پر بہت زیادہ قرضہ لد گیا اور اس نازک موقع پر فرانس کی حکومت نے وہ رقم بھی بند کر دی جو وہ ہندوستان میں کمپنی کی تنظیمات کے لئے بطور امداد دیتی تھی۔

مزید براں یہ بھی تھا کہ اعلیٰ ترین لیڈروں میں جن کی باہمی رقابتیں متحدہ عمل میں حائل تھیں اس درجہ باہمی اختلافات تھے جو خودکشی کے مترادف تھے۔ پیرس سے ایسے غیر معمولی احکامات آتے تھے جن سے چڑچڑاپن اور ان کے فضول ہونے کا احساس پیدا ہوتا تھا۔

لڑائی جو چار سال تک جاری رہی مجموعی طور پر فرانس کی موافقت میں ختم ہوئی۔ ڈوپلے کی باکمال ذہانت کل مشکلات پر حاوی رہی۔ اپنی تدبیر سے اس نے ہندوستان کے راجاؤں کی حمایت حاصل کر لی اور اسے اس نے انگریزوں کے خلاف استعمال کیا۔ کافی فرانسیسی فوج کی کمی کو ڈوپلے نے ہندوستانی سپاہیوں کو بھرتی کر کے اور مغربی انداز کی

ٹریننگ دے کر پورا کر دیا۔ اس نے عملی مظاہرے سے ٹریننگ پائے ہوئے فوجیوں کی بلا ٹریننگ پائے ہوئے رنگروٹوں پر فوقیت ثابت کر دکھائی۔ جو لڑائی "سینٹ تھوم" کے مقام اور دریائے اڈیار کے ساحل پر محفوظ خاں پسر انوار الدین نواب کرناٹک کے انبوہ اور فرانسیسی کپتان پیریڈیس کے درمیان ۹ نومبر 1746ء کو لڑی گئی اس میں فرانسیسیوں نے نواب پر نہایت تیزی سے فتح حاصل کی۔ پیریڈیس کی ماتحتی میں جو فوجی دستہ تھا اس میں 230 یورپین اور 700 ہندوستانی سپاہی تھے۔ ان کے پاس کوئی توپ نہ تھی اور ان کو ایک دس ہزار کے لشکر کا جو توپوں سے مسلح تھا مقابلہ کر کے دریا کو عبور کرنا تھا۔ یہ مشکل فوجی چال کامیابی کے ساتھ عمل میں لائی گئی۔ ایک مختصر فوج کی ڈسپلن اور اس کی تنظیم نے جس کی کمان شیر دل اور لائق افسران کے ہاتھ میں تھی کامیابی حاصل کی۔ جیسا کہ میلیسن نے حق بجانب غرور کے ساتھ کہا ہے "پورے وثوق کے ساتھ یہ اظہار و اعلان کیا جا سکتا ہے کہ وہ تمام فیصلہ کن لڑائیاں جو ہندوستان میں لڑی گئی ہیں ان سے زیادہ کوئی چیز یادگار منانے کے قابل نہیں ہے .... جو حالات اس کے قابل یادگار بنانے پر مہر ثبت کرتی ہے یہ ہے کہ یہ اپنی قسم کی پہلی لڑائی تھی جس نے فریقین پر حیرت کے ساتھ یہ ثابت کر دیا کہ تربیت یافتہ یورپین سپاہی اپنے ایشیائی حریفوں پر کس درجہ فائق ہے[32]" ڈوپلے نے مدراس پر قبضہ کر لیا اور کارومنڈل ساحل کے تقریباً کل حصہ سے انگریزوں کو خارج کر دیا۔

اکس۔لا۔چیپل کے صلح نامہ سے (1748ء) یورپ کی لڑائی تو ختم ہو گئی لیکن اس سے ہندوستان کے رقیبوں میں صلح قائم نہیں ہوئی۔ ان کے حوصلے جاگے ہوئے تھے اور باہمی رقابت جوش پر تھی اور اس بات کی حرص کہ مملکت میں اضافہ ان کے دروازے پر دستک دے رہا ہے پھر ان کو صلح سے کیا کام ہو سکتا تھا۔[33]

1748ء کا سال یادگار سال ہے۔ مغل شہنشاہ محمد شاہ اسی سال میں فوت ہوا اور احمد شاہ ابدالی کا پہلا حملہ وقوع پذیر ہوا۔ نظام الملک بھی دنیا سے گذر گئے اور مسند کے وراثت کے دعویداروں میں وراثت کی جنگ چھڑ گئی۔ ایک دوسرے کے مخالفین اپنی اپنی طرف مرہٹوں، کرناٹک کے فرمانروا فرانسیسی اور انگریز سب کو گھسیٹ لائے۔ فرانسیسی اور انگریز بجائے اس کے کہ ہندوستانی رقیبوں کی امدادی فوج کا کام دیتے خود

اصل دعویدار بن کر برتری کے لئے لڑنے لگے حالانکہ وطن میں دونوں قوموں میں صلح تھی۔

ہندوستان میں فرانسیسی استحکامات کے گورنر جنرل ڈوپلے میں اتنی دوربینی تھی کہ اس نے یہ محسوس کیا کہ انگریزوں کو ہندوستان سے خارج کرنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہندوستان کی حکومتیں اس کی ہدایات قبول کریں اور اپنے تمام وسائل انگریزوں کے خلاف استعمال کرنے کے لئے اس کے حوالے کردیں۔ وہ اس پالیسی پر عمل درآمد اس وجہ سے کرسکا کہ دکن اور کرناٹک دونوں جگہ وراثت کے جھگڑے چل رہے تھے جس سے اس کو دخل دینے کے مواقع حاصل ہوتے۔ اپنی عمدہ تربیت یافتہ یورپین اور ہندوستانی افواج کی مدد سے اس نے اپنے مؤکل کے حق میں پانسہ پلٹ دیا۔ وہ اور اس کے لیفٹیننٹ "بوسی" نے ایسی ہوشیاری سے سارے کام کیے کہ 748ء سے 1756ء تک فرانسیسی کل جزیرہ نما میں غالب و با اقتدار تھے۔ ڈوپلے ہی دراصل کرناٹک کا نواب بنا۔ کرشنا دریا کے دکن کے تمام علاقوں کا گورنر۔ اور بوسی دکن کے معاملات کی نگرانی رکھتا تھا اور نظام کو اپنے ہاتھ کا ایک کھلونا بنائے ہوتے تھا۔

لیکن نہ تو ڈوپلے کے وسائل اور اس کی فنی مہارت اور نہ بوسی کی جرأت مندانہ اسکیمیں اور خوف وخطرے سے بے نیاز بہادری کام آئیں۔ فرانس کا سیاسی نظام فرسودہ ہوچکا تھا۔ فرانس کے معاملات بہت کمزور ہاتھوں میں چلے گئے تھے۔ مالی حیثیت سے فرانس دیوالیہ پن کے بہت قریب پہنچ گیا تھا۔ اس کی بحری طاقت بالکل نظرانداز کرنے کے قابل تھی۔ ان حالات میں ڈوپلے کا واپس بلالینا جس کی دوراندیشی اور عزم نے ہندوستان میں ایک فرانسیسی مملکت قائم کردی تھی ان کے مفاد کے لئے ایک ناقابل تلافی ضرب تھا۔ 1755ء میں ڈوپلے کے جانے کے بعد دکن پر فرانسیسیوں کا اقتدار ختم ہوگیا اور ہفت سالہ جنگ میں انگریزوں نے تباہ کن شکست پر شکست دی جس سے پھر وہ کبھی سنبھل نہ سکے۔

انگریزوں کی یہ خوش قسمتی تھی کہ اگرچہ ہفت سالہ جنگ یورپ میں جو اگست 1756ء میں شروع ہوئی ہندوستان میں لڑائی کی کارروائیاں 1758ء میں شروع ہوئیں اس وقت تک پلاسی کی لڑائی لڑی جاچکی تھی اور بنگال کے دولت آفریں وسائل انگریزوں کے ہاتھ میں جاچکے تھے۔ کرناٹک میں جو بھی کچھ ہوا ہو وہ ہندوستان میں ان دو قوموں کے

مستقبل کو بدل نہیں سکتا تھا۔

ہفت سالہ جنگ میں فرانسیسیوں کی سرگرمیوں کا انجام مکمل تباہی و بربادی ہوا جو سلطنت ڈوپلے اور بوسی کی محنتوں سے تعمیر کی گئی تھی اس میں سوائے ساحل کے دو قصبات کے جو غیر مسلح تھے کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ فرانس کے سیاسی اثرات کلیتاً ختم ہو گئے۔

ایک ایک کر کے سب رقیب ختم ہو گئے اور میدان انگلستان کے لئے صاف ہو گیا کہ وہ ہندوستان میں اپنے مقاصد کو بروئے کار لائے۔ تنازع للبقا میں اصلح ترین کامیاب ہوا تھا۔ پرتگال کے معاملہ میں ناکامی کے وجوہ تلاش کرنے ہیں کہیں دور نہیں جانا ہے۔ سولھویں صدی میں اس کی آبادی صرف دس لاکھ تھی۔ یہ اس قدر کم تھی کہ اس کے پیش نظر بادشاہ سلامت کا یہ شاندار اعلان کہ وہ "فتوحات، جہازرانی اور تجارت کے حبشہ، ایران اور ہندوستان میں مالک اعلیٰ ہیں" کسی طرح جائز نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے مقاصد بہت وسیع تھے مثلاً دنیائے اسلام کے خلاف جہاد کرنا، حضرت مسیح کا پیغام کافر قوموں میں پھیلانا، گرم مسالوں کی تجارت پر قبضہ کرنا اور نصف دنیا پر حکومت قائم کرنا۔ پرتگال نے جو عظیم کام اپنے ذمہ لیا تھا اس کے لئے اس کے پاس آدمیوں میں تجربہ اور عقل مندی کی کمی تھی۔ اس پر اتنا دباؤ پڑا کہ اس کی طاقت ٹوٹ گئی اور شاہی خاندان کے خاتمہ کے بعد جو مہم شہنشاہیت کے بھروسہ پر شروع کی گئی تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔

1580ء میں پرتگال کا تاج اسپین کے بادشاہ کو وراثت میں ملا۔ دونوں کے اشتراک سے طاقت میں اضافہ ہوا۔ اسپین کی مالیات پریشانی کی حالات سے گذر رہی تھیں۔ سولھویں صدی میں چیزوں کا نرخ پانچ گنا ہو گیا تھا۔ پیداوار میں تنزلی آگئی تھی۔ منڈیاں کھو گئی تھیں اور صنعت مفلوج تھی۔ افراط زر نے دولت مندوں اور امرا کو اور زیادہ دولت مند بنا دیا لیکن غریبوں، محنت کش مزدوروں اور خریداروں کو بھوکوں مار دیا۔ طبقاتی اختلافات بڑھے اور دونوں طبقوں میں ٹکراؤ اور زیادہ گہرا ہو گیا۔ کاہل دولت مند اور لاکھوں بھوک سے مرنے والے ایک دوسرے پر قہر آلود نظریں ڈالتے تھے۔ سماج کے اعضائے رئیسہ میں ایک سڑنے والا اخلاقی مرض پیدا ہو گیا تھا جب کہ دولت نے حسد کو جنم دیا اور رقابت کو کسا یا قوم سے مدافعت کی طاقت سلب ہو گئی۔ اس طرح "سمندر کے گداگر" ڈچ اور "سمندر کے کپتان" انگریز نے اسپین کی مملکت شاہانہ کو خاک میں ملا دیا۔

اس کے بعد ڈچ جو مشکل سے پچاس لاکھ کی ایک قوم تھی پرتگالیوں کی وراثت کے میدان میں بڑی جرأت سے اترے اپنی سوداگرانہ اغراض کے لئے جو کہ انھوں نے ایجاد کیا وہ ایک نیم قومی کمپنی تھی۔ اس کے سپرد دو کام تھے، تجارت اور جنگ۔ اس کو وسیع اختیارات سونپے گئے۔ مشرق کی کل تجارت کی اجارہ داری، درآمدی ٹیکس سے معافی، مسلح فوج کا قیام، جنگ اور صلح کرنا، صلح ناموں کو ترتیب دینا، روپیہ کمانا ما پنے حدود کے اندر انتظامی عدلیہ اور قانون سازی کے اختیارات برتنا۔

لیکن کمپنی اور ڈچ اسٹیٹس جنرل کے قریبی تعلقات کی وجہ سے اس کو قومی دولت کے نشیب وفراز سے متاثر ہونا پڑا۔ شروع ہی سے ہالینڈ مسلسل جنگوں میں مبتلا تھا۔ پہلے پرتگال اور اسپین کے خلاف اور اس کے بعد سترھویں صدی کے وسط سے انگلستان کے خلاف اور بعدہٗ لوئی چہاردہم کے فرانس کے خلاف تمام اٹھارھویں صدی میں کمپنی کی پابندیاں ایک اقتدار اعلیٰ کے مالک کی حیثیت سے بڑھتی گئیں۔ قلعے بے شمار ہو گئے۔ انتظامیہ کے اخراجات بڑھ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ کمپنی کی تجارت کو فروغ ہوا لیکن کمپنی کی مالیات زیادہ سے زیادہ پریشانی میں مبتلا ہوتی گئی۔

لڑائیوں کو جاری رکھنے کے لئے سرمایہ کے بارے میں کمپنی کا حکومت پر بھروسہ ایک ناقص انتظام تھا۔ زمین پر لڑائیاں ہونے سے بحری بیڑہ نظر انداز ہو گیا۔ کمپنی کو تجارت میں عظیم نقصانات اٹھانے پڑے۔ بہت سے مرکزوں سے کوئی منافع ہوا ہی نہیں اور اس کے قرضے بڑھتے ہی گئے حتیٰ کہ ان کی مقدار ایک سو ملین گلڈرس کی بڑی رقم تک پہنچ گئی۔ اسٹیٹس جنرل کا کنٹرول ڈائرکٹروں کی تقرری اور پالیسیوں کے بارے میں غیر صحت مندانہ ثابت ہوا۔ حکومت کی مالیات کے نشیب وفراز کا اثر کمپنی پر بھی ہوتا تھا۔ اس لئے جب انقلاب فرانس کی لڑائیاں شروع ہوئیں اور ہالینڈ نپولین کے قائم کردہ نظام کا ایک جزو ہو گیا تو انگریزوں کے بحری بیڑے نے ڈچوں کو ہندوستان کے سمندروں سے بہا کر باہر پھینک دیا۔

فرانسیسی اپنے کاہلانہ خواب سے اس وقت بیدار ہوتے جب "پریارڈ ڈی لیول" اور مارٹن ڈی وٹرے نے 1601ء میں اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ہندوستان کا سفر کیا لیکن مشرقی ممالک سے تجارت ناکام ہی رہی تا آنکہ سوداگرانہ نظریے کے عظیم علم بردار گلبرٹ نے 1664ء میں فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد رکھی۔ لیکن فرانسیسی تجار جو مال تیار کراتے تھے

ان کی مخالفت کا اس کو سامنا ہوا اور اس کی کاروائیاں کم ہو گئیں۔ لوئی چہاردہم جو لڑائیاں بحری طاقتوں سے لڑا اس نے سمندر پار کی فرانس کی تجارت کو مفلوج کر دیا اور کمپنی کا کاروبار اور بھی زیادہ کم ہو گیا۔ اس مشکل حالت سے جان لا نے اس کو 1720ء میں نجات دلائی۔ لیکن یہ حکومت کا ایک محکمہ بن گئی جو خود کوئی عمل کرنے یا کسی قسم کی ذمہ داری محسوس کرنے سے محروم تھی۔ اس کے ڈائریکٹروں کو بادشاہ حصہ داران کی حمائیت سے نامزد کرتے تھے اور وہ ان ڈہائی عشروں کے احکام بجالاتے تھے جن کو گورنمنٹ مقرر کرتی تھی۔ فرانس کا کنٹرولر جنرل ڈائریکٹروں کے جلسہ کی صدارت کرتا تھا اور کل اہم معاملات میں اس کی منظوری لازمی تھی اگرچہ کمپنی ان تمام اختیارات سے لدی ہوئی تھی جو ایک سوداگرانہ پالیسی کا تقاضہ تھا یعنی تجارت کی اجارہ داری، جنگ اور صلح کرنے کا حق۔

لیکن آزادی کے فقدان نے اپنی طبیعت سے کاروائیاں آغاز کرنے کا گلا گھونٹ دیا اور اہلِ صنعت کی مخالفت نے ایک دوراندیشانہ تجارتی پالیسی بنانے میں رکاوٹ ڈالی۔ کونسلوں میں حکومت کے غلبے نے کمپنی کو ان تمام برائیوں سے دوچار کر دیا جن کی گورنمنٹ خود شکار تھی۔ مالیات میں بدنظمی کا عمل دخل تھا۔ کمپنی مقروض تھی اور ڈوپلے کی اسکیموں کے لئے ضروری سرمایہ نہیں ملتا تھا۔ چوں کہ لوئی چہاردہم براعظم پر لڑائیوں میں مشغول تھا اس لئے تجارتی جہاز اور بحری بیڑوں پر کوئی توجہ ہی نہ دی جاتی تھی۔ اس نااہلی اور بدانتظامی کی فرانس کو بڑی گراں قیمت ادا کرنی پڑی۔ اس کا جاگیردارانہ سیاسی نظام اٹھارھویں صدی کے حالات کے قطعی غیر موافق تھا۔ انقلاب کے دوران یہ نظام پھٹ گیا اور ان تمام اداروں کو بھی اپنے ساتھ ختم کر دیا جو اس کے زیر سایہ اس کی مالی امداد سے قائم تھے۔

انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے رقیبوں سے زیادہ خوش قسمت تھی۔ یہ ایک آزاد جماعت تھی اور اپنے کاروبار میں حکومت کی مداخلت سے بے نیاز تھی۔ حکومت سے اس کا تعلق لچکدار تھا۔ اگرچہ اندرونی خانہ جنگیوں اور سیاسی انقلابات کے اثرات اس پر مترتب ہوتے تھے۔ لیکن دستور سے متعلق ہنگاموں میں یہ گہرائی کے ساتھ مبتلا نہیں ہوتی تھی اور نہ ان جنگوں سے کوئی حقیقی تعلق رکھتی تھی جو ملک کے باہر ہوتی تھیں جس کے ہاتھ میں بھی اختیارات کی باگ ڈور ہو خواہ وہ بادشاہ ہو یا پارلیمنٹ اس کے مفادات مجموعی طور پر محفوظ رہتے تھے کیوں کہ سمندری طاقت میں ترقی دینے اور قومی خوش حالی کی نشوو

نمایں کمپنی کا جو حصہ تھا اسے انگلستان تسلیم کرتا تھا۔ انگریزوں کا سیاسی نظام خواہ وہ مطلق العنان شہنشاہیت ہو جیسا کہ ٹیوڈر بادشاہوں کے زمانہ میں تھا یا پارلیمنٹری آمریت ہو جیسے کہ کرام ول کے زمانہ میں تھا ایک اعلیٰ سطح کے متوسط طبقہ کی چند سری حکومت ہو جو اٹھارھویں صدی میں تھی سب کے سب عوام کی خواہشات کے ہمدرد اور ان کے مفاد کی ترقی کے لئے فکرمند رہتے تھے۔ اس طرح یہ نظام ان نظاموں سے جو پرتگال، اسپین اور فرانس میں رائج تھا افضل تھا۔

کمپنی کا نظام اور اس کے کاروبار کے طریقے بھی فرانسیسی اور ڈچ کمپنیوں سے بہتر تھے ان لوگوں کے برخلاف انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی مالدار جماعت تھی جو ان حکومتوں کو جو ضرورت مند ہوتی تھیں قرض دیتی تھی۔ اس نے تجارت کا ایسا منصوبہ بنایا تھا جس سے صنعت کی ترقی کو نقصان پہنچائے بغیر ملک کو فائدہ پہنچتا تھا۔ جو سونا چاندی باہر جاتا تھا اس کے بدلے میں ایک سیلاب قابلِ استعمال سامانوں اور پھر برآمد کرنے کے لائق سامانوں کا آتا تھا اور انگلستان کو دھنی بناتا تھا۔ انگلش کمپنی میں برتری مضمر تھی —— اگرچہ یہ سخت امتحانات سے گذری لیکن آخر میں یہ فتحیاب ہوئی۔

بنگال فتح کے وقت پر

قبل اس کے کہ آسٹریا کے تخت کی جانشینی کی لڑائی شروع ہو جنوبی ہند میں اقتدار کے لئے دو مقابل حریفوں انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اپنی جنگجویانہ حرکات کو معطل کر دینے کا فیصلہ کر دیا تھا۔ 1754ء کا صلح نامہ ڈوپلے کے عظیم منصوبوں کی علامت تھا۔ اگرچہ ایک دوسرا باکمال ذہانت کا مالک "بوسی" اب بھی دکن کے نظام پر اپنی خطرناک بالادستی قائم کئے ہوئے تھا پھر بھی ہندوستان میں فرانس کی پوزیشن کی کمزوری بالکل ظاہر ہو چکی تھی۔ اس لئے جب کہ فرانسیسی اپنے زخموں کو چاٹ رہے تھے اور دوسرے قریب الوقوع مقابلہ کی تیاری کر رہے تھے جسے وہ ناگزیر تصور کرتے تھے انگریز فتح کی خوشی میں پھولے نہ سماتے تھے۔ جو کھیل فرانسیسیوں نے شروع کیا تھا اس میں ان کی تمام چالبازیوں کو انگریزوں نے خود سیکھ لیا اور اپنے استادوں پر سبقت لے گئے۔ انھوں نے ہندوستانی راجاؤں اور ان کی فوجی مقدرت کو پیمانہ میں ناپ لیا تھا۔ ان کی یہ خوش قسمتی تھی کہ 1756ء اور 1758ء

کے مابین باوجود اس کے کہ یورپ میں جنگ ہو رہی تھی وہ اپنے حریفوں سے کسی اہم کشمکش میں مبتلا نہ تھے لیکن اسی درمیان ان کے منصوبہ کے لئے بنگال میں ایک نیا چیلنج ظاہر ہوا۔

1756ء میں اللہ وردی خاں نواب بنگال جس نے صوبہ پر پندرہ سال حکومت کی انتقال کر گیا۔ اس کی موت نے ہندوستان کی تاریخ میں ایک منحوس دروازے کو کھول دیا۔ بنگال اٹھارھویں صدی کے نصف تک گورنروں کے معاملہ میں بہت ہی تقدیر والا رہا۔ مرشد قلی خاں جو 1700ء میں بنگال کا دیوان مقرر کیا گیا، اپنی موت تک جو 1727ء میں واقع ہوئی حکمرانی کرتا رہا۔ اس کے بعد اس کے داماد سوجا خان نے چودہ سال تک صوبہ پر حکمرانی کی۔ تقریباً ایک سال کی درمیانی مدت کے بعد جب کہ مرشد قلی خاں کا نااہل بیٹا فرمانروا رہا اللہ وردی خاں نے باگ چھین لی اور 1756ء تک حکمران رہا۔ یہ تینوں بڑے طاقت ور اور لائق منتظم تھے۔ ان کی ماتحتی میں بنگال بہت زیادہ خوش حال ہوا۔ یہاں تک کہ اسے "ہندوستان کی جنت" تصور کیا جاتا تھا۔

اس کے بہت سے وجوہ تھے، جبکہ بقیہ ہندوستان باہمی خانہ جنگیوں مرہٹوں کے حملوں اور جاٹوں کی بغاوتوں سے پریشان تھا شمالی ہندوستان نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے تباہ و برباد کر دیا گیا تھا بنگال مجموعی طور پر پُر سکون تھا۔ مرہٹوں کی غارت گری (1742ء تا 1752ء) درحقیقت بہت ہی تکلیف دہ واقعہ تھی۔ کیوں کہ اُڑیسہ کو ان کی مملکت میں شامل تو ہونا پڑا تھا بقیہ اور طریقوں سے امن وامان میں خلل نہیں پڑا تھا۔ امن اور قانون کے قیام کے ساتھ ساتھ انتظامی تدابیر کے استعمال نے خوشحالی پیدا کی حکومت کے جو جو ذرائع آمدنی تھے، مالگذاری اور تجارت، دونوں پر خصوصی توجہ مبذول کی گئی۔

دوسرے صوبوں کی طرح بنگال بھی آخری مغل حکمرانوں کے ایام میں جاگیردارانہ نظام کے غیر معمولی طور پر پھیلنے سے مصیبت میں مبتلا ہوا تھا۔ یہ صورتِ حال اقتصادی حیثیت سے تباہ کن اور سیاسی حیثیت سے خطرناک تھی۔ مرشد قلی خاں نے اس کے خلاف انتہا پسندانہ قدم اٹھائے۔ بنگال میں بہت سی جاگیروں پر حکومت نے قبضہ کر لیا اور جاگیرداروں کو اُڑیسہ میں زمین دے دی گئی۔ خالصہ (یعنی تاج) کی اراضی جو اس طرح تصرف میں آئی وہ حکومت کی براہِ راست نگرانی میں لے لی گئی۔ اس کی مالگذاری طے کرنے کے لئے کئی راستے کھلے ہوئے تھے۔ ٹوڈرمل کا نظام "ضبط" سب سے زیادہ سائنسی تھا اس کی بنیاد یہ تھی کہ کاشت کاروں کی

زمینوں کی پیمائش کرلی جائے اوران کی اوسط پیداوار کا تخمینہ لگا لیا جائے اور حکومت کا حصہ اس میں نقدی میں مقرر کر دیا جائے۔ مگر یہ نظام بنگال کی عجیب اور موسمی حالات کی وجہ سے ناقابلِ عمل تھا" اسٹان کار" کے الفاظ میں" ہندوستان کے تمام دیگر صوبوں سے زیادہ شاید بنگال کے نچلے حصہ میں بہت ہی غیر معمولی تبدیلیاں دریاؤں کے زبردست زور سے پیدا ہوتی ہیں جو اپنے ساتھ برسات کے موسم میں سبز سیلاب لاتی ہیں۔ پانی کی ایک کثیر مقدار قدرتی رکاوٹوں کے مابین کاٹ کر نکلتی اور گاؤں کے گاؤں بہالے جاتی ہے۔ ریاست کا آدھا یا پورا حصہ گھس ڈالتی ہے اور اپنے قبضہ تصرف میں لے آتی ہے۔ بڑے بڑے علاقوں کو پانی سے بھر دیتی ہے اور اکتوبر میں غائب ہو جاتی ہے۔ اس کے پیچھے ایک جدید اراضی پانی سے بنا کر چھوڑ جاتی ہے اور حیران و پریشان مالکان اراضی مبہم قیاس کرتے رہتے ہیں کہ ان کی پرانی زمینوں کے حدود کہاں سے کہاں تک تھے[35]"

بنگال کے کاشت کار چھوٹے چھوٹے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے گاؤں میں رہتے تھے جن کے چاروں طرف ناقابلِ عبور ندیاں تھیں۔ ان حالات میں زمینوں کا صحیح صحیح ریکارڈ نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی لئے نوابوں نے یہی مناسب سمجھا کہ گاؤں کو فارم پر اُٹھا دیں۔ مالکانِ فارم انتہائی سختی سے لگان وصول کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ حکومت کے خزانے میں روپیہ ریلا آتا رہتا لیکن کاشت کار غریبی کی انتہائی حد تک پہنچ گیا تھا۔ زمین داروں کا بھی حال بہتر نہ تھا۔ ان پر یہ شبہہ ہوتا تھا کہ اپنے مفاد کے پیشِ نظر انھوں نے مالگذاری میں مداخلت کی ہے۔ وہ اپنے عہدے سے ہٹا دیئے جاتے تھے۔ "امیل" یا ریونیو افسران کلکٹر مقرر کئے جاتے تھے۔ ان میں زیادہ تر ہندو ہوتے تھے کیوں کہ اطاعت گذار ہندوؤں کو قابو میں رکھنا سرکش مسلمانوں سے زیادہ آسان تھا۔

ان تمام کارروائیوں کا اثر یہ ہوا کہ محاصل کا مطالبہ جس کا اندازہ ٹوڈرمل نے ایک کروڑ سے کچھ ہی زیادہ لگایا تھا مرشد قلی خاں کے زمانہ میں ڈیڑھ کروڑ تک پہنچ گیا اور اس کی موت کے وقت تو یہ بڑھ کر ایک کروڑ چھیاسی لاکھ ہو گیا تھا۔ اس زیادتی کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ جنگی محصول بڑھا دیئے گئے تھے۔ لیکن اگرچہ مطالبہ بڑھتا گیا مگر دراصل جو رقم وصول ہوتی تھی وہ بہت کم تھی۔ 63-1762ء میں اگرچہ مطالبہ ساڑھے سات کروڑ سے بھی زائد کا تھا لیکن اصل وصول پچاس فی صدسے کم ہوئی۔ لیکن بہرحال ان بقایوں کے باوجود صوبہ کی سالانہ آمدنی میں برابر اضافہ

ہوتا گیا۔

صوبہ کا دوسرا اہم ذریعۂ آمدنی کسٹم ڈیوٹی تھا۔ صرف ڈھاکہ تقریباً تیس لاکھ قیمت کا کپڑا ایشیائی ملکوں کو بھیجتا تھا۔ قاسم بازار ڈھائی لاکھ ملین پونڈ کی قیمت کی سلک تیار کرتا تھا۔ مرشدآباد کے کسٹم آفس نے ستر لاکھ روپیہ کی قیمت کی سلک کی تیاری کا ریکارڈ قائم کیا۔ پچاس ہزار من شکر بحیرۂ فارس اور ہندوستانی صوبوں کو بنگال سے روانہ کی گئی اور اسی کے ساتھ جوٹ کی بھی ایک بڑی مقدار بھیجی گئی۔ اس کے علاوہ متعدد اشیاء ایسی تھیں جو باہر فروخت کی گئیں مثلاً شورہ اور افیون وغیرہ۔ 1706ء سے 1756ء کی نصف صدی میں اپنے برآمد کے صلہ میں تقریباً 6 کروڑ روپیہ کے برابر سونے کی سلاخیں اور تقریباً 2.3 کروڑ کا تیار شدہ مال بنگال کو ملا۔

ہندوستان کے تیار شدہ مال کی مانگ مشرقی اور مغربی ایشیا کے ملکوں افریقہ اور یورپ میں تھی اور وہ یورپین تجار جنھوں نے ہندوستانی اور دوسرے ایشیائی تجار کو سمندری مال کی خرید فروخت کے منافع بخش کاروبار سے نکال کر ان کی جگہ خود لے لی تھی بڑے بڑے منافع حاصل کر رہے تھے۔ سمندر کی تجارت بڑھ کر بہت بڑی مقدار تک پہنچ گئی تھی۔ باوجود اس کے کہ کسٹم ڈیوٹی کی شرح بہت کم تھی (مال کی کل مقدار کی قیمت کا 2.5 فی صدی) اور انگریزوں کو ان کی ادائیگی سے استثنا کا حق حاصل تھا۔ مغل سلطنت کی آمدنی مجموعی طور پر اور صوبہ بنگال کی آمدنی خاص طور پر بہت زیادہ تھی۔

بیرون ملک کی تجارت نے صنعت کو فروغ دیا اور ملک کی خوش حالی میں ترقی بخشی۔ اس سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ ہندوستان کے حکمراں انگریزوں اور دوسرے تاجروں کے ساتھ کیوں اتنا لطف و کرم برتتے تھے۔ 1686ء سے 1689ء تک کی لڑائی کے باوجود اورنگ زیب نے انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کو وہ تمام حقوق و مراعات از سر نو عطا کر دیئے جو پہلے سے ان کو حاصل تھے۔ عظیم الشان شاہ نے ڈچوں، فرانسیسیوں اور انگریزوں کو فیکٹریوں کے لئے قلعے تعمیر کرنے اور ان کی حفاظت کے لئے ان میں ہندوستانی سپاہیوں کو رکھنے کی اجازت دی۔ مرشد قلی خاں نے تاجروں کے ساتھ بڑی رعایتیں کیں جس کا انجام یہ ہوا کہ ہگلی ترقی کر کے کلچر کا ایک بڑا مرکز بن گیا۔ کلکتہ کی آبادی جو 1704ء میں پندرہ ہزار تھی بڑھ کر ایک لاکھ ہو گئی اور ڈھاکہ اور مرشدآباد آباد شہر ہو گئے۔

تجارت، صنعت اور زراعت کی ترقی نے بینک کے کاروبار کو اکسایا جیسا کہ "جگت سیٹھ" (یعنی عالمگیر مالکان بینک) کے ابھرنے کی مثال سے ثابت ہے جو صوبوں کی حکومتوں کی طرف سے ایک وقت میں ایک ایک کروڑ کی بدلائی ہنڈی جاری کرتے تھے۔ مرشد قلی خاں بنگال کا خراج اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ دلی بھیجا کرتا تھا۔ یہ قدرتی بات ہے کہ یہ لوگ اس زمانہ کی سیاست میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔

دولت میں اضافہ کے دوسرے ذرائع اختیار کیے گئے۔ حکومت کے اخراجات میں کفایت شعاری برتی گئی لیکن مسلح افواج میں بنظر کفایت کمی کر کے صرف دو ہزار سواروں اور چار ہزار پیدل کا قائم رکھنا ایسا معقول تھا جس کی دانش مندی مشتبہ ہے۔

اس وقت تنزل، بے کسی، دیوالیہ پن کی سیاہ تصویر جو ہندوستان پیش کرتا تھا اس میں صرف بنگال ایک روشن مقام تھا جہاں خوش حالی بھری ہوئی تھی۔ "مغل سلطنت کی واحد چاندی کی کان" اس لئے ایسا ہوا کہ جب دوسرے صوبے کام نہیں آرہے تھے تو اورنگ زیب اپنے دکن کے فضول خرچ مہموں کے سرمائے کے لئے مرشد قلی خاں پر بھروسہ کرتا تھا۔ ان کو بنگال سے ہر سال ایک کروڑ روپیہ ملتا تھا اور اس کے معاوضے میں انھوں نے گورنر کو آزادانہ اختیارات دے دیتے تھے کہ جو جی چاہے کرے۔ اس نے اس سے (گورنر سے) کہا "تم اختیاراتِ کابل کے حامل دیوان اور فوجدار ہو اور کسی بھی شخص کا تمہارے خلاف لگایا ہوا الزام مجھے قبول نہ ہوگا۔"[25]

بد قسمتی سے جگمگاتی ہوئی خوش حالی کی عمارت کے سامنے کے رخ کے پیچھے ایک گری پڑی تعمیر بھی تھی جو اتنی کمزور تھی کہ سمندروں سے جو طوفان چلا تھا اس کی ادنیٰ جنبش سے مسمار ہو جانے والی تھی۔ نواب اور ان کے ظالم چند لیسری حکمرانوں کی دولت بھوکے مرتے کسانوں اور بدبخت کاریگروں کی محنت اور مصیبت سے زبردستی کھینچ کر نکالی ہوئی تھی۔ نئے بنے ہوتے نو دولتیے حکمران اور ان کے مدت دراز سے مبتلائے مصیبت کا شکار صرف بالوں کی رسی سے آپس میں جڑے ہوئے تھے۔

بیرونی لوگ جو عوام کے اندر رہتے تھے انھوں نے اس نظام کی مضبوطی اور کمزوری دونوں کو خوب سمجھ لیا تھا۔ وہ ہندوستان کے حکمرانوں کی طاقت کے بارے میں بڑا حقیر خیال رکھتے تھے۔ 'برنیر' ہندوستانی افواج کے بارے میں اپنا خیال ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے "یہ بڑی

بڑی فوجیں اکثر بڑے بڑے کارنامے انجام دیتی ہیں۔ لیکن جب ایک مرتبہ ان کو منتشر کر دیا جائے تو پھر ان کو ضبط اور قاعدے کے اندر لانا ناممکن ہے۔ جب بھی ان سپاہیوں کو جو نظم و ضبط سے محروم ہیں جانوروں کے ایک جھنڈ کی طرح ناہموار انداز میں مارچ کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو ہر مرتبہ میرا خیال ہوتا ہے کہ فلینڈرس کی فوج کے پچیس ہزار آزمودہ کار سپاہی جن کی کمان پرنس کانڈے یا مارشل ٹورین کے ہاتھ میں ہو وہ کس آسانی سے ایک ہندوستانی فوج پر خواہ اس کی تعداد کتنی ہی ہو قابو پا سکتے ہیں[37]" ایک مصنف اٹھارھویں صدی کے آخر میں لکھتا ہے کہ "ان کی تشکیل جتنا خرچ مانگتی ہے اتنی ہی ناقص ہے۔ ان بے شمار مردوں کی جماعت اور ان تیز رفتار گھوڑوں کا منشا اس کے سوا اور کچھ نہیں نظر آتا کہ اپنے حاکم کے مارچ کی زینت بنیں[38]"۔ مارکوئس آف الورنا نے ہندوستان کے اُمرا اور راجگان کی بے ترتیب فوجی بھیڑ پر اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا ہے کہ "پانچ ہزار باضابطہ فوج کے ساتھ میں اس طرح کی پچاس ہزار فوج پر حملہ کرنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہ کروں گا[39]" فرانسیسی اور انگریز فوجی افسر جو ہندوستانی حکمرانوں کی فوجوں سے واقعی لڑتے تھے ان کی فوجی قابلیت کے بارے میں حقارت آمیز رائے رکھتے تھے۔ مثلاً ڈوپلے نے کمپنی کے ڈائرکٹروں کو پیرس میں لکھا ہے کہ "کسٹنا کے اس پار کے تمام مسلم قلعوں اور صوبوں پر صرف پانچ سو یورپین سپاہی قبضہ کر سکتے ہیں[40]" کلایو نے 7 جنوری 1759ء کو ولیم پٹ کو لکھا کہ دو ہزار یورپین سے کمپنی میر جعفر اور میران سے اقتدار اعلیٰ چھین سکتی ہے[41]۔

واقعہ یہ ہے کہ یورپین فوجیں "ایک ایسے دیو کی طرح تھیں جس کے ہزاروں ہاتھ ہوں جن سے وہ مدافعت بھی کرے اور حملہ بھی جس طرح ایک دماغ اس کو حکم دے، جب کہ ہندوستان کی فوجیں ایک غیر تربیت یافتہ بھیڑ کی طرح تھیں جو دست بدست لڑائی میں نہ تو ضرب ہی لگا سکتی تھیں اور نہ بچاؤ ہی کر سکتی تھیں۔"

معلوم ہوتا ہے کہ اللہ وردی خاں کو اس کا دھندلا سا احساس تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے آئندہ خطرے کا ان الفاظ میں اظہار کیا تھا[42] "اب زمین پر آگ بجھنا مشکل ہو گیا ہے لیکن اگر سمندر میں آگ لگ جائے تو کون اسے بجھا سکتا ہے۔"

جب وہ 1756ء میں مرا اور اس کا پوتا سراج الدولہ بنگال کی مسند پر قابض ہوا تو سمندر میں آگ لگا دی گئی۔ یہ وہ سال ہے جب احمد شاہ ابدالی پنجاب میں داخل ہوا۔ بنگال پر اس کا

یہ اثر ہوا کہ حکومت کی حمایت بالکل صفر کے برابر ہو گئی۔ سراج الدولہ نے گورنر کا عہدہ غالباً بغیر دلی کو اطلاع تک کئے سنبھال لیا کیوں کہ شہنشاہ کا منصب مشتبہ ہو گیا تھا۔

بنگال کی فتح

سراج الدولہ اس طرز کا حکمران نہ تھا جو وقت کی ضرورت تھی۔ وہ ایک ایسا بچہ تھا جو خراب کر دیا گیا تھا۔ "جسے ایک بوڑھے آدمی کے لاڈ و پیار نے خود آرا اور خود پسند بنا دیا تھا۔ اس نے اعلیٰ اور ادنیٰ سب کو اپنے انتہائی حریصانہ، آمرانہ اور ظالمانہ برتاؤ سے ناراض کر دیا۔" وہ اس تخت پر جو بہت عرصہ قبل اس کا قرار دیا جا چکا تھا اس وقت بیٹھا جب خود اس کے گھر میں باہمی اختلافات تھے۔ فوج کا ایک گروہ مخالف تھا اور رعایا کی آبادی غیر مطمئن تھی۔[43] "ان یورپینوں نے جو اس کی عزت گھٹانے کے درپے تھے اس کی تصویر سیاہ رنگ میں اتاری ہے لیکن اس کی دوسری تدابیر خواہ کسی قدر ناقابل جواز ہوں لیکن جہاں تک انگریزوں کا تعلق ہے انھوں نے اس کے خلاف زیادہ گناہ کئے بہ نسبت اس کے کہ اس نے گناہ کئے ہوں۔

جو نزاع اس کے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹوں کے درمیان شروع ہوا تھا وہ اس میں بالکل حق پر تھا۔ کمپنی نے یہ معمولی اخلاق بھی نہیں برتا کہ اس کی تخت نشینی کو ہی تسلیم کر لیتی۔ ایک شخص کو جس کے خلاف اس نے عدالتی حکم جاری کیا تھا اور جو انصاف سے بھاگ رہا تھا کمپنی والوں نے خلاف قانون پناہ دے دی اور اس کے افسر کو کلکتہ سے خارج کر دیا جو اب بھی بنگال کے نواب کی مملکت میں تھا۔ سب سے زیادہ خراب بات یہ تھی کہ کمپنی نے کلکتہ میں بلا نواب کی اجازت طلب کیے جو قلعے تعمیر کر لیے تھے ان میں رہنے کے لئے فوجیوں کی تعداد بڑھالی تھی جو بات اللہ وردی خاں کے احکام کے اعلانیہ خلاف تھی جس نے فرانسیسیوں اور انگریزوں سے کہہ دیا تھا کہ "تم لوگ تاجر ہو تم کو قلعہ کی کیا ضرورت ہے۔ چوں کہ تم ہماری محافظت میں ہو تم کو کسی دشمن کا کیا ڈر ہے۔"[44]

انگریزوں نے نواب کے غصہ کو معافیوں سے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی لیکن ان لوگوں نے مخالفت کی کارروائیاں بھی پہلے تو اس امید پر جاری رکھیں کہ فرانسیسی اور ڈچ ان کی مدد کریں گے اور جب اس میں ناکامی ہوئی تو فوج کی تعداد کو بڑھا کر، خوراک اکٹھا کر کے اور محافظت کے انتظامات میں اضافہ کر کے مخالفت کا عملی اظہار کیا۔ ان باتوں

سے غصہ میں آکر وہ عجلت کے ساتھ کلکتہ پہنچا۔ قلعوں پر گولہ باری کی اور حملہ کر کے فورٹ ولیم پر قبضہ کر لیا۔ لیکن بہر حال اس نے انگریز گورنر کو اپنے جہازوں کے ساتھ "فلتا" نکل جانے دیا جہاں وہ بلا مداخلت اس وقت تک رہا جب تک کہ کلایو کی سرکردگی میں مدراس سے کمک نہ آگئی۔

فوجی نقطۂ نگاہ سے اس سے بڑی غلطی ممکن ہی نہیں تھی کیوں کہ فلتا انگریزوں کا ایک مرکزی مقام تھا جہاں سے بحری طاقت کی مدد سے وہ ان قلعوں کو حاصل کر سکتے تھے جو دریا پر انھوں نے کھو دیے تھے۔ مدراس کی فوجوں کو لے کر کلایو کے آجانے سے حالات کا پورا رخ بدل گیا۔ بنگال کے حالات میں بودا پن تھا۔ 1686ء سے 1689ء جنگ کی یادیں دماغوں کو پریشان کرتی رہتی تھیں اور جان رسل نے جو خط 1712ء میں مغل بادشاہ کو لکھا تھا اور اس میں جو توہین نمایاں تھی وہ اب تک باقی تھی[45] لیکن دکن کی فتوحات نشہ آور تھیں۔ اس لئے واٹس اور کلایو نے جو خطوط سراج الدولہ کو لکھے وہ آگ اور کبریت سے بھرے ہوئے تھے۔ کلایو نے نواب کو لکھا "یور ایکسیلنسی جب دوسروں سے سنیں گے کہ کتنی فوج بنگال میں آگئی ہے ایسی فوجی طاقت آپ کے صوبہ میں کبھی دیکھی نہیں گئی تھی جب یور ایکسلنسی یہ سب سنیں گے اور ان پر سنجیدگی سے غور کریں گے تو مجھے امید ہے کہ آپ اپنا ہم لوگوں کا اور اپنے صوبہ کی تجارت کا اتنا زیادہ خیال کریں گے کہ آپ کمپنی کو جو نقصانات ہوئے ہیں ان کا پورا معاوضہ ادا کریں گے۔[46]"

واٹس نے اور زیادہ صفائی سے بات کہی اور بلا کسی مدبرانہ نفاست کے بھدے پن سے اس طرح پھوٹ پڑا "میں تمہارے ملک میں ایسی آگ لگاؤں گا جسے دریائے گنگا کا کل پانی بھی نہ بجھا سکے گا۔[47]" اس کی ضرورت نہیں کہ لڑائی کی چالبازیوں، حیلہ سازیوں، سازشوں، سیاست بازیوں اور خدا معلوم کیا کیا، کی تفصیل بیان کی جائے جس سے بنگال انگریزوں کی غلامی میں چلا گیا۔

1757ء کی جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کا خاتمہ ہوگیا اور میر جعفر خاں از راہ مروت اس پر راضی ہوگیا کہ "کرنل کلایو کے گیدڑ" اور بطور کٹھ پتلی نواب کا کردار ادا کرے۔ پلاسی نے ایک طویل سلسلۂ نتائج پیدا کیا جس نے ہندوستان کا چہرہ بالکل بدل دیا۔ اقتصادیات اور گورنمنٹ کا جو نظام صدیوں سے چلا آرہا تھا الٹ گیا۔[48]

پلاسی نے طاقت منتقل کی۔ 1769ء کی بکسر کی لڑائی نے حقوق کو جنم دیا۔ نام نہاد مغل شہنشاہ نے ایک فرمان جاری کیا جس کی رو سے دیوانی (یعنی سول حکومت) بنگال، بہار اور اڑیسہ کے صوبوں کی کمپنی کو تفویض کر دی گئی۔ کمپنی کی تاریخ میں باقاعدہ مالی تجارت کا دور ختم ہو گیا اور اس کے بجائے سیاسی طاقت کے سایہ میں اور حکومت کے محاصل کی مدد سے تجارت کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ ان نئی سماجی طاقتوں کے ظہور کا آغاز تھا جو بہت دُور مغرب میں ابھری تھیں اور جو آہستہ آہستہ حرکت کر کے سمندر اور بر اعظم کے پار آنے والی تھیں اور سارے عالم کو محیط کر لینے والی تھیں۔

انگریزوں کی فتح کے اسباب

تاریخ کا یہ ایک بہت عجیب واقعہ ہے کہ اس بڑی اور ناقابل تسخیر فوج کے ایجنٹ زیادہ تر بے اصول جھگڑالو حاسد لوگ تھے اور ان خراب جرأت مند مہم بازوں کی سرکردگی میں ان کے ابنائے قوم سپاہی تھے جن میں زیادہ تر بدترین خلائق لوگ تھے۔ مجرم، مرتد، کم ظرف اور یورپ کی تمام نسلوں کی ذلیل ترین لوگ۔[49] ڈوپلے کہتا ہے کہ "کمپنی بھیک منگوں کو اپنا ملازم اور افسر بنا کر بھیجتی ہے جن کی پیٹھ پر ایک قمیص بھی نہیں ہوتی ہے۔[50]" ایک شخص جو عینی شاہد تھا جب بمبئی سے گیا تو اس نے کہا "میں انتہائی گھن محسوس کئے بغیر اس بات کا ذکر نہیں کر سکتا کہ کس حد تک اس مقام میں ہر طرح کی برائیاں بڑے بڑے پیمانے پر کی جاتی ہیں۔ ان کے عمل کے اصول اور نتیجہ میں انگریزوں کے برے اعمال نامے ان کے مصائب کا پیش خیمہ بنتے ہیں اور ہوا کو گندی بھاپ سے بھر دیتے ہیں جو ان کے جسم میں حلول کر جاتی ہیں اور دوسری دنیا کی طرف ان کو جلدی سے رخصت کر دیتی ہیں۔ عیش پسندی، بے حیائی اور کردار کے زوال کی بے شرمانہ انداز ان سب کو کام کرنے کے لیے نیا مواد دیتی ہیں۔" اینڈرسن یہ بھی اضافہ کرتا ہے کہ "تمام قسم کی برائیاں انتہائی عروج پر تھیں۔ اور انتہائی نفرت انگیز گناہ غیر محدود طور پر کیے جاتے تھے۔[51]" اور اس کے علاوہ "ڈائرکٹروں کی کورٹ خود ان برائیوں کی شہادت میں پیش کی جاتی ہے۔ اخلاق اس درجہ گر گئے تھے کہ کورٹ کو دخل دینے کی ضرورت محسوس ہوئی اور 1662ء میں بڑے سخت احکام بھیجے گئے کہ حکام اصلاحی تدابیر کو فوراً عمل میں لائیں۔ انھوں نے سخت مذمت کے ساتھ ریمارک میں "بلوے، اسراف، کاہلی اور حماقت" کے الفاظ استعمال کیے ہیں جو حد درجہ

عام ہو چکے ہیں۔ ان لوگوں نے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ فضول خرچیوں اور مخرب اخلاق عادتوں کو روکنا ہے[52]۔

ان کی موافقت میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ صرف یہ کہ جو اُن کے لوگ شکار ہوئے ان کے اخلاق بھی ان سے کچھ بہتر نہ تھے۔ ہندوستان کے راجگان اور امراء جنھوں نے انگریزوں کی مخالفت کی اور ان سے لڑے وہ کل کے کل ایسے نہ تھے جن پر رشک کیا جا سکے۔ ڈوپلے ان کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتا ہے "ضمیر فروش، بزدل اور گورنمنٹ کے ابتدائی اصولوں اور تدبیر ملکی میں اعتماد کی بنیادوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں[53]" دوسرے الفاظ جو اس نے ان لوگوں کے بارے میں استعمال کیے وہ یہ تھے "توہم پرست، متلون المزاج، ایک دوسرے پر شک کرنے والے، طاقت نمود اور دھوکے پر بھروسہ کرنے والے، کسی چیز کی سوائے پیسے کے پروا نہ کرنے والے، عشرت پسند، عیاش[54]" ایک ایسے بیرونی مہم باز کے اس فیصلے میں مبالغہ اور بدنیتی شامل ہو سکتی ہے جو اس بات پر تلا ہوا تھا کہ یہاں ایک سلطنت کی تعمیر کرے لیکن اس کے بیان کی تائید ایک سنجیدہ ہندوستانی مورخ سے بھی ہوتی ہے۔ جدو ناتھ سرکار نے اٹھارھویں صدی کے ہندوستانی نظم و نسق کو ناامیدی کی حد تک بے ایمانی اور نالائقی کا مجسمہ قرار دیا ہے اور منتظمین کے بارے میں لکھا ہے کہ "وہ خود غرض، مغرور اور نالائق حکمران طبقہ کی ایک چھوٹی سی ٹولی۔" وہ ان کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جیسے کہ "احمق، زانی اور سادیت (ایک قسم کی جنسی کج روی جس کے کرنے والے کو معشوق کو ایذا دینے میں مزہ آتا ہے) میں گرفتار تھے۔ ان کی ماتحتی میں خانگی زندگی کی پاکبازی خطرے میں تھی .... مذہب گناہ اور حماقت کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بن گیا تھا۔

اس میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ لوگ عام اخلاق اور سیاسی فہم و فراست سے عاری تھے۔ ان کے دماغ میں عوام کے ساتھ اچھا اخلاق برتنے کا کوئی تخیل تک نہ تھا۔ نہ حکومت یا ملک سے وفاداری یا مذہب تک سے وفاداری کا کوئی خیال تھا۔ انھوں نے یہ سیکھا ہی نہ تھا کہ اپنے ذاتی جذبات کو کسی بڑے مقصد کے کس طرح تابع کیا جاتا ہے لیکن ان میں جوش کی کمی کا الزام لگانا ناانصافی ہوگی، ان میں بہت سے بے پناہی کی حد تک بہادر تھے۔ کام سے نہ جھکنے والے، صاحبِ وسائل تھے، جن میں جو کچھ پیش آئے اس کے سامنے سنجیدگی سے سر جھکانے والے اور تکلیف برداشت کرنے کی لامحدود استعداد رکھتے تھے،

وہ موت تک لوگوں کے ساتھ وفاداری برت سکتے تھے اور اپنے قول پر قائم رہتے تھے۔
جو دین کے طور پر دیا گیا ہو کبھی کبھی مردانہ وار عزم کا بھی اظہار کرتے تھے۔
ان کو ذلت اور شکست کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس وجہ سے نہیں کہ وہ انگریزوں اور فرانسیسیوں سے کم بہادر تھے اور نہ اس وجہ سے کہ ان کے ہتھیار اور ان کی فوجی تدابیر ان لوگوں سے کم کارگر تھے۔ انگریزوں کی فتح نیکی کی بدی پر فتح نہ تھی کیوں کہ اٹھارھویں صدی میں اور بالخصوص اس سے پہلے۔ نصف حصہ میں انگلستان کے اخلاق بھی مثالی نہ تھے۔
جارج اور جارج دوئم دلی مرشد آباد اور حیدر آباد پونہ اور حیدر آباد کے اپنے صنف کے لوگوں سے بہتر نہ تھے۔ لارڈ جیمس فورڈ جارج اول کو کاہل، سست، بھدا اور ذلیل قسم کا عیاش بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جو دل لگی بازوں اور مسخروں کی صحبت کو پسند کرتا ہے۔ جارج دوئم اپنے باپ سے کم چڑچڑا معلوم ہوتا تھا۔ کند ذہن، کنجوس اور ابن الوقت اور اس کی دماغی سطح اس کلاسکی ریمارک میں ظاہر کی گئی ہے کہ "اس کے پاس جینٹنگ (مصوری کا بگڑا ہوا لفظ) بوئٹری (شاعری کا بگڑا ہوا لفظ) کے لیے کوئی وقت نہیں ہے۔ ان کی پارلیمنٹ روزگار اور عہدوں کے متلاشیوں کا مجموعہ تھی جن کے ممبران رشوت خوری اور سڑے ہوئے حلقوں سے چنے جاتے تھے۔ انگلستان کے بسنے والے ایک شر بھونک کرنے والی بھیڑ تھی جو اخلاق، قانون اور ضابطہ کی ادنیٰ بھی عزت نہ کرتے تھے۔ ان کی بدتمیزی اور شہدپن سے سڑکوں پر چلنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ ایک ہم عصر نے خیال ظاہر کیا ہے کہ "لڑنا جھگڑنا انگریزوں کے لئے بہت لذت بخش ہے۔" غلہ سے بنی ہوئی شراب کا پینا بڑے وسیع پیمانے پر پھیل گیا تھا۔ شراب میں مست نوجوان ہر طرح کی زیادتیاں کرتے تھے۔ امیر خاندانوں کے بدمعاش رات میں رہزنی کرتے تھے۔ یہ لوگ چنگیوں کے استاد اور شراب پلانے والے مردوں اور عورتوں کی گھات میں بیٹھ کر ان کو پکڑتے تھے، مارتے تھے اور ان کی ناک کان کاٹ لیتے تھے۔ ادھیڑ عمر کی عورتوں کو پیپوں میں بند کر کے برف کے پہاڑ سے نیچے دھکیل دیتے تھے اور ان سے بے شرمی کے اعمال کرتے تھے۔
کانسٹبلان شراب میں بدمست اور نالائق تھے۔ ہوریس وال پول شرابی پولیس والوں کے بارے میں رپورٹ کرتا ہے کہ ان لوگوں نے 25 یا 26 مردوں اور عورتوں کو جو بھیک مانگنے والے تھے یا حاملہ عورتیں تھیں یا تجارت پیشہ لوگ تھے سینٹ مارٹن کی

لیک کوٹھری میں بند کر دیا اور ان کو تمام رات وہیں رکھا۔ حالاں کہ یہ لوگ برابر پانی کے لئے چلاتے رہے صبح کو چار سانس کے رک جانے سے مر گئے تھے اور دو بعد کو مر گئے اور بارہ ہولناک حالات میں تھے۔

چور ڈاکو اور کھلی سڑک پر لوٹنے والے بھرے ہوئے تھے۔ وال پول لکھتا ہے کہ "اگر دوپہر میں بھی سفر کرنا ہو تو اس طرح سفر کرنا پڑتا ہے کہ گویا لڑائی کے میدان میں جا رہے ہیں"۔ جرائم، اسمگلنگ، جانوروں کے شکار کے لیے چارہ ڈالنا، چوری، زناکاری اور بدچلنی عام تھی۔ جنسی تعلقات ڈھیلے تھے۔ چلتی ہوئی شادیاں یعنی رضامندی اور خلوت صحیحہ بس شادی کے جائز ہونے کے لیے کافی سمجھے جاتے تھے۔ لیکی کہتا ہے کہ "ترک تعلقات، جنسی بے وفائی، ایک عورت کی دو مردوں سے شادی، فرضی شادیاں جن کو فرضی پادری کر دیتے تھے، اس نظام کے قدرتی اور بیشتر ہونے والے نتائج تھے"[59] شادی شدہ عورتیں بذریعہ نیلام فروخت کی جا سکتی تھیں۔ مذہبی احیا کے ساتھ ہسٹیریا، پاگل پن اور رہبانیت، معجزات اور جادو پر یقین اور دینی اختلافات عام تھے۔ مذہبی قواعد کی پابندی سے فرار کی ترغیبات مضبوط تھیں۔

مختصر یہ کہ نہ تو انگلستان اور نہ ہندوستان اٹھارویں صدی کے اندر سماجی حالات کی کوئی خوش گوار تصویر پیش کرتا ہے لیکن انگریز ایک معاملہ میں فوقیت رکھتے تھے، انھوں نے نیشنلزم کے جذبہ کو پروان چڑھا دیا تھا اور ڈسپلن اور نظم و نسق کو حاصل کر لیا تھا۔

انگریزوں کی بنگال پر فتح تاریخ عالم میں عدیم المثال ہے۔ وہ لوگ جنھوں نے اس فتح کی کارروائیوں کو چلایا وہ صرف ایک ٹریڈنگ کارپوریشن (تجارتی گروہ) کے تاجر تھے جن کو جنگی کارروائیوں کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ بہت سے ان کے کمانڈر تو کلرکی کے محکمہ کے تھے جنھوں نے اپنے کو رضاکارانہ پیش کیا تھا یا بس پکڑ لیے گئے تھے اور سپاہی بنا دیئے گئے تھے۔ جن لوگوں پر انھوں نے فتح حاصل کی وہ نہ تو افریقہ اور آسٹریلیا کے قدیم وحشی باشندوں کی طرح تھے اور نہ امریکہ کے نیم مہذب ریڈ انڈین کی طرح کے تھے۔ ہندوستان ایک قدیم اور اعلیٰ درجہ کی ترقی یافتہ تہذیب پر ناز کرتا تھا اور اس پر ناز کرتا تھا کہ اس نے ایسی سلطنت قائم کی جو اپنے بیش قیمت کلچرل کارناموں کے لیے تمام دنیا میں شہرت رکھتی تھی۔ اس کے بہت قسم کے فنون اور اس کی شدید کاریگری سے ایسی فنی مہارت نمایاں تھی جو یورپ پر

فوقیت رکھتی تھی لیکن سائنسی تکنیک، صنعت اور سیاست میں مغرب بلاشبہ راستہ کاٹ کر آگے نکل گیا تھا۔ پھر بھی اٹھارھویں صدی میں فرق بہت زیادہ نہ تھا۔

یہ فتح ایک اور معنی میں بھی عجیب تھی۔ یہ کلیتاً مفتوحین ہی کے سرمایہ سے حاصل کی گئی تھی کیوں کہ کمپنی جنگ یا فتح کے لئے ایک حبہ بھی نہیں دیتی تھی۔ یہ اور بھی چونکا دینے والی بات ہے کہ لڑائی کے ہتھیار مفتوحین نے فراہم کئے تھے۔ دکن کی لڑائیوں میں (1754-1744ء) مدراس کی فوج میں 300 انگریز سپاہی اور تین چار ہزار تک ہندوستانی سپاہی تھے جن میں عیسائی، ہندو اور مسلمان ہر مذہب کے لوگ تھے۔ کلایو نے پلاسی میں جس فوج کو کمان کیا اس میں 950 انگریز پیدل فوج، 150 توپیں اور 2100 ہندوستانی سپاہی تھے جن میں کچھ تو تلنگانہ کے تھے اور کچھ شمالی ہندوستان کے پٹھان، جاٹ، راجپوت اور برہمن۔

جس سستے طریقے پر یہ لڑائی جیتی گئی اس کی کوئی دوسری مثال ملنا مشکل ہے۔ پلاسی میں انگریزوں کا نقصان یہ تھا کہ سات یورپین اور 17 سپاہی قتل ہوئے اور 13 یورپین اور 36 سپاہی زخمی ہوئے اور منافع یہ ہوا کہ ہندوستان کے سب سے دولت مند صوبہ پر حاکمانہ اقتدار حاصل ہوا جس سے 2½ ملین روپیہ سالانہ کے محاصل ملتے تھے اور جس میں 30 ملین لوگ تھے۔

پلاسی نے انگریزوں کی ڈسپلن اور تنظیم کے لیے بنگال کے وسیع وسائل کو ان کے سپرد کر دیا۔ ان کا وقار اتنا بلند ہو گیا کہ مغلوں کی وراثت کے لیے ان کو سب سے زیادہ سنجیدہ دعویدار شمار کیا جانے لگا۔ ان کی خوش قسمتی سے پانی پت میں مرہٹوں کی شکست اور بعد کو ان کے اندر باہمی اختلافات اور افغانستان میں احمد شاہ ابدالی کی موت اور اس کے پیچھے وہاں تاراج کے پھیل جانے سے انگریزوں کے راستہ سے دو بڑے مضبوط حریف ہٹ گئے۔

بکسر کی لڑائی نے انگریزوں کو بنگال کا قانونی حکمران بنا دیا۔ اس نے نواب اودھ کو ایک ایسے معاہدہ کا پابند کر دیا جس سے بنگال کی مغربی سرحدیں محفوظ ہو گئیں اس نے شہنشاہ کی پوزیشن کو گھٹا کر ان کو ایک وظیفہ خوار بنا دیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مغل حکومت کے دوبارہ واپس آنے کے امکان کو ختم کر دیا۔

ڈوپلے صبر کی تلقین کرنے سے کبھی تھکتا نہ تھا۔ انگریزوں نے اس پر عمل کیا۔ وہ کفایت شعاری کے خصائص سے بھی خوب واقف تھے۔ کیوں کہ فرانسیسیوں نے ان کو کافی وارننگ دی تھی۔ انگریز فرانسیسیوں کی تجارت کے طریقوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے کیوں کہ وہ اسے اصولِ اقتصادیات کے خلاف سمجھتے تھے۔ فرانسیسیوں کے استحکامات جو ہندوستان میں تھے ان کی نظر میں چھوٹے چھوٹے خوب صورت گرجا تھے جہاں پادری کا وعظ سنا جا سکے۔ اس لئے 1765ء کے بعد انھوں نے سوچا کہ وہ کافی آگے چلے گئے ہیں اب ان کو جس بات کی ضرورت تھی وہ یہ تھی کہ اپنی فتوحات کو مستحکم کریں اور اپنے منافع کو ترقی دیں۔ ڈائریکٹروں کی کورٹ نے ہندوستان کے اپنے ایجنٹوں کو لکھا "یہ کمپنی کا کام نہیں ہے کہ ہندوستان کو متحد کرنے کا فرض انجام دے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے راجگان بلا ہماری مداخلت کے ایک دوسرے کے خلاف روک بنے رہیں۔"

مزید فتوحات اور مملکت کی توسیع

لیکن ہندوستان کے سیاسی بھنور میں پھنس جانے کے بعد ان کا الگ ہو جانا ناممکن تھا۔ برطانیہ کے مفادات تین حلقوں میں مرکوز تھے۔ بمبئی کے ارد گرد پچھم کے ساحلوں پر، مدراس کے قریب جنوبی مشرقی ساحل پر شمالی مشرقی ہندوستان میں کلکتہ کے گرد و نواح میں۔ بمبئی مکمل طور سے مرہٹوں کی مملکت سے گھرا ہوا تھا۔ اور بمبئی کی خوش حالیاں مرہٹہ حکمرانوں کی سیاست سے متاثر ہوتی تھیں۔ دکن میں جو انگریزوں کے مقبوضات تھے ان کے ڈانڈے تین حکومتوں کی سرحدوں سے ملتے تھے، مرہٹہ، میسوری اور نظام۔ یہ تینوں برابر اپنا اتحاد بدلتے رہتے تھے اور مختلف قسم کی جماعتیں بناتے رہتے تھے اپنی جدید حاصل کی ہوئی مملکتوں کو قائم رکھنے اور ان میں مداخلتوں کو روکنے کے لئے انگریز ان تینوں کی باہمی لڑائیوں میں اپنے کو پھنساتے رہتے تھے خاص کر جب فرانسیسی ان میں سے کسی ایک سے اپنے حریف کو نکال باہر کرنے کے لئے دوستی کرتے تھے۔

شمال میں مغل حکومت اپنی کل طاقت کھو چکی تھی لیکن اس کے نام کا وقار اب بھی باقی تھا۔ اس کی لاش پر قبضہ کرنے کے لئے ایک خوفناک تصادم جاری تھا جس کا شور

اٹھارھویں صدی کے آخری نصف تک برابر گونجتا رہا۔ متصادم ہونے والوں میں دو خاص تھے، افغان اور مرہٹے، ان کے علاوہ اور بہت سے تھے جو امدادی کمک کا کام کرتے تھے۔ ان کے ہر لحظہ ساتھ بدلنے کے واقعات نے اس ذرد ناک ڈرامہ کو ایک غیر معمولی سنجیدہ مسئلہ بنا دیا تھا۔ روہیلہ سردار اور نواب اودھ اکثر دلی دربار میں اثر قائم کرنے کے لئے ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے۔ راجپوت اور جاٹ اور اس صدی کے خاتمہ کے قریب سکھ بھی اس کھیل میں حصہ لے رہے تھے۔ ان کی خفیہ ریشہ دوانیاں، سازشیں، چالبازیاں اور کاٹ میں مخالف چالبازیاں، مغربی مہم اور حملے چاروں طرف بدامنی اور تاراج پھیلا رہے تھے۔ انگریز جو دوابہ کے نچلے حصہ کو اپنے قبضہ اور اثر میں لاچکے تھے، اس پاگل پن کی بدقسمتی کو سرحد پار سے دیکھ رہے تھے اور وقت کے منتظر تھے۔

کورٹ آف ڈائرکٹرس کے حکم کے برخلاف تقریباً مسلسل جنگیں ہو رہی تھیں جن میں بمبئی، مدراس اور بنگال کے صوبے یا تو براہ راست یا بطور امدادی جماعت کے شریک تھے اس کے بہت سے اسباب تھے۔ مدراس اور بمبئی کلکتہ کے کارناموں کو دہرانے کے لئے بہت آرزومند تھے۔ ہر ایک اپنے محاصل میں اضافہ چاہتا تھا اور اس لیے اس کی ماتحتی میں جو مملکت تھی اسے وسیع کرنا چاہتا تھا۔ سب لوگ اس سے خائف تھے کہ کہیں ہندوستان کے افسرانِ مملکت متحد ہو کر کوئی کارروائی نہ کردیں۔ اور اس بات کے خواہش مند تھے کہ ان کے درمیان طاقت کا توازن باقی رہے۔ ہندوستان کے افسرانِ مملکت ایک دوسرے سے حسد کرتے تھے۔ ان کی خودغرضیوں سے جو نتائج پیدا ہونے والے تھے ان کا پیشگی اندازہ کیے بغیر وہ کمپنی ہی کا کھیل کھیل رہے تھے۔ اپنی باہمی لڑائیوں میں اس کی مدد طلب کرتے تھے۔ ہفت سالہ جنگ کے اختتام کے بعد فرانسیسی بدلہ لینے کے لئے موقع کی تلاش میں تھے۔ وہ انگریزوں کی مملکت اور ان کی دور دور تک پھیلی ہوئی تجارت کو برباد کرنے کے لئے ان کی ہر مشکل سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ جب امریکہ کی نوآبادیوں نے آزادی کی جنگ شروع کردی تو فرانس بحرِ اٹلانٹک کے اس پار ان کی مدد کے لئے دوڑ پڑا اور انگریزوں کو دفاعی پریشانی میں مبتلا کرنے کے لئے حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی مدد کے لئے ہندوستان میں فوجیں بھیج دیں۔ فرانسیسیوں کا ہندوستانی حکمرانوں سے گفت وشنید کرنے اور ان کی افواج میں فرانسیسی افسران کی

موجودگی کو کمپنی نے دشمنی کی علامت قرار دیا۔ ان تمام کارروائیوں پر کمپنی کے لوگ بڑی احتیاط سے نگرانی رکھتے تھے اور ان کی کاٹ کے لیے برابر تدبیریں کیا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک ایک حکمران گروہ یا تو ختم کر دیا گیا یا مطیع بنا لیا گیا تاآنکہ پورا ہندوستان برطانیہ کے اقتدار میں چلا گیا۔

نظام

اس سلسلے کے دو دور تھے۔ پہلے دور میں دکن کی طاقتوں سے نمٹا گیا اور دوسرے دور میں برطانیہ کا جھنڈا آگے بڑھ کر ہندوستان کے قدرتی سرحدوں تک پہنچا۔ دکن میں تین خاص طاقتیں تھیں یعنی نظام، سلطان میسور اور مرہٹے۔ ان میں نظام سب سے زیادہ کمزور اور متلون مزاج تھا۔ ہفت سالہ جنگ کے اختتام تک نظام فرانسیسیوں کے زیر اثر رہا۔ اس کے بعد وہ انگریزوں کے ساتھ ہو گیا۔ 'خاردا' کے مقام پر 1754ء میں مرہٹوں کی شکست کے بعد وہ پھر فرانسیسیوں کی طرف گھوم آیا لیکن ولزلی نے نہایت آسانی سے اس کو راضی کر لیا۔ 1798ء میں ادائیگی خراج کی شرط کے ساتھ انگریزوں کا معاہد بن گیا۔ اس طرح نظام نے اپنی آزادی محافظت کے حصول سے بدل لی جس کی گارنٹی ایک ایسی افواج سے ہوتی تھی جس میں زیادہ تر ہندوستانی تھے مگر جس کے افسران انگریز تھے اور جس کا خرچ انہی کے روپے سے چلتا تھا۔

میسور

میسور کے سلطان حیدر علی اور ٹیپو ایسے سخت میوہ ثابت ہوئے کہ ان کو توڑنا آسان نہ نکلا۔ انھوں نے انگریزوں اور ان کے تمام ساتھیوں کو مقابلے کی دعوت دی۔ وہ چار بہادرانہ لڑائیاں لڑے۔ پہلی لڑائی میں حیدر علی کامیاب ہوا اور مدراس کی دیواروں کے سائے میں صلح کی شرائط کے نادری حکم دیئے۔ دوسری جنگ میں (1780ء تا 1784ء) اس کو فرانسیسیوں سے کچھ کمک ملی جنھوں نے دو ہزار سپاہی بوسی کی سرکردگی میں بھیجے اور فرانسیسی امیر البحر 'سفرن' انگریزوں کے جہازوں کے بیڑوں کو بھگاتا رہا۔ لیکن جب 1783ء میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان صلحنامہ پر دستخط ہو گئے تو فرانسیسی ہٹ گئے

اور دوسری جنگ میسور منگلور کے صلحنامہ سے اس طرح ختم ہوئی کہ لڑائی سے پہلے جو پوزیشن تھی وہی قائم رہی لیکن تیسری جنگ میں جس میں کلایو نے زبردستی کر کے ٹیپو سلطان کو لڑنے پر اس طرح مجبور کیا کہ صلحنامہ کی شرائط کی خلاف ورزی کی اور ایسا طریقہ عمل اختیار کیا جو نہ صرف عہد کی پاسداری کے نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض تھا بلکہ جو ٹیپو سلطان کے لیے اور زیادہ اشتعال انگیز رہا ہوگا جس کا مقصد ہی یہ تھا کہ اس حکمران سے لڑائی لڑی جائے نہ کہ یہ کہنا کہ ایک دفاعی عہدنامہ اس خاص اور جائز مقصد کے لئے کیا گیا تھا کہ ان کے غیر معمولی حوصلوں کو روکا جائے۔ ٹیپو کو شکستیں ہوئیں اور برطانوی فوج اس کی راج دھانی سرینگا پٹم تک آ پہنچی۔ اس نے آدھی مملکت دے کر صلح خریدی۔

چوتھی لڑائی میں برطانیہ کے سونے نے وہ کام کر دکھایا جو آج تک برطانیہ کی توپیں نہ کر سکی تھیں۔ وزراء نے اپنے مالک سے غداری۔ ٹیپو نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کیا اور اپنے قلعہ کی حفاظت میں بہادری کے ساتھ لڑتا ہوا قتل ہوا۔ خاندان ختم کر دیا گیا اور پرانا ہندو خاندان اس سے بہت کم مملکت پر برطانیہ کے ایک نائب کی حیثیت سے حکمران بنایا گیا۔ نظام نے سلطان کے خلاف جو عمل کیا تھا اس کے معاوضہ میں ملک کا ایک حصہ ان کی مملکت میں شامل کر دیا۔

مرہٹے

مرہٹوں کا زوال خود ان کی باہمی خانہ جنگیوں، حد سے زیادہ حماقتوں اور مجرمانہ خود غرضیوں کے باعث ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ خودکشی کی حد تک خود پسندی کا شکار تھے۔ پہلی لڑائی مرہٹوں اور انگریزوں میں جو تھے اور پانچویں پیشوا مادھو اور نرائن راؤ کے چچا رگھوناتھ راؤ کی حوصلہ مندی کا نتیجہ تھی۔ مادھو رائے ایک ایسی بیماری سے ہلاک ہوا جو جسم کو گھلا دیتی ہے اور نرائن راؤ نسوانی رقابتوں اور محل کی سازشوں کا شکار ہو کر قتل کر دیا گیا۔ رگھوناتھ راؤ گدی کا دعویدار بنا۔ لیکن نرائن راؤ کے مرنے کے بعد اس کے ایک لڑکا پیدا ہو جانے سے وہ جس متاعِ عزیز کی لالچ رکھتا تھا اس سے محروم رہا۔ اس نے سورت کے مقام پر 1775ء میں اس نے ایک صلح نامہ پر دستخط کر کے مرہٹوں کی آزادی اس لیے قربان کر دی کہ وہ انگریزوں کا پٹھو پیشوا بن جائے۔ انگریز تو نہایت

رغبت سے اس تاک ہی میں تھے کہ طاقت حاصل کرنے کا اب موقع حاصل کریں لیکن بہرحال یہ کوشش قبل از وقت ثابت ہوئی۔ مرہٹوں کے دفاق کی وحدت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اور لائق اور معتدل مشیر مثل مادھوراؤ سندھیا اب بھی اثر انداز ہو سکتے تھے۔ اس لئے جو لڑائیاں ہوئیں ان میں سہرا دونوں کے سر برابر برابر باندھا گیا۔ انگریزوں کو ذلتیں برداشت کرنی پڑیں لیکن گارڈرڈ نے وسط ہندوستان سے مارچ کرکے سندھیا کو شکست دی اس لیے ان کا وقار بحال ہوگیا۔ لڑائی کا خاتمہ 1792ء میں "سالبے" کے صلحنامہ سے ہوا۔

انگریزوں کو کوئی علاقہ نفع میں نہیں ملا لیکن وہ لڑائی سے اور زیادہ طاقت ور ہو کر نکلے۔ وہ پہلی جنگ مرہٹوں سے اس وقت لڑے جب ان کے حالات انتہائی ابتری میں تھے۔ وہ امریکہ میں اپنی مملکتیں کھو رہے تھے اور ان کے یورپین حریف ان کی پریشانیوں سے خوب فائدہ اٹھا رہے تھے۔ ہندوستان میں کمپنی کے معاملات ہموار طریقہ پر نہیں چل رہے تھے۔ پریسیڈنسیوں کے گورنر کلکتہ کے مرکزی افسران کی ہدایات کو نظر انداز کرکے خود اپنی پالیسیاں چلا رہے تھے۔ کلکتہ میں "رگولیٹنگ ایکٹ" نے ایک مشکل صورت حال پیدا کردی تھی کیوں کہ کونسل کے ممبران نے گورنر جنرل کی پالیسیوں کو ناکام بنا دیا تھا اور مالیات بھی اطمینان بخش حالت میں نہ تھی۔ وارن ہیسٹنگز کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ کل خطرات پر اس نے قابو حاصل کیا اور ایک نہایت نازک صورت میں برطانیہ کے مفادات کا تحفظ کیا۔ اس کے بعد کبھی بھی اس قدر عظیم خطرہ ہندوستان میں ان لوگوں کے سامنے نہیں آیا۔

مرہٹوں سے دوسری لڑائی انہی حالات میں شروع ہوئی جن میں پہلی لڑائی ہوئی تھی۔ اس مرتبہ ڈرامے کا شیطان رگھوناتھ راؤ کا نالائق بیٹا پیشوا باجی راؤ دویم تھا۔ سندھیا اور ہولکر میں جو ہمیشہ جنگ ہوتی رہتی تھی۔ اس میں اس نے سندھیا کا ساتھ دیا۔ موخر الذکر نے دونوں کی ملی جلی قوت کو شکست دی اور پونا پر قبضہ کرلیا۔ باجی راؤ نے بھاگ کر انگریزوں کے یہاں پناہ لی۔ گورنر جنرل لارڈ ولزلی نے یہ طے کرلیا تھا کہ وہ ہندوستان میں اقتدار اعلیٰ کا منصب حاصل کرے گا۔ اس نے باجی راؤ کا خیر مقدم کیا اور اس سے 1802ء میں بیسن کے مقام پر ایک صلحنامہ پر دستخط کرائے جس کی رو سے اس نے برطانیہ کا اقتدار تسلیم کرتے ہوئے خراج دینے کا اقرار کیا۔ پیشوا کا یہ فعل دوسرے مرہٹوں سرداروں کے لئے ایک

چیلنج تھا۔ بدقسمتی سے اگرچہ بعض تباہیاں ان کے سامنے تھیں لیکن پرانی لڑائیوں اور رقابتوں نے ان کو اندھا کر رکھا تھا۔ یہ لوگ متحد نہ ہو سکے۔ سندھیا اور بھونسلہ نے انگریزی حملوں کے وار کا مقابلہ کیا لیکن گائیکوار غیر جانب دار ہو گیا اور ہولکر پر روٹھنے کا دورہ سا پڑ گیا۔ نتیجہ پہلے ہی معلوم تھا۔ انگریزوں نے مرہٹوں کو دکن اور ہندوستان میں لڑائیوں میں پھنسائے رکھا۔ ان کی افواج زیر کمان آرتھر ولزلی (بعدہٗ ڈیوک آف ولنگٹن) نے اسائے اور آرگاؤں کے مقامات پر مرہٹوں کو فیصلہ کن شکستیں دیں اور احمد نگر، برہان پور، اسیر گڑھ اور گوالی گڑھ پر قبضہ کر لیا۔ ہندوستان میں 'لیک' نے علی گڑھ اور دلی فتح کیا اور سندھیا کی فوجوں کو لسواری کے مقام پر شکست فاش دے کر ان میں بھگدڑ مچا دی۔ مرہٹہ سرداروں کو صلح کی درخواست کرنی پڑی اور اپنی مملکت کا بڑا حصہ دینا اور انگریزوں کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرنا پڑا۔

ہولکر کو اپنی حماقت کی بھاری سزا ملتی لیکن لارڈ ولزلی واپس بلا لیا گیا اور ان کے جانشین نے ان کو ملائم شرائط پر چھوڑ دیا۔

مرہٹے ہار گئے۔ وہ برطانیہ کے نائب کی حیثیت کو پہنچ گئے اور ایک دوسرے سے جدا بھی ہو گئے۔ اگرچہ یہ ذلت ان کے جسم میں ایک مکروہ مرض کی طرح انہیں تکلیف دیتی رہی لیکن پھر بھی اپنی ناکامیوں سے انھوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ اپنے مصائب کی صحیح وجہ کا تجزیہ کرنے سے وہ قاصر رہے۔ نہ تو ان میں اتنا صبر تھا کہ اپنی ٹوٹی پھوٹی مملکت کی از سر نو تعمیر کرتے اور نہ اتنی عقل یا مہارت تھی کہ ایک چالاک اور طاقت ور دشمن کے مقابلے میں جتنی زمین انھوں نے کھو دی تھی اس کا کچھ حصہ پھر سے حاصل کرنے میں ایک متفقہ کوشش کرتے۔ انھوں نے سازشیں شروع کیں لیکن ان کے اندر ایسے غدار موجود تھے جو انگریزوں کو ان کی ہر کارروائی کی برابر خبر دیتے رہتے تھے۔ جوں جوں سال گذرتے گئے حالت اور زیادہ خراب ہوتی گئی۔ لیکن ولزلی کی لڑائیوں اور فتوحات نے کمپنی کی مالیات پر بڑا دباؤ ڈالا اور ڈائرکٹروں نے خوف زدہ ہو کر عدم مداخلت کی پالیسی کا فیصلہ کیا۔

لیکن ولزلی کے واپس بلائے جانے کے دس سال کے اندر انگریز اور آگے بڑھنے کے لئے تیار تھے۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز 1813ء میں ہندوستان کا گورنر جنرل ہو کر آیا اور اس نے کوچ کا حکم دیا۔ مرہٹوں کی مداخلت کمزور تھی اور آسانی سے اس پر قابو پالیا

گیا۔ مرہٹہ مملکت کا خاتمہ ہوگیا اور 1818ء میں دکن اور شمالی ہندوستان کے زیادہ حصہ پر برطانوی اقتدار قائم ہوگیا۔

برطانیہ کی مملکت کے پھیلاؤ کے دوسرے دور کا نتیجہ پورے ملک میں ہمالیہ کے سمندر تک ہندوستان کی آزادی کا خاتمہ تھا۔ سندھ اور پنجاب فتح کر لیے گئے۔ اودھ اور صوبہ متوسط انگریزوں کی مملکت میں شامل ہو گئے اور اِدھر اُدھر بکھری ہوئی متعدد ہندوستانی ریاستیں فنا ہوگئیں۔

سِندھ

سِندھ کی بدقسمتی یہ تھی کہ یہاں آپس میں اختلافات تھے اور یہ کمزور تھا۔ اس کے ہمسائے مضبوط تھے یعنی اُتر میں افغان جن کے اوصاف کو انھوں نے احمد شاہ ابدالی کے زمانہ سے دیکھا تھا اور سِکھ جو دریائے سِندھ کے بالائی حصہ کے مالِک تھے اور وہ دریا پر اپنا اقتدار دکھن سمندر تک قائم کرنا چاہتے تھے اور انگریزوں نے دریائے ستلج کے ساحل تک کے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا اور ان کے اپنے خود منصوبے تھے اُس کے وسط ایشیا کے قلب تک بڑھ آنے کو وہ خطرے کی علامت سمجھتے تھے۔ یہ ضروری تھا کہ افغانستان کو سب سے کاٹ کر الگ کر دیا جائے اور چوں کہ رنجیت سنگھ پنجاب کو مضبوطی سے گھیرے ہوئے تھا اس لئے پہاڑی سلطنت تک کا ایک ہی راستہ سندھ کے اندر سے تھا اس لیے سلطنت کی حفاظت اور سالمیت کے لئے سندھ کو قربان کر دیا گیا۔ نیپیر خود سر فاتح نے اپنی اس کامیابی کو اس مختصر اور پرمغز اور مشہور عالم مکتوب میں جو جملہ "پنج" نے تصنیف کیا تھا اس کو اپنانے میں کسی قسم کی شرم محسوس نہیں کی یعنی "میں نے گناہ کیا"

پنجاب

پنجاب میں جب تک رنجیت سنگھ زندہ تھا اس کو اتنی سمجھ تھی کہ اس نے انگریزوں کو کوئی اشتعال نہیں دلایا کیوں کہ ان کی طاقت کا اس کو صحیح اندازہ تھا۔ جیسے ہی اس کی قوی اور ماہرانہ سیاسی دوربینی کی قیادت ختم ہوئی نراج اور بدامنی کے طوفان چل پڑے۔ شکوک، رقابت، جذباتیت نے غلبہ پایا اور بے محابا قتل اور خوں ریزی سے زمین بھر گئی

بہت جلد فوج نے حکومت کے معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا۔ یہ بدقسمتی تھی کہ اگرچہ خالصہ بہادر تھا لیکن بہت جلد مذہبی جذبات سے بہل جاتا تھا اور بلا نتائج کو تولے ہوئے عمل کے میدان میں کود پڑنے پر راغب رہتا تھا خاص کر جب کہ نہنگ اور پجاریوں نے ان کے مشوروں پر غلبہ حاصل کر لیا تھا جیسا کہ انھوں نے اس نازک موقع پر دراصل کیا خود غرض اور بدکردار لیڈروں نے اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے مختلف پارٹیوں نے متعدد بار فوج کی کمیٹی (خالصہ پنچ) سے اپیل کی۔

بہت جلد فوج حکومت کی سربراہی کرنے لگی۔ وہ لوگ جنھوں نے خود اپنے کو تباہ کرنے والا طوفان کھڑا کیا تھا اب خوفزدہ ہوئے کہ کہیں وہ اپنے عہدے نہ کھو بیٹھیں۔ حالت یہ تھی کہ ایک بچہ دلیپ سنگھ سربرآرائے تخت تھا۔ اس کی ماں رانی جنداں کنور ریجنٹ (ولی) تھی اور اس کا آشنا لال سنگھ وزیر اعظم تھا اور اس کا طفیلی تیج سنگھ سپہ سالار اعظم تھا۔ یہ تینوں انتہائی ذلیل اور بدکردار تھے اور جن عہدوں پر وہ قابض تھے ان کے لیے بالکل نااہل تھے۔ یہ تینوں خالصہ سے نفرت کرتے تھے اور اس کو اکھاڑ پھینکنے کی سازشیں کیا کرتے تھے۔

ان لوگوں نے خفیہ طور پر انگریزوں سے بات چیت کی جو اس موقع کی تلاش ہی میں تھے کہ پنجاب کے معاملات میں دخل دیں۔ تقریباً کل ہندوستان کے مالک بن جانے کے بعد یہ ناممکن تھا کہ انگریز اس صوبہ میں دلچسپی نہ لیتے جو فوجی نقطۂ نظر سے اتنی اہمیت رکھتا تھا۔

ایک اچھی طرح منظم اور باضابطہ اور مضبوط حکومت سے یہ امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ جب ہمسایہ مملکت میں تاراج اس کو مداخلت کی دعوت دے تو وہ صرف تماشائی بنی رہے۔ یہ ظاہر تھا کہ اگر انگریز دخل نہ دیتے تو افغانستان کب خاموش رہنے والا تھا اور پیچھے پیچھے روس کا اسٹیم رولر بیدردی کے ساتھ بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ طاقت کا جو خلا سکھوں کے اندرونی خانہ جنگی پیدا کر رہی تھی وہ زیادہ عرصہ تک بلا پُر ہوئے نہیں رہ سکتا تھا۔

انگریزوں کے ارادوں کے کئی اشارے نمایاں ہو چکے تھے۔ ان میں سے ایک تو یہ تھا کہ انھوں نے فیروزپور پر قبضہ کر لیا اور اسے انگریز فوج کے لئے ایک چھاؤنی بنا دیا۔ دوسرے انبالہ میں اور سکھوں کی سرحد کے قریب پہاڑیوں میں فوجیں جمع کر دیں۔ اس کے علاوہ ستلج

پر کشتیوں کا ایک پُل تعمیر کیا اور یہ تجویز کیا کہ پشاور امیر دوست محمد کے حوالے کر دیا جاتے۔ برطانوی ایجنٹ براڈفٹ سکھوں کے معاملات کے بارے میں اشتعال انگیز تھا۔ اس نے کُھلم کُھلا یہ اعلان کر دیا کہ ستلج کے اس پار کا علاقہ دلیپ سنگھ کی موت یا ان کے تخت سے اتارے جانے کے بعد انگریزوں کے علاقہ میں شامل ہو جائے گا۔"

سکھ فوج کو اس طرح کامل یقین تھا کہ انگریز پنجاب کو اپنی مملکت میں شامل کر لینا چاہتے ہیں۔ لال سنگھ اور تیج سنگھ خوف سے بے قابو ہو گئے اور گھبراہٹ کے جوش کو آخری حد تک پہنچا دیا۔ اس حالت میں ان لوگوں نے سنا کہ انگریزوں نے لدھیانہ کے پاس کچھ سکھ گاؤں پر قبضہ کر لیا ہے اور انگریز گورنر جنرل ان کی سرحد کی جانب کوچ کر رہا ہے۔ اب پیالہ آخری کناروں تک لبریز ہو گیا۔ ۱۱ دسمبر 1845ء کو سکھ فوجوں نے دریائے ستلج کو عبور کیا اور جنگ شروع ہو گئی۔ لیکن یہ ایک ایسی جنگ تھی جس میں یہ نمایاں طور پر ظاہر تھا کہ فوج میں ایک فرض واحد کے لئے انتہائی جوش تھا لیکن ان کے افسران نہ صرف جنگ سے ناواقف تھے بلکہ سمجھ بوجھ کر اپنے پیروؤں سے غداری پر تلے ہوئے تھے۔" لڑائیاں لڑی گئیں اور عام سپاہیوں نے بہادری کے محیرالعقول کارنامے ظاہر کئے۔ لیکن لیڈروں کی گھناونی دھوکہ بازی اور شرمناک غداری نے سپاہیوں کی بہادری پر خاک ڈال دی۔ لاہور انگریزوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ پنجاب نے اپنی آزادی کھو دی لیکن ٹھیک ایک نقلی سکھ ریاست باقی رکھی گئی۔

سکھوں کو ہار تو ہو گئی تھی لیکن اپنی پوزیشن پھر بحال کرنے کی امید ابھی انھوں نے نہیں کھوئی تھی۔ 1849ء میں ایک دوسری جنگ شروع ہوئی لیکن پہلی جنگ کی کہانی پھر دُہرائی گئی۔ 'مالیسن' کے قول کے مطابق "کوئی فوج اس سے بہتر لڑاکو نہیں ہو سکتی تھی جس طرح یہ فوج لڑی اور کسی کی کمانداری اس سے بدتر ممکن نہ تھی۔" نتیجہ یہ ہوا کہ سکھ ریاست کی نشانی بھی باقی نہ رہی۔ پنجاب برٹش انڈیا میں شامل کر لیا گیا۔ ایک سکھ نے اپنی عظیم تخلیقی ذہانت کی مدد اور سپاہیانہ مہم بازی اور سیاسی دور بینی کی لیاقت سے جو محل تعمیر کیا تھا وہ اس کے نالائق جانشینوں کی سیہ کاریوں اور خباثتوں سے خاک میں مل گیا۔

پلاسی سے سو سال کے اندر کل ہندوستان کو مجبور ہو کر برطانیہ کا جوا اپنے کندھے پر رکھنا پڑا۔ فوجی نقطۂ نگاہ سے یہ ایک عجیب کارنامہ تھا کیوں کہ ان تمام لڑائیوں میں

لڑنے والے ہندوستانی تھے۔ ہندوستان کے حکمرانوں کی فوج جن اجزاء سے مرکب تھی وہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے۔ ہندوستانی حکمرانوں کی فوج میں یورپین سپاہیوں کا ایک چھوٹا سا دستہ ہوتا تھا جس کی کمان یورپین افسران کرتے تھے خاص کر توپ خانہ کے دستوں کی سرکردگی یورپینوں کے ہاتھ میں تھی۔ ان کے علاوہ ہندوستانی فوج کا ایک حصہ مختلف تعداد میں ایسا ہوتا تھا جس کو یورپین افسران نے ٹریننگ دی تھی۔ بقیہ کثیر تعداد ہندوستانی گھوڑوں کے سوار اور پیدل کی ہوتی تھی جو اپنے روایتی طریقو سے لڑتے تھے۔ کمپنی کی فوج میں یورپین سپاہیوں کا ایک دستہ ہوتا تھا اور ایک ہندوستانی فوج کا دستہ جسے یورپین افسران نے ٹریننگ دی تھی اور تیسری مد یعنی بلا ٹریننگ یافتہ سپاہی کی مد یا تو بالکل غائب ہوتی تھی یا ایک غیر اہم امدادی فوج کا کام دیتی تھی۔ اس طرح ہندوستانی حکمرانوں کی فوجیں یورپین اور ہندوستانی افسران کے زیر کمان کمپنی کی فوجوں سے لڑتی تھیں جن میں یورپین اور ہندوستانی سپاہی یورپین اور ہندوستانی افسران کی ماتحتی میں ہوتے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ یورپین افسران اور دوسرے عہدوں کے لوگ اپنے ہندوستانی مالکان کے ساتھ اتنے وفادار اور ثابت قدم نہ تھے جتنا کہ ہندوستانی اپنے یورپین کمانڈروں کی ماتحتی میں تھے۔

دشمن کے ہتھیار بھی مختلف نہ تھے۔ ہتھیار یہ تھے بندوق اور ہاتھ سے بھری جانے والی پیدل فوج کی بندوق اور توڑے دار بندوق، ہوائی چرخی اور توپیں، علاوہ پرانے روایتی ہتھیاروں تلوار، بھالا، کمان اور تیر کے۔

لیکن دونوں کی ہمتوں میں بے انتہا فرق تھا۔ ہندوستانی آگ اگلنے والے ہتھیاروں کے لئے نئے تھے اور انھوں نے اس کے استعمال میں ابھی مہارت حاصل نہ کی تھی۔ وہ سائنس کا علم نہ رکھنے کی وجہ سے بندوق کے اندر نہ تو ٹوٹ پھوٹ کو درست کر سکتے تھے اور نہ میگزین کو آسانی سے بھر سکتے تھے۔ ان کو ہندوستان کے باہر کے لوگوں پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا جو ناقابلِ اعتبار تھے۔ یورپین افسران جو ملازمت میں تھے کرایے کے ٹٹو اور قسمت آزما لوگ تھے۔ شروع زمانہ میں وہ ہندوستانی حکمرانوں کی طرف سے اس لیے لڑے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح وہ اپنی قوم کے مفاد کی مدد کر رہے ہیں لیکن جب نپولین کے سلسلے کی لڑائیاں ختم ہوئیں تو وہ یورپین سپاہی جو اپنے یہاں کی فوج میں بھرتی

نہ ہو سکے اور جن کی شہریت بھی باقی نہ رہی وہ ہندوستانی حکمرانوں کی ملازمت میں صرف اپنی ذات کے لیے دولت کمانے آتے۔ بعض خوب لڑے کیوں کہ ان کے اندر ایک سپاہی کی عزت کا جذبہ تھا لیکن بہت سے ایسے بھی تھے کہ جب ان کو امید فتح نہیں رہی تو اپنے مالکان سے غداری کر کے بھاگ کھڑے ہوئے۔

فوجی تدبیر اور فوجی چال میں انگریز ہندوستانیوں سے بہت بڑھ کر تھے۔ لیکن یہ فرق فیصلہ کن نہیں قرار دیا جا سکتا۔ فوجی تدبیریں ایک تھوڑے عرصہ میں سیکھی جا سکتی ہیں۔ جو چیز کہ سیکھی نہیں جا سکتی وہ ہمت مردانہ ہے۔ یہاں پر ہندوستان کی طرف وہ کمزوری تھی جو جان لیوا ثابت ہوئی۔ بہت سی لڑائیاں تو اس لئے ہاری گئیں کہ عام سپاہی اس وجہ سے غیر مطمئن تھا کہ یا تو اس کی تنخواہ بقایا میں پڑ گئی تھی یا اس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں ہوا تھا۔ قومی حیثیت سے ایک بڑی کمزوری ہندوستان کی طرف مالی بدانتظامیاں تھیں جن کے نتیجہ میں حکومتیں پریشانیوں میں مبتلا تھیں اور فوجوں کی تنخواہوں کے تقسیم کرنے میں بے ضابطگی تھی۔

ہندوستانی سپاہی بزدل نہیں تھا۔ اکثر مواقع پر بڑی بڑی مشکلات کے درمیان ہوتے ہوئے بھی اس نے اپنی بہادری، استقامت اور عزم راسخ کا ثبوت دیا۔

جو ہندوستانی سپاہی یورپین افسران کے کمان کے نیچے لڑے انھوں نے ہر لڑائی میں عظیم سپاہیانہ اوصاف کا اظہار کیا۔ نہیں نہیں نقص ہندوستانی قیادتوں میں تھا۔ سپاہی تو اپنے مالک کی ذات کے لیے لڑتا تھا لیکن مالک کے اندر لڑائی لڑنے کے جذبے کو کون سی چیز اکساتی تھی وہ اپنی ذات اور اپنے خاندان کے ماورا کسی ایسے مقصد کے لیے نہیں لڑتا تھا جس کا تصور کیا جا سکے۔ یہ کوئی کافی مضبوط بنیاد ان لوگوں کے خلاف لڑنے کے لیے ہمتِ مردانہ کے نشوونما کی نہ تھی جن کا حال یہ تھا کہ خواہ اپنے ذاتی کردار و اخلاق میں کتنے ہی ناقص ہوں لیکن ان کے متعلق یہ معلوم ہے کہ کبھی بھی انھوں نے اپنی ذات کے تحفظ کے لیے اپنے ملک کے مفاد کو قربان نہیں کیا۔ ایک جنرل کی شکست صرف ایک فرد کے لئے عارضی طور پر اس کو پیچھے ہٹا دینے والی ہوتی تھی۔ وہ ایک ایسی خرچ کرنے والی تجارتی شے کی مانند ہوتا تھا جس کی بجائے دوسری ویسی ہی چیز آ سکتی تھی۔ اس کے برخلاف ایک ہندوستانی حکمران کو شکست کا یہ نتیجہ ہوتا تھا کہ کل پالیسی ہی برباد ہو جاتی تھی۔ پلاسی کا مطلب یہ ہوا کہ

بنگال کی حکومت ختم ہوگئی۔ سرنگاپٹم سے میسور کی حکومت چلی گئی۔" آیئے" نے سندھیا کی آرگاؤں نے بھونسلہ کی مہید پور نے ہولکر کی اور " کھرکی" نے باجی راؤ پیسوا کی طاقت کے پرزے اڑا دیئے۔ سکھ ریاست الیوال اور سبراؤں کے مقامات پر چت ہوئی اور پھر گجرات کی لڑائی میں بالکلیہ جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دی گئی۔

اس کے برخلاف حیدر علی کی فتوحات " مثل ایک سیلاب کے تھیں جو اپنے ساتھ تباہیاں لئے ہوئے چلتا تھا" یا مغربی گھاٹوں پر مرہٹوں کی فتوحات جن سے مجبور ہوکر انگریزوں نے " آرگاؤں". کے ذلت آمیز صلحنامہ پر دستخط کیے یا بھرت پور کے مقام پر ایک کی شکست یا جو سزائیں سکھ افواج نے برطانوی دستوں کو مدکی اور فیروز شاہ میں دیں اور جنھوں نے ان کو" نازک اور خطرناک حالت" میں ڈال دیا یا چتیانوالہ میں دیں جہاں برطانوی دستوں کے دستے اور ان کی توپیں گرفتار کرلی گئیں یہ سب محض عارضی مرحلے تھے جن کا آخری نتیجہ پر کوئی اثر نہ تھا۔

نتیجہ صاف ظاہر ہے ہندوستان کا حال یہ تھا کہ ریاست ایک ذات میں مضمر تھی جو فوج کی قیادت کرتی تھی۔ اس کی ناکامی سے حکومت کا مسمار ہوجانا لازمی تھا۔ اور کوئی ایک ایسی حکومت تھی بھی نہیں جو کل ملک کی وفاداری اور اطاعت کی سربراہی کرتی۔ ہندوستان آپس میں لڑنے والے والیان ریاست کا ایک ایسا مختلف النوع جھنڈ تھا جو اپنے اندھے پن میں ہندوستانیوں اور بیرون ہندوستان کے لوگوں میں کوئی فرق نہ کرتا تھا۔ انگریز فوجی افسران کی پشت پر ایک قوم تھی جو ممکن ہے کہ برے حالات میں جو تھوڑی مدت رہیں یا زیادہ مدت سے دوچار ہو لیکن شکستوں سے جس کا وجود مٹایا نہیں جا سکتا تھا۔ ہندوستان کو ایک صدی تک اس کا انتظار کرنا پڑا کہ اسی قسم کا تعلق حکومت اور افراد کے مابین نشوونما پائے اور یہ جذبہ ابھرے کہ قوم کا حق افراد کے حقوق سے بالاتر ہے۔

حاشیہ چھٹا باب

1۔ ہیکس چر ای۔ ایف۔ مرکنٹائی لزم ان دی انسائیکلوپیڈیا آف دی سوشل سائنس۔

2۔ آدم اسمتھ دی ویلتھ آف نیشنس (ماڈرن لائبریری ایڈیشن)

3- ہیکس جے ای-ایف-مرکنٹائلزم-او-پی-سٹ صفحہ 338-
4- ایضاً صفحہ 555-
5- ملاحظہ ہو ہسٹری آف دی رائل سوسائٹی 1667 صفحہ 152 بحوالہ ای لپسن دی اکنامک ہسٹری آف انگلینڈ جلد 2 صفحہ 41-
6- لپسن ای دی اکنامک ہسٹری آف انگلینڈ جلد 3 صفحہ 155-
7- ولیم سن جے-اے-شارٹ ہسٹری برٹش اکسپینشن صفحہ 424-
8- دی کیمبرج ماڈرن ہسٹری جلد 7 صفحہ 28-
9- ایضاً صفحہ 29-
10- اسمتھ آدم دی ویلتھ آف نیشنز او-پی-بسٹ صفحہ 388-
11- ہنٹر ڈبلیو-ڈبلیو اے-ہسٹری آف برٹش انڈیا-جلد 1 صفحہ 253-
12- ایضاً جلد 2 صفحہ 277-
13- ایضاً صفحہ 278-
14- برک ایڈمنڈ اسپیچز ان دی ٹرایل آف وران ہیسٹنگز بحوالہ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا (انڈین ایڈیشن جلد 5 صفحہ 182)
15- اینڈرسن پی-دی-انگلش ان واسٹرن انڈیا (بمبئی 1854ء صفحہ 16)
16- ملاحظہ ہو تھامسن اینڈ گیرٹ-رائز اینڈ فل فلمنٹ آف برٹش رول ان انڈیا 1958ء ایڈیشن صفحہ 15-
17- ٹری ایڈورڈ اے وائج ان ایسٹ انڈیا 1777ء ایڈیشن صفحہ 6-5-
18- اینڈرسن پی-دی انگلش ویسٹرن انڈیا صفحہ 109-
19- مل اینڈ ولسن دی ہسٹری آف برٹش انڈیا (پانچواں ایڈیشن 1858ء) جلد 1 صفحہ 91-
20- ہنٹر ڈبلیو ڈبلیو اے ہسٹری آف برٹش انڈیا-جلد 2 صفحہ 273-
21- اینڈرسن پی-دی انگلش ان ویسٹرن انڈیا-صفحہ 110-
22- ایضاً صفحہ 111-
23- ہنٹر ڈبلیو-ڈبلیو اے-ہسٹری آف برٹش انڈیا-جلد 2-صفحہ 248-
24- مل اینڈ ولسن، دی ہسٹری آف برٹش انڈیا-جلد 1-صفحہ 86-

25- ڈاب مارس اسٹاڈیز ان دی ڈیولپمنٹ آف کیپی ٹیلزم (لندن 1946ء) صفحہ 121-
26- ایضاً-
27- ہل اینڈ ونس- دی ہسٹری آف برٹش انڈیا- او پی- سی- آئی- ٹی- جلد 3 - صفحہ 60-
28- ایضاً- جلد 1- صفحہ 8-87-
29- ایضاً- جلد 3- صفحہ 63-
30- ایک گھوڑا تین روپئے آٹھ آنے کا ہوتا ہے- (ہابسن جابسن)
31- ہسٹری آف بنگال ایڈیٹڈ بائی جادو ناتھ سرکار- جلد 2- صفحہ 432-
32- دی کیمبرج ہسٹری آف انڈیا- جلد 5- صفحہ 73-
33- "میلے سن" دی ہسٹری آف دی فرنچ ان انڈیا (لندن 1868ء) صفحہ 93-192-
34- ایضاً- صفحہ 226-
35- کیمبرج ہسٹری آف انڈیا- جلد 5- صفحہ 57-
36- اشان کار ڈبلیو- ایس- کارنواس (رولرس آف انڈیا سیریز) صفحہ 55-154-
37- دیکھو جادو ناتھ سرکار- دی ہسٹری آف بنگال- جلد 2 (1948) صفحہ 401-
38- برتیر- صفحہ 55-
39- ملاحظہ ہو اِروِن ولیمس- دی آرمی آف دی مغلس- لندن 1903ء- صفحہ 300-
40- ملاحظہ ہو ایس- این- دی ملٹری سسٹم آف مرہٹاز- 1958ء ایڈیشن- صفحہ 73-72-
41- ٹامسن وی- ایم- ڈوبلے اینڈ ہر لیٹرس (نیو یارک 1933ء) صفحہ 635-
42- کم- مالکوم جے- دی- لائف آف رابرٹ کلایو- جلد 2- صفحہ 21-120-
43- ہل ایس- سی- بنگال ان 57-1756- جلد 1- صفحہ 32-
44- جادو ناتھ سرکار- ہسٹری آف بنگال- جلد 2- صفحہ 470-
45- ایضاً- صفحہ 450-
46- ملاحظہ ہو جے- ایم- برٹش انڈیا اٹس روزس اینڈ ہسٹری کیمبرج 1958ء- جلد 1- صفحہ 139-
47- ہل- ایس- سی- بنگال ان 1756- جلد 2- صفحہ 76-

48- ہل-ایس-سی-بنگال ان 1756-جلد 1-صفحہ 5-

49- کلائیو کا خط اورے کے نام-دیکھو مندرجہ بالا صفحہ

50- کیتھ نے کرامل کی فوجوں کو اس طرح بیان کیا ہے "اس کی فوج اگرچہ تعداد میں کثیر تھی یعنی تقریباً 70 ہزار کل ملا کر لیکن وہ بہت ہی گھٹیا قسم کی تھی خاص کر وہ چھ ہزار کمپنی کی فوج کے یورپین لندن کی سڑکوں کے ارذل لوگ اور جیل کے مزدور تھے جن کے افسران برباد شدہ نوجوان اور حریص پیسے کے متلاشی تھے۔" کیتھ اے۔ بی-کانسٹی ٹیوشنل ہسٹری آف انڈیا 1635-1600ء-سیکنڈ ایڈیشن 1957ء صفحہ 104-

51- ڈوپلے پیام ای کوئن کورٹ 15 فروری 1753ء بحوالہ ٹامسن وی-ایم-ان ڈوپلے اینڈ ہز لیٹرس نیویارک 1923ء صفحہ 724-

52- بحوالہ اینڈرسن پی-دی انگلش ان ویسٹرن انڈیا 1754ء-صفحہ 130-

53- ایضاً-صفحہ 120-

54- لیٹر ٹو دی کورٹ فرام ڈپٹی گورنر اینڈ کونسل آف بامبے-مورخہ مئی 1682ء بحوالہ اینڈرسن پی ایضاً صفحہ 10-

55- ملاحظہ ہو ٹامسن وی-ایم-ڈوپلے اینڈ ہز لیٹرس-صفحہ 297-

56- ایضاً-صفحہ 130-

57- لیٹرس فرام دی کورٹ ٹو دی ڈپٹی گورنر اینڈ کونسل آف بامبے-مورخہ مئی 1682ء بحوالہ اینڈرسن-صفحہ 100-

58- ملاحظہ ہو ٹامسن وی-ایم-ڈوپلے اینڈ ہز لیٹرس-صفحہ 697-

59- لیکی ڈبلیو ایچ-اے-ہسٹری آف انگلینڈ ان دی ایٹینتھ سنچوری-جلد 1-صفحہ 491 اور فلپس آر-ایچ-جارجین اسکریپ بک-

60- مالکوجے اسکیچ آف دی پولیٹیکل ہسٹری آف انڈیا (لندن 1811ء) صفحہ 69-

61- کنگھم جے-ڈی-اے-ہسٹری آف سکھ (ایڈیٹیڈ لائی گیرٹ اینڈ سیٹھی 1955ء) صفحہ 252-

62- ایضاً-صفحہ 264-

ساتواں باب

برطانوی نظم ونسق کا نشوونما 1793ء تک

ہندوستان پلاسی کے وقت

بنگال کی فتح اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں میں طاقت کے منتقل ہوجانے سے ایک ایسی صورت حال پیدا ہوئی جس کی اور کوئی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہ تھی۔ ہندوستان پر فتوحات کی آفتیں پچھلے زمانوں میں بھی آئی تھیں لیکن ایشیائی فاتحین کے ہاتھوں یہ فتوحات ہوئے تھے جو اپنے نظریات اور کلچر کے معاملہ میں ہندوستان کے بسنے والوں کے نظریات اور کلچر سے ہم آہنگی رکھتے تھے اور ایک طرح کے سماجی قوانین کے تحت زندگی گذارتے تھے۔ ان لوگوں کی فتوحات کا زیادہ تر یہی مطلب ہوتا کہ حکمران تبدیل ہوجائے لیکن سماجی نظام یا ملک کے اقتصادی ڈھانچے میں مشکل ہی سے کسی قسم کی کوئی تبدیلی ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ دونوں کی سیاسی تنظیم اور نظم ونسق کے انتظامات میں کوئی بنیادی فرق نہ تھا۔ جہاں تک کلچر کا تعلق ہے تو ہندوستان میں تو پہلے ہی متنوع شکلیں موجود تھیں انھیں میں ایک اور خدوخال کا اضافہ ہوجاتا تھا۔

شروع میں مسلم فاتحین اپنے ساتھ نئی زبانیں لائے۔ فارسی اور عربی۔ نیا مذہب لائے۔ اسلام۔ فن میں نیا اسلوب اور کچھ نئی قسم کی سوداگری۔ انھوں نے اپنے نئے طریقۂ رہائش، رسم ورواج، کھانے اور پہننے کے طریقوں کو بھی رائج کیا۔ لیکن ملک کی اقتصادیات، زراعت، صنعت اور تجارت میں کوئی انتہا پسندانہ تغیر نہیں آیا۔ گاؤں کی اقتصادی پالیسی

اپنے پرانے ڈھرے پر چلتی رہی۔ سماجی اداروں میں جامد ہونے کا جو مادہ تھا اس میں اور زیادہ ترقی ہوگئی۔ حتیٰ کہ مسلمان بھی اس کے زیر اثر آگئے۔ سماج میں اونچ اور نیچ کے فرق میں ذات پات ہی کی طرح مبتلا ہو گئے۔ دوسری جانب اسلام کے زیر اثر بہت سے ہندو مصلحین نمودار ہوئے جنھوں نے ذات کے نظام کی مذمت کر کے اسے رد کر دیا۔

پرانا سیاسی ڈھانچہ

سیاسی طاقت اور اس کی بنیاد اور اس کی کمک یعنی فوج فاتحین کے ہاتھ میں رہی لیکن انتظام کی مشینری اور خاص کر اقتصادی نظام کو زیادہ تر ہندو ہی چلاتے رہے۔

جب مغل آئے تو انھوں نے زیادہ مرکزی قسم کا نظم و نسق قائم کیا۔ انھوں نے ایسے مواقع فراہم کیے جو یکساں قسم کے کلچر کو نشوونما دے سکیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبائلی اور علاقائی اختلافات کم ہوتے اور ایک ہونے کا جذبہ نمودار ہوا۔ ان کے مالگذاری وصول کرنے کے نظام نے باہم مل کر ایک ہو جانے کی طاقتوں کو بڑی حد تک اکسایا۔ انھوں نے ادب اور فنون کی جو سرپرستی کی اس سے ایک ثقافتی نشاۃ ثانیہ کا وجود عمل میں آیا اور مذہب کے بارے میں ان کا جو نقطۂ نظر تھا اس نے باہمی اختلافات کو مٹا دینے کی جانب قدم بڑھایا اور تمام طبقوں اور فرقوں کی حکومت سے وفاداری کی جانب رہنمائی کی۔

لیکن ہندوستان کا دماغ جس پرانے راستے پر پڑ گیا تھا اس سے باہر کی جانب متحرک نہیں ہوا اور پرانے استادوں ہی کے حوالے سے سوچنے کے انداز سے ہٹنے سے انکار کرتا رہا۔ ہندو اور مسلمان قدیم فلسفہ، قدیم قانون، قدیم سائنس اور پرانے مذہبی مسائل کی جگالی کی ہوئی غذا کو ہی چباتے اور پھر چباتے رہے۔ کوئی نئی سائنس عالم وجود میں نہیں آئی۔ حتیٰ کہ کیمسٹری (کیمیا)، فزکس (علم طبیعیات)، باٹنی (علم نباتات)، زوالوجی (علم حیوانات)، علم الاعضاء یا علم افعال اعضاء کے ابتدائی اصول بھی مشکل سے ان کو معلوم تھے۔ سائنسی تجربات، عینی مشاہدۂ فطرت اور نیچر کا مطالعہ کرنے میں بنے ہوئے اصولوں سے جانچنے کا تو خواب بھی نہیں دیکھا گیا۔

سماج کے تمام محکموں پر شخصیت پرستی چھائی ہوئی تھی۔ حکومت حکمران کی ذات کا دوسرا نام تھا۔ یہ اصولاً اقتدار اعلیٰ کی مالک اس طور پر نہیں تھی کہ ملک کے تمام باشندوں

کی حقیقی رضا کی حامل ہوتی۔

حکومت سے وفاداری بادشاہ کی ذات کے باعث تھی۔ یہ ایک کمزور دھاگا تھا جو جلدی سے ٹوٹ جاتا تھا۔ وہ حکومت جو شخصیت کے بل بوتے پر قائم ہو وہ قطعی دیرپا نہیں ہو سکتی۔ اور طوفان اور دباؤ کا مقابلہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ مصیبت میں اس کا لنگر اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکتا۔

سوسائٹی کے باہمی سیاسی تعلقات کمزور تھے۔ حقوقِ ہمسائگی، علاقائی حب الوطنی کا بندھن اور مادرِ وطن سے محبت کا کوئی جذبہ نہ تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے طور پر خون اور رشتہ داریوں کی بنیادوں پر جو تعلقات قائم تھے وہ بڑے مضبوط تھے۔ رشتہ داریوں سے جو منافع حاصل ہوتے تھے وہ علاقائی سماج کے لیے باعثِ نقصان تھے۔ مذہب کا عمل دخل بھی تخریبی تھا۔ کیوں کہ مذہب سے سماج میں ایک دوسرے کے ساتھ مل جانے کے جذبے اور قومی وحدت میں رکاوٹ پیدا ہوتی تھی۔ مذہب کے ساتھ وفاداری کا تقاضہ یہ تھا کہ اپنے ہم مذہبوں کی سیاست کی اطاعت کی جائے۔ یہ بات ایک سیکولر اور مختلف مذاہب کی ملی جلی حکومت کی منافی تھی۔ قانون ہر شخص کے عقائد کا دم چھلا تھا نہ کہ ایک علاقائی طبقہ کی قانون ساز عادت کا نتیجہ ہو۔ عدالتی کارروائی کا انحصار ہر شخص کے منصب پر تھا نہ کہ قانون کے دفعات پر۔ روزمرہ کی عدالتی کارروائیوں پر رسم ورواج چھایا ہوا تھا۔ کاروبار اور پیشہ کا مسئلہ پیدائش کی بنیاد پر طے ہوتا تھا۔ انفرادی انتخاب یا اہلیت پر نہیں۔ شادی میں آزادانہ ساتھ اور رومان کا کوئی عنصر شامل نہ تھا۔ یہ صرف افزائش نسل کے لئے ایک پلان سمجھا جاتا تھا۔ تدبر اور حکمرانی اشخاص کی ذاتی بصیرت کا مظاہرہ تھی نہ کہ بحث اور جانچ، موافق اور مخالف امور کو تولنے اور اسباب اور نتائج کے باہمی ربط کا نتیجہ ہو۔ افراد کے کردار کا اصل چشمہ ایک صوفیانہ، داخلی اور اس دنیا سے ماورا دوسری دنیا سے متعلق رجحان تھا۔ ان باتوں نے واضح اور متعین اعمال کو دھندلا کر دیا تھا اور کاہلی اور تذبذب کو جنم دیا۔

اس طرح ہندوستان کی عملی زندگی کی نمایاں خصوصیت ایک خاص قسم کی متصوفانہ بے عملی تھی اور اہم مسائل کے حل کرنے میں بجائے عقل کے قوت تمیز یہ کے جس سے کام لیا جاتا تھا۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اٹھارھویں صدی کی حکومتیں

کے دستاویزات میں باوجود اس کے کہ ان کی مقدار بہت ہے لیکن کہیں بھی تحریر میں کسی پالیسی
پر بحث کی کارروائی یا سفرا کے نام مکتوبات میں کوئی تحریری ہدایات یا سالانہ محاصل کا
کوئی تخمینہ یا حکومت کے اخراجات کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے "آرمے" نے نوٹ کیا ہے
کہ "اہم امور میں کوئی چیز سوائے اس کے کہ وہ مبہم انداز میں ہو کبھی بھی ان لوگوں نے
(یعنی ہندوستان کے حکمرانوں نے) تحریر میں نہیں دی ہے۔" ضبط تحریر میں لائے
گئے وہ خطوط خواہ وہ سیاسی ہوں یا مدبرانہ جو باقی رہ گئے ہیں وہ سب نہایت الجھی ہوئی
عبارت آرائی ہے جس میں معانی کو بڑے بڑے الفاظ میں چھپا رکھا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے
کہ تحریر معانی کو متعین کر دیتی ہے۔ اس صفت سے ہندوستانی مدبرین نے ہمیشہ پہلوتہی
کی اور اس کے بجائے زبانی مباحثے اور زبانی ہدایات کو جن میں ابہام بھرا ہوا تھا اور جس
کے مختلف معانی ہو سکتے تھے اختیار کیا۔ ہندوستانی عام طور پر متحمل، فرماں بردار اور صابر
تھا۔ اور لڑائی کرنے کے بجائے اطاعت قبول کرنے پر زیادہ راغب رہتا تھا۔ اٹھارویں
صدی میں وہ عام سطح سے زیادہ خود پسند، تنگ نظر اور پست ہمت تھا اور وہ نہ اپنی ذات
کا وفادار تھا نہ دوسروں کا وفادار۔

پلاسی اور اس کے بعد

پلاسی کی شکست نے ہندوستان کی تمام کمزوریوں کو آشکارا کر دیا۔ یہ ہندوستان
کے سب سے زیادہ دھنی اور خوب صورت علاقے کو بیرونی جوئے کے نیچے لے آئی۔
اس نے انگریزوں اور ہندوستانیوں کے باہمی تعلقات میں ایک اچانک اور انتہا پسندانہ
تبدیلی پیدا کر دی۔ مراعات کی بھیک مانگنے والا انگریز اب بخششوں کا عطا کرنے والا بن
گیا۔ کلایو نے سب سے پہلے نواب بنگال کو جو خط لکھا اس میں جنگ کا نعرہ دیا۔ اس فتح
نے کلایو کے ہم وطنوں کو ناقابلِ برداشت حد تک گستاخ، شان جتانے والا اور ظالم بنا دیا۔
اس نے کردار کے گھناؤنے حصہ کو بڑھا دیا اور فاتح نسل کے اندر اپنے کو مغرورانہ انداز میں
نمایاں کرنے کے لیے اکسایا۔

پلاسی نے بنگال میں ایک عجیب و غریب حالت پیدا کر دی۔ مفتوحہ ملک کا
کوئی مالک باقی نہ رہا تھا۔ نواب سے کل اختیارات چھین لیے گئے تھے۔ ایسٹ انڈیا

کمپنی بہت دور تھی اور بہر حال یہ ایک تجارت کرنے والوں کا ادارہ تھی جس کی تعمیر سیاسی اور انتظامی امور کی کارروائیوں کے لئے نہیں ہوئی تھی۔ انگلستان کی گورنمنٹ کو اس کی خبر ہی نہ ہوگی کہ کمپنی کے ایجنٹ یہاں کیا کر رہے تھے اور مفتوحہ قوم کے تئیں ان کی کیا ذمہ داریاں ہیں اس کا کوئی احساس نہ تھا۔" لیکی" کا بیان ہے کہ" طاقت عملاً متفرق افسران کے ایک بڑے جھنڈ کی اجارہ داری بن گئی تھی جو نگرانی کے حلقے سے بہت دور تربیت یافتہ کثیر التعداد سپاہیوں کو اپنے زیر کمان لئے ہوئے تھے۔"[2]

چند افسران ایسے تھے جو" مایوسی کے شکار ہو کر شورہ پشت ہو گئے تھے جن کی مالی حالت تباہ اور جن کی عزت داغ دار تھی۔ یہ لوگ ان ایام میں ہندوستان آئے تھے جب بہت کم بہترین یورپین اپنے اوپر یہ لازم سمجھتے تھے کہ اخلاق کا کل قانون ایک ایسی قوم پر لاگو کریں جن کا عقیدہ غیر اہلِ کتاب کا اور جن کا رنگ ان کے رنگ سے مختلف تھا۔"[3] ان کے تاخت وتاراج کرنے کے نتیجہ کی مثال ایک ہرے بھرے کھیت سے دی جا سکتی ہے جس پر ٹڈی دل کا ایک جھنڈ آکر بیٹھ گیا ہو۔ لیکی کہتا ہے" پورے ضلعے جو آباد اور خوش حال تھے آخر کار غیر آباد ہو گئے اور یہ دیکھا گیا کہ اگر انگریز تاجروں کی ٹولی گاؤں میں آگئی تو لوگ فوراً گاؤں چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے، دکانیں بند کر دی جاتی تھیں اور سڑک خوف سے بدحواس دوسرے کسی ملک میں پناہ لینے کے آرزومند بھگوڑوں سے بھر جاتی تھی۔"[4]

دولت جمع کرنے میں کوئی اخلاقی اصول کمپنی کے ان لالچی افسران کے راستہ میں رکاوٹ نہیں ڈالتا تھا۔" ہندوستان کے باشندوں کو کبھی ایسے ظلم کا سامنا نہیں ہوا تھا جو پوری فنی مہارت اور پوری سوجھ بوجھ پر مبنی اور اتنا زوردار ہو۔"[5] کمپنی کے مسودہ ساز عمال اور تجار اچانک بہت بڑی طاقت رکھنے والے افسر بن گئے تھے۔ ان کو بہت معمولی تنخواہ دی جاتی تھی اور ان کو اجازت تھی کہ اس کمی کو وہ اپنی پرائیویٹ تجارت کے منافع سے پورا کرلیں۔ بنگال کی فتح نے ان کو سنہرا موقع دیا تھا۔ انھوں نے اپنے اختیارات اپنے ہندوستانی اور دوسرے رقیبوں کو تجارت کے میدان سے بھگا دینے کے لئے استعمال کیا۔ وہ کسٹم ڈیوٹی اور چنگی دینے سے انکار کرتے تھے، وہ اپنی اشیا ہندوستانیوں کے ہاتھ بڑی رقوم کے عوض بیچتے تھے، ہندوستانی کام کرنے والوں کو دھمکاتے تھے اور جو

اشیاء وہ بیچتے تھے اسے بیچنے کے لئے دوسرے تجار کو منع کرتے تھے۔ وہ گاؤں والوں پر تشدد آمیز دباؤ ڈال کر انھیں مجبور کرتے تھے کہ وہ ان کی چیزیں ناقابلِ برداشت قیمتوں پر خریدیں۔ اور اپنی چیزیں ان کے ہاتھ سستے داموں بیچیں۔ زندگی کی ابتدائی ضروریات کے لئے جو چیزیں درکار ہیں ان پر ان کی اجارہ داری تھی۔ وہ دوسرے ذرائع بھی اپنی آمدنی کو بہت زیادہ بڑھانے کے لئے اختیار کرتے تھے۔ وہ جرمانے عائد کرتے، ٹیکس وصول کرتے اور ہندوستان کے مفلس، قلاش اور دیوالیہ راجاؤں اور حکمرانوں کو انتہا سے زیادہ شرح سود پر قرض دیتے تھے۔ استحصال بالجبر، بددیانتی اور رشوت پر ان کا عمل تھا۔ میر قاسم نے انگریز گورنر اور ان کی کونسل سے 1762ء میں شکایت کی کہ "یہ ہے آپ کے شریف آدمیوں کے برتاؤ کا طریقہ۔ وہ تمام ملک میں فساد اور بدامنی پھیلاتے ہیں۔ لوگوں کو لوٹتے اور میرے ملازمین کو مارتے اور ذلیل کرتے ہیں۔ اپنے عہدوں کی نمائش کر کے اور کمپنی کا پاس دکھلا کر وہ اپنی انتہائی کوشش کسانوں، تاجروں اور ملک کے دوسرے لوگوں کے ستانے پر صرف کرتے ہیں۔ ہر گاؤں اور ہر فیکٹری میں وہ نمک، ڈلی، چاول، بھوس، بانس، مچھلی، بورے، ادرک، چینی، تمباکو، افیون اور بہت سی دوسری چیزیں خریدتے اور بیچتے ہیں.......... یہ لوگ کسانوں اور تاجروں کا مال اور ان کی تیار کی ہوئی چیزیں اصل قیمت کی چوتھائی پر زبردستی اٹھالے جاتے ہیں اور تشدد اور ظلم ڈھا کر وہ کسانوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان کی روپیہ کی چیز پانچ روپیہ میں خریدیں اور صرف پانچ روپیہ کے لئے وہ ایک آدمی کو جو سو روپیہ مالگذاری ادا کرتا ہے اور علاوہ ازیں ذلیل کرتے ہیں اور یہ لوگ میرے ملازمان کو کوئی اختیار برتنے کی اجازت نہیں دیتے۔"[7]

اپنی ان محنتوں نے جو میر قاسم اپنی رعایا کے حقوق کی حفاظت کے لیے اور ان مظالم کے خلاف آواز اٹھانے کے سلسلہ میں کر رہا تھا اس پر اتنا دباؤ ڈالا کہ آخر کار اس کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا۔ اس کو اتنا اشتعال ہوا کہ وہ تشدد اور جنگ پر اتر آیا لیکن آخر کار اس کو شکست ہوئی اور اس کو مجبوراً جلاوطن ہونا پڑا۔

اونچے درجہ کے افسران مثلاً گورنر، گورنر جنرل اور کونسلر صاحبان وغیرہ ان تحائف سے بہت کثیر دولت کے مالک ہو گئے تھے جو ہندوستان کے شہزادگان

اور افسران ان کو اس لیے دیتے تھے کہ ان کے لطف وکرم کے ذریعہ اپنی اس پوزیشن کو قائم رکھ سکیں جن پر ان کی حریصانہ نگاہ تھی اور جن پر وہ قابض تھے۔ "جیمس مل" ان رقوم کا حساب لکھتا ہے جو بنگال کے شہزادوں اور دوسرے شہریوں نے 1757ء سے 1760ء تک ان لوگوں کو دیں ان کی مجموعی مقدار 6 ملین ڈالر یا چھ کروڑ روپیہ کا ہوش ربا عدد ہے۔[9] صرف اس جاگیر سے جو کلایو کے قبضہ میں تھی ان کو تیس ہزار پونڈ سالانہ کی گراں قدر رقم وصول ہوتی تھی۔ کلایو 34 سال کی عمر میں انگلستان واپس گیا اور اپنے ساتھ چالیس ہزار پونڈ سالانہ کی رقم اور اپنے عزیزوں کے لئے پچاس ہزار پونڈ لے گیا۔[9]

کمپنی کے ادنٰی سطح کے ملازمین نے بھی اپنے لیے خوب دولت جمع کی وہ اس ملک میں اپنے عارضی قیام کو اپنے کو دولت مند بنانے کا ایک نادر موقع سمجھتے تھے۔ اس پر ذرا بھی نظر ڈالے بغیر کہ یہاں کے بسنے والوں پر کیا گذرتی ہے۔ ڈائریکٹر صاحبان کو بھی مجبور ہو کر تسلیم کرنا پڑا کہ "ہم لوگوں کا خیال ہے کہ اندرون ملک کی تجارت سے جو کثیر دولت حاصل کی گئی ہے وہ ایسی انتہائی جبر اور ظلم کی طویل کارروائیوں سے حاصل کی گئی ہے جس کی مثال کسی زمانہ یا کسی ملک میں نہیں ملے گی۔"[10]

دولت کو آسانی سے اور بہت جلد حاصل کرنے کی توقع نے دوسرے انگریزوں کی حرص کو ابھارا۔ کمپنی کے مالکان اور ذی اثر لوگوں نے کمپنی کو مجبور کیا کہ وہ ان کے جوان رشتہ داروں اور دوستوں کو اپنی نفع بخش ملازمت میں جگہ دے۔ حریص انسانوں نے انگریزی اخبارات میں اشتہار دیا کہ بنگال میں لکھنے پڑھنے کی کوئی جگہ دلانے والے کو ایک ہزار گنی بطور معاوضہ میں دیا جائے گا۔

سرکاری محکموں اور ان کے ملازمین کی تعداد میں بہت بڑا اضافہ ہوا اور رشتہ داری میں اعلیٰ طبقہ سے جڑے ہوتے دولت کے حریص نوجوانوں کو کروڑوں ہندوستانیوں کی تقدیر کا انچارج بنا دیا گیا۔ جن کی زندگی کا واحد مقصد یہ تھا کہ وہ سونے کے سکوں کے درخت کو ہلائیں اور دولت سے لدے پھندے اوائل عمری میں وطن واپس لوٹ جائیں۔ کیتھ لکھتا ہے کہ "مطالبات کا نتیجہ ...... تھا کہ وہ ملک جو انتہائی جابرانہ اور خود مختارانہ حکومت کے ماتحت بھی سرسبز تھا تباہی کے کنارے اس وقت پہنچ گیا تھا جب

اس کے نظم و نسق میں تھا۔ انگریزوں کا حصہ اتنا زیادہ ہو چکا تھا۔[111]

کلایو نے حرص و آز کو صلائے عام دی تو اس نے انگریزوں کی سوسائٹی کے تمام حلقوں کو متاثر کیا۔ کمپنی کے مالکان اور زیادہ منافع تقسیم کرنے کے لئے شور و غل مچانے لگے۔ 1767ء میں شرح بڑھا کر دس فی صدی کر دی گئی اور 1771ء میں ساڑھے بارہ فی صدی کی تجویز آئی۔ انگلستان کے وزراء اور اس کی پارلیمنٹ کو بھی یہ چھوت کی بیماری لگی۔ یہ خیال کہ ہندوستان قومی قرضے کو ادا کر سکتا ہے نہایت درجہ جاذب نظر آیا۔ مشرق کی دولت کے جو مبالغہ آمیز تصورات پھیلے ہوئے تھے ان سے اس کا تعلق تھا۔ کلایو نے پٹ کو لکھا تھا کہ بنگال کی فتح آگے چل کر اس غرض کے لئے استعمال کی جا سکتی ہے اور بیک فورڈ کا خیال تھا کہ "مشرق" براہ راست محاصل کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ ایک صحیفہ نگار نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہندوستان برطانیہ کی حکومت کی ماتحتی میں اتنا کافی منافع دے سکتا ہے جس سے قرضہ ادا ہو جائے۔

اندازہ کیا جاتا ہے کہ تقریباً بیس لاکھ پونڈ ہر سال خراج کے طور پر کمپنی سے حکومت برطانیہ کو ملا کرتے تھے۔ "لیکی" لکھتا ہے " بلا کسی ایسے اختیار کے جو چارٹر کے ذریعہ حاصل ہوا ہو۔ یا قانون کے الفاظ سے ملا ہو۔ وزرا نے ملک کے محاصل اور کمپنی کی تجارت کے محاصل میں فرق کر دیا۔ متقدم الذکر کو خطرے میں ڈال کر ان لوگوں نے جائز محصولوں کے علاوہ جو شاہی خزانہ میں جمع کر دیے گئے تھے زبردستی مزید چالیس ہزار پونڈ سالانہ عائد کر کے وصول کر لئے۔ اور یہ اس وقت جب کہ کسی کی مالیات اس جابرانہ وصولی کو برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ یہ خراج جو کمپنی کے دیوالیہ پن کے آغاز کی اصل وجہ تھا صاف صاف استحصال بالجبر تھا۔ حساب لگا کر معلوم ہوا کہ دو ملین اسٹرلنگ سے کچھ ہی کم سالانہ کمپنی کے ہاتھ سے نکل کر گورنمنٹ کے پاس جاتا ہے۔

کلایو نے کمپنی کو بے حرمت کر دیا اور "چیتھم" کو یہ فکر تھی کہ کہیں وہ قوم کو بے حرمت نہ کر دے، یہ خطرہ حقیقی تھا۔ اٹھارھویں صدی کے آخری نصف میں انگلستان کے اندر اخلاق اسفل ترین سطح پر تھا۔ رشوت ستانی پھیلی ہوئی تھی۔ انتخاب کے حلقوں پر کسی نہ کسی کا پنجہ گڑا ہوا تھا اور وہ سڑے ہوتے تھے۔ ان سے جو ممبران چن کر آتے تھے وہ قابل فروخت اشیاء میں ہوتا۔ بادشاہ اور پارٹی کے لیڈر ان کو خریدنے کے بہت مشتاق تھے

اس لئے وہ لوگ کمپنی سے کثیر رقم جنھیں چھین لینے کے لیے بے قرار رہتے تھے۔ اسی طرح کمپنی کے دولت مند ملازمین جو نواب بن کر لوٹے تھے قانون ساز جماعت میں اپنا اثر قائم کرنے کے لیے بے چین تھے۔ ان رجحانات کی ایک واضح مثال 1778ء کے ایک الیکشن میں پائی جاتی ہے جس میں اُن کے اکیس آدمی منتخب ہو کر آ گئے۔ "جدید پارلیمنٹ درحقیقت نوابوں کے ایک مقام پر جمع ہونے کی جگہ تھی" ان کے درمیان چار کلایو تھے، دوسرے وہ تھے جنھوں نے ہندوستان کے حالیہ واقعات میں نمایاں حصہ لیا تھا۔

کیا انگلستان اس راہ پر جارہا تھا جس پر رومی شہنشاہیت گئی تھی جب کہ صوبوں کے سینیٹ (قانون ساز جماعت) پر صوبوں کے والی غالب ہوئے اور ری پبلک کو شہنشاہیت میں بدل دیا۔ وہ قدیم آزادی جس کی بنا انگلستان نے کئی نسلوں کی زحمتوں اور قربانیوں سے ڈالی تھی خطرے میں تھی۔

ایک وسیع اور آباد علاقے کے حاصل ہو جانے سے دستوری اور قانونی نقطۂ نظر سے انتہائی پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ایک تجارتی جماعت تھی جسے انگلستان کی حکومت نے جنم دیا تھا۔ یہ انھیں اختیارات اور حقوق کو برت سکتی تھی جو حکومت کے سربراہ کے عطا کردہ چارٹر (فرمان) سے نکلتے تھے۔ کیا وہ ایک لاکھ پچاس ہزار مربع میل کے رقبے کے علاقے پر جس کی آبادی تیس ملین تھی اعلیٰ سیاسی اقتدار حاصل کر سکتی تھی جب کہ اس کے اپنے ملک (برطانیہ اور آئرلینڈ) کا رقبہ صرف ایک لاکھ بیس ہزار مربع میل تھا اور جس میں صرف نو ملین لوگ آباد تھے۔ اور کیا ایسا کرنے سے ملک کے سیاسی نظام میں اختلال نہ پیدا ہو جائے گا۔ حکومت اندرون حکومت ہمیشہ ایک خطرناک بات مانی گئی ہے خصوصاً اس وقت اس اقتدار کو برتنے والی ایسی جماعت ہو جو بے اصول منافع تلاش کرنے والے سوداگروں پر مشتمل ہو۔

کمپنی نے صوبہ بنگال پر جو اقتدار حاصل کیا اس کا بے شرمی کے ساتھ ناجائز استعمال کیا گیا۔ چنانچہ پلاسی کے تیس سال کی مدت ملک کی تاریخ کا انتہائی دردناک اور شرمناک عرصہ ہے۔ 1757ء سے 1765ء تک بنگال کو ایک وسیع پیمانہ پر مفتوحہ ملک قرار دے کر اس طرح لوٹا گیا کہ گویا یہاں کے باشندوں کے بارے میں فاتحین کی نہ کوئی ذمہ داری تھی نہ کچھ فرائض کسی اصول و ضابطے کے بغیر صوبوں میں

نوابوں کو بنایا اور بگاڑا جاتا تھا اور ایسا ہر موقع کمپنی کے اعلیٰ افسران یعنی پریسیڈنٹ کونسل کے ممبران اور فوجی افسران کے لئے بڑے بڑے تحائف زبردستی وصول کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے معمولی عہدیدار اضلاع پر جھاڑو پھیر دیتے تھے۔ 1765ء میں بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل کی گئی اور اس کے بعد کے سات سال تک وہ دُہری حکومت چلتی رہی جو کلایو نے قائم کی تھی اس علاقے کی اقتصادیات پر اقتدار کا کمپنی کے ہاتھوں میں چلے جانا ایک عظیم اور نہایت منحوس تبدیلی تھی۔ ایک تجارتی کارپوریشن کے کارکنان اور سوداگر رات گذری اور صبح اچانک افسرانِ نظم ونسق اور مدبرین ہو گئے جن کے سر ایسے پیچیدہ سوالات کو حل کرنا تھا جن میں ناقابل تصور اور لامحدود امکانات پنہاں تھے۔ بدقسمتی سے ان لوگوں کو یہاں کے نظامِ اراضی اور ملکیت کے تناسب کا قطعی کوئی علم نہ تھا۔ ان حالات میں انھوں نے انگلستان کے سیاسی اور اقتصادی نظریات کو جن سے وہ آشنا تھے سراسر مختلف حالات میں جو ہندوستان میں تھے انھیں نافذ کر دیا۔

پہلے چند سالوں میں کمپنی کی ہمت نہ ہوئی کہ دیوانی کی منتقلی میں جو ذمہ داریاں تھیں ان کو برتیں اس لیے انھوں نے یہ کوشش کی کہ ہندوستانی اقتدار کی فرضی ماتحتی قائم رکھیں۔ کمپنی مغل حکومت کے پس پردہ کام کرتی تھی۔[12]

اس عہد میں اصلی اختیارات پر عمل درآمد ایک ایسے معاہدہ کے تحت ہوتا تھا جس میں ہندوستان کے کٹھ پتلی حکمران کو بظاہر اختیار دیا گیا تھا لیکن اقتدارِ اعلیٰ کی اصلی طاقت کمپنی کے ہاتھوں میں تھی۔ امن وامان کے قیام کی ذمہ داری نواب کی تھی لیکن اس کے لیے جو سرمایہ اور طاقت درکار تھی اس کے لئے کمپنی پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا جس کی ملازمت میں کارکن فوج تھی اور جس کے اختیار میں صوبہ کے محاصل کا خرچ کرنا تھا۔ مالگذاری کی وصولی میں بھی کمپنی نے کوئی مداخلت نہ کی کیوں کہ یہ پرانے تخمینوں کی بنیاد پر وصول کی جاتی تھی۔ خزانہ مرشدآباد ہی میں رہا۔ ایک نائب دیوان بظاہر نواب کی ماتحتی میں مقرر کیا گیا لیکن درحقیقت وہ مالگذاری کے جمع کرنے کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنے کے سلسلے میں کمپنی کے سامنے جواب دہ تھا۔

یہ انتظامات ناقابلِ اطمینان ثابت ہوئے۔ کمپنی کی حد سے بڑھی ہوئی حرص اور

کمپنی کے ملازمین کی شیطنت نے بنگال کو تاراج اور بدامنی کی آماجگاہ بنا دیا۔ نتیجہ 70-1769ء کا وہ بھیانک قحط تھا جس نے آبادی کے ایک تہائی باشندوں کو فنا کر دیا۔[1]
ہنٹر ایک ہم عصر کا حوالہ دیتا ہے جس نے لکھا ہے کہ "مصائب کا جو عمل دخل ہوا اور جو اب تک قائم ہے وہ انسانیت کے لیے اتنا بڑا دھکا ہے کہ بیان میں نہیں آسکتا۔ یہ یقینی بات ہے کہ بعض حلقوں میں انسان مُردوں کو کھا کر زندہ رہے۔"[194] پھر بھی ہوا یہ کہ اس قحط کے زمانہ میں بھی کمپنی نے محاصل میں صرف 5 فی صدی چھوٹ دی اور دوسرے سال 10 فی صدی کا اضافہ کر دیا تاکہ جو لوگ زندہ بچ گئے ہیں ان سے ان نقصانات کو پورا کیا جائے جو بعض جگہ آبادیوں کے اجڑ جانے سے کمپنی کو ہوا تھا۔"

کمپنی نے ان انسانیت سوز طریقوں کو اس لئے اختیار کیا تھا کہ بنگال کی فتح نے کمپنی کے شرکاء کے حرص کو ابھار دیا تھا جو زیادہ شرح منافع اور زیادہ روپیہ کاروبار میں لگانے پر اصرار کرتے تھے۔ اس نے انگلستان کی حکومت کے لالچ کو بھی تیز کر دیا تھا جو اس لُوٹ میں حصہ مانگتی تھی۔ دونوں مل کر ہندوستان کو ایک ایسا فرضی ملک سمجھتے تھے جس میں سونے کی افراط تھی۔ دونوں ہندوستان کے نہ ختم ہونے والے سونے میں حصہ دار بننے کے خواہش مند تھے۔ انھوں نے دیکھا تھا کہ کلایو اور کمپنی کے دوسرے ملازمین افسانوی سرمائے لے کر لوٹے ہیں۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے اگر انھوں نے ہندوستان کی دولت کے بارے میں مبالغہ آمیز خیالات گڑھ لئے۔

لیکن تعجب خیز واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ کمپنی کے ملازمین نے بے انتہا دولت جمع کی پھر بھی خود کمپنی مالی مشکلات میں مبتلا تھی۔ کمپنی پر 60 لاکھ پونڈ کا قرض تھا اور اس نے انگلستان کی حکومت کو سالانہ چار لاکھ پونڈ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کو مغل بادشاہ، بنگال کے نواب اور ہندوستانی حکمرانوں کو دس لاکھ پونڈ سالانہ امداد دینا ہوتا تھا۔ ان سب پر بالاتر بات یہ ہوئی کہ کمپنی کے مالکان نے شرح منافع 1767ء میں 6 فی صدی سے بڑھا کر دس فی صدی کر دیا اور 1773ء میں ½12 فی صدی کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی نے مجبور ہو کر نہ صرف 4 لاکھ پونڈ سالانہ دینا بند کر دیا بلکہ انگلستان کی گورنمنٹ سے مزید قرضہ کی درخواست کی۔ قدرتی بات تھی کہ اس سے بدحواسی پیدا ہوئی۔

جب 1769ء اور 1770ء کے مکروہ حادثے کی داستانیں انگلستان پہنچیں تو یہ

لازم ہو گیا کہ کمپنی کے معاملات کو سدھارنے کے لئے فوری قدم اٹھایا جائے۔

وارن ہیسٹنگز نے نقاب چاک کر دی

1722 میں وارن ہیسٹنگز جس نے مختلف منصوبوں پر کمپنی کی ملازمت کی تھی بنگال کا گورنر مقرر ہوا۔ اس نے مغل شہنشاہیت کے فرضی نقاب کو چاک کر دیا اور کمپنی کو اس کے اصلی خدوخال میں ایک فوجی طاقت کی حیثیت سے نمایاں کیا جو ملک پر فتح کے حق کی بنا پر قابض تھی۔ اس نے مغل بادشاہ یا گورنر بنگال کے معاہدوں کو یک طرفہ رد کر دیا۔ اس نے نواب ناظم کے اختیارات چھین لئے اور دیوانی (یعنی مالگذاری کے عطیہ) اور نظامت (یعنی مقدمات فوجداری اور پولیس کے نظم) کو ایک میں ملا دیا۔ اس نے نائب دیوان کو برخاست کر دیا۔ اور مالگذاری کی وصولی کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور بورڈ آف ریونیو (حکام متعلق مقدمات مال) اور خزانہ کو مرشد آباد سے کلکتہ منتقل کر دیا۔ بادشاہ کو جو امداد دی جاتی تھی اسے روک لیا۔ اور نواب کا محاصل میں جو حصہ مقرر تھا اس میں کمی کر دی۔ الہ آباد اور کڑا کے صوبے جو شہنشاہ کو دیئے گئے تھے وہ پچاس لاکھ روپئے کے عوض نواب اودھ کو دے دیے گئے اور ایک انگریزی فوج کا دستہ 4 لاکھ پونڈ کے عوض نواب کو عاریۃً دیا گیا تا کہ وہ روہیلوں کو کچل دے۔ "برک" نے ان تمام کارروائیوں کو "صدمہ خیز، بھیانک اور شرمناک وعدہ خلافی" کہہ کر ان کی سخت مذمت کی[15] گورنر جنرل اور ان تمام لوگوں کا جو ان کو جائز قرار دینے کا عذر تلاش کرتے ہیں۔ کہنا تھا کہ "ضرورت ہو تو جائز ہے۔"

کمپنی کی ساخت، اس کے نظم و نسق اور اس کے اقتصادی نظام میں انتہا پسندانہ تبدیلیاں کی گئیں کیوں کہ 'بینتھم' کے الفاظ میں "ہندوستان بے انصافیوں سے اس طرح بھرا ہوا تھا جس کی بو زمین سے آسمان تک ہر جگہ سونگھی جا سکتی تھی۔"[16]

اب یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ایک ایسی سلطنت کے انتظام کی ذمہ داری سے پہلو تہی برتی جائے جو ایک پرائیویٹ ایجنسی نے حاصل کی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اب صرف ایک تجارتی ادارہ نہ تھی یہ ترقی کر کے ایک سیاسی جماعت بن گئی تھی جو کئی ملین انسانوں پر اقتدارِ اعلیٰ کے اختیارات برت رہی تھی اس لیے اب یہ ضروری ہوا کہ حکومت

اور کمپنی کے حکمران جماعت کے درمیان جو انگلستان میں تھی نیا معاہدہ ہو۔ اور یہ بھی طے کیا جائے کہ حکومت اور ہندوستان کے اندر کی کمپنی کے تعلقات اب کیا ہوں گے جس میں یہ بات مضمر تھی کہ کمپنی کے ڈائریکٹروں کے جو وطن میں تھے اور اس کے افسران کے جو ہندوستان میں تھے باہمی تعلقات پر از سرِ نو غور ہو اور نیا فیصلہ کیا جائے۔

ہندوستان کے مسائل کا جواب پارلیمنٹ نے 1773ء کا ریگولیٹنگ ایکٹ پاس کر کے دیا یہ ایک طرح کی مصالحت تھی۔ اس نے کمپنی کے حقوق جائداد میں مداخلت سے گریز کیا تھا۔ مغل بادشاہ نے دیوانی یا محاصل مالگذاری کا جو انتظام کمپنی کو تفویض کیا تھا وہ کمپنی کے پاس رہا۔ اس ایکٹ نے ان خطرات سے بھی پہلو تہی کی راہ نکالی جو انگلستان کے وزرا کے اختیارات میں اضافہ سے پیدا ہو سکتے تھے۔

ریگولیٹنگ ایکٹ نے وارن ہسٹینگز کو گورنر جنرل نامزد کیا اور ان کی کونسل کے چار ممبران کی بھی تقرری کر دی۔ اس نے ایک سپریم کورٹ بنائی جس کے چیف جسٹس اور تین جونیر ججوں کا تقرر بادشاہ کو کرنا تھا۔ اس نے گورنر جنرل کو یہ مشورہ کونسل امن اور قانون کے قیام اور سول گورنمنٹ کے لیے ضوابط آرڈیننس اور ریگولیشن بنانے کا اختیار بھی دے دیا۔

اس طرح حکومت کی تمام کارروائیوں یعنی قانون سازی عدالت اور نظم و نسق کے لئے ضابطہ بن گیا اور ایک نئے نظامِ حکومت کی بنیاد پڑ گئی۔ لیکن ایک ایسے ڈھانچے کا بنا کر کھڑا کر دینا آسان نہ تھا۔ کیوں کہ جو کام وارن ہسٹینگز کے سامنے تھا وہ درحقیقت "کوہ کنی کے مصداق تھا۔ اس کو سوداگروں، افسروں اور کلرکوں کی ایک کمپنی کو حکومت کی مشینری میں تبدیل کرنا تھا اور ایک دم توڑتے ہوئے ہندوستانی نظام کو ہٹا کر اس کی جگہ ایک خالص سوداگرانہ طبقہ کی ایجنسی کو لانا تھا" جو اپنے ماتحت باشندوں کے رسم و رواج، مذہب اور معاشی عادات سے بالکل ناواقف تھی اور وہ اپنی رعایا کے سامنے نہ کسی ذمہ داری کو تسلیم کرتی تھی اور نہ اس کا اقرار کرتی تھی اور ان سب باتوں کے باوجود درحقیقت ان پر ایک انتہائی مطلق العنان اور خود مختار جبری حکومت کے اختیارات برت سکتی تھی۔[174]

اس لئے یہ لازم تھا کہ ان عناصر کا جو ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے تھے

تصادم ہو کیوں کہ وہ خلیج ناقابل عبور تھی جو شکست خوردہ اور خون میں نہائے ہوئے
ہندوستان کو ایک ایسے انگلستان سے جدا کرتی تھی جو تیزی کے ساتھ شہنشاہیت اور
حکمرانی کی اعلیٰ منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وارن ہیسٹنگز جس کے تعمیری ایام ہندوستان
میں بسر ہوئے ہندوستان کے روایتی طریقوں اور حکومت کے طور و طرز سے واقف
تھا اور اس کی نگاہ "نسلی برتری یا ایک مشن پورا کرنے کے جذبات سے دھندلی نہیں
ہوئی تھی"۔ اس نے پوری کوشش کی کہ ہمارے ریگولیشنوں کو عوام کے طرز زندگی، ذہن
اور ملک کی ضروریات سے مطابق کیا جائے تاکہ جہاں تک ہم سے ممکن ہو ہم ان کے
مراسم اور اداروں سے ہم آہنگ ہوسکیں"! اگرچہ وہ ہندوستان کے اندر برطانیہ کی
سلطنت کو جو عظیم خطرہ اس وقت درپیش تھا جب برطانیہ کی امپائر (سلطنت) امریکہ
میں ٹوٹ رہی تھی اس سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور اگرچہ وہ ان واقعات
پر بھی غالب آیا جو ریگولیٹنگ ایکٹ نے اس کی راہ میں پیدا کیے تھے لیکن ان سب
باتوں کے باوجود حکومت کا ایک ایسا نظم و نسق تیار کرنے میں جو مشرق کی روایات اور
مغرب کے تصورات کے باہمی میل جول کی بنیاد پر قائم ہو اس کی کامیابی محض معمولی
تھی۔ دوعملی حکومت سے جو پریشانیاں ہوتی تھیں اور اس سے جو جبر و تعدی ہوتی تھی
اس کو اس نے ختم کر دیا۔ بہرحال حکومت کی ایک ایک نئی تنظیم اُسے ایسے مشکل حالات
میں کرنی تھی جو ایسے شخص کو جو اس سے کم ابھرنے والی طاقت اور استقلال مزاج سے
بہرہ ور ہوتا پکل کر رکھ دیتے۔ مالگذاری کے نظام کو ترتیب دینے، سول اور ملٹری
افسران میں مناسب ڈسپلن اور اصلاح کو نافذ کرنے اور مالیات کو بحال کرنے میں
اس کی کوششیں ناکام رہیں پھر بھی آئندہ کے لئے ایک مضبوط نظام کی اس سے
بنیاد پڑ گئی۔

یہ صحیح ہے کہ وارن ہیسٹنگز نے وہ دوعملی حکومت ختم کر دی جو کمپنی اور نواب کے
درمیان تھی اور کل طاقت کمپنی کے ہاتھ میں مرکوز کر دی لیکن خود کمپنی کے اندر جو دوعملی
تھی وہ باقی رہی۔ سب سے اوپر تو پارلیمنٹ کا یہ اعلان تھا کہ وہ اقتدار اعلیٰ کی مالک ہے۔
بغیر اس کے وہ کوئی ادارہ ایسا بناتی جس کے ذریعہ اس کے اختیارات برتے جا سکتے۔
ہندوستان میں گورنر جنرل کے اختیارات ممبران کونسل اور سپریم کورٹ کے چیف

جسٹس کے اختیارات نے کے ذریعہ محدود کر دیے گئے تھے۔ گورنر جنرل اور مدراس اور بمبئی کے صوبوں (پریسیڈنسی) کے گورنروں کے باہمی تعلقات کی وضاحت بھی ناکافی تھی۔

نظامِ عدلیہ میں بھی دوعملی تھی۔ سپریم کورٹ تو انگلستان کے قوانین کے مطابق فیصلے کرتا تھا۔ جب کہ دیوانی عدالت اور صدر نظام عدالت اور ان کی ماتحت عدالتیں ہندوستان کے مال اور فوجداری قوانین کے مطابق یا ان ریگولیشنوں کے مطابق جو گورنر جنرل نے بنائے تھے کارروائیاں کرتے تھے۔ اختیارِ سماعت میں بھی تضاد تھا۔ کیوں کہ سپریم کورٹ قانون کی ایسی شرح کر سکتا تھا جس سے مال کے مقدمات میں اس کا اختیارِ سماعت کمپنی کی عدالتوں تک بھی پھیل جائے۔ پھر مشکل تھی کہ دونوں عدالتوں میں جو طریقے رائج تھے وہ ایک دوسرے سے مختلف تھے۔

ضلعوں میں مالگذاری کی وصولی اور امن و قانون کے قیام کا جو نظام قائم تھا وہ مغلوں کے نمونہ کا تھا اور ان کے کارپردازوں میں انگریز اور ہندوستانی دونوں تھے مگر کمپنی کا دستور اور اس کے مرکزی نظام کی کارروائی انگلستان کے قوانین کے تابع تھی۔

آخری بات یہ کہ کمپنی کے اقتدار کے وسائل میں بھی دوعملی تھی اس لئے اس پر دُہری ذمہ داری تھی۔ اس کے سول (مال) اختیارات مغل بادشاہوں کی نوازش سے ماخوذ تھے اور اس کے عام اختیارات تاجِ برطانیہ سے اُسے ملے تھے۔ مغل بادشاہ سے وفاداری کا تقاضہ تھا کہ وہ ہندوستان کے قوانین، اس کے مذہب اور اس کے مراسم کا اکرام کرے۔ دوسری جانب حکومتِ برطانیہ کے ایجنٹ کی حیثیت سے اس کا فرض تھا کہ برطانوی طور و طرز اور برطانوی اصول کو بحال کرے۔ اس طرح ان لوگوں میں جو ہندوستانیت کی وکالت کرتے تھے اور ان لوگوں میں جو انگریزیت کے طرفدار تھے تصادم تھا۔

وارن ہسٹینگز کی تقرری کے ساتھ تبدیلی شروع ہوئی۔ ڈائریکٹروں کے کورٹ نے پریسیڈنٹ اور کونسل کے نام احکام جاری کیے تھے کہ "وہ اپنے کو دیوان کی حیثیت دیں اور وصولی مالگذاری کی کل نگرانی اور اس کا کل انتظام کمپنی کے ملازمین کی ایجنسی سے اپنے ہاتھ میں لیں۔"[15]

یہ فیصلہ تاریخی اہمیت رکھتا تھا اور اس کے جو اثرات ہوئے ان کا بیان مل کے الفاظ سے بہتر انداز میں ممکن نہیں یعنی "اس حکم کا تقاضہ یہ تھا کہ ایک عظیم تبدیلی بروئے کار آئے۔ یہ ایک انقلاب تھا، ایسا انقلاب جو تمام پرانے حوادث سے بڑا ہندوؤں کے ہاتھوں سے نکل کر مسلمانوں کے ہاتھوں میں حکومت کے چلے جانے سے بھی زیادہ بڑا اور دور رس انقلاب "۔

ہندوؤں سے مسلمانوں میں حکومت کے منتقل ہونے میں صرف وہ ہاتھ تبدیل ہوا تھا جو تلوار چلاتا تھا اور انعام واکرام بخشتا تھا۔ لیکن حکومت کی مشین اور اس سے بھی زیادہ سوسائٹی کے ڈھانچے میں بہت خفیف تبدیلی ہوئی اور نظم ونسق کا غیر فوجی جزء بلا لحاظ سہولت تقریباً کل کا کل ہندوؤں کے ہاتھ میں رہ گیا۔ مالگذاری کے نظام میں ایسی مکمل تبدیلی نے جو کبھی لائی ہندوستان کے حالات کو افراد اور جماعت دونوں اعتبار سے ایسی گہرائی کے ساتھ متاثر کیا کہ اس کا سمجھنا یورپ کے اہل مطالعہ کے لئے آسان ہے۔ یہ ایک انوکھی بات تھی جس سے ملک کی کل املاک اور اسی کے ساتھ اس کا نظام عدل ایک نئی بنیاد پر قائم کر دیے گئے۔"[20]

13 اراپریل کو ہیسٹنگز نے گورنری کا عہدہ سنبھالا اور 14 اراپریل کو اسے ڈائریکٹروں کے کورٹ کا فیصلہ ملا کہ نائب دیوان کا عہدہ توڑ دیا گیا۔ نواب اس وقت نابالغ تھا۔ اس لئے جس وقت نائب دیوان کا عہدہ توڑا گیا اسی وقت سے ملک میں سب سے بڑی طاقت کی حیثیت سے کمپنی کا عوام سے رابطہ پیدا ہو گیا۔ سرکٹ کمیٹی کے الفاظ میں "کورٹ نے نظام کو یک قلم بدل دیا اور اس کے متعلق پلان بنانے اور عمل درآمد کرانے کا کام بورڈ کے سپرد کر دیا ہے۔ بغیر باضابطہ اس ریگولیشن کو منسوخ کیے ہوئے جو انھوں نے اس سے قبل جاری کیا تھا اور جو دوسرے نظام سے مطابقت رکھتا تھا جس کی منسوخی میں لازمی طور پر یہ بات مضمر ہے کہ اس کے ماتحت ادارے بھی ختم کر دیے گئے تاکہ وہ نئے نظام سے متصادم نظر نہ آئیں۔"[21]

اس سوال پر کہ مالگذاری کا انتظام پرانے زمین داروں کے ساتھ ہو یا نئے آدمیوں سے بولی بلوائی جائے۔ گورنر کی کونسل کے ممبران میں ایک طرف اور پریسیڈنٹ اور کونسل اور ڈائریکٹروں کے کورٹ میں دوسری طرف پورے طور پر بحث ہوئی اور آخر کار یہ

طے ہوا کہ مالگذاری کی وصولی کی جو ایجنسی اس وقت قائم ہے اسی سے کام لیا جائے بجائے اس کے کہ زمین داران کو پنشن دے دی جائے اور کاشت کاروں کو ان کی جوتوں کا مالک بنا دیا جائے۔ ہیسٹنگز لکھتا ہے کہ "زمین داروں اور تعلقداروں کو خطرات میں مبتلا کرنا نہ تو ہمارے نظریۂ حق شناسی سے مطابقت رکھتا ہے اور نہ آپ (یعنی ڈائرکٹرز) کے احکام سے جن میں یہ ہدایت ہے کہ ہم کسی اچانک تبدیلی سے دستور کو نہ بدلیں اور نہ زمیندار وغیرہ کو ان کے قدیم مراعات سے محروم کریں۔"[22] لیکن بہر حال یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ حکومت کے مفاد کو قربان کر دیا جائے اس لیے یہ اصول طے پایا کہ نئے لوگوں کے مقابلے میں زمین داروں اور تعلقداروں سے معاملہ کیا جائے لیکن جہاں کہیں زمین داران آگے نہ بڑھیں یا اتنی مالگذاری ادا کرنے پر راضی ہوں جو نئے بولی بولنے والے دینے کو تیار ہوں تو ایسی حالت میں بندوبست موخر الذکر کے ساتھ کر دیا جائے۔ اس طرح موجودہ زمین داروں کو ترجیح صرف اس حالت میں دی جاتی جب کہ وہ اتنی مالگذاری دینے کو تیار ہوں جو کمپنی ان دوسرے لوگوں سے کھینچ سکے جن کو اس سے قبل کوئی حق حاصل نہ تھا۔ 1772ء میں یہ طے ہوا کہ بندوبست پانچ سال کے لیے کیا جائے۔

ہیسٹنگز کے مالگذاری نظام نے کاشت کاروں اور مالکانِ اراضی پر تباہی نازل کر دی کیوں کہ تخمینہ غیر یقینی ہونے کی وجہ سے کاشت کو ترقی دینے کی خواہش ناپید ہو گئی۔ ان کے مالگذاری وصول کرنے والے افسران عدالت اور مجسٹریٹ کے وسیع اختیارات سے مسلح تھے جس کی وجہ سے ان افسران کے ظلم سے مالکان اراضی کو کہیں پناہ میسر نہ تھی۔ زمین میں جو حق مجبور اور بیکس کاشت کاران بنگال زمانہ قدیم سے برتتے چلے آرہے تھے اس کی لوٹ میں خود ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران آزادی سے حصہ لیتے تھے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک بڑی زمین داری ہیسٹنگز کے ایک یہیں کے بسنے والے ملازم کنتو بابو کو عطا کر دی گئی۔ یہ عطیہ کنتو بابو کے دس سالہ بچے کے نام رجسٹری کیا گیا۔ ہیسٹنگز نے اس کی مدافعت میں یہ کہا کہ یہ اس کے نوکر کے ساتھ طرفداری نہیں ہے بلکہ جس نے سب سے بہتر شرائط پیش کیے اس کو زمین دی گئی ہے۔ اس طرح کے دورُخے معاملے کرنے میں ہیسٹنگز ہٹتا نہیں تھا۔ 1773ء اور 1793ء کے درمیان کمپنی کے ملازمین کا اپنے ہندوستانی نوکروں یا دوسرے فرضی ناموں سے زمیندار یا

حاصل کرنا بڑے پیمانے پر رائج تھا۔ سرکٹ کمیٹی کے ممبران کی اکثریت نے لکھا ہے کہ "جب ہم 3½ لاکھ سالانہ آمدنی کے فارم طے کرتے ہیں اس کے علاوہ کمپنی کی جانب سے 16 لاکھ مزید کمپنی کی لاگت کا اضافہ کرتے ہیں تو یہ سب گورنر کے بنیوں یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی پر اس لئے نہیں لادا جا سکتا ہے کہ اس سے وہی فائدہ اٹھائیں۔ ہم مالک اور نوکر کے مشترک مفاد کا ایک یقین ثبوت فراہم کرنے کا بہانہ نہیں تراشیں گے اور یہ غالباً ناممکن ہے لیکن بہر حال ڈائریکٹروں کا کورٹ یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہے کہ وہ تمام غلط استعمال جو ثابت ہو چکے ہیں ان سب میں بنیا ہی دراصل اصلی شخص رہا ہے جس کے نام پر فارم یا معاہدہ مالک کرتا ہے۔ مسٹر فلیٹ وڈ کا بنیا شری گرٹھ کا ایک فرضی کاشتکار ہے۔ اسی طرح مسٹر تھیکرے کا بنیا سلہٹ کا فرضی کاشت کار ہے۔ بجورا اور اپولے کا مسٹر کرسٹی، بلوا کے نمک کے کارخانہ کے مسٹر مارٹن، ہمارے پاس یہ یقین کرنے کے کافی وجوہ ہیں کہ ان صوبوں میں کمپنی کی کم و بیش ایک تہائی اراضی کا رقبہ کمپنی کے صاحبان کے بنیوں کے قبضہ میں رہا ہے۔"[23]

یہ 1775ء کی بات ہے۔ یہ عمل اس کے بعد بھی جاری رہا اور 1793ء تک جب بندوبست استمراری کیا گیا بورے بنگال کی نصف زمین اس طرح چھین کر قبضہ میں کر لی تھی۔

ہیسٹنگز نے ہندوستان کی دیہی اقتصادیات کے محل کو ایک خوفناک دھکا لگایا تھا۔ اس نے یہ نظریہ قائم کیا کہ کل زمین حکومت کی ملکیت ہے اس لئے پیداوار میں کاشت کار کا حصہ مزدور کی اجرت اور اس کے آلاتِ زراعت کے منافع تک محدود ہے اور درمیانی آدمی کا حصہ وہ کمیشن ہے جو مالگزاری وصول کرنے والے کو اس کی خدمات کے عوض دیا جاتا ہے باقی کل حکومت کا ہے۔ اس نظریہ پر عمل درآمد ہوا اور اس کے نتائج تباہ کن ہوتے۔ موروثی زمین داروں کے حقوق کو نظر انداز کر دیا گیا، زمین نیلام پر چڑھا دی گئی اور جو سب سے زیادہ بولی بولا اور جو لگان ادا کرنے کی مقررہ ضمانت دے سکا اس کے نام پٹہ کر دیا گیا۔ پہلا نیلام 1772ء میں پانچ سال کے لئے ہوا۔ اس کے بعد کے پٹے ہر سال ہوتے رہتے تھے۔

دوسری اہم تبدیلی جو وارن ہیسٹنگز نے کی وہ سرکاری مطالبات کی وصولی کے

طریقے میں تھی" اگر وہ بقائے میں پڑجائیں تو وہ (یعنی زمین دار) مستوجب بے دخلی ہوں گے اور ان کی زمین داری کا کل یا جزء فروخت کر کے بقایا پورا کیا جائے گا"[24]
اس سے بے شمار برائیاں پیدا ہوئیں۔ وصولی کرنے والوں کی طرف سے سختی، مالکانہ اراضی کی طرف سے تباہ کن لگان پر اٹھانے کا رواج اور کاشت کاروں کی جانب سے اخفاء اور ٹال مٹول کرنے کی کوشش۔

ان کارروائیوں کا جو نتیجہ ہوا اس کے بارے میں فلپ فرانسس نے اپنے نوٹ میں لکھا ہے کہ زمین داروں کا بیشتر طبقہ برباد ہوگیا اور نچلے طبقہ کے لوگوں کو کمپنی نے ٹیکسوں کی وصولی کے لیے ملازم رکھا۔ آر۔ سی۔ دت ان واقعات پر تنقید کرتا ہوا کہتا ہے کہ" سالانہ بندوبست، مسلسل اضافۂ مالگذاری اور ایسے سخت طریقے کی وصولی سے جن کی کوئی مثال ماضی میں نہ تھی بنگال کے تمام بڑے زمین داروں اور تمام قدیم خاندانوں پر مصیبت ٹوٹ پڑی۔ پرانے خاندانوں کے وارثوں نے دیکھا کہ ان کی زمین کلکتہ کے مہاجنوں اور سٹہ بازوں کے پاس چلی گئی۔ بیواؤں اور نابالغ زمین داروں کو نظر آیا کہ کلکتہ کے جو حریص ایجنٹ مقرر کیے گئے تھے وہ کاشت کاروں پر شدید مظالم ڈھا رہے تھے۔"[25] اس نے مثالیں دے دے کر بنگال کی تین بڑی ریاستوں یعنی بردوان، راج شاہی اور دیناج پور میں عوام کے مصائب کی تفصیل دی ہے۔[26]

پٹ کا انڈیا ایکٹ

عام حالات بھی اچھی صورت میں نہ تھے۔ کمپنی سنگین مالی مشکلات میں مبتلا تھی۔ میسور کی شرمناک لڑائیوں اور مرہٹوں کے خلاف فوج کشی نے اس کے وسائل کو نچوڑ لیا تھا۔ جہازرانی کے اخراجات جو عالم گیر جنگ کی وجہ سے اس لیے بڑھ گئے تھے کہ انگلستان بھی اس میں شریک تھا تجارت پر بڑا اثر ڈال رہے تھے۔ ریگولیٹنگ ایکٹ عملاً پارہ پارہ ہوگیا تھا۔ یہ ایکٹ حکومت، کمپنی اور کمپنی کے جو ملازمین ہندوستان میں تھے۔ گورنر جنرل اور کونسل اور تینوں پریسیڈنسیوں کے باہمی تعلقات اور ان سب کے حدِ اختیار کو صفائی کے ساتھ متعین کرنے میں ناکام رہا تھا۔ نظم و نسق بدکرداریوں سے بھرا ہوا تھا۔ وارن ہیسٹنگز نے خود اس طرح بیان کیا کہ" یہ ایک

ایسا انتظام ہے جس میں محکموں پر بہت زیادہ خرچ ہے اور اتنے زیادہ آدمی پرورش پانے والے ہیں اور پھر مربیانہ حمایت کی لعنت الگ سوار ہے۔ ان سب نے مل کر اصلاح کو ناممکن بنا دیا ہے اور اسے ایک ایسی حکومت بنا دیا ہے جو بے انتہا عیش پرستانہ طرز کی متعدد عادتوں سے تنگی ہو کر رہ گئی ہے۔ ایک ایسا ملک جو افراد کے حرص سے کچلا جا رہا تھا اور اپنے مخصوص وسائل سے اس لئے محروم ہو گیا تھا کہ اس کی مخصوص اشیائ کا بہت عظیم حصہ ہر سال پرائیویٹ آدمیوں کی دولت بنانے کے لئے باہر بھیج دیا جاتا تھا۔"[27]

کمپنی کی پریشانیاں صرف ہندوستان تک محدود نہ تھیں۔ گذشتہ بیس سال سے اس کی مخالفت روز بروز زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ وارن ہیسٹنگز نے تشویش اور بداعتمادی کو پیدا کیا تھا جسے امریکہ سے لڑائی میں انگلینڈ کی روز افزوں خراب حالت اور اسپین اور فرانس کے حملے کی مشترکہ تیاری نے اور بڑھا دیا تھا۔ وزرا ہندوستان کی طرف حریصانہ نگاہیں ڈال رہے تھے جہاں کمپنی نے ایسے علاقے حاصل کر لیے تھے جن سے چار ملین پونڈ سالانہ مالگذاری ملتی تھی اس لیے ان کا خیال تھا کہ ہندوستان پر مربیانہ ہاتھ پھیر لے اور وہاں کے سرمائے کو حاصل کرنے سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ آدم اسمتھ اس بات پر بحث کرتے ہوئے کہ انگلستان پر جو قرض ہے وہ کس طرح کم کیا جاسکتا ہے لکھتا ہے "ایسٹ انڈیا کمپنی کے مفتوحہ علاقے اور تاج مسلّمہ حقوق یعنی سلطنت اور اقوامِ برطانیہ کے غیر نزاعی حقوق ایسی دوسری سبیل محاصل کی ہو سکتی ہیں جو ان تمام طریقوں سے زیادہ ہوں جن کا اوپر ذکر ہوا۔ افراط سے آمدنی دینے والی ہے۔ ان ملکوں کے بارے میں بتلایا گیا ہے کہ وہ برطانیہ سے زیادہ زرخیز، زیادہ وسیع اور اپنے رقبہ کے لحاظ سے بہت زیادہ دولت آفریں اور آباد ہیں۔[28]

پارلیمنٹ بے چین تھی اور عوام پبلک اقتصادیات کا مطالبہ کر رہے تھے۔ فلپ فرانسس جو ہیسٹنگز کا زبردست مخالف تھا گورنر جنرل اور کمپنی کے خلاف الزامات کی بوچھار کر رہا تھا۔ سیاسی لوگوں کی پارٹی بازی کے جذبات بہت تیز ہو رہے تھے اور جارج سوئم کی یہ کوشش کہ وہ دوبارہ اپنے شاہانہ منصب کی مراعات کو بحال کر کے شاہانہ اختیار کو واپس لاتے عام غصہ پیدا کر رہی تھی۔ "ہُوِگس" دربار کی

پارٹی کے خلاف تھے۔ "ہُوورگس" کے لیڈر فاکس اور پٹ کی جو دربار کے پٹھوؤں سے حمایت حاصل کرتا تھا ذاتی رقابت کا ردعمل بڑے زور و شور سے ایسٹ انڈیا کمپنی پر ہوا۔ آدم کی طرح کے مفکرین نے سلطنت تعمیر کرنے کی اس مہم سے جو کمپنی چلا رہی تھی بیزاری کا اظہار کیا۔ اس نے لکھا "کوئی دو کردار ایک دوسرے کے اتنے متضاد نہیں ہو سکتے جتنا کہ تاجر اور حکمران ہے۔ اگر انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی اسپرٹ نے جیسا کہ معلوم ہوتا ہے اس کو بہت خراب قسم کا حکمران بنا دیا ہے تو حکمرانی کی صفت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی طرح اُسے بہت خراب قسم کا تاجر بنا دیا ہے۔ جب تک وہ صرف تاجر تھا وہ اپنا تجارتی کاروبار کامیابی سے چلا رہی تھی اور اپنے منافع سے وہ مالکان کمپنی کو ایک معتدل شرح کے مطابق نفع بھی دیتی تھی لیکن جب سے وہ حکمران ہو گئی اور اس کی شروع کی آمدنی کہا جاتا ہے کہ تین ملین پونڈ سے بھی زیادہ ہو گئی تب اس کو حکومت سے غیر معمولی امداد مانگنے پر مجبور ہونا پڑا تاکہ وہ فوراً دیوالیہ ہونے سے بچ سکے۔ اپنی پہلی حالت میں اس کے ہندوستان کے اندر کے ملازمین اپنے آپ کو تاجروں کا کلرک تصور کرتے تھے۔ اب موجودہ پوزیشن میں یہی کلرک اپنے آپ کو ایک حکمران کا وزیر تصور کرتے ہیں۔"[23]

کمپنی کے سامنے اس طرح مالی مشکلات کے آنے سے اس نے حکومت سے امداد کی درخواست کی جس سے نکتہ چینی اور مذمت کا گویا سیلاب پھوٹ نکلا۔ منتخب اور خفیہ کمیٹیاں مقرر کی گئیں جنھوں نے بہت سی پارٹیاں اور بہت سے صفحات پر پھیلی ہوئی رپورٹیں دیں۔ پارلیمنٹ اشتعال سے کانپ رہی تھی۔ پارٹیوں نے اپنا اپنا مسودۂ قانون پیش کیا جن میں اپنے خیال کے مطابق اصلاح تجویز کی تھی۔ آخر کار 1784ء میں 'پٹ' کا انڈیا بل منظور ہوا جس میں وہ اصول طے ہوئے جن پر آئندہ تین چوتھائی صدی تک ہندوستان کے معاملات چلائے جائیں گے۔ پارلیمنٹ نے غیر مبہم الفاظ میں ہندوستان کے علاقوں پر اپنے اقتدار اعلیٰ کا صاف صاف اعلان کر دیا اور اس کے عمل درآمد کے لیے ایک نگراں بورڈ کا تقرر کیا جس میں وزیر خزانہ، سکریٹری آف اسٹیٹ اور چار اور پریوی کونسل کے ممبران تھے۔ جو اختیار نگراں بورڈ (بورڈ آف کنٹرول) کو دیا گیا تھا اس کے استعمال کا حق علاوہ وزیر خزانہ یا سکریٹری

آف اسٹیٹ کے کمشنروں میں جو سب سے سینیر تھا اس کو بھی دیا گیا تھا۔ اس کو نگراں بورڈ کا پریسیڈنٹ بھی نامزد کر دیا گیا تھا۔ بورڈ کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ تمام ان کارروائیوں، انتظامات اور معاملات کی نگرانی کرے جو کسی طرح سے ایسٹ انڈیز میں برطانوی مقبوضات کی شہری یا فوجی حکومت یا محاصل مالگذاری سے تعلق رکھتے ہوں ان کے بارے میں ہدایات دے اور ان کو کنٹرول میں رکھنے کے لئے احکام صادر کرے۔ وزراء میں ایک کو صدر کا منصب دے دیا گیا اور بورڈ کے تمام اختیارات اس کی ذات میں جمع ہو گئے۔ اس طرح کمپنی سے اس کی سیاسی طاقت چھین لی گئی۔ لیکن اس کے پاس سرپرستی کا حق اور تاجرانہ مراعات باقی رہ گئے۔ وہ ایک تحتی ایجنسی ہو گئی جس کے ذریعہ پارلیمنٹ ہندوستان کے معاملات کا انتظام کرتی تھی۔

کارنواس اور کمپنی بہادر

پٹ کے انڈیا ایکٹ نے ریگولیٹنگ ایکٹ کی خامیوں کو دُور کر دیا۔ اس نے گورنر جنرل کے اعزاز اور ان کے اختیارات میں دو طرح سے اضافہ کیا یعنی اب وہ کونسل کے فیصلوں کو رد کر سکتا تھا اور بمبئی اور مدراس کی پریسیڈنٹیوں بھی قطعی طور پر کلکتہ کے تابع کر دی گئی تھیں۔ کارنواس کے ہاتھ اس سے اور بھی مضبوط ہو گئے کہ اس کو گورنر جنرل اور کمانڈر ان چیف دونوں عہدے دے دیے گئے۔

کارنواس کے سامنے کام یہ تھا کہ "ایک ایسی مکمل انتظامی مشنری ایجاد کرے جو امن و امان بھی قائم کرے، عدالتی انصاف بھی دے اور کمپنی کی مالیات کو بھی بحال کرے جو بدعنوانیوں اور غلط حکومتی کارروائیوں سے تباہ ہو چکی تھی تاکہ آخری مقصد پورا ہو یعنی ایک مستقل بچت جس سے کمپنی ہندوستان کی اشیاء اور چین کی چائے میں سالانہ رقم لگا سکے۔"[30] کارنواس نے اپنا کام انگلستان کے مالکانِ اراضی امراء کے طرز پر شروع کیا۔ انگلستان کی ترقی میں مالکانِ اراضی اصل متحرک قوت تھے اور اس نے "پختہ طور پر طے کر لیا تھا کہ یورپ کے امراء کے نظام کا نمونہ ہندوستان میں بھی قائم کرے گا۔"[31] وہ "ہوگ" پارٹی سے تعلق رکھتا تھا اور ہندوستان کی حکومت میں "ہوگ" کے اصولوں کو نافذ کرنا چاہتا تھا یعنی انتظامیہ کے اختیارات کی

حد بندی۔ انتظامیہ اور عدلیہ کا الگ الگ ہونا۔ اقتصادی معاملات میں حکومت کی مداخلت میں کمی اور معاہدوں کی آزادی پر عمل درآمد۔ بدقسمتی سے وہ ہندوستان کے حالات سے ناواقف تھا۔ اور ہندوستان کے آدمیوں اور ان کے معاملات کا اسے کوئی تجربہ نہ تھا۔ ہندوستان کے اداروں اور ان کے طریقوں کو وہ حقیر سمجھتا تھا۔ وہ فاتح کی نسلی برتری کے جذبہ سے بھرا ہوا تھا۔ اور جیسے جیسے انگریزوں اور عورتوں کی تعداد میں ہندوستان کے اندر اضافہ ہوتا اس کے ملک کے لوگوں کا ہندوستانیوں سے رابطہ ختم ہوتا جاتا۔

ان خیالات اور حالات کے دباؤ کے نیچے نظم و نسق کے برطانوی نظام کی شکل مرتب ہوئی اور اس نے نشوونما پایا۔ اس کے اثرات دُہرے تھے۔ ایک طرف تو اس نے پرانے نظام کو منہدم کر دیا۔ دوسری طرف اس نے ایسی طاقتوں کو متحرک کر دیا جن سے نیا ہندوستان نمودار ہوا۔

کارنواس کی گورنر جنرلی کے زمانہ میں فاتح کی حکمرانی کی صحیح شکل میں مرتب اور منظم ہوئی جب اس نے اس عہدے کو چھوڑا۔ اس کے برسوں بعد تک کوئی غیر معمولی تبدیلی نہیں آئی۔ اس نظام کے مخصوص خدوخال تقریباً اسی طرح 1858ء تک برروئے کار رہے اگرچہ بعض اہم معمولی ترمیمیں عمل میں آئیں۔

جہاں تک اقتدار اعلیٰ کا سوال ہے اُسے پٹ کے انڈیا ایکٹ نے کمپنی سے پارلیمنٹ کو منتقل کر دیا تھا۔ پارلیمنٹ نے قوانین وضع کیے اور ہندوستان میں اپنے برطانوی مقبوضات کے شہری اور فوجی معاملات پر اپنے اختیارات برتے۔ پالیسیوں کے لیے آخری ہدایات دینے اور انھیں طے کرنے کا اختیار کمپنی سے لے کر کنٹرول بورڈ کے پریسیڈنٹ (کمشنران) کو دے دیا گیا۔ جن کا عہدہ سکریٹری آف اسٹیٹ کے عہدے میں شامل کر دیا گیا تھا۔ ڈائرکٹروں کے کورٹ اور مالکان محض برائے نام اپنے پرانے مراعات برتتے تھے۔ نگرانی کرنے کا حق ان کے پاس رہ گیا تھا اور انتظام کی تفصیلات سے ان کا تعلق رہ گیا تھا۔ لیکن بورڈ کے دیئے ہوئے احکام میں چون وچرا کرنے سے وہ قانوناً روک دیے گئے تھے۔ اور "جنگ شروع کرنے یا صلح کرنے یا ہندوستانی راجاؤں یا ہندوستانی حکومتوں سے کوئی معاملہ یا گفت وشنید

سے وہ کلیتہً الگ کر دیئے گئے تھے۔" ان معاملات کے متعلق تمام احکام تین ڈائریکٹروں کی ایک خفیہ کمیٹی کے ذریعہ جاری ہوتے۔ نگرانی کا جو حق کمپنی کو دیا گیا اس میں بھی جزیہ یہ کمی کردی گئی تھی کہ تاج کو یہ حق دے دیا گیا تھا کہ وہ کمپنی کے جس ملازم کو چاہے برخاست کردے یا واپس بلا لے۔ کنٹرول بورڈ کو کمپنی کے کل کاغذات دیکھنے کا حق تھا۔ اور تجارتی کاروبار کے علاوہ ہر حکم جاری کرنے کے لئے کمپنی بورڈ کی رضامندی کی محتاج تھی۔

یہ تمام انتظامات جو ہندوستان کی ہوم گورنمنٹ سے متعلق تھے کسی قدر پیچیدہ تھے۔ کیوں کہ بورڈ اور ڈائریکٹروں کے اختیارات ملے جلے تھے اور شروع میں یہ کہنا مشکل تھا کہ کس حد تک بورڈ اپنی ذمہ داریوں پر عمل درآمد کر سکتا ہے مگر بہت جلد تمام اختیارات جو اندرونی انتظامات سے تعلق رکھتے تھے اور وہ معاملات بھی جو بیرونی طاقتوں سے مربوط تھے سکریٹری آف اسٹیٹ کے ہاتھوں میں چلے گئے۔ ڈائریکٹروں کا بورڈ گھٹ کر اس پوزیشن میں رہ گیا جیسے کہ "کسی شہر کے کارپوریشن کے میئر یا آلڈرین" ہوتے ہیں۔ کے۔ ای۔ کے الفاظ میں "ہندوستان کے باشندوں کی خوش حالی کا انحصار 24 شریف انگریزوں کے مباحث پر اتنا منحصر نہیں ہے جتنا کہ ایک فردِ واحد کے توہم پر ہو سکتی ہے کہ کل نکال دیا جائے، جو دو ہفتہ تک انڈیا بورڈ کی صدارت کرے اور ہندوستان پر حکومت کرے اور پھر اچانک پارلیمنٹ کی بے یقینیوں کے تحت معزول کر دیا جائے یا کسی پارٹی لیڈر کی ناتجربہ کارانہ غلط تدبیر یا ایک نالائق سیاسی کو نظر انداز کرنے سے نکال دیا جائے۔"[32]

اس طرح بورڈ کے پریسیڈنٹ نے مغلِ اعظم کی جگہ لے لی۔ اتنا فرق ضرور تھا کہ مغلِ اعظم تو دلّی میں رہتا تھا لیکن جو اس کا جانشین ہوا وہ لندن میں رہتا تھا۔ اپنی رعایا سے چھ ہزار میل طویل طویل فاصلہ پر! اس کے عہدے کی میعاد عام طور پر بہت کم ہوتی تھی۔ اس عہدے کے سنبھالنے والے کی ذمہ داری تھی کہ انگریز قوم کے مفاد کو ترقی دے جو پارلیمنٹ میں اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعہ اس پر گہری نظر رکھتی تھی۔ اور اگر اس کا انتظام قابلِ اطمینان نہ ہوا تو اس کے خلاف سخت کارروائی ہوتی تھی۔

کمپنی کی حکومت کے اصول

جس طرز کی حکومت پٹ کے ایکٹ نے قائم کی وہ ہندوستان کے لیے قطعی ایک نیا تجربہ تھا۔ نیا حکمران گوشت اور خون کا کوئی فرد نہ تھا جیسا کہ اب تک ہندستان کو معلوم تھا بلکہ ایک خیالی شخصیت تھی۔ ہندوستانی جو اس کی حکمرانی کے تلے آئے وہ اس کی ذات کے متعلق موہوم سا موہوم خیال بھی نہ رکھتے تھے۔ اس کے جو ایجنٹ ہندوستان میں رہتے اور جن کا حکم اس کو ماننا ہوتا ان کے عہدوں کی مدت قلیل ہوتی تھی اور وہ برابر بدلتے رہتے تھے۔ اپنی اس دماغی الجھن میں انھوں نے اس کو ایک مختص ذات کا لباس پہنا دیا اور اس کا نام "کمپنی بہادر" رکھ دیا۔

ان لوگوں نے کمپنی بہادر اور ان لوگوں میں جو احکام جاری کرتے تھے فرق کرنا بھی سیکھ لیا۔ اس طرح افراد کی پبلک اور پرائیویٹ حیثیت کے فرق نے ہندوستانی دماغ میں جنم لینا شروع کیا۔

پٹ کے انڈیا ایکٹ سے پارلیمنٹ نے ہندوستان کے کل معاملات پر اپنا مکمل اقتدار حاصل کر لیا لیکن پٹ نے یہ سمجھا کہ اتنے وسیع اور دور دراز ممالک کی حکومت معقول طریقہ پر نہیں چلائی جا سکتی۔ اس لئے اس نے حکومت کے تمام امور ہندوستان کے گورنر جنرل اور کونسل کی زیر نگرانی و ہدایت سکریٹری آف اسٹیٹ سپرد کر دیئے۔ کارنواس نے جو پہلا گورنر جنرل مقرر ہوا تھا اس حکم کے دفعات کی آزادانہ شرح کی اور اپنے اختیارات کو وسیع ترین حد تک کھینچ لایا۔

جہاں تک قانون سازی کا سوال ہے 1773ء کے ریگولیٹنگ ایکٹ نے گورنر جنرل اور کونسل کو یہ اختیار دیا کہ کمپنی کا جو نظام فورٹ ولیم پر بنگال میں اور اس کی ماتحتی میں دوسری جگہوں پر قائم تھا اس کے لیے امن و امان کے قیام اور شہری حکومت کے لیے قانون آرڈیننس اور ضوابط وضع کرے۔ 1784ء کے ایکٹ کے بموجب گورنر جنرل اور کونسل مجاز تھے کہ صوبوں کی عدالتوں اور کونسلوں کے لیے قواعد و ضوابط بنائیں۔

اس کے بعد 1793ء میں "ایک ریگولیشن اس لیے منظور ہوا کہ ان تمام ریگولیشنوں

کو جو بنگال میں برطانوی مقبوضات کی اندرونی حکومت کے لئے منظور کئے جائیں۔ ایک باضابطہ کوڈ (قانون کی کتاب) میں منضبط کیا جائے۔" یہ ریگولیشن ہندوستانی رعایا کے حقوق ان کی ذات اور جائداد پر نافذ تھا اور عدالتوں کو پابند کرتا تھا کہ اس میں جو رول اور ریگولیشن درج ہیں انہیں کے مطابق وہ اپنے فیصلے صادر کریں۔ یہاں جو چیز قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ اس نے یہ لازم قرار دیا تھا کہ تمام قوانین جو ذات اور جائداد سے تعلق رکھتے ہیں وہ چھاپے جائیں اور ہندوستانی زبانوں میں ان کے ترجمے بھی کیے اور چھاپے جائیں اور بطور تمہید وہ وجوہات بھی چھاپے جائیں جن کی بنا پر وہ قوانین بنائے گئے تھے تاکہ افراد اچھی طرح سمجھ سکیں کہ ان کے حقوق اور مراعات اور مخصوص آزادیاں کیا ہیں۔ اس میں ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ ان قوانین میں ترمیم اور تبدیلی بھی جس طرح تجربہ کا تقاضہ ہو ہو سکتی ہے۔

اس طرح ملک میں بادشاہ کے ذاتی قانون کی جگہ جیسا کہ آج تک رواج چلا آرہا تھا ضبطِ تحریر میں لائے ہوئے قوانین اور ریگولیشن کی بنیاد ڈالی گئی۔ حکمران کی مرضی اب ریگولیشن اور ایکٹ سے ظاہر ہوتی تھی جس کی شرح کرنے کا اختیار عدالتوں کو دیا گیا تھا۔ گورنر جنرل کو قوانین وضع کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ اس میں صرف ایک استثنار تھا۔ 1793ء کے ریگولیشن نے یہ قانون بنا دیا تھا کہ "وہ مقدمات جو جانشینی، وراثت، شادی اور ذات سے تعلق رکھتے ہوں اور تمام مذہبی مراسم اور اداروں کے معاملات کے بارے میں جج اپنے فیصلے مسلمانوں کے بارے میں مسلمانوں کے قوانین اور ہندوؤں کے بارے میں ہندوؤں کے قانون کے مطابق کریں۔" بنا رمخاصمت کی ان باتوں کے علاوہ جن کا ذکر ریگولیشن میں تھا ہندو اور مسلم لا کا لازمی عمل درآمد ہو گیا۔ اسی طرح ان بنا ہائے مخاصمت کے بارے میں جو حکم امتناعی جاری ہوتے تھے ان کے فیصلے کے لئے احکام کی شرح کا حق عدالتوں کو حاصل ہو گیا۔ اس طرح ترمیم ذریعہ تشریح، جو قانون کے ارتقا کا ایک مشہور و معروف ذریعہ ہے عوام کے نمائندوں کی بجائے گورنمنٹ کے افسران کو حاصل ہو گیا۔ کیا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان قوانین کی جن کی وقعت ان کے ماننے والوں میں خواہ کتنی ہی ہو آئندہ بنیاد گورنمنٹ کی منظوری پر تھی یعنی 1793ء کا ریگولیشن۔

جہاں تک فوجداری کے مقدمات کا سوال ہے مسلم قانون 1772ء تک نافذ رہا۔ 1773ء کے ریگولیٹنگ ایکٹ سے گورنمنٹ کو اس میں ترمیم کرنے کا حق حاصل ہُوا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے عمل درآمد پر اہم پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ اس کے بعد کے ریگولیشن سے اس کو کلیتہً ختم کر دیا گیا۔

1793ء کا بنگال کا ریگولیشن ایک نمونہ تھا چنانچہ اسی طرح کے قوانین مدراس میں 1802ء اور بمبئی میں 1799ء اور 1827ء میں وضع کیے گئے اور ہندو اور مسلم قوانین کے بارے میں استثنا ان صوبوں میں بھی جاری ہوا۔

قوانین کا اصل ڈھانچہ جس سے ہندوستان کی سوسائٹی پر حکمرانی ہو رہی تھی اب زیادہ تر بیرون ملک کے لوگ بناتے تھے یہ صرف شہری اور فوجداری قوانین تک محدود نہیں رہا بلکہ ہندو اور مسلم فرقوں کے پرسنل قوانین پر بھی حاوی ہو گیا اس نے یہ بھی طے کر دیا کہ جہاں فریقین مختلف مذاہب کے ہوں وہاں ہندو یا مسلم لا کا نفاذ نہیں ہوگا بلکہ فیصلہ حق اور انصاف اور ضمیر صالح سے کیا جائے گا۔ ریگولیشنوں کے ذریعہ اس بات کی اجازت ہوئی کہ مقدس قوانین کو ہٹا کر ان کی جگہ رسم و رواج لے لیں جیسا کہ خوجہ، میمن اور کچھ پنجابی مسلم قبائل کے معاملہ میں ہوا۔

اس طرح پہلی مرتبہ ہندوستان کا ایک حصہ ایک ایسی حکومت کے نیچے زندگی گذارنے لگا جو باضابطہ قانون سازی کا کام کرتی تھی۔ یہ ایک کہربائی قانونی نظام کے تحت آگیا جس میں انسان کی مرضی سے ردوبدل ہوتا تھا برخلاف اس قانون کے جو احکام الٰہیہ سے ماخوذ ہو کر مقدس اور ناقابلِ ترمیم سمجھا جاتا تھا۔ اس قانون کو برتنے والے نہ تو پروہت تھے اور نہ مقدس قانون کے ماہر جاننے والے بلکہ دنیوی عدالتیں تھیں جن کے مسند نشیں مختلف نسلوں کے آدمی تھے اور جن کے عقائد بھی مختلف تھے اور وہ سب بلا لحاظ مذہب بربنائے انصاف اپنا فیصلہ دیتے تھے۔ غیر ذمہ دار دنیوی یا اخروی امتیازات کی عائد کردہ ڈگریوں کو جو اپنے عمل دخل میں فرد فرد، طبقہ طبقہ اور ذات ذات میں فرق کرنے والے قوانین پر مبنی ہوتی تھیں ہٹا کر ان کی جگہ ایک "سول لا" کا تخیل، جو ایک ذمہ دار سیکولر انسانی ایجنسی کا تیار کیا ہوا تھا اور جو کسی طبقے کے ساتھ امتیاز برتے بغیر سب پر یکساں نافذ تھا ایک عظیم انقلاب تھا جس نے خیالات،

چال چلن، افراد اور سوسائٹی سب کو متاثر کیا۔
کسی ملک کے نظم و نسق کا ڈھانچہ اس طرح مرتب کیا جاتا ہے کہ وہ حکمرانوں کے اغراض و مقاصد کو پورا کرے۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے یہ اغراض ایسٹ انڈیا کمپنی بناتی تھی جو اپنے دستور کے دفعات کے مطابق سب سے زیادہ اس امر کی خواہشمند تھی کہ ہندوستان کے مقبوضات سے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرے۔ جہاں تک ان اغراض کا تعلق ہے کمپنی اور اس کے مالکان یعنی گورنمنٹ آف انگلینڈ میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ پارلیمنٹ نے اقتدارِ اعلیٰ کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھتے ہوئے 1863ء تک کمپنی کو اپنی تاجرانہ پالیسی مرتب کرنے اور ہندوستان میں تجارت کی اجارہ داری قائم رکھنے میں قطعی آزاد چھوڑ دیا تھا۔ لیکن یہاں بھی اس کے ماسوا کہ کمپنی کے حصہ داروں کو زیادہ سے زیادہ حصہ ملے، پبلک پالیسی بھی انگلستان کے وسیع تر قومی مفاد کی بنیاد پر طے کی جاتی تھی نہ کہ ہندوستان کے بسنے والوں کے مفاد کے پیشِ نظر۔

بندوبستِ اِستمراری

کارنواس نے جو بندوبستِ اِستمراری رائج کیا اس سے اور زیادہ بنیادی تبدیلی ہندوستان کی سوسائٹی اور ملک کے دیہی اقتصادیات کے خدوخال میں واقع ہوئیں۔ بندوبستِ اِستمراری نے قدیم دیہی طبقہ کو منہدم کر دیا، املاک کے رشتوں کو تبدیل کر دیا، نئے سماجی طبقے پیدا کئے اور ہندوستان کے دیہی علاقوں میں ایک سماجی انقلاب برپا کر دیا۔
وارن ہیسٹنگز کی کارروائیوں نے ہندوستان کو ایک قتل گاہ بنا دیا تھا۔ اس نے اپنے پیچھے معصیت، سرکشی اور قحط کا ایک سیاہ سلسلہ چھوڑا تھا۔ کارنواس کو یہ ہدایت تھی کہ وہ اس گندے اصطبل کو صاف کرے اور ایک ایسا بندوبست کرے جس میں کمپنی کے مفاد، باشندوں کی خوش حالی اور زمین داروں کی پائیداری شامل ہو۔ ہندوستان آتے ہی اس نے حکم دیا کہ رسم و رواج، جوت اور لگان کے بارے میں جانچ کی جائے۔ اس جانچ کے سربراہ جان شور تھے جنہوں نے اپنی رپورٹ

1769ء میں دی۔ زمین پر حقوق کے معاملہ میں جان شور ایک ایسے نتیجہ پر پہنچا جو وارن ہیسٹنگز کی رائے سے مختلف تھا۔ اس نے لکھا "میں زمین داروں کو زمین کا مالک خیال کرتا ہوں۔ جائداد کی وراثت کے بارے میں اُن کے مذہبی قوانین ہیں جن کے بموجب وہ اسے بطور وارث حاصل کرتے ہیں اور اقتدار اعلیٰ رکھنے والی طاقت انصافاً ایسے اختیار نہیں برت سکتی ہے جن سے وہ اس وراثت سے محروم کر دیے جائیں۔ نہ اس وقت تک اس میں وہ کوئی ترمیم ہی کر سکتی ہے جب تک کہ وارث موجود ہے۔ اپنی زمین کو بیع کرنے یا رہن کرنے کا اختیار ان کو اپنے بنیادی حقوق کی بنا پر ملا ہے اور ہمارے دیوانی حاصل کرنے کے پہلے سے زمین دار ان اختیارات کو برتتے چلے آر ہے ہیں"۔[33]

شور جس نتیجہ پر پہنچا وہ اسی طرح غلط فہمی پر مبنی تھا جس طرح وارن ہیسٹنگز کے نتائج غلط فہمی پر مبنی تھے لیکن کارنواس نے جو انگریزی نظام کی موافقت میں متعصبانہ خیال رکھتا تھا اور اپنے پیش رو کے تجربات کی ناکامیوں سے خبردار ہو چکا تھا اس پر اپنی رضامندی کی مہر تصدیق ثبت کر دی۔ 1789ء کے قریب جب بندوبست استمراری پر بحث ہونے لگی تو ایک نئے قسم کے بہ ادائے مالگذاری فارم کرنے والے پیدا ہو گئے جن کا وجود ابھی حال میں ہوا تھا۔ اور جو درحقیقت انگریزوں کے پیدا کردہ تھے جیسا کہ فلاوڈ کیشن نے بتایا ہے۔[34] بنگال میں چار قسم کے زمین دار تھے۔ جن کے ساتھ 1793ء میں مالگذاری کا پائدار بندوبست کیا گیا۔ اول وہ جو شروع سے آزاد والیان ریاست تھے جیسے کہ راجہ ھا جان کوچ بہار، آسام اور تری پورہ جو اپنے علاقوں پر مغل حکمرانوں کو خراج ادا کرکے قبضہ بحال رکھے ہوئے تھے۔ دوسرے پرانے مستحکم زمین داروں کے خاندان تھے جیسے راجگان، راج شاہی، بردوان اور دیناج پور جو آزاد راجاؤں کی طرح ایک مستقل رقم زمین کے ٹیکس کے طور پر حکمران طاقت کو ادا کرتے تھے۔ تیسرے وہ لوگ تھے جو مالگذاری کی تحصیل وصول کرنے والے تھے جو مغل حکومت کے زمانہ میں وجود میں آئے تھے اور کئی پشتوں کے بعد ان کا عہد موروثی ہو گیا تھا۔ اور آخر میں وہ کاشت کار تھے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیوانی عطا ہونے کے بعد مالگذاری کی وصولی اور اسے جمع کرنے کے ذمہ دار بنائے گئے تھے اور جو "زمیندار"

کے عام لفظ سے پکارے جاتے تھے۔اس طبقہ میں نہ صرف کلکتہ کے بنیوں کی ایک کثیر تعداد تھی جنھوں نے ادائیگی مالگذاری کی رقم پر کھلے نیلام میں حصے لے کر زمین داری حاصل کی تھی بلکہ بہت سے کمپنی کے ملازمین بھی تھے جو دیسی بنیوں اور نوکروں کے فرضی نام سے اراضیوں پر قابض تھے۔

فلاوڈ کمیشن نے لکھا ہے کہ "یہ بالکل واضح ہے کہ اگر کوئی بندوبست کسی سے کیا جاتا ہے تو اول کے دو طبقوں کا حق مضبوط ہوگا، تیسرے کا کمتر درجہ کا اور چوتھے کا تو دراصل کوئی حق ہے ہی نہیں۔"

علاوہ ان چھوٹے چھوٹے کاریگروں، ادنیٰ ملازموں اور ذیلی لوگوں کے جن پر کارنواس کے قانون کا بہت کم اثر تھا۔تین پارٹیاں ایسی تھیں جو زمین کی پیداوار کی حصہ دار تھیں یعنی گورنمنٹ، درمیانی لوگ (یا زمین داران) اور کاشت کاران (یا رعیت)۔بندوبست استمراری نے پہلے دو کے حصوں کو متعین کر دیا اور زمین کی پیداوار میں گورنمنٹ کا حصہ مستقلاً مقرر کر دیا۔یہ بات امید کے برخلاف نہ تھی کہ اس نے سب سے زیادہ فائدہ گورنمنٹ کو پہنچایا۔جہاں تک کہ مالیاتی حصہ کا تعلق ہے سرکاری مالگذاری کی شرح اونچی سے اونچی سطح پر طے کی گئی جہاں تک کبھی بھی وہ نہ پہنچی تھی۔حکومت کا حصہ لگان کے تخمینے کا 89 فی صدی رکھا گیا اور صرف گیارہ فی صدی زمین دار کے لئے ان خدمات کے صلے میں باقی رہا جو تحصیل مالگذاری کے سلسلہ میں اس پر عائد ہوتی تھیں۔[35] گورنمنٹ اس طرح آمدنی کے گھٹتے بڑھتے رہنے کی پریشانی سے بچ گئی اور اپنے تجارتی اور انتظامی ضروریات یعنی تجارت میں سرمایہ لگانے، ادائیگی کرنے اور گورنمنٹ کے اخراجات کے لئے ایک طے شدہ اور برابر ملنے والی اور کثیر محاصل کی طرف سے اس کو یقینی طور پر اطمینان ہوگیا۔

اس کے علاوہ اگرچہ ان اراضیات کی مالگذاری تو مقرر ہوگئی تھی جو جوت میں تھے لیکن گورنمنٹ جوت میں اضافہ کر کے اپنی آمدنی بڑھانے کا خیال کر سکتی تھی۔

ان سب کے ماسوا حکومت کو ایک اور مالی فائدہ اس طرح ہوا کہ اس نے مالگذاری وصول کرنے والے پورے محکمہ کو جس میں تحصیلدار قانون گو نے پٹواری و دیگر دوسرے محکمۂ مال کے افسران تھے یک قلم توڑ دیا۔

مالی فوائد سے زیادہ اہم بندوبست کے سیاسی فائدے تھے۔ مغل حکومت کے ماتحت زمین داروں نے بڑی طاقت حاصل کرلی تھی۔ مالگذاری وصول کرنے کے علاوہ وہ مجسٹریٹی اور انتظامیہ کے اختیارات بھی برتتے تھے۔ جہاں تک کہ عمل دخل کا تعلق ہے اور جیسا کہ دیکھنے سے بظاہر نظر بھی آتا ہے یہ لوگ اپنے علاقوں میں اقتدار اعلیٰ کے منصب سے بہرہ ور تھے۔ کارنواس نے ایک سودا کیا۔ ان سے سیاسی اختیارات لے لیے گئے۔ اور ان کے بجائے زمین کی ملکیت کے ان کو ایسے محدود اختیارات بخش دیئے گئے جو اس سے پہلے ماضی میں کبھی بھی حاصل نہ تھے اور یہ بھی ان کو حق دے دیا گیا کہ اپنی مرضی سے لگان میں جتنا چاہیں اضافہ کرلیں۔ ان کے سیاسی اختیارات اور فساد پیدا کرنے کی طاقت چھین لی گئی لیکن کاشتکاروں پر ان کی مالی طاقت بہت زیادہ بڑھ گئی۔ اس کے بعد یہ دو پارٹیاں جنھوں نے باہمی سودا کیا تھا جو طے ہوا تھا اسی پر قائم ہوگئیں۔ پرامن تعاون کا ایک دور شروع ہوا۔ ایک سیاسی اختیار برتتا تھا اور دوسرا اقتصادی طاقت اور دونوں زمین جوتنے والے کاشت کاروں کا استحصال کرتے اور ان پر ظلم کرتے تھے لیکن شان کار کہتا ہے کہ "اگر خالص سیاسی نقطۂ نظر سے اس پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ خوف و ہراس پر قابو پانے اور شکوک مٹانے والا معلوم ہوگا جب کہ یہ اچھے چال چلن کے لیے ایک مضبوط، ترغیب دینے والا اور بغاوت اور اکھاڑ پچھاڑ کے زمانہ میں محض خاموش وفاداری سے کچھ آگے لے جانے والا ثابت ہوا۔"[36]

رعیت جو اپنے خون پسینے سے دولت پیدا کرتی تھی زمین داروں کا خرچ چلاتی اور گورنمنٹ کے خزانے بھرتی۔ خود اس کو اس کے بندوبست نے بری طرح نظر انداز کر دیا تھا۔

ڈائرکٹروں کے بورڈ نے یہ تسلیم کیا کہ "بنگال کی رعیت کے حقوق خاموشی سے ختم ہوگئے اور یہ درحقیقت ایسے کاشت کار ہوگئے جن کا وجود زمین دار کی مرضی پر منحصر تھا۔"[37] "کے۔ ای۔" کے قول کے مطابق "اس بات کی کوئی تشریح نہیں کی گئی تھی کہ زمین دار اپنے ماتحت کاشت کار پر کتنا مطالبہ لاد سکتا ہے اور زمیندار باستثناء چند رعیت سے بہ جبر اتنا وصول کرتا تھا جتنا اس سے لیا جا سکے اور

اس میں کوئی شک نہیں کہ اصل جوتنے والے کاشت کاروں کے پاس ان تمام جبری وصولیوں کے بعد بس اس سے برائے نام ہی زیادہ بچتا تھا جس سے وہ اپنی روح اور جسم کو یکجا رکھ سکیں۔" وہ مزید کہتا ہے" دراصل یہ قطعی طور پر طے کر دیا گیا تھا کہ رعیت کے کچھ حقوق نہیں ہیں اور اسے چھوڑ دیا گیا کہ وہ اپنے حقوق کے لئے زمین دار سے لڑ جھگڑ لے۔"38

اگر اس میں کوئی استثنا تھا تو بس ماتحت اداروں اور تعلقداروں کا جو زمین داروں کی طرف سے زمین پر قابض تھے اور آباد (خود کاشت) کاشت کاروں کا جو کسی حد تک مالکان کی جانب سے اضافۂ لگان سے محفوظ تھے لیکن بقیہ سب اور بلکہ وہ آباد کاشت کار بھی جو 1793ء کے بعد حق دخل کاری حاصل کر سکتے تھے ان سب کو زمین داروں کے ملاتم رحم کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ ان کو بے دخل کرنے میں کوئی چیز مانع نہ تھی۔ کیوں کہ شور نے پہلے ہی اعلان کر دیا تھا کہ" لگان کی تقرری کے اصول وضوابط دراصل زمین دار اور مالکانِ اراضی اور ان کے کاشت کاران کے مابین کا معاملہ ہے جس سے گورنمنٹ کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔"39

جوت میں اضافہ ہونے، آبادی بڑھنے اور اس کے علاوہ صنعت کے زوال پذیر ہونے کے نتیجے میں مزدور آبادی کے تجارت اور صنعت سے زراعت کی جانب منتقل ہو جانے سے زمین کی مانگ بڑھی، زمین کی قیمت میں اضافہ ہوا اور کمر توڑ نے والا لگان عائد کرنے کے واقعات میں زیادتی ہوئی۔

مالگذاری کی جو حد سے زیادہ شرح لگادی گئی تھی اس کا اتنا سخت دباؤ پڑا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ 1793ء سے 1815ء (بائیس سال) کے اندر بنگال کی تقریباً نصف اراضی کی ملکیت فروخت پر رکھ دی گئی اور ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں چلی گئی۔ خریدار پر یہ لازم نہیں تھا کہ وہ کاشت کار سے وہی لگان لے جو پرانا زمین دار لیتا تھا۔ نئے زمین دار اس سے زیادہ لگان مانگتے اور لیتے تھے۔ ان کی تقلید پرانے زمین داروں نے بھی کی جیسا کہ ڈاکٹر فیلڈ کا ارشاد ہے کہ "مروجہ لگان میں اس طرح اضافہ ہو جانے سے اس میں کوئی دقت نہیں تھی کہ دوسرے کاشت کاروں کا لگان بھی بڑھا کر اسی سطح پر لے آیا جائے۔"40

یہ صحیح ہے کہ زمین دار کے لئے کاشت کار سے معاہدہ کرنا یعنی پٹہ دینا لازم تھا جس میں لگان کی ٹھیک مقدار مع رواج کے مطابق محاصل (منظور شدہ ابواب) مقبوضہ جوت کا رقبہ اور شرح لگان یہ سب درج ہوتا تھا اور مندرج لگان اور محاصل سے فاضل وصول کرنا اور شرائط مندرجہ سے گریز کرنا منع تھا اور قاصر رہنے پر جرمانہ کی سزا مقرر تھی لیکن جو دادرسی خلاف ورزی معاہدہ کے سلسلہ میں دی گئی تھی اس کے لئے عدالت میں دعویٰ داخل کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ ایک ایسا راستہ تھا جو طول بھی کھینچتا تھا اور گراں بھی تھا اور کاشت کار کی وسعت کے باہر بھی۔ نتیجہ میں پچاس سال کی ناقابل بیان پریشانی اور مصیبت سے نجات دلانے کے لئے کوئی راحت دینے والی تدبیر عمل میں نہیں آئی۔ بیڈن پاول نے مجبور ہو کر تسلیم کیا ہے کہ "جہاں یہ مشکل ہے کہ قانون سازی کی ان کارروائیوں کی کوئی مدافعت کی جا سکے جو 1800ء سے 1812ء تا 1845ء کا زمانہ ہے۔ جو غلطیاں اس وقت کی گئیں وہ مہلک تھیں۔"[41] 1799ء کے قانون کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ "اس کے شیطانی دفعات بغیر غصہ میں آئے پڑھنا مشکل ہے۔"[42] 1859ء میں جا کر کچھ سہولت کے اسباب وضع کئے گئے۔

حکومت سے ہندوستانیوں کا الگ رکھنا

نئے انتظام میں ہندوستانیوں کو اثر اور اختیار والے تمام عہدوں سے الگ رکھا گیا۔ اقتدار اعلیٰ کی طاقت تو برطانوی پارلیمنٹ کو حاصل تھی جو وطن میں جہاں تک سیاسی معاملات کا تعلق ہے بورڈ آف کنٹرول کے ذریعہ اور تجارت کے معاملہ میں کمپنی کے ڈائریکٹروں کے ذریعے سے کام کرتی تھی۔ ہندوستان کی سب سے اونچی حکومت برطانوی نظام کی ایک ماتحت شاخ تھی جسے قانون سازی، سیاسی اور انتظامی امور میں تفویض شدہ اختیارات حاصل تھے۔ یہ تینوں یعنی پارلیمنٹ، ہوم گورنمنٹ جس میں بورڈ آف کنٹرول اور ڈائرکٹریٹ شامل تھے اور انڈیا گورنمنٹ جس کے اجزاء ترکیبی، گورنر جنرل اور ان کی کونسل تھے، کُل کے کُل برطانوی تھے اور باشندگان ہند کے سامنے قطعی غیر جواب دہ تھے۔

ملازمتوں کی تشکیل میں کارنواس نے یہ فیصلہ کیا کہ تمام اونچے درجے کی تقرریوں سے ہندوستانیوں کو الگ رکھا جائے۔ اس انتہاپسندانہ امتیاز برتنے کے متعدد وجوہ تھے جو ہندوستان کی تاریخ میں ایک انوکھی نوعیت کے تھے۔ انگریزوں نے ایک مبالغہ آمیز اندازہ " نہ صرف ہندوستان میں اپنے سیاسی تدابیر کے بارے میں بلکہ اپنے ملک کے اداروں کے بارے میں بھی بالعموم قائم کر لیا تھا۔ ایک بھدے قسم کی کمزوری کے ماتحت کہ اپنی ذات ضرور بہترین ہے اور جو کچھ اپنی ذات کے غرور کو متاثر کرتی ہے وہ ضرور اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی بہترین ہوگی۔ انگریزوں کے اداروں اور انگریزوں کے طریقوں کو عام طور پر معیار قرار دیا گیا۔ جس سے مطابق یا غیر مطابق ہونے پر دنیا کی ہر چیز کے عمدہ یا ناقص ہونے کا فیصلہ ہونا چاہئے "[43] اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نظم و نسق کا وہ نظام جو برطانوی تصورات کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا اس کے عہدیداران بھی برطانوی افراد ہی ہونے چاہئیں۔

اس کے علاوہ برطانوی حکمران ہندوستانیوں کی اہلیت، ایمان داری اور چال چلن کے بارے میں بہت حقیر خیالات رکھتے تھے۔ " مل " کی رائے میں " ہندوستان میں کوئی مبنی بر اخلاق کردار نہیں ہے۔ ہمدردی اور عداوت کی تقسیم از روئے مذہب ہوتی ہے نہ کہ بر بنائے اخلاق فیصلہ کرنے پر "[44] چارلس گرانٹ نے جو کلیپ ہام فرقہ کا ایک ممبر اور ولیبر فورس کا ساتھی تھا اور کلکتہ میں تجارتی بورڈ کا ممبر رہ چکا تھا اور ڈائرکٹروں کے بورڈ کا چیرمین اور پارلیمنٹ کا ممبر بھی رہا تھا، ہندوستان کے لوگوں پر الزام لگایا کہ " انسانوں کی ایک ایسی نسل کے لوگ جو افسوسناک حد تک کم ظرف اور گھٹیا ہیں۔ ان کے اندر اخلاقی پابندیوں کا بہت ہی معمولی احساس ہے حتیٰ کہ وہ جس کو وہ خود حق سمجھتے ہیں نظر انداز کرتے ہیں۔ انتہائی ضدی واقع ہوتے ہیں۔ ان پر کینہ توز اور عیاشانہ جذبات کی حکمرانی ہے۔ وہ ایک بڑی مثال سوسائٹی پر ان اثرات کی فراہم کرتے ہیں جو کردار کی بڑی اور عام خرابیوں کے باعث پیدا ہوتے ہیں اور اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے مصیبت میں ڈوبے رہتے ہیں "[45] کارنواس کہتا ہے کہ " ہندوستان کا ہر اصلی باشندہ (میں واقعی یقین کرتا ہوں) بدکردار ہے "[46] ڈھاکہ کے مسٹر پیٹرسن ایک گشتی سوالات کے جواب میں فرماتے ہیں کہ " ان کے دماغ

بالکل غیر تربیت یافتہ ہیں۔ اخلاق کے فرائض کیا ہیں ان کا انھیں کوئی خیال تک نہیں ہے۔ ان کے اندر اس ذلیل عیاری کا بہت بڑا حصہ موجود ہے جو قلب کی سیہ کاری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ کاہل اور انتہائی عیاش ہیں۔ یہ ظالم، بزدل، گستاخ اور ذلیل ہیں۔ ان کے اندر مذہب کا کوئی احساس نہیں ہے۔ صرف توہمات ہیں۔ مختصر یہ کہ ان کے اندر وحشیانہ زندگی کی تمام خرابیاں بلا کسی خوبی کے موجود ہیں۔"[47]

انگلستان کے مذہبی مصلحین متھوڈسٹ اور ایونجلسٹ نے بھی سیاہ ترین رنگ میں ہندوستانیوں کی تصویر کھینچی ہے۔ ولبر فورس کے قول کے مطابق "ہندو ایسے دیوتاؤں کی پوجا کرنے والے ہیں جو شہوت، ناانصافی، بدمعاشی اور ظلم کے مکمل دیو ہیں۔ مختصر یہ کہ ان کا مذہبی نظام بہت ہی نفرت انگیز ہے۔"[48]

پھر برطانوی حکومت کو برابر قائم رکھنے کے لئے اس کی بھی ضرورت محسوس ہوئی کہ ہندوستانیوں کو مکمل بے کسی کی حالت میں اتار دیا جائے اور ان کے دماغ سے حوصلے کے تمام جراثیم ختم کر دیئے جائیں۔ شور کہتا ہے "انگریزوں کا بنیادی اصول یہ رہا ہے کہ کل ہندوستانی قوم کو ہر ممکن طریقے سے ہمارے مفاد اور نفع کے تابع بنا دیا جائے۔ ہندوستانیوں کو ہر عزت، منصب اور ہر ایسے عہدے سے محروم کر دیا گیا جو کمتر سے کمتر درجہ کے انگریز کو بھی قبول کرنے پر راضی کرنا مشکل تھا۔"[49]

ضرورت کا بھی تقاضہ تھا کہ ہندوستانیوں کو افسری کے ہر منصب سے جدا رکھا جائے۔ کارنواس اس فکر میں مبتلا تھا کہ کمپنی کے یورپین فوجی افسران کی شکایات کو دور کرے جن پر شاہی فوج متعینہ ہندوستان کے افسران متکبرانہ نفرت کی نگاہ ڈالتے تھے لیکن کمپنی کی فوج میں ایسے ہندوستانی افسر بھی تھے جو عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بہت سی پرانی سے پرانی رجمنٹس ایسی تھیں جن کا نام ہندوستانی کمانڈروں کے نام پر تھا۔ ہندوستانی افسران مثل یوسف خاں نے کمپنی کی ملازمت میں امتیاز حاصل کیا تھا۔ یوسف خاں دو سے تین ہزار سپاہیوں تک کا کمانڈر تھا۔ جن میں یورپین سپاہی بھی تھے۔ وہ شروع کی کرناٹک کی لڑائیوں میں لڑا تھا۔ "اس نے قلعہ بندی کی سربراہی کی، قلعوں کی محافظت کی اور نازک اوقات میں رسد اور کمک دشمن کے ملک سے لے گیا۔" بیورج کے قول کے مطابق "ترچناپلی کو بچا نا اور فرانسیسیوں

سے سری رنگم کے جزیرے میں ہتھیار رکھوالیتا یوسف خاں کے حسن تدبیر کا نتیجہ تھا۔ مالکوم کہتا ہے کہ "اس ہیرو کا نام کیوں کہ درحقیقت وہ ہیرو تھا، انگریز مورخ (رابرٹ آرم) کے اوراق میں اتنی ہی بار آتا ہے جتنی بار کہ لارنس اور کلایو کا نام آتا ہے"[45] سر ہنری لارنس اس کا ذکر ایسے مہتم بالشان الفاظ میں کرتا ہے جیسے کہ "وفادار، بہادر، جدت پسند"۔ ایک انگریز مورخ کے قول کے مطابق "محمد یوسف جمال صاحب اور دوسروں کے نام سے تاریخ کے اوراق بھرے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ان سے کم قابلِ یادگار نہیں ہیں جتنی کہ ان ہیوں کی کامیابیوں کے تذکرے جو ہمارے کا لینڈ اور کوٹ نے حاصل کیں۔"[46]

سردار علی خاں، حسین علی، بھوانی سنگھ اور دوسروں نے اپنے پیشے میں چمک دمک پیدا کی۔ ایسے ہندوستانی افسران کو شاہی رجمنٹ کے افسران کے برابر جگہ دینی ہوگی بشرطیکہ کمپنی کے کمانڈروں کو شاہی رجمنٹ کے افسران کی حیثیت کے برابر جگہ دی جا سکے۔ لیکن ہندوستانی سپاہیوں پر جو ہندوستانی افسر مقرر تھے ان پر اعتماد کرنا ناممکن تھا۔ ہندوستانی اور انگریز افسران کا فوج میں برابری کی جگہ دینا ایک ایسی حکومت کے لئے خطرناک تھا جو فوجی طاقت کی بنا پر قائم تھی۔ کمپنی کے ڈائریکٹران نے اپنے ایک خط مورخہ 5 اردسمبر 1808ء میں اس کو بالکل واضح کر دیا۔ "ہمارے پاس ایک لاکھ پچاس ہزار کی فوج ہے جس کے اخراجات ہم برداشت کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اس کی بدولت جہاں تک کمپنی کا تعلق ہے پورے ہندوستان میں امن وامان قائم رہتا ہے۔" کارنواس نے اپنے اس خط میں جو کمپنی کو لکھا اس پر کافی زور دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے "اس سے سب کچھ سمجھ لینا چاہئے کہ بغیر ایک بڑی اور تربیت یافتہ یورپین فوج کے ہمارا قبضہ ان بیش بہا ممالک پر بہت کمزور رہے گا۔ اس سے کبھی امید نہ کرنی چاہئے کہ ہم خواہ کتنا بھی عمدہ برتاؤ کریں وہ مسلسل اور رضا ورغبت سے اطاعت پر انسانوں کی اتنی بڑی تعداد کو مائل رکھے گا جو ہم سے قانون مذہب اور رسم ورواج ہر چیز میں مختلف ہیں۔ افراد پر زیادتی، فیصلے کی غلطی اور دوسرے اور کئی ایسے اسباب جو آج پیش نظر نہیں ہیں ضرور ایسے ہوں گے جو ان کو بغاوت کے لئے اکسا سکتے ہیں۔ ایسے حالات میں یہ عقل مندی کی بات نہ ہوگی کہ دیسی سپاہیوں کے افسروں پر یہ بھروسہ کیا جائے

کہ وہ اپنے ماتحتوں کو مطیع رکھیں گے۔"[52]

جہاں تک غیر فوجی ملازمتوں میں بھرتی کا سوال ہے کچھ اس طرح کے وجوہ کی بنا پر ہندوستانی رد کر دیے گئے۔ بنگالیوں کے بارے میں گرانٹ کہتا ہے کہ "ان صفات میں جو سوسائٹی کی محافظت اور راحت کے لئے ضروری ہیں یہ لوگ تعجب خیز حد تک ان سے بے بہرہ ہیں......... سچائی، ایمان داری اور نیک نیتی سے حد درجہ تک یہ لوگ خالی ہیں۔ سچائی کے فقدان کی تو ایسی عادت ہو گئی ہے کہ اگر کسی شخص کو سچ کی مدافعت کرنی ہو تو اس کے لئے بھی وہ جھوٹ کا سہارا لے گا اور پھر جس طرح خوب سوچ سمجھ کر جس نفرت، جھوٹ، الزام تراشی اور کھلم کھلا عداوت سے یہ لوگ ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہیں اور کبھی کبھی باپ سے بیٹے تک یہ سلسلہ چلا آتا ہے وہ انسانی کردار کا ایک گھناؤنا منظر پیش کرتا ہے۔"[53]

لیکن یہ دلیل کہ ہندوستانی اس وجہ سے اعلیٰ عہدوں پر تقرری کے قابل نہیں کہ ان کے چال چلن میں خرابیاں ہیں حد درجہ بدنیتی پر مبنی ہے کیوں کہ انگریز جو ہندوستان میں آتے تھے وہ اچھائیوں کے پتلے نہ تھے۔ درحقیقت کپلنگ نے جو کہا ہے اس کو پورے طور پر ثابت کرتے تھے یعنی یہ کہ "سوئز کے یورپ میں اس احکام خداوندی کا کوئی وجود نہیں ہے۔" انگریز ٹامس اور گرانٹ لکھتے ہیں کہ "اس عہد کے بھاری مقدار میں موجود لٹریچر سے یہ ممکن ہے کہ ہندوستان میں یورپی لوگوں کی شروع انیسویں صدی میں زندگی کا نقشہ پھر سے تیار کیا جائے۔ بہت سے ایسے تھے جو ایسی کاہلی، لہو ولعب اور عیاشی کی عادتوں میں آسانی سے پڑ گئے جو اس جزیرہ نما کے اثر سے حملہ آوروں پر پہلے غالب آ چکی تھیں۔ بروئے اقرار نامہ جو ملازمین آئے وہ سولہ سترہ سال کے لڑکے تھے اور ولزلی کے زمانہ تک ان کی ٹریننگ کا کوئی انتظام نہ ان کے وطن میں اور نہ ہندوستان میں کیا گیا تھا۔ کبھی کبھی یہ بحث کی جاتی ہے کہ وہ لوگ اپنے جانشینوں سے زیادہ بہتر طور پر ملک کو سمجھتے تھے۔ ایک ذریعہ ان کی معلومات کا تو یہ تھا کہ وہ ہندوستانی عورتوں کو بطور داشتہ رکھتے تھے لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا اس سے ہندوستانی نسل کی کوئی بڑی عزت افزائی ہوتی تھی یا اس سے یہاں کے رسم ورواج میں کچھ زیادہ دلچسپی لی جاتی تھی۔"[54] ولیمسن کے قول کے مطابق "یہ بدچلن عورتیں

اپنی خدمات کے لئے چالیس روپیہ مہینہ پاتی تھیں"۔[55]

ٹریویلین اس زمانہ کی یورپین سوسائٹی کی شاندار کاہلی اور پست درجہ کی عیاشی کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس نے جو بیان دیا ہے وہ اس قابل ہے کہ اسے یہاں دُہرایا جائے۔ وہ کہتا ہے "فضول خرچیوں کے نتائج سے بدحواس انگریز صاحبان ہندو عورتوں اور آنولہ رنگ کے بچوں سے رُکاوٹ میں پڑے ہوئے ایسے تھے کہ نہ تو ان میں خود خواہش تھی اور نہ اس کی طاقت ہی تھی کہ ہندوستان چھوڑ کر چلے جائیں۔ بُھسہ آدمی حکومت کی گاڑیوں پر سوار ہو کر شاہانہ انداز سے چلتے تھے اور کوئی ایک درجن ملازمین ان کے آگے اور پیچھے زور زور سے ان کے منصب کا شور کرتے ہوئے چلتے تھے۔ چھوٹے لوگ یا تو پالکی پر چلتے تھے یا گاڑیوں پر جس کا کرایہ ادا کرنے کا کوئی ارادہ نہ رکھتے تھے۔ ان گاڑیوں میں گھوڑے جوتے جاتے تھے جن کو یہ لوگ دولت مند بابوؤں کے اصطبل سے یا تو خوشامد کر کے یا دھمکی دے کر لے آتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک وقت ایسا آیا کہ جب قریب قریب سو غیر فوجی افسران جن کی ملازمت میں 35 سال سے زائد ہو چکے تھے اپنے مہاجنوں کے ہاں قرضوں کی علت میں گِرو تھے۔ یہ لوگ نوجوانوں کے اصول کو زہر آلود بناتے اور اپنے سے بہتر لوگوں کو اعلیٰ اور ذمہ داری کے عہدوں پر فائز ہونے کی راہ میں روڑا بنے ہوئے تھے"۔[56]

کے۔ ای۔ کے قول کے مطابق کارنواس نے ہندوستانیوں کو ملازمت میں لینے سے اس لئے انکار نہیں کیا تھا کہ وہ ان پر بھروسہ نہیں کرتا تھا بلکہ اس لئے کہ وہ یورپین عہدہ داروں پر زیادہ بھروسہ کرتا تھا"[57]

جو عام بدچلنی یورپین افسروں میں پھیلی ہوئی تھی اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ برطانوی ریزیڈنٹ مقیم بنارس ایک ہزار روپیہ ماہوار کی مقررہ تنخواہ پاتا تھا لیکن تجارت میں اجارہ داری اور دیگر ذرائع سے اس کی آمدنی چار لاکھ روپئے سالانہ تھی۔ مالگذاری عمال جو بارہ سو روپیہ ماہوار ملتا تھا لیکن وہ عام طور پر بالائی آمدنی سے ایک لاکھ روپیہ ماہانہ اور بنا لیتے تھے۔

یہ بالکل ظاہر ہے کہ ہندوستانیوں کو ملازمتوں سے الگ رکھنے کی اصل وجہ

نفع بخش ملازمتوں کے لئے انگریزوں کے مطالبات پورا کرنا، مفتوحین کو ان کی اصلی حیثیت جتانا، سابق حکمراں طبقہ کو ذلیل کرنا، ان کو ماتحتی اور ناداری کی زندگی کا عادی بنانا اور ان کے دماغوں سے آزادی اور غیرت کے رتی ریزے کو نکال دینا تھا۔ انگریز عہدہ داروں کی زندگی کو آرام دہ اور صحت مند بنانے کے حالات پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ ان کو بڑی بڑی تنخواہیں اس لئے دی جاتی تھیں کہ وہ کسی حریص کے شکار نہ ہو جائیں۔ تجارت میں حصہ لینے یا تحائف وصول کرنے یا رشوت لینے سے روکنے کے جو احکام دیئے جائیں ان پر عمل کرنے کے سلسلے میں ان کی ہمت افزائی کی جائے۔ ان کے سپرد جو کام تھا وہ عدلیہ کو وصولی مالگذاری نظام سے الگ کر کے اور پولیس کو عدالتوں کے ماتحت کر کے واضح کر دیا گیا تھا۔ مختصر یہ کہ ان کو خوش حالی، اختیار اور ذمہ داری دی گئی یعنی ایسے اتالیق جو بہترین طریقہ پر اپنے اندر خود داری کے جذبہ کو پیدا کر سکیں۔ ان میں یہ حس پیدا ہو کہ وہ ایک مشن کا کام کر رہے ہیں اور ان کے اندر اس بات کی خواہش پیدا ہو کہ وہ اپنے کو اس عہدے کے لائق بنائیں۔

عدلیہ

عدلیہ کے محکمہ میں ہندوستانی منصف اور صدرامین کے عہدے سے اوپر نہ اٹھ سکے۔ اسی طرح پولیس میں داروغہ تک اور انتظامیہ کی شاخ میں ڈپٹی کلکٹر تک رہ گئے۔ اس زمانہ میں جس کو بروئے معاہدہ ملازمتیں کہتے تھے ان کا دروازہ ان کے لئے قطعاً بند تھا۔

چوں کہ ان تمام محکموں کا انتظام انگریز افسران کی ماتحتی میں ہوتا تھا اس لئے ہندوستانیوں کو ذمہ داری کے کام کے تمام مواقع سے محروم کر دیا گیا۔ انھوں نے نہ صرف بحیثیت انسان ان کا رتبہ گھٹا دیا بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ ہوا کہ ہندوستان کا قدیم سماجی اور سیاسی نظام درہم برہم ہو گیا۔ کارنواس کی اسکیم نے دیوانی اور فوجداری کے مقدمات کے فیصلوں کو ان کے ہاتھوں سے چھین لیا جو زمانہ قدیم سے ان کے سپرد چلے آرہے تھے یعنی گاؤں کی پنچایت، زمیندار، فوجدار، صوبہ دار، قاضی و مفت

وغیرہ اور انھیں ایک ایسی نئی تنظیم کے سپرد کر دیا جس کی کوئی جڑ گاؤں میں نہ تھی۔

عدالتی انصاف کے نظام کے بارے میں پہلی چیز قابلِ توجہ یہ ہے کہ برطانوی نظام نے جو ہندوستان میں جاری ہوا نسلی امتیاز پیدا کیا۔ اس نے ہندوستان کے باشندوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ (1) برٹش یورپین رعایا اور ان کے جائز جانشین اور (2) ہندو، مسلمان، ایشیائی، ارمنی، عیسائی وغیرہ۔ ان دونوں گروہوں کے لئے دیوانی اور فوجداری دونوں کے معاملات کے لئے بالکل الگ الگ عدالتیں تھیں۔ پہلے گروہ کے لئے وہ عدالتیں تھیں جو اسٹیٹیوٹ (قوانین) اور تاج برطانیہ کے عطا کردہ چارٹر سے قائم کی گئی تھیں، بادشاہ یا ملکہ کی عدالتیں کہلاتی تھیں ان کے علاوہ جسٹس آف دی پیس (جہان امن وامان)، مجسٹریٹ اور کارونر (ایسے عہدیدار جو غیر طبعی موت کی تحقیقات کریں) تھے۔

دوسرے گروہ کے لئے وہ عدالتیں تھیں جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے اختیار کے ماتحت قائم ہوئی تھیں اور جن کی صدارت ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقرر کردہ جج کرتے تھے۔ یہ جج دو حصوں میں منقسم تھے از روئے معاہدہ اور بلا معاہدہ۔

یہاں یہ ضروری نہیں ہے کہ پہلی قسم کی عدالتوں کی تفصیل دی جائے جن میں کلکتہ، مدراس اور بمبئی کی سپریم کورٹ سب سے زیادہ اہم تھیں۔ کلکتہ کے سپریم کورٹ کے قیام نے جو ریگولیٹنگ ایکٹ سے جو عالم وجود میں آئی تھی پہلے بڑی دماغی پریشانی پیدا کی لیکن یہ ابہام 1781ء و 1786ء اور 1793ء کے قوانین سے دور ہو گیا، جنھوں نے دائرۂ سماعت کو متعین کر دیا۔ تمام سپریم کورٹ انگلستان کے مبنی بر رسم ورواج عام قانون اور باضابطہ قانون کے دفعات سے ان ریگولیشنوں سے جو ہندوستان کے گورنر جنرل نے بنائے اور سپریم کورٹ میں رجسٹرڈ ہو گئے تھے اور ہندو اور مسلم لا سے جہاں مدعا علیہ ہندو یا مسلمان ہوں فیصلے کرتے تھے۔

1793 — 1802 اور 1827 کے ریگولیشنوں سے تینوں پریسیڈنسیوں میں کمپنی کی عدالتیں قائم تھیں۔ 1772ء سے کئی تجربے کیے گئے تھے تاکہ ایک قابلِ اطمینان نظام قائم کیا جائے۔ لیکن 1793ء ہی میں جاکر اسے استقلال نصیب ہوا اور عدلیہ کے موٹے موٹے اصول مرتب کیے جا سکے۔ کارنواس کے ریگولیشن

کے ضابطے مابعد کے تمام نشو ونما کی بنیاد رہے۔

اس ضابطہ کا عام تخیل یہ تھا (1) تمام زمین داروں اور دیگر روایتی ایجنٹوں سے پولیس اور عدلیہ کے کاموں میں حصہ لینے کے اختیارات چھین لئے جائیں۔ (2) مبنی برمعاہدہ ملازمتوں میں تمام اعلیٰ عہدے کی ملازمتیں شامل کر دی جائیں۔ انھیں کو ہدایت اور نگرانی کا حق ہو اور ان کے عہدیداران کلیتہً انگریز ہوں۔ (3) مالگذاری کی تحصیل وصول کو عدلیہ کے نظام سے بالکل الگ کر دیا جائے اور مال کی عدالتوں کو توڑ دیا جائے۔

دیوانی عدالتوں کا جو نظام تھا اس میں باضابطہ درجے تھے۔ سب سے نیچے درجے میں دیسی کمشنروں کی عدالتیں تھیں جو ان ابتدائی مقدمات کی شنوائی کرتیں اور فیصلے کرتی تھیں جن میں بنابر مخاصمت پچاس روپئے سے زائد نہ ہو۔ یہ عدالتیں تین قسم کی تھیں یعنی امین، ثالثان اور منصف۔ ان کے فیصلوں کی اپیل ضلع یا شہر کی عدالتوں میں ہو سکتی تھی۔ دیسی کمشنروں کے اوپر رجسٹرار کی عدالتیں تھیں جو بربنا معاہدہ ملازمین میں تھے اور ضلع یا شہر سے متعلق تھے۔ ان کو دوسو روپیہ تک کے مقدمات کی کارروائی کرنے کا اختیار تھا۔ اسی ترتیب سے ان کے اوپر ضلع یا شہر کی عدالتیں تھیں۔ ہرایک کا صدر ایک ایسا شخص ہوتا تھا جو بربنا معاہدہ ملازمت کارکن ہوتا تھا۔ جس کی مدد کے لئے ہندو اور مسلم فضلاء اور رجسٹرار رہتے تھے۔ ان کو دیوانی کے تمام مقدمات کی سماعت کا اختیار تھا اور ان کے فیصلوں کے خلاف صوبہ کی عدالتوں میں اپیل ہو سکتی تھی۔ بنگال میں ضلع عدالتوں کی تعداد 36 تھی۔

صوبے کی اپیل کی عدالتیں چار مرکزوں پر قائم تھیں، کلکتہ، ڈھاکہ، مرشد آباد اور پٹنہ۔ ان میں سے ہر ایک میں تین انگریز جج، ایک رجسٹرار، ایک قاضی، ایک مفتی اور ایک پنڈت ہو تے تھے۔ اگر مالیت دعویٰ ایک ہزار سے زائد نہ ہو ان کے فیصلے آخری اور قطعی ہوتے تھے۔ اس سے اونچی رقم ہونے پر صدر دیوانی عدالت کو اپیل ہو سکتی تھی۔ صدر دیوانی عدالت ریگولیشن کے ماتحت قائم نظامِ عدالت کی سب سے اونچی چوٹی تھی جو گورنر جنرل (صدر) اور ممبران کونسل پر مشتمل ہوتی۔ یہ صوبے کی عدالتوں، صوبہ کی کونسلوں اور کمیٹی یا بورڈ آف ریونیو ان سب کے

فیصلوں کے خلاف اپیل کی شنوائی کرتی۔

فوجداری کے مقدمات کے انتظام کو کمپنی نے 1790ء میں اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس وقت بنگال کا ڈپٹی گورنر جو پولیس اور فوجداری کے نظامِ عدلیہ کا انچارج تھا ان فرائض سے سبکدوش کر دیا گیا اور فوجداری کی عدالتوں کے تین درجے مقرر کر دیئے گئے۔

ضلع اور شہر کے ججوں کو بحیثیت مجسٹریٹ تسلیم کیا گیا۔ وہ اور ان کے ماتحتوں کو اختیار دیا گیا تھا کہ قاتلوں، ڈاکوؤں، چوروں، نقب زنوں اور بدچلنی کے ملزموں کو گرفتار کریں۔ چھوٹے چھوٹے مقدمات میں وہ آخری فیصلہ دے سکتے تھے اور سزا تجویز کر سکتے تھے۔

چار صوبوں کی عدالتیں گشتی عدالتوں میں تبدیل کر دی گئی تھیں جو بیشتر اضلاع میں چھ ماہی گشت کرتی تھیں۔ ان کو سزائے موت یا عمر قید کی سزا بشرطِ تصدیقِ صدر نظامتِ عدالت دینے کا اختیار تھا۔ سپریم عدالت فوجداری میں گورنر جنرل اور ان کی کونسل کے ممبران ہوتے تھے جن کی مدد میں قاضی القضاۃ اور مفتی رہتے تھے۔ ان کا اختیارِ سماعت فوجداری کے ہر طرح کے مقدمات اور پولیس سے متعلق تھا۔ ان کے فیصلوں کی کوئی اپیل نہ تھی لیکن گورنر جنرل کو یہ اختیار تھا کہ وہ سزا کو معاف کر دیں یا ایک سزا کو دوسری سزا میں تبدیل کر دیں۔

پولیس محکمہ کے افسران کو گورنر جنرل مقرر کرتا تھا۔ اس نے زمین داروں اور دیگر لوگوں کو انسدادِ جرائم کی کل ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا تھا۔ ضلع تھانوں میں بٹا ہوا تھا اور ایک تھانہ تقریباً بیس مربع میل کا ہوتا تھا۔ اس کا نگراں افسر ایک داروغہ ہوتا اور اس کے نائب ہوتے تھے۔ ان سب کی تنخواہیں گورنمنٹ ادا کرتی تھی۔ شہروں کو کوتوال کے چارج میں رکھا گیا تھا۔ ضلع مجسٹریٹ داروغاؤں کی نگرانی کرتے تھے۔

جب دیوانی اور فوجداری کی عدالتیں قائم ہو گئیں، مقدمات کی کارروائیوں کے متعلق پیچیدہ قوانین بن گئے اور جب اپیل کے امکانات ایک درجہ بدرجہ مرتب نظامِ عدلیہ میں پیدا ہوئے تو یہ لازم تھا کہ وکلا کا ایک طبقہ عالمِ وجود میں آئے۔

پرانے نظام کی جگہ عدلیہ کا جو نظام انگریزوں نے قائم کیا وہ اپنی ظاہری شکل اور اندرونی روح دونوں لحاظ سے بالکل مختلف تھا۔ اس نے ایک بے ضابطہ عجلت آمیز بلا خرچ نظام کی جس میں عدالت کے آداب کا کوئی عنصر نہ تھا جگہ لے لی۔ اس سیکولر نظام نے وکلا کے وجود کو لازمی قرار دے دیا۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کی عدالتیں چالبازی، جھوٹ اور دھوکہ دہی کا گھر بن گئیں اور مقدمہ بازی چاروں طرف پھیل گئی۔

پھر بھی ان عدالتوں کے ذریعہ حق کا احساس پیدا ہوا اور محض فرض تک محدود رہنے کا عہد ختم ہوا۔ انفرادی صواب دید کے مطابق قوموں، طبقوں اور ذاتوں کے لئے مختلف معیار انصاف اور بیکسوں اور کمزوروں کو انصاف سے محروم کرنے کا زمانہ گیا۔ سوائے حکمران طبقہ کے بقیہ سب کے لئے یکساں انصاف اور قانون کی حکومت نے ہندوستان کی زمین میں جڑ جمائی۔ یہ تبدیلی انفرادی اخلاق اور پبلک کے تعلقات دونوں کے لیے بے انتہا اہم تھی۔

نظم و نسق کا جو ڈھانچہ کارنوالس نے تیار کیا تھا اس کے بنیادی اصول اور کام کرنے کے طریقے اس درجہ انوکھے تھے اور جن سے لوگ اتنے ناآشنا تھے کہ ان سے روشناس ہونے میں بہت سال لگ گئے۔ شروع میں ردعمل بہت زیادہ ناپسندیدہ تھا۔ ہندوستانیوں کے جو طبقے طاقت اور اثر کے تمام عہدوں سے ہٹا دیئے گئے تھے وہ منہ پھلائے ہوئے تھے اور مخالف تھے۔ زمین کے مالکان جلد جلد بدلے، کاشت کار ستائے گئے اور زمین دار اور کاشت کار دونوں بے چین ہوئے۔ عدلیہ کے نئے نظام نے ایک ایسے مختلف ضابطہ قانون اور ایسی مختلف قانونی کارروائیوں کے طریقوں کو شروع کیا جسے لوگ مشکل سے سمجھ پاتے تھے۔ اس کی وجہ سے مقدمہ بازی بڑی حد تک بڑھ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پرانے سماجی بندھن اور رسم و رواج ٹوٹنا شروع ہوئے اور جرائم، برائیوں اور تشدد میں ہولناک زیادتی ہوئی۔

برطانوی افسران کے برتاؤ نے معاملہ کو اور خراب کردیا۔ "کمپنی کے فوجی اور غیر فوجی افسران کی ایک کثیر تعداد ہندوستان کے اونچے اور متوسط درجہ کے

لوگوں کے ساتھ جس تحقیر اور نخوت کا برتاؤ کرتی تھی اس نے آگ میں ایندھن کا کام کیا۔"[58]

فوج

مسلح افواج کو از سرِ نَو منظم کرنا ایک دوسرا مرحلہ تھا جس پر کارنواس نے اپنی توجہ مبذول کی۔ ایک بیرونی طاقت کے ملک پر قبضہ رکھنے کے خمیر ہی میں یہ بات مضمر ہے کہ اس کا وجود طاقت پر مبنی ہو۔ ان حالات میں جو اٹھارھویں صدی کے آخر میں ہندوستان کے تھے، جب کہ ہندوستان کا ایک بڑا حصہ آزاد تھا، جب کہ برطانوی حکومت اپنی ابتدائی منزل میں تھی اور جب کہ فرانس کا خطرہ جو ہندوستان کے حکمرانوں سے تعلقات رکھتا تھا ایک اہم حیثیت رکھتا تھا۔ یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ "حکومت کی تمام طاقت کی بنیاد اور اس کی بقا کے انحصار تلوار ہو۔"[59] اس زمانہ کے بڑے بڑے افسران کے دماغ میں اس بارے میں "کوئی غلط فہمی نہ تھی کہ برطانوی حکومت کبھی بھی لوگوں کی محبت کی بنیاد پر قائم نہ ہوگی اور اس کی بقا کا انحصار صرف اس پر ہے کہ لوگ یقین کرلیں کہ اس کی طاقت ناقابلِ تسخیر ہے۔"[60] اور منٹرو "ہماری گورنمنٹ اور ہماری عظیم فوجی طاقت کی وحدت"[61] کی بات اور برطانوی مقبوضات کے وسیع تر ہونے کے ذرائع کی باتیں کرتا تھا۔

قدرتی بات ہے کہ کارنواس اس کے لیے بے چین تھا کہ حکومت کا فوجی بازو پوری اہلیت سے چلے اگرچہ فوج کمپنی کے نظام میں سب سے زیادہ محبوب محکمہ تھا جس کا ثبوت گورنر جنرل اور سپہ سالارِ اعظم کے عہدے کارنواس کی ذات میں جمع کردینا ہی بہت کافی تھا۔ پھر بھی مسلح افواج میں کافی گڑبڑ تھی۔ بہت سے معاملات اس کے ذمہ دار تھے۔ سب سے پہلی بات تو یہ تھی کہ فوج جو کمپنی کے اقتدار میں تھی اس کے دو الگ الگ منظم حلقے تھے ــــ

بادشاہ کی فوج یعنی یورپین افواج جو برطانوی فوج سے متعلق تھی اور کمپنی کے کام کے لئے تعینات کردی گئی تھی اور دوسرے خود کمپنی کی فوج جن کی بھرتی جزءً تو یورپی لوگوں سے لیکن زیادہ تر ہندوستانیوں سے ہوتی تھی اگرچہ بادشاہ کی افواج

برطانوی استحکامات پر تعینات تھیں لیکن ان کے کل خرچ کمپنی کو وصول ہونے والی مالگذاری سے ادا کئے جاتے تھے۔ پھر اپنی افواج کا خرچ تو کمپنی برداشت ہی کرتی تھی۔ ان انتظامات کے تحت انگلستان کی حکومت کی یہ کوشش تھی کہ اپنی ذمہ داریوں کو کمپنی کے سر لاد دے خواہ کمپنی کو ان افواج کی ضرورت ہو یا نہ ہو جو ہندوستان بھیجی جاتی تھیں لیکن اہم نزاع کی اصلی وجہ وہ فرق تھا جو بادشاہ کی فوج کے افسران اور کمپنی کی فوج کے افسران کے مابین قائم تھا۔ بادشاہ کے کمیشن کے افسران کے رتبہ اور تن خواہ دونوں میں فضیلت کمپنی کے افسران کے دماغ میں زور زور سے کھٹکتی تھی اور اس نے خراب حالات پیدا کر دیے۔

کمپنی کے افسران کے دماغ میں بے اطمینانی تھی۔ افواج کے یورپین حصہ میں "قابلِ نفرت، نکمے، لندن کی سڑک پر گھومنے والے نالائق لوگ" تھے جنھیں فوجی دلال بہلا پھسلا کر لے آئے تھے یا مختلف جیلوں کے خوشہ چین تھے۔ افسران زیادہ تر نوجوان لوگ ہیں جنھوں نے اپنے کو برباد کر دیا ہے اور اس لیے مجبور ہیں کہ اپنے ملک سے بھاگ جائیں یا بہت ہی ادنیٰ قسم کے لوگ جو دولت کمانے کے لئے بھیج دیئے جاتے ہیں اور جو روپیہ کمانے کے لیے کسی بات کی پروا نہ کریں گے۔[62]

اس کے برخلاف ہندوستانی فوج کا "معیار بہت بہتر تھا" لیکن یورپین اور ہندوستانی فوج کے سپاہیوں کی تنخواہوں میں بہت زیادہ نابرابری تھی۔[63]

لیکن کمپنی کے ملازمین کی بے اطمینانی خاص کر الاؤنس کی بنیاد پر تھی۔ کلایو اور ہیسٹنگز دونوں کو اس بارے میں بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور جب کلایو ہندوستان آیا تو اس نے یہاں نافرمانی کو عام پایا۔

اس کے علاوہ غیر فوجی حکام میں جو تجار اور کلرکوں کے ہاتھ میں تھے اور سپاہیوں میں ٹکراؤ تھا۔ سپاہی نہ صرف اس کے مدعی تھے کہ ان کا پیشہ اعلیٰ ہے بلکہ وہ لوگ کمپنی کے مقبوضات کا حقیقی فاتح اپنے کو سمجھتے تھے۔ فوج کی اہمیت ان کی تعداد بڑھنے سے بڑھ گئی تھی۔ جب کلایو پلاسی کی لڑائی لڑا تو اس کے کمان کے اندر 2100 ہندوستانی سپاہی اور 900 یورپین اور دو سو مخلوط النسل پرتگالی تھے۔ 1794ء میں کمپنی کے افواج کی تعداد ستر ہزار تھی۔ جس میں تیرہ ہزار پانچ سو برطانوی تھے۔[64] اس کے بعد

تعداد تیزی سے بڑھی حتی کہ مارکوئس آف ہیسٹنگز کی فتوحات اور علاقوں کو اپنی مملکت میں شامل کرنے کے وقت تک کمپنی کی مستقل فوج روس کے بعد دنیا میں سب سے بڑی فوج تھی۔

بے اطمینانیاں دُور کرنے کے لیے کارنواس کی کوششیں صرف معمولی حد تک کامیاب ہوئیں۔ کمپنی کے افسران کو یہ حق ملا کہ ہندوستان میں ملازمت کے فرائض انجام دیتے ہوئے وہ شاہی افواج کے افسران کی حیثیت کے برابر رتبہ حاصل کرسکیں۔ لیکن دوسری شکایتیں باقی رہیں اور وقتاً فوقتاً پریشانیاں اور بغاوتیں ہوتی رہتی تھیں۔ لیکن جن چیزوں نے برطانوی مملکت کو تباہی سے بچایا وہ یہ تھیں (1) برطانوی افسران اور دوسرے عہدے داروں کے اندر نازک اوقات میں اپنی شکایتیں بھول جانے اور اپنے ملک کے مفاد کے تحفظ کے لیے مقابلے پر ڈٹ جانے کا ایک نادر مادہ تھا اور (2) ہندوستان میں متحد ہونے یا مشترک دشمن کے مقابلے میں اپنی طاقت منظم کرنے کی کوئی اہلیت سرے سے تھی ہی نہیں۔

کمپنی کی افواج کی اصلاح کا جو منصوبہ کارنواس نے بنایا تھا وہ اسے عملی جامہ نہ پہنا سکا بلکہ درحقیقت اس کی ہندوستان مخالف تدبیروں نے اسے اور کمزور کردیا۔ وہ ہندوستانی افسران کی بے عزتی کرتا تھا۔ ان کی تنخواہیں کمتر رکھتا تھا۔ ان کو ترقی کرنے کا کوئی موقع نہیں دیتا تھا۔ اس نے ان کی تعداد کو بھی کم کردیا۔ نتیجہ یہ کہ جب 1857ء میں فوج کے اندر بغاوت پھوٹ پڑی تو اس وقت کافی ہندوستانی افسر نہ تھے جو ڈسپلن قائم رکھ سکتے۔

کارنواس نے ایک ایسے نظامِ حکومت کا قصر تیار کیا جس کی بنیاد پر برطانیہ نے آئندہ 150 سال تک ہندوستان پر حکومت کی۔ نیا نظامِ حکومت دو اصولوں پر مبنی تھا یعنی بیرونی حکومت کا مسلسل قیام اور رعایا کی دولت کو حکمران طاقت کے افراد کے لئے ناجائز طور پر استعمال کرنا۔ جس نظم و نسق کا آلہ "پٹ" کے انڈیا ایکٹ اور کارنواس نے بنایا تھا اس نے ان دونوں اغراض کو قابلِ مدح حد تک کامیاب بنایا۔ برطانوی پارلیمنٹ ہندوستان میں اپنے مقبوضات پر اقتدارِ اعلیٰ رکھنے والی ہوگئی۔ مقامی حکام یعنی گورنر جنرل اور ان کی کونسل اور صوبہ کے گورنران اس اقتدارِ اعلیٰ کی خواہشات

اور اس کے احکام کو عمل میں لانے والے ایجنٹ تھے۔ تمام اہم عہدے خواہ وہ فوج کے ہوں یا شہری انتظام کے ہوں سب پر حکمراں نسل کے لوگ مقرر کیے گئے۔ بیرونی لوگوں کو اپنے اختیارات کے منوانے کا جبر بہ فوج تھی۔ ملک سے جو محاصل ہوتے تھے وہ بجائے اس کے کہ زراعت، صنعت اور ملک کی پیداوار کو ترقی دینے میں خرچ ہوں حکمراں طاقت کو خراج ادا کرنے میں صرف کیے جاتے تھے۔

ان تبدیلیوں کا عوام کے اخلاقی اور مادی حالات پر تباہ کن اثر پڑا۔ عوام افسردہ اپنی نظر میں خفیف، پست ہمت اور رستہ اقدام کرنے کے جذبے سے عاری ہو گئے۔ وہ ان تمام برائیوں اور اخلاقی نقائص میں مبتلا ہو گئے جو غلامی اور آزادی دبانے سے پیدا ہوتی ہیں۔

حواشی ساتواں باب

1۔ دیکھو اے ہسٹری آف مونری ٹرنسی ایشن آف برٹش نیشن ان ہندوستان۔ جلد 1۔ صفحہ 59۔

2۔ لیکی ڈبلیو۔ ای۔ ایچ۔ اے ہسٹری آف انگلینڈ ان دی ایٹینتھ سنچوری (نیا ایڈیشن) جلد 4 صفحہ 262

3۔ ایضاً

4۔ ایضاً۔ صفحہ 264۔

5۔ ایضاً۔ صفحہ 264۔

6۔ ایضاً۔ صفحہ 246۔

7۔ ووڈرف فلپ۔ دی مین ہو رولڈ انڈیا (دی فاؤنڈر) صفحہ 184۔

8۔ مل اور ولسن۔ دی ہسٹری آف برٹش انڈیا (ففتھ ایڈیشن) جلد 3۔ صفحہ 7-256۔

9۔ لیکی۔ جلد 4۔ صفحہ 80 — 279۔

10۔ ڈیویس اے رون کلائیو آف پلاسی 1939ء۔ صفحہ 263۔

11۔ کیتھ۔ اے۔ بی۔ اے کانسٹی ٹیوشنل ہسٹری آف انڈیا (پانچواں ایڈیشن) جلد 3۔ صفحہ 57۔

12۔ اصولاً مغل بادشاہ 'پٹ' کے انڈیا بل کے 1784ء میں پاس ہونے تک اقتدار اعلیٰ کے مالک رہے۔ کس حد تک 1769ء میں یہ اصول کمپنی کے ملازمین کے لیے قابلِ قبول تھا، اس کا پتہ "ہیری ورلیٹ" گورنر کے ایک خط کے ان الفاظ سے چلے گا جو اس نے کونسل کے ممبران کو اپنی علیحدگی کے وقت لکھا تھا۔

"ایک چٹان ہے اور وہ خطرناک ہے جس سے بچنے کے لئے حد سے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ ہم ماضی کی عام کارروائیوں اور مثالوں سے آگے نکل گئے ہیں۔ ہمارے پاس بہترین اور نہایت درجہ قابلِ ستائش وجوہ اپنے کردار کو مبنی برحق ثابت کرنے کے ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہم آخری حد تک آچکے ہیں جس سے گذرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اقتدارِ اعلیٰ کے دعویدار ہیں۔ مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ہم نہ اس سے زیادہ ہو سکتے ہیں نہ اس سے کم (بغیر اس سے بلند تر ہوئے جو معقول پالیسی کا تقاضہ ہے) جو وطن میں ہمارے مالکان کے مفاد اور بیرونی ممالک میں ہمارے قومی مفاد ممنوع قرار دیتے ہیں۔ جو تبدیلی آئی ہے اس سے پہلے اگر ہم دیسی حکومتوں کے معاملات میں دخل دینے اور بیرونِ ملک کی قوموں کا حسد ابھارنے میں محتاط رہے ہیں تو اب ہم کو اور زیادہ محتاط ہونا پڑے گا۔ جو تبدیلی ہوئی ہے وہ بذاتِ خود ایسی تھی جس میں ہمارے صبر و استقامت کو فرض کر کے یہ رجحان پیدا کیا گیا تھا کہ نظامت کے نام کو ختم کر دیا جائے جو واقعۃً کمپنی اور قوم کے لئے انتہائی مسرت کا موقع ہوتا لیکن اس تبدیلی میں یہ بھی امکان ہے کہ وہ ہمارے لیے پریشانی کا باعث ہو اور رقابتوں کو اُبھارے۔ پھر بھی ایک درمیانی راستہ باقی ہے جس میں اعتدال ہمارا رہنما اور رہبر کو قائم رکھنے کا باعث ہوگا۔ ہم سلامتی، نفع اندوزی اور تسلسل کے ساتھ آگے بڑھ سکتے ہیں اور اس میں بہت زیادہ پابندی یا حد سے زیادہ آزادی نہ ہوگی۔ غیر متعلق چیزوں کو اب ضروری تصور کرنا ہوگا۔ ہر حکم پر دیسی حکومت کی مہر تصدیق ثبت ہونی چاہئے۔ (ورے لٹ

ولیو ابنڈکس صفحہ 123- فرمنجر ففتھ رپورٹ۔ جلد ا۔ صفحہ 11-)
13- آبادی کا تخمینہ دس ملین اور 36 ملین کے مختلف اعداد کے درمیان بتایا جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو " مل " دی ہسٹری آف انڈیا۔ جلد 5۔ صفحہ 376-) رابرٹ کا خیال یہ ہے کہ آبادی 30 ملین تھی اور 10 ملین مر گئے۔ (رابرٹ پی۔ ای۔ ہسٹری آف برٹش انڈیا انڈر کمپنی اینڈ کراون 1930ء) صفحہ 167- کیتھ اے بی اے کانسٹی ٹیوشنل ہسٹری آف انڈیا 1937ء صفحہ 58-
14- ہنٹر ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ دی اینالس آف رورل بنگال۔ صفحہ 410-
15- دی کیمبرج ہسٹری آف انڈیا۔ جلد 5۔ صفحہ 216-
16- ایضاً۔ صفحہ 187-
17- جولس ایم۔ وارن ہیسٹنگز۔ صفحہ 103-
18- فارسٹ جی۔ ڈبلو۔ سلکشن فرام دی اسٹیٹ پیپرس آف دی گورنر جنرل آف انڈیا۔ وارن ہیسٹنگز۔ جلد دوم۔ اینڈکس اے۔ صفحہ 277-
19- فرمنگر ففتھ ایورٹ۔ جلد اول۔ انٹروڈکشن۔ صفحہ او۔ سی۔ اکس۔ آئی۔ آئی۔
20- مل اینڈ ولسن۔ دی ہسٹری آف برٹش انڈیا۔ جلد 3۔ صفحہ 365-
21- فرمنجر او۔ پی۔ سٹ۔ انٹروڈکشن۔ صفحہ ccxii — ccxiii سکستھ رپورٹ آف سروے 1772ء صفحہ 18-
22- فرمنجر او۔ پی۔ سٹ۔ صفحہ ccxvii-
23- کمیٹی آف سرکٹ منٹ مورخہ 15 ستمبر 1775ء فرمنجر او۔ پی۔ سٹ۔ صفحہ ccxxvii ccxxvi-
24- کیا ئے۔ جے۔ ڈبلیو دی ایڈمنسٹریشن آف ایسٹ انڈیا کمپنی۔ صفحہ 172-
25- دت۔ آر۔ سی۔ دی اکنامک ہسٹری آف انڈیا انڈر ارلی برٹش رول۔ صفحہ 6-
26- ایضاً۔ صفحہ 61-
27- کیمبرج ہسٹری آف انڈیا (انڈین پرنٹ) جلد 5۔ صفحہ 198-
28- آدم اسمتھ۔ دی ویلتھ آف نیشنس (ماڈرن لائبریری ایڈیشن) صفحہ 898-
29- ایضاً۔ صفحہ 771-

30- اسٹوکس ایرک دی انگلش یوٹی لی ٹیلیرنس اینڈ انڈیا۔ (آکسفورڈ 1939ء) صفحہ 25-

31- مل اینڈ ولسن دی ہسٹری آف برٹش انڈیا۔ جلد 5۔ صفحہ 341-

32- کے۔ ای۔ جے۔ ڈبلو۔ ایڈمنسٹریشن آف دی ایسٹ انڈیا کمپنی۔ صفحہ 133-

33- ملاحظہ ہو ہومینٹس آف مسٹر شور۔ مورخہ 18ر جون 1789ء۔ پیرا 370-
ریسپکٹنگ دی پرمانینٹ سیٹلمنٹ آف دی لینڈس ان بنگال پرونسز فرمنجر ڈبلیو
کے۔ دی ففتھ رپورٹ۔ جلد دوم۔ صفحہ 81 — 80-

34- رپورٹ آف دی بنگال لینڈ ریونیو کمیشن 1943ء۔ پیرا 34-

35- دکیمو رجرڈ آرانڈیا آن فیلکس۔ جلد ا (1829ء ایڈیشن) صفحہ 360-

36- اشان کار ڈبلیو۔ ایس۔ دی مارکوئس کارنواس (رولرس آف انڈیا سیریز)
صفحہ 72-

37- گرتھنا سوامی۔ ایم۔ سم انفلونسز دیٹ میڈ دی برٹش ایڈمنسٹریشن اِن انڈیا
(1939ء) صفحہ 252-

38- کے۔ ای۔ جے۔ ڈبلو۔ دی ایڈمنسٹریشن آف دی ایسٹ انڈیا کمپنی۔
صفحہ 198-

39- بیڈن پاول۔ بی۔ ایچ۔ دی لینڈ سسٹم آف برٹش انڈیا۔ جلد ا۔ صفحہ 619-
نوٹ ا۔

40 ایضاً۔ صفحہ 625-

41- بیڈن پاول او۔ پی۔ سٹ۔ جلد ا۔ صفحہ 615-

42- ایضاً۔ صفحہ 676-

43- مل اینڈ ولسن دی ہسٹری آف برٹش انڈیا۔ جلد 5۔ صفحہ 407-

44- ایضاً۔ صفحہ 408-

45- اسٹوکس ایری دی انگلش یوٹی لی ٹیرینس اینڈ انڈیا۔ صفحہ 31-

46- اشان کار ڈبلیو۔ ایس۔ دی مارکوئس کارنواس۔ او۔ پی۔ سٹ۔ صفحہ 181-

47- کے۔ ای۔ جے۔ ڈبلیو۔ دی ایڈمنسٹریشن آف ایسٹ انڈیا کمپنی۔ صفحہ 345 فٹ نوٹ-

48- اسٹوکس اری۔ او۔ پی۔ سٹ۔ صفحہ 31-

49- شور۔ جے۔ نوٹس آن انڈین افیرس۔ جلد 2۔ صفحہ 57۔
50- بل۔ ایس۔ سی۔ یوسف خاں دی بلوچ۔ اینڈکس 5۔
51- ملاحظہ ہو رتنا سوامی۔ ایم۔ سم انفلوئنسز دیٹ میڈ دی برٹش ایڈمنسٹریشن اِن انڈیا۔ صفحہ 153۔
52- سکلٹن کارڈبو۔ ایس۔ دی مارکوئس کارنواس۔ او۔ پی۔ سٹ۔ صفحہ 99۔
53- رپورٹ فرام دی سلکٹ کمیٹی آن دی افیرس آف ایسٹ انڈیا کمپنی 1833ء جنرل انڈکس۔ صفحہ 20۔
54- ٹامسن اینڈ کارنفاس وائز اینڈ فلفلمنٹ آف برٹش رول اِن انڈیا۔ لندن 1934ء۔ صفحہ 192۔
55- دی ایسٹ انڈیا کمپنیز ویڈی میکم۔ دیکھو بالا نوٹ 21۔
56- ٹری ولین سرجی، او۔ دی کمپٹیشن والا (1864ء) بحوالہ ٹامسن اینڈ گیرٹ او۔ پی۔ سٹ۔ صفحہ 193۔
57- کے۔ ای۔ جے۔ ڈبلیو۔ دی ایڈمنسٹریشن آف ایسٹ انڈیا کمپنی۔ صفحہ 23۔
58- رچرڈ۔ آر۔ انڈیا آن ٹیکٹس۔ او۔ پی۔ سٹ۔ جلد 1۔ صفحہ 107۔
59- ڈیوک آف ولنگٹن فیریش آف مارکوئس ولزلیز گورنمنٹ آف انڈیا۔ دیکھئے راما سوامی میور۔ دی میکنگ آف برٹش انڈیا۔ صفحہ 209۔
60- اسٹوکس ایری دی انگلش یوٹی لی ٹیرین اینڈ انڈیا۔ صفحہ 16۔
61- گلیج میورٹرس۔ صفحہ 203۔
62- لیٹرس آف دی ڈیوک آف یارک آکن کارنواس۔ دیکھئے ٹامسن اینڈ گیرٹی او۔ پی۔ سٹ۔ صفحہ 175۔
63- حسب ذیل نقشہ تنخواہوں میں فرق کو نمایاں کرتا ہے۔

انگلش افسران	تنخواہ	انڈین افسران	تنخواہ
کیپٹن (آرٹلری)	448—8—0	صوبہ دار	82—0—0
لفٹیننٹ (انفنٹری)	266—8—0	جمعدار	28—0—0
پائلٹ (بحری)	700—0—0	حولدار	19—0—0

ماسٹر (بحری)	0—0—270	نائک	0—0—17
میٹ (بحری)	0—0—154	سپاہی	0—8—8

دیکھئے لیٹرس آف دی کورٹ آف ڈائریکٹرس ٹو دی گورنر جنرل اِن بنگال (پبلک ڈیپارٹمنٹ) 31راگست 1801ء اور 13رمئی 1807ء۔

64- دیکھئے رُحتنا سوامی۔ ایم۔ سم انفلوئنسز دیٹ میڈ دی برٹش سسٹم اِن انڈیا۔ (1939ء ایڈیشن) صفحہ 125-

آٹھواں باب

1739ء سے 1857ء تک برطانوی نظم و نسق کا نشو و نما

۱۔ یورپ کے اقتصادی اور سیاسی انقلابات کے اثرات

اس کے نظام کے نقائص جو بھی ہوں لیکن کارنواس نے تراج ختم کر کے امن اور قانون کو قائم کر دیا تھا۔ پلاسی کے بعد مقبوضہ علاقوں میں جو تراج پھیلا ہوا تھا وہ ختم ہو گیا اور بنگال میں زندگی جدید لیکن منظم راہوں پر چل پڑی۔ برطانوی حکومت کے ان علاقوں میں بھی جو بعد کو مملکت میں شامل ہوئے نظم و نسق کے وہی مراحل سامنے آئے جن سے بنگال میں سابقہ پڑ چکا تھا۔ ان کو حل کرنے میں کارنواس کے طرز تنظیم نے مثالی کام کیا۔ اگرچہ اس کے کچھ خدوخال ہی باقی رہ گئے باقی میں ترمیم ہوئی اور اس کے بنیادی خیالات کو نزاعی قرار دیا گیا۔ ان کارروائیوں میں نصف صدی کا وقت لگا جس کے درمیان برطانوی مملکت میں توسیع ہوتی گئی اور نظم و نسق کے نشو و نما کی تکمیل ہوئی۔

یورپ اور انگلستان

لیکن اس زمانہ میں یورپ میں بڑی اتھل پتھل ہوئی اور ہندوستان کے اربابِ

نظم ونسق میں ایک نیا مزاج اور ایک نیا نظریہ نمایاں ہوا۔ انگلستان میں کیا بصیغۂ عمل اور کیا بہ دائرۂ خیالات عظیم تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ اٹھارھویں صدی کا دوسرا نصف جو "برطانوی پارلیمنٹ کی تاریخ میں انتہائی نفرت انگیز اور برائیوں سے بھرپور تھا" اب خاتمہ کے قریب تھا۔ نئے نئے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ نئی نئی طاقتوں نے اپنا عمل دخل جمانا شروع کیا۔ دولت پیدا کرنے کے نئے طریقے وسیع پیمانے پر پھیل رہے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ سوچنے کے اور کردار اور اخلاق کے نئے انداز نمودار ہو رہے تھے۔ یہ نیا جذبہ جو زندگی کے سمندر پر سانس لے رہا تھا ہندوستان کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ ان نتائج سے بچ نہیں سکتا تھا جو مغربی دنیا کو متحرک کر رہے تھے۔

صنعتی انقلاب جو اٹھارھویں صدی کے وسط میں شروع ہوا اب بڑی طاقت پکڑ رہا تھا۔ انگلستان تیزی کے ساتھ ایک صنعتی ملک بن رہا تھا۔ سائنس، ٹکنالوجی اور صنعت میں یورپ کی قیادت کر رہا تھا۔ فیکٹریوں کا نظام اور دولت کی فراوانی انگریزی سوسائٹی کے ڈھانچے کو بدل رہی تھی۔ سائنس اور ٹکنالوجی نوعِ انسان کو فطرت کی طاقتوں پر غیر معمولی اقتدار عطا کر رہی تھی۔ بنی نوع انسان کے سامنے ترقی کا ایک غیر محدود منظر کھل رہا تھا۔ انگلستان خوش قسمت تھا کیوں کہ صنعتی انقلاب نے اس کو ایسے ذرائع اور ایسے وسائل فراہم کر دیتے جن کی یورپین حریفوں کے مقابلے کے لئے اس کو ضرورت تھی۔

"انگلش چینل" کی دوسری جانب ایک دوسرا انقلاب رونما تھا جس نے فرانس میں ایک نئے عہد کا آغاز کیا اور یورپ میں ترقی کو زور بخشا۔ یہ پرانے جاگیردارانہ نظام کو بہا لے گیا اور اس نے شہری متوسط طبقہ کی فتح کا اعلان کیا۔ اس کی مسلح افواج نے جن کے جھنڈوں پر مساوات، آزادی اور انسانی برادری کے نغمے ثبت تھے یورپ کے بدنام دور کو الٹ دیا۔ ایک ذہین عظیم فوجی ماہر یعنی نیپولین کے زیرِ قیادت فرانس کا جھنڈا تمام یورپ پر لہرا گیا اور اس نے انگلستان کو چیلنج کیا اور اس کی فتوحات کی صدائے بازگشت ایشیا کے کونے کونے میں گونج گئی۔

ان دو انقلابوں نے ایسی طاقتوں کو پیدا کیا جنھوں نے آخر کار عربی ذہنی غلامی اور قدامت پرستی کے بندھنوں کو توڑ دیا اور نیشنلزم کے دور کو روبرو لایا۔

برائعظم پر والٹیر، روسو، انسائیکلوپیڈیائی اور کانٹ اس انقلاب کے ازروئے کردار، جذبات و خیالات علمبردار تھے۔ انگلستان میں اس جدید اسپرٹ نے ایسے شعراء جیسے کہ ورڈس ورتھ، ماہرین اقتصادیات مثل آدم اسمتھ اور بنتھم جیسے فلسفیوں کو متاثر کیا۔ برک ایک ایسی سوسائٹی کے تصور سے مسحور تھا جس میں ماضی، حال اور مستقبل کا اجتماع ہو اور فن اخلاق اور کمال اپنی اپنی شکلوں میں ظہور کریں۔ برک روایات اور تسلسل کا داعی تھا۔ بنتھم نے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کے لئے زیادہ سے زیادہ سامان مسرت کے پیغام آزادی کی تبلیغ کی۔ ایک نے اپنی حفاظت کی قدرتی قوت تمیز یہ اور تاریخ کے اسرار سے اپیل کی اور دوسرا اپنی ترقی پسندی کے جھنڈے نیچے ڈٹ گیا۔ دونوں نے انگریزوں کے دماغوں پر بہت بڑا اثر ڈالا۔

فلسفیانہ تحریک کے علاوہ مذہبی زندگی میں بھی ایک گہری ہلچل تھی۔ یہ اس آزاد مشربی اور اخلاقی ابتری کے خلاف جو جارج اول سے ملکۂ وکٹوریہ تک کے عہد میں پھیلی ہوئی تھی ایک زبردست ردعمل تھا۔ مذہب کے اس احیاءِ جدید کے "وسلے" اور "وٹیفیلڈ" دو لیڈر تھے جنھوں نے اپنے کو اس کے لئے وقف کر دیا تھا اور جس کا نام "میتھوڈ ازم" ہوا۔ یہ لوگ گاؤں اور چھوٹے چھوٹے قصبات کے عام آدمیوں یعنی قلی، مل مزدور، ملاح، تجار، دوکان دار اور محنت کش کو خطاب کرتے تھے۔ وہ انسانی فسق و فجور کی مذمت کرتے اور لوگوں کو دعوت دیتے کہ وہ سوچ سمجھ کر اپنے آپ کو بدلیں اور اپنے اندر پاکیزگی پیدا کریں اور وعدہ کرتے تھے کہ اس طرح وہ نجات اور اجرِ آخرت کے مستحق ہوں گے جیسا کہ اس تاریخ کا جدید ترین مورخ کہتا ہے کہ "اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ بغیر اس کے (یعنی میتھوڈ ازم کے) یا اسی کے مثل کسی تازہ دم کرنے والے آلے کے انگلستان ایک تباہ کن زوال کے عہد میں داخل ہو جاتا۔"

انہی سے متعلق "ایونجلسٹ" تھے جو کلیسائے قدیم میں رہے مگر بحیثیت پارٹی کے "وہ زیادہ منظم تھے اور اسے خوب سمجھتے تھے کہ ان کے دماغ میں کیا ہے ...... اور کلیسا کے ہر مذہبی فرقہ سے زیادہ جارح تھے۔"[2] وہ اعلیٰ طبقے اور متوسط طبقے کے اونچے لوگوں سے اپیل کرتے تھے اور پبلک پر ان کا اثر بے پناہ تھا۔ ان ہی میں سے ایک گروہ تھا جو "کلفام" فرقہ کہلاتا تھا۔ "ولبرفور" جو غلاموں کی تجارت کو ممنوع قرار دینے کا ایک

عظیم علمبردار تھا اور شاعر" کاوپر" دونوں اس فرقے میں شامل تھے اور یہ زبان زد تھا کہ ان لوگوں میں "ہر انسانی مفاد کا ایک مربی ہے اور دنیا کے ہر مذہب کا ایک نمائندہ ہے۔"

ہندوستان کی اقتصادیات پر اثر

انقلابی اور نپولینی لڑائیوں نے ہندوستان میں آگے بڑھنے والی انگلستان کی پالیسی کو اکسایا۔ ہندوستان کے معاملات میں فرانسیسی مداخلت کے مبالغہ آمیز خوف نے لارڈ ولزلی اور مارکوئس آف ہیسٹنگز کی ان تدابیر کے لئے مہمیز کا کام کیا جو وہ ہندوستان میں شہنشاہیت قائم کرنے کے لئے کر رہے تھے۔ برطانوی تجارت کے خلاف نپولین کے احکام سے اور برِاعظم کے تمام بندرگاہوں کو بند کر دینے سے انگلستان کو ان تیار شدہ سامانوں کے لئے جو ان کی نئی ملیں اور فیکٹریاں تیار کر رہی تھیں نئے بازار تلاش کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

صنعتی انقلاب نے جس نے انگریزوں کی اقتصادیات کے طرز کو اچانک بدل دیا تھا انگلستان اور ہندوستان کے درمیان اقتصادی تعلقات کو بھی متاثر کیا۔ اس وقت تک تجارت کی اصل بنیاد یہ تھی کہ ہندوستان اپنے کپڑے انگلستان کی چاندی کے عوض بیچتا تھا۔ جیسا کہ" ویرا انسٹے" کہتا ہے" اٹھارھویں صدی تک ہندوستان کی اقتصادی حالت نسبتاً ترقی یافتہ تھی اور ہندوستان کے مال تیار کرنے کا طریقہ اور اس کا تاجرانہ نظام ان تمام طریقوں اور نظاموں سے تابِ مقابلہ رکھتا تھا جو دنیا کے کسی حصہ میں رائج تھے۔"[۹]

لیکن صنعتی انقلاب کے آجانے سے انگلستان سوتی کپڑوں اور دوسری اشیاء کا وسیع پیمانہ پر تیار کرنے والا ہو گیا اور اشیاء کا جو تبادلہ دونوں کے درمیان تھا وہ الٹ گیا۔ ہندوستان کے ہاتھ کے بُنے ہوئے کپڑے انگلستان کے مشین سے تیار کیے ہوئے کپڑوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اس لئے ہندوستان کی تجارت تباہ و برباد ہو گئی۔ گاؤں کے کاریگروں اور جولاہوں کا ذریعۂ معاش جاتا رہا اور بہت جلد وہ بھومی ہین (بلا زمین) مزدوروں میں تبدیل ہو گئے۔ مالگذاری کی جو پالیسی حکومت نے اختیار کی اور موضع کی صنعت کی بربادی ان دونوں نے مل کر گاؤں کے قدیم منظم معاشرے کو پارہ پارہ کر دیا۔

صنعتی انقلاب نے انگلستان کی پرانی سوداگرانہ پالیسی (بنیا پن) کو غیر نفع بخش بنا دیا۔ اسی لئے ماہرین اقتصادیات اس پر زور دینے لگے کہ تجارت کو بندشوں اور اجارہ داری سے آزاد کیا جائے۔ مہم جوئی کی اجازت کا تجارت اور صنعت پر بجلی کی مانند اثر ہوا اور دولت تیزی سے جمع ہونے لگی۔

دولت کی بہتات نے جو صنعت کے آگے بڑھنے سے ہوئی طریقوں کو سدھارا۔ نیپولینی کشمکش نے انگریز قوم کے کردار کو پرکھا بھی اور اسے فولاد بھی بنا دیا۔ مذہب اور اخلاق میں اصلاحات کے پھیل جانے سے خلوص اور سنجیدگی میں ترقی ہوئی اور تعصب، انگریز کے چال چلن کے نمایاں خدوخال بن گئے۔ نسلی برتری کے احساس اور اس شعور نے کہ سفید فام لوگوں پر ایک ذمہ داری ہے چال چلن پہ اثر ڈالنا شروع کیا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود انگلستان کے مالی منافع کا جذبہ کم نہیں ہوا۔ 1802ء کے بعد ہندوستان میں برطانوی حکمرانی کے بارے میں یہ خیال پنپنے لگا کہ وہ ایک ایسے آلے کے سوا کچھ نہیں ہے جس کے ذریعہ ہندوستان میں امن وامان قائم ہو جائے تاکہ امکانات سے لبریز وسیع ہندوستانی بازار کو برطانوی صنعت سے فتح کیا جا سکے۔"

نظم ونسق میں نئی روح

پھر دُہرایا جاتا ہے کہ کارنواس کا منصوبہ "ہووگ" اصولوں پر قائم تھا جن کا منشا یہ تھا کہ سوسائٹی کے معاملات میں حکومت کی مداخلت کو کم کیا جائے۔ لاشخصی قانون کا غلبہ ہو۔ انتظامیہ اور عدلیہ کو جدا جدا کر دیا جائے اور عدلیہ کو فضیلت حاصل رہے۔" ہووگ" کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ سوسائٹی کے استحکام کے لئے جائداد ایک ضروری چیز ہے کیوں کہ یہ آزادی اور قانون کی پابندی میں توازن قائم رکھتی ہے۔

نئے عہد میں ان تمام اصولوں کی مخالفت ہوئی۔ اصولِ سودمندی ماننے والے انتہا پسندوں نے جن میں جیمس مل نمایاں ہے دونوں وجوہ سے یعنی یوٹیلٹیرینزم (اصولِ سودمندی) والوں کے حلقے میں اپنے اثر کے لحاظ سے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظام میں اپنی پوزیشن کے لحاظ سے کمپنی کی حکومت کی نشوونما اور کارنواس کے نظام میں ترمیم کرنے پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ "اینجلیٹ" نے "ریڈکلس" (انتہا پسندوں) کی حمایت کی لیکن دونوں کے سوچنے

کے انداز مختلف تھے۔ بہرحال پارلیمنٹ کے ذریعہ ان لوگوں نے کمپنی پر اپنی کچھ خواہشات کے منوانے کے لئے اثر ڈالا اور جس طرح ان کے خیالات اونچے طبقوں میں پھیلتے گئے اسی طرح ہندوستان میں بہت سے اعلیٰ افسران ہی اصولوں کی پیروی کرنے لگے۔ ان سے مختلف انگریزوں کا وہ گروہ تھا جو 'برک' کے قدامت پرستانہ فلسفہ کا پیرو تھا۔ یہ لوگ کارنوالس کی آزادی کی پالیسی اور مل کے انتہاپسندانہ رجحانات اور ان کے نقطۂ خیال کے مخالف تھے۔ ان میں سے بعض نظم و نسق کی بہترین صلاحیت رکھنے والے تھے جیسے کہ 'منرو' 'مالکوم' 'الفنسٹن' اور 'میٹکاف'۔

(ب) برطانوی حکومت کی نوعیت

جیسے جیسے اور زیادہ ہندوستانی علاقہ برطانیہ کے زیر اقتدار آتا گیا اور نئے مفتوحہ علاقوں میں برطانوی نظم و نسق کا ان جگہوں میں بھی چلانے کا سوال حکام کے سامنے آیا تو اس وقت کارنوالس نے جو نظام بنایا تھا اس کی خوبیوں اور خرابیوں پر بحث شروع ہوئی۔

لیکن نظم و نسق کے مسائل کی تہ میں یہ بنیادی تنقیح مضمر تھی کہ ہندوستان میں برطانیہ کی حکومت کی نوعیت اور اس کی غرض و غایت کیا ہے۔ فتح کی کارروائی کی مثال ایک سیلاب کے زوردار بہاؤ سے دی جا سکتی ہے جو سرحدی حدبندیوں کو توڑ دیتا ہے اور تباہی اور بربادی پھیلا دیتا ہے۔ فتح ایک گندی چیز ہے کیوں کہ ناانصافی، فریب، وحشیانہ طریقے اور تشدد اس کے ہمیشہ ہمراہی رہتے ہیں۔ یہ ایک منحوس چیز ہے۔ مفتوحین کو پست اور ذلیل کرتی اور ان کو بھوکوں مار دیتی ہے اور فاتح کو پہلے سے بدتر اور بدکردار بناتی ہے۔ جب یہ ختم ہو جاتی ہے تو دونوں مجبور ہو کر دل ہی دل کے اندر محاسبہ کرتے ہیں۔ مفتوح یہ سوچتا ہے کہ وہ کیا باتیں تھیں جن سے وہ ہار گیا اور وہ کون سی ترکیب ہے جس سے وہ اپنا کھویا ہوا وقار پھر حاصل کرلے اور فاتح وہ وجوہ تلاش کرتا ہے جن کی بنا پر وہ اپنی کارروائی کو حق بجانب ثابت کر کے اپنے ضمیر کو مطمئن کر سکے۔

تینوں مکتبۂ فکر یعنی بنتھامسٹ، ایوں جلسٹ اور ٹریڈیشنلسٹ (روایتی) میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے مخصوص طریقوں سے اس ضروری کام کو انجام دینے کے لئے کام کیا۔

انتہاپسند

انتہاپسندوں کا نقطۂ نظر سیکولر تھا۔ ان کے خیال کے مطابق برطانوی فتوحات اس لیے مبنی برحق تھیں کہ ان سے ایک ایسے ملک میں جو آپس کے اختلافات اور باہمی لڑائیوں سے پُرزے پُرزے ہو رہا تھا اور نوابوں اور راجاؤں کی حکمرانی کے نیچے کراہ رہا تھا امن و نظم قائم ہوا۔ وہ لوگ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ قانون کی بادشاہت قائم کی جائے جو فراج کو اکھاڑ کر اس کی جگہ لے لے اور ایسے حالات پیدا کرے جس میں لوگ ہنسی خوشی زندگی گذار سکیں۔ کیوں کہ جس چیز کی ان کو سب سے زیادہ ضرورت تھی وہ آزادی یا سلف گورنمنٹ نہ تھی بلکہ امن اور خوش حالی تھی۔ صرف ایک ہمہ گیر اور اہلیت رکھنے والی گورنمنٹ ہی جس کو ایک خودمختار انتظامی ادارے کے ذریعہ کلی طاقت حاصل ہو، حکومت کرتی ہو وہی امن قائم کر سکتی ہے اور وہ ضروری قوانین وضع کر سکتی ہے جو حقوق کو متعین کریں اور ان کی حفاظت بھی کریں نیز ان حقوق کو قائم رکھنے کے لئے ایک بلا خرچ اور تیزی سے فیصلہ کرنے والی عدلیہ بنا سکتی ہے اور ایک ایسا سیاسی اور اقتصادی نظام تیار کرا سکتی ہے جو ہر شخص کو سرمایہ دارانہ سوسائٹی کے ایک فرد کی حیثیت سے اپنی معرفت حاصل کرنے کے مواقع فراہم کرے۔

ہندوستان کی اس بنی برا جتماعیت اور جامد تہذیب کو برداشت کرنے کے لئے جو ازمنۂ وسطیٰ کے رسم و رواج سے بھرپور اور سختی کے ساتھ ذات پات کے بندھنوں میں بندھی ہوئی ایک ایسی سوسائٹی تھی جس میں عوام پر زمین دار اور مذہبی پیشوا ظلم ڈھاتے رہتے تھے۔ انتہاپسندوں کے اندر صبر کا مادّہ بالکل نہ تھا۔ اس کا علاج یہی تھا کہ جڑ سے لے کر شاخوں تک کو اس کو یورپین طرز میں بدل دیا جائے۔ یہی وہ طریقہ ہے جو سماجی حالات میں تبدیلی لا سکتا ہے اور سیاسی انقلابات کو روک سکتا ہے۔

اقتصادی معاملات میں یہ لوگ "مالتھوس" اور "ایکارڈو" کے پیرو تھے۔ ان لوگوں نے اپنے عقیدے کی بنیاد تجارت میں حکومت کی عدم مداخلت انفرادی مہم جوئی اور آزاد تجارت پر رکھی تھی اور حکومت کی امداد یا حکومت کی مداخلت کی وہ مذمت کرتے تھے۔ مالگذاری کے نظام کے بارے میں وہ برطانوی قسم کی زمین داری کو ہندوستان میں رائج کرنے یا اس کو وسعت دینے کی مخالفت کرتے تھے اور اس بات کے مؤید تھے کہ حکومت

کاشت کاروں سے براہ راست معاملہ کرے۔ انتہاپسندوں نے جو نقطۂ خیال، لگان کے بارے میں قائم کیا تھا جس مل اس کا زبردست مؤید تھا۔ اور حکومت پر زور ڈالتا تھا کہ وہ خود زمین دار بن کر تکڑی ہو اور اقتصادی عدل پر مبنی زمین کا کل لگان خود لے لے۔ اس لگان کو اس زمانہ کے ماہرین اقتصادیات اس طرح متعین کرتے تھے کہ مزدور کی اجرت اور سامانِ زراعت پر منافع کو نکال کر آمدنی میں سے جو بچ وہی سب لگان ہے۔

اونجلسٹ

اونجلسٹ کا نقطۂ نگاہ مذہبی تھا۔ ان کا خیال تھا کہ دینی فلاح اور ابدی نجات صرف اسی طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ مذہبی مسیحیت کو قبول کر لیا جائے۔ وہ ہندوستان پر برطانوی فتح کو خدا کا انصاف قرار دیتے تھے کیوں کہ وہ ان کے گناہوں کی سزا ہے۔ "یعنی ہندوستان کی وحشیانہ بت پرستی کی عظیم گمراہی کے گناہ کی یہ بدترین سزا ہے اور ایسے ظالمانہ نظام توہم پرستی سے جس نے کبھی بھی اتنی غلامی میں نہیں جکڑا باہر نکلنے کا وعدہ ہے۔" قدرتی بات ہے کہ ان کا مقصد اقوام ہند کا مذہب تبدیل کرانا تھا تاکہ وہ یورپ کے عیسائی طور طرز میں ضم ہو جائیں۔ لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ ان کی دلچسپی صرف کافروں کی روح بچانے میں تھی۔ انھوں نے کمالِ چالاکی سے یہ حساب لگایا تھا کہ انگریزیت کے رنگ میں رنگ جانے سے ان کے اندر انگریزی اشیاء کی خواہش پیدا ہوگی۔ عیسائی طریقوں کے اختیار کرنے کا لازمی نتیجہ عیسائی اشیاء کی درآمد ہوگا۔ ان نہایت قابلِ مدح اغراض کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ انگریزوں اور مسیحی مشنریوں کے یہاں آکر مقیم ہونے پر اور انگریز تاجروں اور انگریزی اشیاء کے آزادانہ یہاں آنے پر جو پابندیاں لگی ہیں وہ ہٹالی جائیں۔

مسیحیت کی تبلیغ کرنے کے لئے عیسائی حکومت کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ امن و امان کو مسلسل قائم رکھے تاکہ مشن کے اغراض کی تکمیل کے لیے جو حالات ضروری ہیں نہ پیدا ہوں لیکن وہ سب سے زیادہ زور تعلیم پر دیتے تھے کیوں کہ دماغ کی فتح تمام دوسرے مہمات میں کامیابی کے لئے ایک کنجی ہے۔

"ٹریڈیشنلسٹ" روایتی

جہاں تک مقصد کا سوال ہے روایتی طبقہ اور دوسرے دو طبقوں میں کوئی فرق نہ
تھا ان سب کا مقصد واحد برطانوی حکومت کی بنیادوں کو مضبوط کرنا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ
کچھ لوگوں کے دماغ کے سامنے یہ خیالی منظر آتا ہو کہ کبھی عرصۂ دراز کے بعد ہندوستان
آزاد ہو سکتا ہے اور کوئی میکالے اس دنیا پر ایسی نگاہ ڈالے گا کہ گویا وہ انگلستان کی تاریخ
کا سب سے زیادہ شاندار دن ہے لیکن اس بارے میں ان کے اندر کوئی مغالطہ نہ تھا کہ
وہ مبارک منظر آئندہ کے کسی ایسے زمانہ میں مکمل ہو کر دکھلائی دے گا جس کا تصور کیا جا سکے۔
ہندوستان پر عملی نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالنے پر ان کا خیال ہوتا تھا کہ ایک کلیسائی نظام کی
طرح کی گورنمنٹ سب سے زیادہ ہندوستان کے لئے موزوں ہے۔ ان کا یہ نظریہ کہ
طاقت منجانب خدا ایک امانت ہے اس نقطۂ نگاہ کی حمایت کرتا تھا کہ افسر مثل کلکٹر، گورنر
اور گورنر جنرل وقار و سکون اور الوہیت کی صفت رکھنے والے ہیں اور رعایا کو بھی یہ سمجھنا
چاہئے کہ ان حکام میں حفاظت کرنے، رزق دینے اور تباہ کرنے والے کی خدائی صفت
موجود ہے کیوں کہ اسی قسم کی حکومت ہندوستان کی روایات کے مطابق ہوگی۔ یہ لوگ انگریزیت
کے رنگ میں ہندوستانیوں کو رنگنے کے خلاف تھے کیوں کہ وہ اسے ناممکن العمل سمجھتے تھے۔
برک کی طرح یہ لوگ بھی تصوراتی اصولوں پر شبہہ کی نظر ڈالتے تھے۔ وہ تاریخ اور کلچر کے تسلسل
پر عقیدہ رکھتے تھے اور انتہا پسندانہ تبدیلیوں کی مذمت کرتے تھے۔ ماؤنٹ اسٹورٹ
الفنسٹن گورنر جنرل تنبیہ کرتا ہوا لکھتا ہے کہ "بہرحال اسے یاد رکھنا چاہئے کہ ایک منصف
حکومت بھی برکت نہیں تصور کی جائے گی اگر وہ عوام کے عادات و کردار کے تضاد پر مبنی ہو۔"[7]
اس نے مقدمات کے فیصلوں کو پنچایت کے ذریعے کرانے کی تائید ان الفاظ میں کی "امر متنازعہ
کے بارے میں ممبران کی قریبی جانکاری اور بہت سے حالات میں فریقین کے کردار سے بھی
واقفیت ایسی چیزیں ہیں جن سے ان کے فیصلے ضرور درست ہی ہوں گے اور اس کا ایک بیش
بہا فائدہ یہ بھی ہے کہ اس قسم کے ٹرائل (مقدمہ کی کارروائی) میں چوں کہ جج ان عوام سے
لئے گئے ہوں گے وہ لوگ کسی ایسے اصول پر عمل نہ کر سکیں گے جو عام طور پر سمجھے نہیں جاتے
ہیں یہ ایک ایسی کیفیت ہے جو قانون کی بے یقینی اور روک تھام کر کے مقدمہ بازی کی جڑ

پر ضرب لگاتی ہے!

"مالکوم" نے نائبین اور افسران کو جو ہدایات جاری کیں ان میں یہ نوٹ ہے کہ "ہندوستان میں ہماری طاقت کا انحصار دیسی باشندوں کی رائے عامہ اور اس بات پر ہے کہ نیک نیتی، فراست اور قوت میں ہم ان کے حکمرانوں سے بہتر ہیں۔ ان کے دماغ پر اس طرح جو اثر پڑے گا اس میں اس بات سے اسی قدر اضافہ ہو گا جس قدر ہم ان کی عادات، ان کے کرداروں اور ان کے ہم مذہب کا لحاظ رکھیں گے اور جس حد تک ہم ان سے برتاؤ کرنے میں اعتدال مزاج اور مہربانی کا مظاہرہ کریں گے۔ اور ہر اس فعل سے ہم کو نقصان پہنچے گا جس سے ان کے عقائد یا توہمات کی تحقیر ہو اور جس سے یہ ثابت ہو کہ ہم نے افراد یا قوموں کا لحاظ نہیں کیا یا ان کو نظر انداز کیا جس سے یہ ظاہر ہو کہ ہم فاتح ہونے کی اکڑ میں ان اصولوں کو بھول گئے ہیں جن سے یہ عظیم سلطنت تعمیر ہو سکی ہے اور جن کی پابندی سے ہم اسے محفوظ رکھ سکیں گے۔"

ان کے باپ کی طرح شفیق حکومت کے نظریئے میں انتظامیہ اور عدلیہ کے محکموں کا اشتراک مشترکہ بورڈوں کی بجائے انفرادی ایجنسیوں کا قیام اور لگان کے بندوبست میں رعیت داری نظام شامل ہے۔

نظم و نسق کے نشوونما کی تاریخ

یہ ضروری نہیں ہے کہ مختلف اصولوں کے علمبرداروں کی تجاویز کی تفصیلات پر بحث کی جائے یا ان دلچسپ مباحثوں کو لکھا جائے جو ان معاملات کے بارے میں ہوتے لیکن یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً ان مباحثوں سے جو نتائج نکلے ان پر نظر ڈالی جائے اور اس تنظیم کی شکل بیان کی جائے جو کارنوالس سے کیننگ تک نشوونما پا کر ابھری۔

1813ء کا ایکٹ

کمپنی کے معاملات کی جانچ 1808ء سے شروع ہوئی جب کہ دارالعوام نے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی۔ اس نے چار سال کے بعد اپنی رپورٹ پیش کی اور 1813ء کا ایکٹ اسی کی بنیاد پر بنا جس نے کمپنی کے نام چارٹر (فرمانِ شاہی) کی تجدید کی۔ جو تبدیلیاں

ہوئیں ان کے مخصوص خدوخال حسبِ ذیل ہیں:۔
(1) کمپنی کی تجارتی اجارہ داری، چائے اور چین کی تجارت کے استثناء کے ساتھ ختم کردی گئی۔
(2) کلیسا کے نظام کو ایک بطریق (بشپ) کی ماتحتی میں دے دیا گیا جس کے اخراجات ہندوستان کے محاصل سے ادا ہوں۔
(3) انگریزوں کے ہندوستان میں قیام کرنے اور جائداد حاصل کرنے کے لئے اور مشنریوں کو مفید معلومات کو پھیلانے اور مذہب اور اخلاق کی ترقی کے لئے اور تاجروں کے لئے اپنے جائز اغراض کے لئے لیسنس کے ایک نظام کے اندر تجارت کرنے کی دفعات ایکٹ میں لکھی گئیں۔

1833ء کا ایکٹ

بیس سال کے بعد 1833ء میں دستور میں پھر تبدیلی کی گئی۔ کمپنی کی چائے کی اور چین سے تجارت لے لی گئی اور اس کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنا تجارتی کاروبار ختم کردے لیکن اس کے انتظامی اور سیاسی اختیارات برقرار رکھے گئے اور ہندوستان کے اندر کی تقرریوں پر اس کا اقتدار بھی قائم رہا۔

جہاں تک ہندوستان کی حکومت کا سوال ہے گورنر جنرل کی کونسل میں چوتھے ممبر کا اضافہ قانون سازی کے اغراض کے لئے کیا گیا۔ یہ ایک اہم قدم تھا۔ اس نے مرکزی حکومت میں انتظامیہ اور عدلیہ کے کام کو الگ الگ کردیا۔ اس نے بہت سی قانون ساز اور عدل وانصاف کے لیے بااختیار جماعتوں کو جو قائم تھیں اور جن کی کارروائیوں کی حد غیر معین تھی ان کو ختم کردیا۔ ان اقتدار برتنے والوں میں بمبئی اور مدراس پریسیڈنسیوں کے گورنران ان کونسل اور گورنر جنرل بہ امداد کونسل تھے جن کے ریگولیشن جو بیشتر ایک دوسرے سے متضاد ہوتے تھے صرف کمپنی کی عدالت میں قابلِ نفاذ تھے۔

اس کے علاوہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے قوانین اپنے متنوع دفعات اور شرحوں کے ساتھ تھے اور آخر میں انگلستان کے انسٹی ٹیوٹ (ضابطے تھے) کامن لا تھا (عام قانون) اور مبنی بر حق نظریۂ انصاف تھا جن پر بادشاہ کی عدالتوں یعنی سپریم کورٹ اور رُیمیٹر،

کی عدالتوں میں عمل درآمد ہوتا تھا۔ 1833ء کے ایکٹ نے قانون سازی کے کام کو تنہا گورنر جنرل اور ان کی کونسل کے سپرد کردیا اور پریسیڈنسیوں کی حکومتوں کو قانون سازی کے کام کرنے سے محروم کردیا۔ گورنر جنرل کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ قانون اور ریگولیشن سب کے لئے بنائیں۔ خواہ وہ برطانوی ہوں یا ہندوستانی، بیرون ملک کے رہنے والے ہوں یا دیگر اشخاص اور یہ اختیار ان کو برطانیہ کے زیر حکمراں تمام علاقوں کے لئے تھا البتہ ہندوستان کے بارے میں قوانین وضع کرنے کا پارلیمنٹ کا حق اس سے متاثر نہیں ہوتا تھا۔

گورنر جنرل کو ہدایت دی گئی کہ وہ ایک "انڈین لاکمیشن" مقرر کریں تاکہ وہ عدلیہ کے نظام اور کل قوانین کی نوعیت اور ان کے نفاذ کے بارے میں جانچ کرے۔ میکالے کونسل کا چوتھا ممبر اور لاکمیشن کا چیئرمین مقرر ہوا۔ کمیشن کے سوچ بچار کا نتیجہ قانون تعزیرات ہند، قانون ضابطہ فوجداری اور دوسرے قوانین میں، خواہ وہ مستقل قانون ہوں یا محض ضابطے ظاہر ہوا۔ ایک متحدہ نظام قانون ایک یکساں عدالتی کارروائی اور ایک یکساں نظام عدلیہ ہندوستان میں وحدت پیدا کرنے کے لئے ایک طاقت ور محرک ثابت ہوا۔

1853ء کا ایکٹ

1853ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر کی آخری بار تجدید ہوئی۔ گورنر جنرل کی کونسل کو قانون سازی کے اغراض کے لئے وسیع تر کرکے بارہ ممبروں پر مشتمل کردیا گیا۔ سب کے سب تنخواہ دار افسران تھے۔ ان میں گورنر جنرل اور ان کے چار کونسلر کے علاوہ کمانڈر ان چیف، بنگال کے چیف جسٹس، ایک جونیر جج اور چار ممبران بنگال مدراس بمبئی اور صوبہ شمالی مغربی (اترپردیش) کے نمائندے کی حیثیت سے شامل تھے۔ لیجسلیٹیو کونسل (قانون ساز کونسل) کے جلسے عام کردیئے گئے اور اس کی کارروائیاں سرکاری طور پر شائع کی جاتی تھیں۔

1833ء سے کمپنی ایک تجارتی ادارہ باقی نہ رہی تھی اور تاج برطانیہ کا صرف ایک آلۂ کار ہندوستان میں گورنمنٹ چلانے کے لئے رہ گیا تھا۔ ایک وسیع مملکت پر یہ بالواسطہ حکمرانی کرنے کا طریقہ اس درجہ غیر منطقی تھا کہ اس پر تعجب ہوتا ہے کہ یہ تین چوتھائی صدی تک کیسے قائم رہا۔ بہرحال 1857ء کی بغاوت نے اس پرایک

مہلک ضرب لگائی اور 1858ء میں تاج برطانیہ نے براہ راست حکومت ہند کو اپنے انتظام میں لے لیا۔

نظم ونسق کی تبدیلیوں کے اثرات

کمپنی کی حکومت کے آخری پچاس سال کے دوران نظم ونسق کا حل تیار ہو گیا تھا۔ بنگال کے ریگولیشن نے جس کو کارنوالس نے مشتہر کیا تھا بنیاد کا کام کیا لیکن جب مختلف صوبوں میں نئی نئی حکومتیں بنائی گئیں تو نئے خیالات اور حالات کے ماتحت اور نئے تجربات کی روشنی میں ترمیمات ناگزیر ہو گئیں۔

جن مسائل سے برطانوی افسران انتظامیہ دوچار تھے وہ انتہائی پیچیدہ تھے قدرتاً اول فکر تو یہ تھی کہ اپنے ابنائے ملک کے مفاد کا تحفظ کریں اور اپنی مملکت کو دوامی بنائیں حکمران اور رعایا کے باہمی تعلقات کے مسائل کو بھی طے کرنا تھا۔ ان میں سب سے اہم امور یہ تھے کہ کہاں تک ہندوستان کی روایات کو ملحوظ رکھا جائے اور کہاں تک ان کو نامنظور۔ اور نظم ونسق میں ہندوستانیوں کو کیا حصہ دیا جائے اور حکمران اور رعیت میں سماجی میل جول کی کیا حدیں ہوں۔

کارنوالس کے نظام نے ان سب کا حل تلاش کیا تھا۔ مالگذاری کے بندوبست نے اتنے محاصل کی ضمانت دے دی تھی جو حکومت کے نظم ونسق اور کمپنی کے سرمایہ لگانے کے دُہرے کام کے لئے کافی تھی۔ ہندوستانیوں کو ایسے رسوخ حاصل کرنے کے تمام مواقع سے محروم کر دیا گیا تھا جس سے حکومت کو خطرہ لاحق ہو سکے لیکن بندوبست استمراری نے نئے مسائل پیدا کر دیئے تھے۔ اس نے صاحبانِ جائداد کا ایک طبقہ پیدا کر دیا تھا جو ممکن تھا کہ برطانیہ کی حکمرانی کے لئے ایک قابلِ لحاظ خطرہ ثابت ہو اور کاموں کی تقسیم نے انتظامیہ کے اختیارات کو کمزور اور گورنمنٹ کے وقار کو نیچا کر دیا تھا۔

1793ء کے بعد انگریز کے رویہ میں تبدیلی

جہاں تک ثقافتی اور سماجی ربط وضبط کا سوال ہے شروع میں انگریز جو تاجر اور سفیر تھے باوجود اس کے کہ اپنے میں اور ہندوستانیوں میں فرق تسلیم کرتے تھے لیکن

ان میں نسلی غرور کا نقص نہ تھا۔ ان میں بہتوں نے ہندوستان کی زبانوں کو سیکھا۔ ہندوستانی کے رہن سہن کے طریقوں اور آداب کو اختیار کیا اور دوستانہ میل جول رکھا۔ وارن ہیسٹنگز فارسی اور بنگلہ بخوبی جانتا تھا اور ولیم جونس سنسکرت کا ایک مستند عالم تھا۔ جس نے کالیداس کی "شکنتلا" کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا۔ جن ضیافتوں کا دولت مند ہندوستانی اور نوابان اور راجگان اہتمام کرتے تھے ان میں وہ آزادی سے شریک ہوتے تھے۔ اسپیر کہتا ہے کہ "دونوں جانب سے دینے اور لینے کو بہت کچھ تھا۔ انگریزوں میں ناچ دیکھنے کا شوق پیدا ہوگیا تھا۔ اور ہاتھیوں کی لڑائی اور حقہ پینے کے نئے شوق بھی پیدا ہوئے۔ دوسری جانب نوابان انگریزی کھانے اور مشروبات کے تجربے کرتے تھے۔[11] مسلمانوں میں نمکین دھوئیں میں بنائی ہوئی ران کو پسند کرنے کی رغبت پیدا ہوئی جسے وہ "ولایتی ہرن" یا انگریزی ہرن کے گوشت کا نام دے کر کھاتے تھے۔ دوستیاں بھی پیدا ہوئیں۔ ہیسٹنگز کے حلقہ میں بینی رام، اس کے بھائی بشمبھر، پنڈت گنگا گوبند سنگھ اور علی ابراہیم خاں۔

لیکن کارنوالس کے عہد نے ایک تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ دونوں جانب سے ضیافتوں کا بندوبست کم ہوگیا تھا۔ دوستی قائم کرنا ختم ہوگیا تھا اور اونچے عہدے صرف انگریزوں کے لئے مخصوص تھے "گورنمنٹ کے منصوبے زیادہ شاہانہ ہوگئے تھے اور اس کا رویہ زیادہ مغرورانہ اور علیحدگی پسندی کا ہوگیا تھا۔" ریڈیکل (انتہاپسند) اور رایون جلسٹ کی رایوں کے پھیلنے سے انگریزوں کا رویہ یکسر تبدیل ہوگیا۔ رواداری کی جگہ مذمت اور نفرت نے لے لی۔ "احساس برتری کا ایک ایسا جذبہ پیدا ہو رہا تھا جو نہ صرف ہندوستان کو ایک ایسا ملک سمجھتا تھا جس کے ادارے خراب اور جہاں کے لوگ بدکردار تھے بلکہ ایک ایسا ملک سمجھتے تھے کہ کبھی بھی اس سے بہتر نہیں ہو سکتا۔"[12] اس نے ہندوستان کے تمام بسنے والوں پر فرداً فرداً بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی کمتری کی مہر ثبت کر دی۔

زمین کا نیا بندوبست

نقطۂ نظر کے اس ماحول میں نظم و نسق کے اندر تبدیلیاں ہوئیں۔ مملکت کی وسعت کا تقاضہ تھا کہ نظم و نسق کا نظام ایسے نئے طرز کا ہو جو مالگذاری کے مختلف طریقہ کے بندوبست

پر مبنی ہو۔ بنگال کا استمراری بندوبست اس کے بہت سے پہلوؤں پر طویل بحث کے بعد فیصل کیا گیا تھا۔ لیکن اس امر میں کبھی کوئی شبہہ نہ تھا کہ بندوبست زمین داران سے کیا جائے مگر جب دکن کی لڑائیوں سے ایسے علاقے مملکت میں شامل کیے گئے جہاں پر زمین داری کا زرعی طریقہ عام طور پر رائج نہیں تھا صرف اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے رقبوں اور مقامی سرداروں تک محدود تھا تب بنگال کے نمونہ پر زمین کے انتظام کرنے کی مصلحت پر سختی سے اعتراض اٹھا۔ مرہٹوں کی شکست اور برطانوی مملکت کے دکن پر پھیل جانے سے اس علاقے میں بھی یہی مسائل پیدا ہوئے۔

اس کے علاوہ زمین دارانہ نظام سے جو امیدیں باندھی گئی تھیں وہ پوری بھی نہیں ہوئی تھیں۔ سمجھا یہ گیا تھا کہ زمین دار امن اور استحکام کے لئے دیوارِ آہن ثابت ہوں گے اور حکومت سے ان کا تعلق مخلصانہ اور پُرجوش رہے گا کیوں کہ اس کی مضبوط بنیاد خود ان کا مفاد ہوگا۔[13] لیکن عملاً نتیجہ بالکل متضاد نکلا۔ بندوبستِ استمراری کے بعد فوراً بنگال اور شمالی سرکاروں میں مقامی حکومتوں اور زمین داروں میں کشمکش شروع ہوئی جو نہ ہمیشہ "ایک طرف مکاری، جھوٹ اور فرار تک محدود تھی اور نہ دوسری جانب شہری سطح پر سختیوں ہی تک محدود تھی۔" کلکٹر قرق امین اپنے مسلح سپاہیوں اور بعض اوقات باضابطہ فوج کے ساتھ اور زمین داران اپنے مصاحبوں، پولیس اور جو کچھ بھی اپنی ذاتی حفاظت کا سامان ان کے پاس تھا اسے لے کر ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ بجائے اس کے کہ نظم ونسق میں حکومت کی مدد کرتے زمین داران اس کو پریشان کرنے سے بھی نہ چوکتے تھے۔ وہ اس بات پر ناراض ہوتے تھے کہ ان کے اور کاشت کاران کے تعلقات کی جانچ کی جائے اور جو کوشش کاشت کاران کے حقوق کو متعین کرنے کی ہوتی تھی اس کو وہ ناکام بنادیتے تھے اور کاشت کاران کو اپنی عدالتوں کے باہر انصاف طلب کرنے سے روکتے تھے۔ وہ رشوت اور بدکرداری کو بڑھاوا دیتے اور جرائم سے چشم پوشی کرتے تھے۔ زمین داروں کے علاقے لیٹروں اور ڈاکوؤں سے بھرے ہوئے تھے۔ شمالی سرکاروں میں زمین داران نے بار بار بغاوت کی۔ یہ نظامِ حکومت اور عوام کے رابطے کو ڈھیلا کرنے کے باعث ہوا۔ جب تک زمین دار اپنی مقررہ مالگذاری ادا کرتا رہتا اس وقت تک وہ جو کرنا چاہے حکومت اس کو کرنے دیتی تھی۔ اور کلکٹر تقدیر کی

طرح پس پشت چلا جاتا تھا اور روزمرہ کی زندگی میں اس کا بالکل خیال نہ کیا جاتا تھا۔ گورنمنٹ کو اندرونِ ملک کی کوئی واقفیت نہ تھی اور کوئی حقیقی رابطہ اس کا عوام سے نہ تھا۔ ان سب نے ملک پر قابو رکھنے کی حکومت کی اہلیت کو متاثر کیا اور اس کی طاقت کو کمزور کر دیا۔"[14]

دوسری دشواریاں بہت جلد محسوس ہونے لگیں۔ بندوبستِ استمراری نے گورنمنٹ کو اضافۂ لگان سے مستفیض ہونے سے محروم کر دیا جو اقتصادی حالات میں عام بہتری کا لازمی نتیجہ تھا۔ اور کل اضافۂ لگان جو بلا محنت حاصل ہوتا زمین داران کے حوالے کر دیا گیا۔ دوسرے اگرچہ بندوبستِ استمراری نے مٹھی بھر زمین داران کو فائدہ پہنچایا لیکن اس نے کاشت کاروں کی عظیم تعداد کے مفاد کو قطعی نظرانداز کر دیا جن کی بے زاری اور بے اطمینانی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی بھی ہمدردی کی مستحق نہیں سمجھی جاتی تھی۔ منرو نے لکھا ہے "یہ ایک غیر معمولی بات معلوم ہوتی ہے کہ کبھی ایسا نہ سوچا گیا ہو کہ ایک ملک کو جس طرح عام لگان کا ایک حصہ زمین داران کو دے کر فائدہ پہنچایا جاسکتا ہے اسی طرح کاشت کاران کو دے کر بھی ہو سکتا ہے جن سے سارا لگان وصول ہوتا ہے۔"[15]

ریڈ اور منرو نے بندوبستِ استمراری پر حملے کی قیادت کی اور رفتہ رفتہ ہوم گورنمنٹ کو یقین دلا دیا کہ اس نظام کو ہندوستان کے دوسرے حصوں پر نافذ کرنا عقل مندی سے بعید ہوگا۔ دارالعوام کی منتخبہ کمیٹی نے جس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات پر 1813ء میں اس کے فرمانِ شاہی کی تجدید کے قبل غور و خوض کیا تھا رعیت داری طرز کے موافق فیصلہ دیا۔

منرو نے اس بات پر زور دیا کہ "جب کسی ایک بڑے صوبہ کا بندوبست پیشِ نظر ہو تو عوام کی جماعتی خوش حالی ایک عظیم مقصد ہونا چاہیے جس کے سامنے اور تمام باتوں کو سرنگوں ہو جانا چاہیے۔"[16] منرو کا خیال تھا کہ یہ مقصد رعیت داری طرزِ نظام سے بہترین طریقہ پر حاصل ہو سکتا ہے۔ اس اعتراض کا کہ رعیت داری نظام میں کاشت کار اور محکمۂ مال کے افسر کے درمیان کوئی نہ ہوگا۔ منرو نے جواب دیا کہ "یہ اعتراض اس لئے کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے زرعی معاملات کا اعتراض کرنے والوں کو صحیح علم نہیں ہے کیوں کہ اس ملک میں زمین دار اور کاشت کار مستقل طور پر ایک دوسرے سے الگ نہیں کیے جا سکتے جیسا کہ انگلستان میں ہوا ہے۔ جائداد کی بالکل ٹھیک تقسیم ہمیشہ وہی

ہوگی جس میں بہت کم استثناء ہوگا۔ زمین دار کو ہمیشہ اپنا کھیت جوتنا چاہئے اور اس لئے لگان براہِ راست کاشت کار سے اس کو زمین کا مالک سمجھ کر وصول ہونا چاہئے۔ اور کوئی کاشت کار اور افسر مال کے بیچ نہیں ہوسکتا سوائے اس کے کہ زمین داران کو پیدا کیا جائے اور زمین دار وقت گذرنے پر یا تو چھوٹے چھوٹے شہزادے بن جائیں گے یا کاشت کار۔"

اس لئے اس کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ معاہدہ داران یعنی زمین داران کا طبقہ عالمِ وجود میں لایا جاتے" جو یہ اقرار کرتے ہیں کہ رعیت سے حکومت کو اس سے زیادہ مقررہ لگان وصول کرادیں گے جو اور کسی طریقہ سے ممکن نہ ہوگا۔"[18]

دکن میں رعیت واری بندوبست ان زرعی تعلقات پر مبنی فرض کیا جاتا تھا جو ماضی میں صدیوں سے یہاں قائم تھا۔ اس کا مطلب کاشت کاران کو اس زمین پر حقِ ملکیت دینا تھا جو وہ جوتتا تھا۔ بشرطیکہ وہ حکومت کے مطالبات ادا کرتا رہے اور اس طرح اس کی ذات میں مزدور، کاشت کار اور زمین دار تینوں کی صفتیں جمع ہوگئیں۔ یہ نظامِ حکومت اور کاشت کار دونوں کے لئے سودمند تھا۔ حکومت کا فائدہ یہ تھا کہ آئندہ لگان میں جو بھی اضافہ ہو خواہ کاشت کے وسیع ہوجانے خواہ زرعی پیداوار کی قیمت بڑھ جانے سے اس کا اسے ملنا یقینی ہوگیا۔ دوسرا فائدہ یہ تھا کہ برطانیہ کی حکومت کی حمایت کے لئے چند بڑے زمین داروں پر بھروسہ کرنے کے بجائے کاشت کاروں کا عظیم گروہ برطانوی راج کی تائید میں مل گیا۔ یہ بات اب سمجھ میں آگئی تھی کہ برطانیہ کی حکومت چند زمین داروں کی وفاداری سے زیادہ جو کاشت کاران کو لوٹ کھسوٹ کر زندگی گذارتے تھے عامۃ الناس کے مطمئن ہونے میں مضمر ہے۔ پھر کاشت کاری کی آئندہ ترقی کے لیے بھی رعیت واری نظام میں اپنے حریف زمین داری نظام سے زیادہ امکانات ہیں۔ ایک مرتبہ جیسے ہی کاشت کار کو موروثی حقوق عطا ہوجائیں گے وہ اپنی تمام طاقت اور وسائل کاشت کو ترقی دینے اور وسیع کرنے پر صرف کرے گا۔ ملکیت جائداد ایک جادو بن کر مہم جوئی کو اکسائے گی اور کاشت کاری کے معیار کو بلند کرنے میں معاون ہوگی۔

منرو نے رعیت واری نظام کی وکالت جس طرح کی اس کا خلاصہ حسبِ ذیل

الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے" یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے صنعت کی نشوونما اور ملک کی پیداوار میں اضافہ بہتر طریق پر ہو سکتا ہے کیوں کہ اسی کے ذریعہ بہ نسبت زمین داری اور جوت داری نظام کے زیادہ مالکانِ آراضی اور فارم کرنے والے بنتے ہیں اور عام مزدوروں کی تعداد گھٹ جاتی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ رعیت اپنی زمین کا مالک ہو جانے کے بعد اپنی زمین کو ترقی دینے پر بہ نسبت اس کے کہ وہ ایک زمین دار کا اسامی ہو زیادہ راغب ہو گا۔ اس کو تمام چھوٹ ملے گی بجائے اس کے کہ اُس کا ایک جزء پاتے یا کچھ بھی نہ پائے۔ اور وہ بہتر صلاحیت سے کام کر سکے گا۔ کیوں کہ ایک چھوٹا مالک اراضی زیادہ بہتر ملتیجر اور ماہر کاشت کار رہنے کی وجہ سے بھی کہ اس کو بڑے زمین داران کی نسبت اپنی زمین کو کاشت کرنے میں براہِ راست زیادہ دلچسپی ہو گی۔ اس پر زیادہ محنت صرف کرے گا جس سے زیادہ مقدار میں کھیتوں کے اندر فصل تیار ہو گی اور پھر جائیداد کی مقدار یکساں فرض کرتے ہوئے یہ بہتر ہو گا کہ وہ چالیس پچاس ہزار چھوٹے چھوٹے ملکیت داروں کے قبضے میں رہے بجائے اس کے کہ وہ چار پانچ سو بڑے بڑے زمین داروں کے قبضہ میں رہے اور چونکہ چھوٹ فوراً رعیت کو مل جائے گی اس سے اس طبقہ کی مالی حالت میں ترقی ہو گی جس سے دراصل وصول کی جاتی ہے اور اس طبقہ کے لوگ زیادہ مقدار میں غلہ پیدا کرنے کے قابل ہوں گے۔ اس طرح آبادی میں ترقی بھی ہو گی اور یہ کہ اس حساب سے کہ کس قدر رقبہ زیرِ کاشت ہے مالگذاری کو بڑھانے یا گھٹانے سے کاشت کار کو سہولت ملتی ہے بغیر اس کے کہ گورنمنٹ کو کوئی خسارہ ہو۔ اور جس قدر رعیت مالدار ہوتی جائے گی گھٹنا بڑھنا برابر کم ہوتا جائے گا حتیٰ کہ وہ صرف تالاب کی زمینوں تک محدود ہو کر رہ جائے گا۔ اور چوں کہ رعیت واری نظام کل غیر کاشت شدہ زمین کو حکومت کے ہاتھ میں باقی رکھ کر اس کو یہ قدرت عطا کرتا ہے کہ جب تک ایک ایکڑ بھی بنجر زمین ملک میں ہے بلا رعیت پر کسی نئے بوجھ کا اضافہ کیے ہوئے مالگذاری میں اضافہ کرے گا۔"[19]

رعیت وار نظام ہی وہ واحد نظام تھا جو بنگال کے باہر اس زمانہ کے حالات میں ممکن تھا۔ پھر منرو کا حوالہ دیا جاتا ہے وہ کہتا ہے کہ "یہ وہ نظام ہے جو ہمیشہ ہندوستان میں رائج رہا ہے اور یہ کہ کوئی دوسرا نظام پائیدار نہ ہو گا اور کوئی نیا نظام خواہ اس سے کسی قدر مختلف ہو اسے آخر کار اپنے کو اسی سانچے میں ڈھالنا پڑے گا کیونکہ ہر خاندان

ہیں بڑی جائدادوں کا مدت سے اوائل عمر کی اور عالمگیر شادیوں سے ٹکراؤ ہے جس سے جائداد تمام بیٹوں میں برابر تقسیم ہو جاتی ہے اور اگر لڑکے نہ ہوئے تو متبنیٰ کرنے سے یہی حالت پیدا ہوتی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ یہ جوت داری پلان سے زیادہ سادہ ہے کیوں کہ ریاستوں کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچانے کے لئے یہ کوئی ایسی مصنوعی پابندی نہیں لگاتا جو رسم و رواج اور قانونِ وراثت کے خلاف ہو کیوں کہ بڑے اور چھوٹے تمام فارموں کے مدارج کو یہ تسلیم کرتا ہے۔"[20]

زمین داری نظام سے رعیت داری نظام کا جو خاص فرق تھا وہ یہ تھا کہ اس نے بہت سے زمین داران کو ہٹا کر ان کی جگہ ایک زمین دار بنا دیا تھا یعنی حکومت۔ اس سے کاشت کاروں کو براہِ راست حکومت سے تعلق پیدا ہوا۔ جو بحیثیت واحد زمین دار کارفرما تھی۔ اس نے زمین پر کام کرنے والوں اور ملک کے حکمران کے بیچ کسی درمیانی ایجنسی کو نہیں رکھا۔ اور بہرحال اس نے کاشت کاروں کو اس زمین کا جسے وہ جوتتے تھے مالک تسلیم کیا۔

رعیت داری نظام نے عوام اور گورنمنٹ کے درمیان قریب ترین تعلقات پیدا کر دیے کیوں کہ اس نظام کا تقاضہ تھا کہ افسران براہِ راست ہر جوت کی اراضی سے لگان وصول کریں اس لئے یہ ضروری تھا کہ ہر کھیت ناپا جائے اور اس کا سروے کیا جائے اس کے حدود متعین کیے جائیں اور میڈیں بنائی جائیں۔ ان چیزوں کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ کھیت کے نقشے گاؤں کے نقشے اور تعلقہ کے نقشے مرتب کرائے جائیں اور سرویر جنرل کا ایک پورا محکمہ ان فرائض کی انجام دہی کے لیے قائم کیا جائے۔

ہر جوت کی اراضی کا لگان مقرر کرنے سے پہلے سروے کرنا ضروری ہے لیکن لگان کی تقرری کا انحصار پیداوار کے حساب پر ہے قسم زمین کا اس طرح تعین کرنا ہے کہ وہ نم ہے یا خشک، قابلِ کاشت ہے یا نم اور قبل اس کے کہ لگان کی مقدار مقرر کی جائے یہ بھی ضروری ہے کہ جتنے رقبے پر مکانات، درخت، پوکھرے، دریا، نالے، پہاڑیاں، سڑکیں ہیں اور جو رقبہ بنجر، ناقابلِ زراعت اور کنوؤں اور قبرستانوں کا ہے ان سب کی تفصیل تیار کی جائے۔ اس تخمینہ کی بنیاد پر بندوبست کرنا ہوگا اور حکومت اور رعیت کے درمیان معاہدہ بذریعہ پٹہ ہوگا۔

جو لگان مقرر ہو جائے اس کی وصولی کے لئے بھی ایک طویل کارروائی درکار ہے جو افسران اور کاشت کاران کو قریبی تعلق میں لاتی ہے۔ اگر اس بات کو دھیان میں رکھا جائے کہ سروے اور بندوبست کو ہر سال جانچنا اور ان پر نظر ثانی کرنا ہو گا تو ان کے انتظام کی وسعت اور اہمیت بالکل ظاہر ہو جائے گی۔

رعیت واری نظام جو مدراس اور بمبئی کی پریسیڈنسیوں میں رائج کیا جائے اس کے بارے میں یہ فرض کیا جاتا ہے کہ اس کے بنیادی اصول اس نظام سے قریبی مماثلت رکھتے تھے جو یہاں پہلے سے جاری تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے بنیادی اصول اس طرح قدیم رسم ورواج سے دور ہٹ گئے تھے جس طرح کہ زمین داری نظام بنگال میں۔ اس نے زمین پر انفرادی ملکیت کا حق قائم کیا۔ گاؤں کی زندگی کی وحدت اور ایکتا کو ختم کر دیا اور کاشت کار کو محکمۂ مال کے افسران کے ظلم کے پنجے کے نیچے کھڑا کر دیا جو ان سالوں میں بھی لگان کا مطالبہ کرتے اور اسے وصول بھی کر لیتے تھے جب کہ قحط پڑ جاتا اور زمین سے کوئی غلہ پیدا ہی نہ ہوتا تھا اور کاشت کار کے پاس حکومت کے مطالبہ کی ادائیگی کی کوئی سبیل نہ تھی۔

مارکوئس ہیسٹنگز نے مرہٹوں سے لڑائیوں میں جو فتوحات حاصل کیں ان کے نتیجہ میں گنگا کی وادی برطانوی راج کے اندر آگئی۔ بعد ازاں پنجاب، اودھ اور ناگپور کو شامل کر کے ہندوستان پر برطانیہ کی مملکت مکمل ہو گئی۔

قدرتاً ان علاقوں کا اس کے بعد بندوبست بھی ہوا۔ یہاں نئے نئے طریقے آزمائے گئے جن کے کچھ خدوخال تو بنگال کے زمین داری نظام سے مستعار لئے گئے تھے اور بعض دکن کے رعیت وار نظام سے اور جن میں بعض طبع زاد جدید اجزا بھی تھے۔

گنگا کی وادی میں جس کا اس وقت "صوبہ ممالک شمالی مغربی" نام تھا اور اب اتر پردیش ہے گورنمنٹ نے ہر گاؤں کو ایک اکائی بنا کر ہر گاؤں سے ادائیگی لگان کا معاہدہ کیا۔ ہالٹ میکنزی کے مشورے پر 1822ء کے ریگولیشن کا اجرا ہوا جس نے گاؤں کا نظام قائم کیا۔ اس کا اہم رنگ روپ یہ تھا کہ حکومت نے ہر کاشت کار سے فرداً فرداً لگان کا بندوبست نہیں کیا بلکہ پورے گاؤں کے لوگوں سے بحیثیت مجموعی معاہدہ کیا۔ ہر ضلع کا لگان مقرر ہو گیا اور ایک ذمہ دار آدمی کے ذریعہ پورا گاؤں اس بات کا ذمہ دار

قرار دیا گیا کہ کل لگان ادا کرے۔ انفرادی مالکان اپنے محال کے حصہ کا لگان اس ذمہ دار آدمی کو دے دیتے تھے جو لگان کی ادائیگی کا ذمہ دار تھا۔ اس بندوبست پر وقت مقررہ پر نظر ثانی کی جاتی تھی۔ اور بالعموم یہ نظر ثانی تیس سال میں ہوتی تھی۔ "مقدم" گاؤں کا نمائندہ ہوتا تھا جو گورنمنٹ سے معاملہ کرتا تھا۔ اس کی مدد میں پٹواری رہتا تھا جو رجسٹر اور حسابات رکھتا تھا۔ کلکٹر اور تحصیلدار وقت مقررہ پر بندوبست کا کام کرتے تھے اور قانون گو پٹواری اور گاؤں کے باشندوں سے جو اطلاعات ملتی تھیں ان پر عمل کرتے تھے۔

مقررہ مدت پر بندوبست کے رواج سے عوام کا سرکاری افسران سے رابطہ پیدا ہوا لیکن بندوبست تو گاؤں سے ہوتا تھا نہ کہ افراد سے اور گاؤں کا جماعتی نظام درہم برہم نہیں ہوتا تھا۔

پنجاب میں ایک ترمیم شدہ محال داری نظام رائج کیا گیا جیسا کہ جان لارنس نے کہا ہے کہ "مالکان فرداً فرداً حکومت سے معاہدہ نہیں کرتے تھے بلکہ پورے گاؤں سے معاہدہ ہوتا تھا۔ گاؤں کی برادری مکھیا یا نمائندہ کے ذریعہ یہ طے کرتی تھی کہ اتنے سالوں تک اتنی رقم ادا ہوتی رہے گی اور یہ کرنے کے بعد وہ اس رقم کو خود آپس میں ادائیگی کے لئے اس طرح تقسیم کر لیتے تھے کہ ہر ایک کا حصہ طے ہو جاتا تھا۔ ابتدائً تو ہر آدمی خود جوتتا ہے اور اس کا خود لگان ادا کرتا ہے لیکن آخر کار وہ خود بھی ذمہ دار ہوتا ہے اور اس کے ساتھی بھی اس کے لئے ذمے دار ہوتے ہیں۔ اس طرح وہ سب ایک مشترکہ ذمہ داری کے بندھن میں بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔"[21]

سول، امورِ عامہ اور عدلیہ

کارنوالس کے جانشینوں نے حقوق کے تصفیہ کے بجائے امن اور قانون کے قیام پر اعلیٰ شخصی قانون پر عمل درآمد کی بجائے شخصی صواب دید پر اور قانونی حکومت کے بجائے فوجی حکومت پر زور دینا شروع کیا۔ نتیجتہً اختیارات ایک مرکز میں اس طرح جمع ہو گئے کہ اس کے ڈانڈے فوجی ڈسپلن سے ملتے تھے۔

کارنوالس نے ایک ضلع کے مجسٹریٹوں کو اور پولیس کو جج مجسٹریٹ کے کنٹرول میں دے دیا تھا اور مالگزاری کی وصولی کلکٹر کے کنٹرول میں زیرِ نگرانی ریونیو بورڈ کلکتہ تھی۔

اس نظام میں پہلا سوراخ اس وقت ہوا جب 1809ء میں کمشنر کا عہدہ بنایا گیا اور اس کو بہت وسیع اختیارات دے دیے گئے۔ ہر کمشنر ایک کمشنری کا انچارج ہوا تاکہ کلکٹروں کے کام کی نگرانی کرے اور ججوں اور مجسٹریٹوں اور پولیس کے انتظامات کی دیکھ بھال رکھے۔ وہ جوڈیشیل افسر بھی ہو گیا کیوں کہ سیشن جج اور صوبہ کی اپیل کی عدالتوں کے کام بھی اس کو منتقل کر دیئے گئے۔ صوبے ریونیو بورڈ اور صوبہ کی اپیل کی عدالتیں توڑ دی گئیں۔

دو سال کے بعد یہ محسوس کر کے کہ کمشنر کے سپرد بہت بھاری کام ہو گیا ہے تبدیلیاں کی گئیں۔ کمشنر کی فوجداری کے اختیارات ڈسٹرکٹ جج کو منتقل کر دیئے گئے اور جج جو کام مجسٹریٹ کی حیثیت سے کرتا تھا وہ کلکٹر کو دے دیا گیا۔ اس طرح 1831ء تک اگرچہ انصاف کی عدالتوں کا نظام امور عامہ کی علیحدہ شاخ بن گیا تھا لیکن "انتظامیہ کو ایک واحد کمان کے سلسلہ میں لے آیا گیا تھا" مال کے مقدمات میں کلکٹر میں مجسٹریٹ پولیس اور عدلیہ کے اختیارات جمع ہو گئے تھے۔ ایک درجہ وار ماتحت اسٹاف کلکٹر کو مدد دینے کے لئے لایا گیا۔

اس طرح اختیارات اور انفرادی اور ذاتی ذمہ داریوں کے اشتراک کے مربیانہ اصول کی جگہ اختیارات کی علیحدگی اور بورڈ کے ذریعہ ہونے والی مشترکہ ذمہ داری نے لے لی۔ کمشنر یا کے کمشنر اور ضلع کے افسر کے دُہرے نظام نے کارنوالس کے ڈھانچے میں مستقل طور پر ترمیم کر دی اور برطانیہ کی نو آبادی کا آزمودہ نظام بروئے کار آ گیا۔[22]

جہاں تک عدلیہ کا سوال تھا اگرچہ اس کی اہمیت باقی رہی لیکن اس کی فوقیت میں فرق آ گیا۔ جو خاص خاص تبدیلیاں 1793ء کے بعد ہوئیں انھوں نے نظام کے ہر درجہ کو متاثر کیا۔ 1801ء میں صدر دیوانی عدالت اور صدر نظامت عدالت گورنر جنرل ان کونسل سے علیحدہ کر دی گئیں۔ 1811ء میں صدر دیوانی عدالت میں ایک چیف جسٹس اور تین جونیر جج تھے جو کمپنی کے بالمعاہدہ ملازمین ہوتے تھے۔ 1831ء میں صوبہ کی اپیل کی عدالتیں توڑ دی گئیں اور ضلع کی عدالتوں کے اختیارات بڑھا دیئے گئے۔ وہ پانچ ہزار سے زیادہ کی مالیت کے ابتدائی مقدمات دیکھ سکتے تھے اور صدر امینوں کی عدالت کے فیصلوں کی اپیل بھی سنتے تھے۔ ان کے فیصلوں کی اپیل صدر دیوانی عدالت میں ہوتی تھی۔

فوجداری کے صیغہ میں صدر نظامت عدالت کی نئی تشکیل ہوئی۔ گورنر جنرل ان کونسل کی حیثیت عدالت کی جاتی رہی اوراس کی جگہ چار ججوں نے لے لی جن کی مدد میں قاضی القضاۃ اور دو مفتی رہتے تھے۔ 1831ء کے اصلاحات میں گشتی (سرکٹ) عدالتیں قائم کردی گئیں اور ضلع کی عدالتوں پر یہ فرض عائد کیا گیا کہ وہ سیشن کا کام کریں اور جیل بھیجنے یا جیل سے آزاد کرنے کے اختیارات برتیں۔

دونوں طرف ہندوستانی جوڈیشیل افسران کے اختیارات سماعت میں توسیع ہوئی۔ دیوانی کی طرف ایک صدر امین خصوصی مقرر کیا گیا جو پانچ ہزار روپئے تک کی مالیت کے مقدمات کی شنوائی کرسکتا اور ماتحت عدالتوں کی اپیلیں بھی سن سکتا تھا۔ فوجداری کی جانب صدر امین خصوصی اور دوسرے صدر امین مجسٹریٹ اوران کے ماتحتوں کو اختیار تھا کہ جو لوگ فوجداری کے مجرم ثابت ہوں ان کو سزائیں دیں۔

1832ء کے بعد اس بات کی اجازت دے دی گئی کہ ہندوستانی پنچوں اسیسروں یا جوریوں کی مدد دیوانی اور فوجداری کے مقدمات میں لی جائے۔ اب قاضیوں اور مفتیوں کی ضرورت نہیں سمجھی گئی اوران کی خدمات ختم کی جاسکتی تھیں۔ خاص کر اس وجہ سے کہ غیر مسلم لوگ مسلم لا کے مطابق ٹرائیل سے مستثنیٰ ہوگئے تھے۔

پولیس کے نظام میں بھی کچھ تبدیلیاں ہوئیں۔ موضع کے چوکیدار جو اپنی تنخواہ کے لئے زمین دار پر انحصار رکھتے تھے اور اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے تھانہ کے داروغہ کے سامنے ذمہ دار تھے اس کام کے اہل ثابت نہ ہوئے جو ان کے سپرد تھا۔ وہ جرائم کے روکنے میں ناکامیاب رہے۔ لٹیروں کے گروہ ملک کے اندرونی حصوں میں طاعون کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ ایک کوشش یہ کی گئی کہ داروغہ کی مدد کے لئے ذمہ دار آدمی مقرر کیے جائیں لیکن چوں کہ ان کو کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا وہ بہت جلد غائب ہوگئے۔ زمین داروں سے ان کے اختیارات لے لیے گئے تھے اور وہ جرائم کا پتہ لگانے اوران کو روکنے میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے تھے جو ایک ایسا کام تھا جس کی کوئی قدر نہیں تھی۔ 1808ء میں صوبہ کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کا عہدہ قائم کیا گیا۔ لیکن 1829ء میں اُسے توڑ دیا گیا۔ اس کے بعد یہ کام کمشنروں کے سپرد کیا گیا۔ دو سال بعد ضلع کے کلکٹر مجسٹریٹوں کو پولیس کے انتظامات کی نگرانی کا حق ملا اور جرائم روکنے کے واقعی فرائض ضلع کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پاس رہے جن کی امداد میں

داروغہ لوگ تھے۔

فوج

مملکت کی توسیع اور نسبتاً انگریزوں کی قلت اس بات کی ذمہ دار تھی کہ انتظامیہ کو مضبوط کیا جائے اور بڑے پیمانے پر نیچے درجے کی ملازمتوں میں ہندوستانیوں کو بھرتی کیا جائے۔ یہی ضرورت فوج میں بھی توسیع کا باعث ہوئی۔ مارکوئس آف ہیسٹنگز نے فوج کے حسب ذیل فرائض تعین کئے۔

(1) اس بات پر نظر رکھنا کہ عوام میں خود سرانہ جوش نہ پیدا ہو اور پورے ملک میں سول حکام کو بروقت مدد دینے کے لئے فوجی چھاؤنیاں قائم کرنا۔

(2) تحفظ یافتہ والیانِ ریاست کو اپنی رعایا کی بغاوت کے خطرے سے نپٹنے میں مدد کرنا۔

(3) سڑکوں کو لٹیروں اور ڈاکوؤں سے پاک رکھنا اور تاجروں کی حفاظت کرنا۔

(4) فوجی خدمت سے سبکدوش بے شمار ہندوستانی سپاہیوں کو روزگار دینا۔

(5) داتی اودھ اور مہاراجگانِ پنجاب و گوالیار جیسے خود مختار حکمرانوں کی افواج کا جوابی توڑ کرنا۔

درحقیقت شاہی افواج سے یورپی فوجیوں کی ایک مناسب تعداد ہندوستان میں لاتا ناممکن تھا۔ نہ صرف اس لئے کہ کافی تعداد میں انھیں دنیا کے دوسرے حصوں میں ان کی خدمات سے بری نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خصوصاً جب کہ ابھی جنگِ نیپولین (نیپولیانک جنگوں) کا خاتمہ نہیں ہوا تھا اور یورپ ہنگامی حالات سے دوچار تھا بلکہ خاص وجہ یہ تھی کہ یورپی افواج پر بے حد صرف کرنا پڑتا تھا۔ اور کمپنی برابر اس بات پر احتجاج کرتی تھی کہ اس کے خرچ پر اس طرح کے فوجیوں کی بڑی تعداد ہندوستان بھیجی جاتی ہے۔

فوجوں کی بھرتی کے لحاظ سے ہندوستان میں حالات انتہائی سازگار تھے۔ یہاں لائق سپاہیوں کا لازوال خزانہ موجود تھا۔ ان میں سے ایسی ذات اور طبقہ کے لوگ تھے جن کا پیشہ سپہگری تھا یا ایسے بے شمار فوجی تھے جو مفتوح دیسی حکمرانوں کی ملازمت سے سبکدوش کر دیئے گئے تھے۔ یہ لوگ بہادر، سورما تھے۔ ان میں قوتِ برداشت اور فوجی

تربیت کی صلاحیت بدرجہ اُتم موجود تھی۔ ان کی نمک حلالی کی روایات نے فرائض کی انجام دہی اور حکام کے احکام کی رضا کارانہ بجا آوری میں کسی قسم کا ٹکراؤ نہ ہونے دیا۔ علاوہ ازیں وہ سستے بھی تھے۔

کارنوالس کی واپسی کے وقت کمپنی کے لشکر کی تعداد 70000 تھی جس میں سے صرف 13500 انگریز تھے۔ 1826ء تک یہ تعداد بڑھ کر 281000 ہو گئی جن میں سے 10541 کمپنی کے یورپی سپاہی تھے اور تقریباً 22000 کا تعلق شاہی افواج سے تھا۔ 1857ء سے کچھ پہلے فوج میں 311374 سپاہی تھے جن میں سے 45522 یورپ کے تھے[23]۔ ہندوستانی سپاہیوں کے سستے ہونے کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ سپاہی سات روپیہ ماہانہ تنخواہ پاتا تھا اور اس کے غیر کمیشن یافتہ عہدہ دار 25 روپیہ اور 67 روپیہ ماہوار پاتے تھے۔ 1856ء کی ہندوستانی فوج میں جس کی قوت 275000 سپاہیوں کی تھی، صرف تین عہدہ دار ایسے تھے جو 300 روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔

کارنوالس نے اپنی ہندوستان مخالف حکمتِ عملی کا بھرپور مظاہرہ فوج کی تنظیم میں کیا۔ 1784ء کے بعد کپتان سے نیچے درجے کے یورپی فوجی افسران ہندوستانی لشکر کی کمان پر مقرر کئے گئے۔ 1790ء اور 1796ء کے درمیان فوج کی نئی تشکیل کے ماتحت توسیع کی گئی اور ہر ایک فوجی دستہ میں 9 یورپی افسران تعینات کئے گئے۔ 1848ء میں 750 یا 800 سپاہیوں کے پیدل دستہ میں 24 یورپی افسران اور گھوڑ سوار دستے میں 20 افسران تھے۔ 1826ء کے آغاز سے کوئی ہندوستانی فوجی کمانڈر کے عہدے تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ سر ہنری لارنس نے ایک ہندوستانی رسالہ دار کو یہ کہتے سنا کہ "ہم بغیر امید پڑے پڑے سڑتے ہیں"۔ کرنل ولزلی جیسی شخصیت نے جو بعد میں ڈیوک آف ولنگٹن ہوئے ہندوستانی افسران کے اخراج پر اظہارِ افسوس کیا۔

حکومتِ برطانیہ کا نیم فوجی کردار

یہ بات برطانوی حکمتِ عملی کے عمومی مزاج کے عین مطابق تھی کہ ہندوستان کے نظم و نسق میں فوج محض ظاہری نہیں بلکہ ایک اہم کردار ادا کرے۔ حالات کا تقاضہ تھا کہ نئے مقبوضہ علاقوں کے امورِ عامہ کو فوری طور پر عہدے داروں کے سپرد کر دیا جائے

اور یہ اقدام حیرت انگیز نہ تھا کہ پنجاب، سندھ اور اس سے پہلے شمالی، جنوبی اور وسطی ہندوستان کے حاصل شدہ اضلاع فوجی حکام کی نگرانی میں دے دیے گئے تھے۔ غیر معمولی دلچسپی کی بات یہ ہے کہ کئی ایک سول محکموں کا نظم فوجی عملے کے ہاتھ میں تھا۔ دیسی ریاستوں کے معاملات سے متعلق سیاسی محکمہ مکمل طور سے ان کی اجارہ داری میں تھا۔ ریزیڈنسیاں (عملداریاں) اور اقتصادی منڈیاں ان کے تنہا تصرف میں تھیں۔

دوسرا محکمہ پولیس کا تھا جو بڑی حد تک فوج پر تکیہ کرتا تھا۔ حکومت کے اس گشتی اعلانیہ کے باوجود جس میں عوامی تحریک کو دبانے کے لیے فوج کی طلبی کی مذمت کی گئی تھی، مجسٹریٹوں نے فوج طلب کرنا جاری رکھا۔ امن عامہ سے متعلق ان کے فرائض میں اتنا اضافہ ہوا کہ نصف فوجی دستہ بھی مستقل طور سے فوجی چھاؤنیوں پر موجود نہیں رہ پاتا تھا۔ فوجی چوکیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور پولیس چوکیوں پر بھی فوج کا تسلط قائم ہو گیا۔ مختلف مقامات پر خزانے کی بہ حفاظت منتقلی اور کلکتہ سے دوسرے شہروں تک ساز و سامان کی نقل و حرکت فوجی عملے کی زیر نگرانی ہوتی تھی۔ انھیں قیدیوں کو بھی اپنی تحویل میں رکھنا پڑتا تھا۔ بنگال میں "صوبائی فوجی دستے" محکمۂ پولیس سے وابستہ ہوتے تھے۔ لیکن بینٹنک نے اس دستور کو ختم کر دیا۔ بمبئی پریسیڈنسی میں شمالی اور جنوبی خاندیش کے لئے فوجی محافظ تعینات کئے گئے۔ پنجاب میں 8100 سپاہ جس میں دو تہائی پیدل اور ایک تہائی سوار تھے پولیس کے فرائض انجام دیتی تھی۔ سندھ میں بھی فوج پولیس کا کام کرتی تھی۔

ان مخصوص محکموں کے علاوہ دوسرے کئی امور فوج کے ذمہ تھے۔ اس نے محکمۂ پیمائش کی تنظیم کی اور مالگذاری کے عملہ کو ضابطۂ پیمائش سکھایا۔ سڑکوں کی تعمیر خصوصاً رسل و رسائل کے لئے ریلوں کا نظام فوج ہی سے متعلق تھا۔ اس طرح سے پنجاب میں سکھوں پر نگاہ رکھنے کے لئے سڑک کا نظام قائم کیا گیا اور ڈلہوزی نے دفاع کے مقاصد کے پیش نظر گرانٹ ٹرنک روڈ کی توسیع لاہور سے پشاور تک کی۔ ایسٹ انڈیا ریلوے کی تعمیر کا کام ایک کمپنی کو سونپا گیا اور منافع کی ضمانت اس شرط پر دی گئی کہ سپاہیوں اور فوجی ساز و سامان کے نقل و حمل کو اولیت دی جائے گی۔ فوجی اور سیاسی اعتبار سے ہندوستان میں نارتھ ویسٹرن ریلوے کو اہم ترین سمجھا جاتا تھا۔ اس حقیقت پر زور دینا غیر ضروری

معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت کا استحکام اور فوج کی جارحانہ قوت (حملہ وراد صلاحیت) میں اضافہ کا انحصار لازمی طور سے بہتر ذرائع آمدورفت پر تھا۔

صحت وصفائی، جنگلات کے استعمال، ذرائع آب پاشی کی ترقی اور تعمیرِ عامہ کے کے سلسلہ میں بھی فوج کی مدد درکار ہوتی تھی۔ مالگذاری کے انتظام (امورِ مالگذاری) میں بھی فوجی حکام کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ وارن ہیسٹنگز نے ان میں سے کئی ایک کو امینِ مالگذاری کی حیثیت سے تعینات کیا تھا۔ ریڈ اور منرو رعیت داری نظام کے معمار تھے۔ رابرٹسن، برک، پالنگر، ونگیٹ، پاروبل اور سائکس نے دکن میں مالگذاری بندوبست سرانجام دیا اور جیکب نے سندھ میں۔ اگرچہ اس سلسلہ میں ان لوگوں کی خدمات کی حوصلہ افزائی نہیں کی تب بھی ان کا شمار پنجاب، سندھ اور وسطی صوبہ (مدھیہ پردیش) کی بڑی تعداد میں مالگذاری وصول کرنے والے عملہ میں ہوتا تھا۔

اس قسم کا نظامِ حکومت انگریزی سرکار کے نیم فوجی کردار کا مظہر ہے۔ ڈیوک آف ولنگٹن نے تصدیق کی کہ "ہندوستان کا طرزِ حکومت، اقتدار کی بنیاد اور اس کی تائید کا انداز نیز دستورِ حکمرانی ان اصولوں اور طریقوں سے بالکل مختلف ہے جو اسی مقصد کے لئے یورپ میں اختیار کیے گئے ہیں .... تمام اقتدار کی بنیاد اور وسیلہ محض تلوار ہے۔"[24]

گورنر جنرل کی تقرری بھی اسی نیم فوجی کردار کی شاہد ہے۔ کارنوالس ایک سپاہی تھا جس کا فوجی تجربہ بہت وسیع تھا۔ امریکہ کی جنگِ آزادی میں اس نے خدمات انجام دی تھیں۔ اس کے باوجود کہ اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا اس کا وقار قائم رہا۔ دی مارکوئس آف ہیسٹنگز بھی امریکہ کی جنگِ آزادی اور فلینڈرس میں انقلابی جنگوں میں حصہ لے چکا تھا۔ بینٹنک نے نیدرلینڈ اور اٹلی میں، آسٹریا کی افواج کے ساتھ اسپین میں جزیرہ نما کی جنگ کے دوران فوجی خدمات انجام دی تھیں۔ ہارڈنگ ایک جنگ آزمودہ سپاہی تھا جس نے نیپولین کے خلاف لڑی جانے والی جنگوں میں حصہ لیا تھا اور سکھوں کی جنگ میں ہندوستانی افواج کے چیف کمانڈر ہیوگف کے زیرِ کمان فی الواقع جنگی خدمات بہم پہنچائی تھیں۔ ولزلی، آکلینڈ اور ڈلہوزی ان پیشہ ور سپاہیوں سے بھی زیادہ عسکری ذہنیت رکھتے تھے۔ یہ لوگ نہ صرف توسیعِ سلطنت کی پالیسی کے حامی تھے بلکہ انھوں نے فوجی عملہ پر لطف وکرم کی ایسی بارش کی کہ ہنری ٹارنس کو طنزیہ تک بند نظم (ژٹل قافیہ) میں

اس طرح احتجاج کرنا پڑا۔
برطانوی سول سروس کے کلکٹروں کے علاوہ سب ہی اپنے عہدوں کے لئے کافی
ہیں۔
تمام منصب پاک و معصوم ہیں۔ سبھی جج نا اہل ہیں۔
کسی بھی حالت میں رہنے والا کوئی بھی منظورِ نظر فوجی غلطی نہیں کرتا۔
اور توپ خانے کے کرنل آسمان سے اترے ہوئے عہدیدار ہیں۔[25]

سول سروس

اس کے باوجود کہ غیر فوجی ملازمتیں حکومت کے اہم ستون تھیں شروع میں جب کہ کمپنی کی حیثیت محض ایک تجارتی ادارہ کی تھی اس کے ملازمین کی بھرتی متوسط اور نچلے طبقے سے ہوتی تھی۔ بعد میں اہم افراد جیسے امراء، تعلقدار اور سرکاری اعزاز یافتہ لوگ کمپنی کے رکن ہو گئے۔ اٹھارھویں صدی کے اوائل میں معزز خاندانوں کے افراد کمپنی کی ملازمت اختیار کرنے لگے۔ یہ لوگ اوائل عمری میں بلا کسی لیاقت کے نوآموز امیدوار کی حیثیت سے ملازم ہو جاتے تھے اور سات سال کام کرنے کے بعد کلرک کے درجہ پر فائز ہونے کے اہل ہو جاتے تھے۔ کلرک کے درجہ کے بعد جونیر گماشتہ (بعدہٗ جونیر مرچنٹ) اور سینیر گماشتہ (بعدہٗ سینیر مرچنٹ) کے درجات ہوتے تھے۔ ان کی تنخواہیں کم ہوتی تھیں۔ امیدوار کو 5 پونڈ، کلرک کو 10 پونڈ، جونیر گماشتہ کو 20 پونڈ اور سینیر گماشتہ کو 30 سے 40 پونڈ سالانہ تنخواہ ملتی تھی۔ تاہم انھیں مال کی فراہمی میں رقم لگا کر یا نجی تجارت کے ذریعہ آمدنی میں اضافہ کرنے کی اجازت تھی۔

1744 اور 1765 کے درمیان جنوبی ہند اور بنگال کی جنگوں کے نتیجہ میں تاجروں کی کمپنی صوبوں کے حکمرانوں کا ادارہ بن گئی۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ کی حصولِ دیوانی نے تجارتی سرگرمیوں کے ساتھ فرائضِ امورِ عامہ کا اضافہ کر دیا۔ جنگِ پلاسی کے بعد کے تیس سال انتشار اور ابتری کا دور تھے جب کہ ذاتی ترقی و توسیع کے بدترین رجحان کا بول بالا تھا۔ اس کے خطرناک نتائج برآمد ہوئے۔ صوبہ بنگال غارت ہو گیا اور اگرچہ ملازمین نے اپنی جیبیں بھریں لیکن کمپنی کو بڑا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ اور اس سے

بھی زیادہ برا یہ ہوا کہ مستقبل میں اس کے مفاد خطرے میں پڑ گئے۔

کلایو کے زمانہ سے لے کر بعد تک کے حالات کو سدھارنے کی سعی کی گئی۔ رشوت خوری، بدعنوانی اور غیر قانونی تجارت کی لعنت کا خاتمہ کرنے کے لئے ضروری تھا کہ تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے اور ملازمین کی تقرری کے سلسلہ میں ذی اثر لوگوں کے دباؤ کو روکا جائے۔ کلایو کی اس تجویز کو کہ تنخواہوں میں اضافہ کرنے کے لیے نمک کی اجارہ داری سے ایک فنڈ قائم کیا جاتے کمپنی کے منتظمین نے مسترد کر دیا لیکن خود انھوں نے اعلیٰ عہدیداروں کی تنخواہوں میں اضافہ کر دیا۔ 73-1772ء میں تفتیش شدہ خدماتی معاوضہ کی رو سے بنگال کے گورنر کا مشاہرہ 23000 پونڈ سالانہ اور بلحاظ مراتب کونسل کے ممبروں کا 1500 پونڈ سے 3000 پونڈ سالانہ کر دیا گیا۔

1793ء میں یہ مسئلہ مستقل طور سے طے ہوگیا۔ جونیر گریڈ کے اسسٹنٹ عہدیدار کو 300، 400 اور 500 روپیہ ماہوار دیا گیا اور کلکٹر کو 1500 روپیہ کے ساتھ مالگذاری کی وصولی پر تقریباً ایک فی صدی کمیشن دیا جاتا تھا جس کی حد زیادہ سے زیادہ 27500 روپیہ سالانہ تھی۔

کارنوالس نے ملازمتوں کو بدعنوانیوں سے پاک کرنے کے لئے بڑی جدوجہد کی۔ ممتاز اور با اثر لوگوں کے نااہل مقربین کو عہدہ دیئے جانے کے ناقص رواج کو اس نے مضبوطی سے کچل دیا۔ ولزلی نے نوجوان سول ملازمین کی صلاحیتوں کو بہتر بنانا چاہا اور اس مقصد کے لئے اس نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ مقصد یہ تھا کہ ایسے مضامین کا ایک سہ سالہ جامع نصاب تیار کیا جائے جو فوجی طالب علموں کے لئے ضروری سمجھے گئے تھے۔ بدقسمتی سے ولزلی نے ناظمین (ڈائرکٹروں) کو ناراض کر دیا۔ اور منصوبہ میں ترمیم کی گئی جس کی رُو سے کالج مشرقی زبانوں کی درس گاہ بن گیا۔ لیکن ڈائرکٹروں نے اعلیٰ تعلیم کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ہیلی بری کالج قائم کیا جہاں تدریسی مدت دو سال تھی۔ شروع میں داخلہ کی عمر پندرہ سال تھی لیکن 1833ء میں اسے بڑھا کر سترہ برس کر دیا گیا اور عمر کی آخری حد اکیس سال مقرر کی گئی۔ کالج کے اغراض و مقاصد یہ تھے کہ ایسے افسروں کو تیار کیا جائے جو یہ محسوس کریں کہ "انھیں کچھ مخصوص روایتوں کو بدستور قائم رکھنا اور دوسرے ہاتھوں میں سونپنا ہے .... ایک سیاسی

اعتماد کو عزیز رکھنا، ذاتی اور عوامی وقار کے ضوابط کا سختی سے پابند ہونا ہے۔[26] بقول بلنٹ "جب تک آئی۔سی۔ایس۔ہیلی بری کی روایتوں کا پابند رہتا ہے وہ غلط کام نہیں کر سکتا۔"[27] لیکن میکالے کی تجویز کے مطابق سول سروس کی تقرری کے اختیارات ڈائرکٹروں سے چھین لئے گئے اور طے ہوا کہ انتخاب صرف مقابلے کے امتحان کے ذریعے کیے جائیں۔اس طرح کا پہلا امتحان 1855ء میں ہوا۔ 1857ء میں کالج بند کر دیا گیا۔

ان اصلاحات نے ایسا فولادی ڈھانچہ تیار کیا جس کی مدد سے ہندوستان میں برطانوی تسلط ڈیڑھ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ تک قائم رہا۔سول ملازمت کا قیام حقیقی معنوں میں انگریز قوم کی غیر معمولی عملی ذہانت کا قابلِ تعریف اختراع تھا۔یہ مہنگا سودا تھا۔کیوں کہ یہ دنیا میں سب سے زیادہ تنخواہ پانے والی مستقل ملازمت تھی لیکن یہ پُر وقار تھی۔اس کے اختیارات اور ذمہ داریاں عظیم تھیں۔اور اس کے اراکین کی ہمہ گیر صلاحیتیں دراصل حیرت انگیز تھیں۔اس میں سیاسی مہم کے مقصد کا جذبہ کار فرما تھا۔کیوں کہ اس کا عقیدہ تھا کہ برطانوی امن کی برکتوں کو وسیع ممالک اور بے شمار انسانوں تک پہنچانے کے مقدس فرض کو پورا کرنے کے لئے اسے وجود میں لایا گیا۔ اس نے ہندوستان کو ایک ایسا نظامِ حکومت عطا کیا جو ایک 'اعجازِ تنظیم' تھا۔

برٹش حکومت کے اثرات

نئے نظامِ سلطنت کے فوری اثرات انتہائی افسوسناک اور مایوس کن ثابت ہوئے۔اعلیٰ ملازمتوں میں ہندوستانیوں کا مکمل خاتمہ اور امورِ سلطنت میں کسی طرح کی مداخلت سے ان کی یک لخت برطرفی انتہائی خراب اور دوررس نتائج کی حامل تھی۔کمپنی کے کچھ اعلیٰ حکام کو اس طرح کے نظام کی ناشائستگی اور نادانی کا احساس تھا۔ولزلی نے کورٹ آف ڈائرکٹرس (منتظمین کی جماعت) کو لکھا "ہندوستان میں ہماری نوآبادیات کے آئینی نظام کی بنیادی خامی یہ ہے کہ اس میں کوئی ایسا طریقہ نہیں اختیار کیا گیا ہے جس کا مقصد ہماری اس نوعیت کی رعایا کی خیر خواہی حاصل کرنا ہو یا سیاسی بے چینی پر قابو پانا ہو جس کے ہاتھوں میں حکومت تھی اور وقار، دولت اور اختیارات کے کھو جانے سے پیدا ہونے والے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے

کوئی مناسب قدم اٹھائے بغیر جن کو ہم نے آمدنی، عزت اور اقتدار کے حقوق سے محروم کر دیا ہے۔"[28]

منرو لارڈ ہیسٹنگز کو بھیجے جانے والے اپنے مسودہ تجویز مورخہ 12 اگست 1817ء میں لکھتا ہے "برٹش حکومت کی طاقت اسے اس قابل بناتی ہے کہ وہ بغاوت کو کچل سکے یا ہر ایک بیرونی حملے کو پسپا کر سکے اور اپنی رعایا کو اتنا تحفظ عطا کر سکے جو دیسی ریاستوں کی رعایا کو نہیں حاصل ہے۔ اس کے قوانین اور آئینی ادارے داخلی تشدد سے ان کا بچاؤ کرتے ہیں جو دیسی ریاستوں میں ناپید ہے لیکن یہ مراعات ان کو بہت مہنگی پڑی ہیں۔ قومی کردار کی آزادی اور ان تمام اقدار کو جو قوم کو باعزت بناتی ہیں قربان کر کے انھیں حاصل کیا گیا ہے۔ برٹش صوبوں کے باشندے بغیر خوف و خطر اپنے اپنے کاروبار چلاتے ہیں........ اور پر سکون فضا میں اپنی محنت کا ثمرہ حاصل کرتے ہیں لیکن ان میں کوئی بھی امن و آشتی میں پرورش پانے والی محض حیوانی زندگی کے علاوہ اور کسی چیز کی خواہش نہیں کر سکتا۔ ان میں سے کوئی بھی قانون سازی یا اپنے ملک کی فوجی یا غیر فوجی حکومت میں حصہ بٹانے کی امید نہیں کر سکتا ہے۔ کسی ملک کے باشندے اپنی قومی آبرو کو ان اشخاص سے حاصل کرتے ہیں جو سرکاری عہدوں پر فائز ہوں یا اس کے اہل ہوں۔ جہاں ایسے لوگوں کا وجود ہی نہ ہو وہاں قوم کے کسی دوسرے طبقے میں توانائی نہیں آ سکتی۔ اس قسم کے حالات کے اثر کا مشاہدہ تمام برٹش صوبوں میں کیا جا سکتا ہے۔ جہاں کے باشندے دراصل ہندوستان کے سب سے زیادہ حقیر اور پسماندہ لوگ ہیں ایسے لوگوں سے رفعت کردار کی امید نہیں کی جا سکتی۔ جو فوجی پیشہ میں صوبیدار سے اونچا کوئی عہدہ نہیں پا سکتے۔ جہاں وہ علم بردار سے اتنا ہی کمتر ہے جتنا علمبردار سپہ سالار (چیف کمانڈر) سے اور جو غیر معمولی پیشہ میں مالی یا عدلیہ کے کسی معمولی عہدے سے زیادہ کی امید نہیں کر سکتے۔ جہاں وہ رشوت خوری سے ناکافی تنخواہ کی کمی کو پورا کرتے ہیں۔" وہ آگے کہتا ہے "اس لئے ہندوستان پر برطانوی فوجی طاقت سے قائم شدہ تسلط پوری قوم کو بلند کرنے کے بجائے ذلت پذیر کر دے گا۔ برٹش انڈیا کے علاوہ کسی ملک پر تسلط کی شاید ہی کوئی ایسی مثال ہو جہاں ملکی باشندوں کو اپنے ملک کی حکومت میں حصہ لینے کے استحقاق سے یکسر محروم کر دیا گیا ہو۔"

12 نومبر 1818ء کو اس نے دوبارہ لکھا "بیرونی فاتحین نے دیسی باشندوں کے ساتھ تشدد آمیز اور اکثر ظالمانہ سلوک کیا ہے لیکن اتنا نفرت آمیز برتاؤ کسی نے نہیں کیا ہے جتنا کہ ہم لوگوں نے، اور کسی نے بھی پوری قوم کو اس طرح ذلیل ورسوا نہیں کیا ہے کہ اسے ناقابلِ اعتماد، سچائی سے بے بہرہ اور صرف ان جگہوں پر ملازمت کرنے کا اہل سمجھا جائے جہاں ان کے بغیر کام نہ چلے۔ مقبوضہ قوم کے کردار کو اس طرح تباہ کرنے کا اقدام نہ صرف غیر فیاضانہ بلکہ غیر دانشمندانہ معلوم ہوتا ہے۔" آخر میں وہ کہتا ہے "دفاتر سے اعتماد اور مناسب مشاہرہ کا اخراج ہمارے نظامِ حکومت کا ایک جز بن چکا ہے جس سے کوئی فائدہ برآمد نہیں ہوا ہے۔"[29]

اگر برطانیہ اسی قسم کے نظامِ حکومت کے ماتحت ہو جائے جیسا کہ ہندوستان میں رائج ہے اور جس کا وہ خود آلۂ کار ہے تو اس کی ممکنہ حالت کیسی ہوگی اس کا جائزہ چند سال بعد منرو نے ان الفاظ میں لیا "فرض کیجئے برطانیہ کل کسی غیر ملکی طاقت کے زیرِ نگیں ہو جائے۔ یہاں کے باشندے حکومت میں حصہ لینے، عوامی اعزاز حاصل کرنے، اعتماد اور آمدنی کے بلند عہدے پر بھی فائز ہونے کے حقوق سے محروم کر دیئے جائیں اور ہر حالت میں انھیں ناقابلِ اعتماد سمجھا جائے تو ایسی حالت میں ان کا تمام علم، تمام مذہبی اور دنیاوی ادب انھیں اگلی دو پشتوں میں پست ذہنیت، فریبی اور بے ایمان قوم بننے سے نہیں بچا سکتا۔"[30]

الفنسٹن کہتا ہے "پورے انصاف سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ہم نے اپنی فطری ذہانت کے سرچشمہ کو خشک کر دیا اور جس طرح کی فتوحات ہم نے حاصل کیں اس سے نہ صرف یہ کہ علم و ادراک کی ترقی کی حوصلہ افزائی کا خاتمہ ہو چکا ہے بلکہ قوم کی صحیح جانکاری بھی کھو جانے اور اسلاف کے فن اور ذہانت کے کارناموں کو فراموش کیے جانے کا امکان ہے۔"[31]

جنگِ مرہٹہ کے خاتمہ پر مالکم کہتا ہے "ہماری موجودہ حالت بظاہر پرسکون ہے لیکن خطرات سے پُر ہے۔" وہ پھر کہتا ہے "کئی اسباب ہیں جو اس طرح کے مختصر وقفہ کو جنم دیتے ہیں۔ نسبتہً سرد مہر حکمتِ عملی کی طرف مراجعت اور فوری طور سے ہم پر انحصار کرنے والے ممالک میں اپنے قوانین اور ضوابط کو رائج کرنے سے خوف و

انتشار کا پیدا ہونا فطری ہے۔ یہی وقت ہے جب لوگ خواب سے جاگتے ہیں۔ خوف اور ستائش کی جگہ نفرت اور بے چینی پیدا ہوتی ہے۔ حکمران، امرا اور وہ سب افراد جو درجات و اثرات کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں دیکھتے کہ ایک نظام ہے جو اُن کے فوری زوال کا باعث ہوگا اور آخر کار انھیں فنا کر دے گا۔"

وسطی ہندوستان میں سب ہی طبقہ کے لوگوں نے انگریزی اقتدار کے قیام کو اگرچہ ایک حقیقی رحمت کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا کیوں کہ اس نے انھیں ناقابل برداشت برائیوں سے چھٹکارہ دلا دیا تھا لیکن اب والیانِ ریاست، امراء اور ملک کا فوجی گروہ اسے ایسے ملے جلے جذبات سے دیکھنے لگا ہے جس میں ان کی موجودہ حالت کے مستقلاً بنے رہنے کا بھیانک خوف غالب ہے۔

"ہماری حکومت میں لوگوں کو معاشرہ میں وہی مقام نہیں حاصل ہے جو انھیں دیسی حکرانوں کے ماتحت حاصل تھا اور نہ لوگوں میں اس نوعیت کے مقاصد کی ترغیب پائی جاتی ہے۔ ہماری حکومت انصاف پسند ہوتے ہوئے بھی سخت گیر اور سرد مہر ہے۔ اگر یہ دہشت نہیں پیدا کرتی تو کسی قسم کے جذبہ ریس کو نہیں اُکساتی۔ عوام کو تحفظ دیا گیا ہے لیکن ہمت افزائی نہیں کی گئی ہے۔ ممبران سے قلبی لگاؤ پیدا کیا گیا ہے۔ ایسا شاذ ہے کہ کوئی ہندوستانی باشندہ ظلم یا جارحیت کا شکار ہو سکے لیکن اس سے بھی زیادہ نادر یہ ہے کہ مراعات یا اعزاز سے اس کی ہمت افزائی کی جا سکے یا اونچا اٹھایا جا سکے۔"[31]

شہرت، دولت اور طاقت کے سارے راستے ہندوستانیوں پر بند کر دیے گئے تھے۔ سرکاری ملازمتوں اور ملک کے دفاع اور اس کی خوش حالی میں اضافہ کرنے سے متعلق شہری فرائض کی انجام دہی کے مواقع ختم کر دیئے گئے۔ منرو نے پیش گوئی کی تھی کہ اس طرح کی حق تلفی بے اطمینانی اور مخالفت کے جذبہ کو ہوا دے گی۔ اور اگر ایسا نہیں ہوا تو عوام کا اخلاق گر جائے گا........ اور ایک ایسی کاہل و مردہ نسل میں ڈھل جائے گا جو محض حیوانی خواہشات کی تسکین سے بالاتر کسی اور کام کے قابل نہیں رہتی۔"[32]

اسی طرح اس نے درست کہا کہ" وہ جو اپنی آزادی گنوا دیتا ہے اپنی نصف اہلیت کھو دیتا ہے........ غلام قوم اپنے حقوق اسی طرح کھو دیتی ہے جس طرح کوئی غلام۔ وہ ایک آزاد شخص کے اپنے اوپر ٹیکس لگانے، خود اپنے قانون بنانے، ان کے نافذ

کرنے یا ملک کی عام حکومت میں کوئی حصہ لینے کے حق کو کھو دیتی ہے۔ برطانوی ہندوستان ان حقوق میں سے کوئی حق بھی نہیں رکھتا ہے"[34]

ہندوستان کے اوپر ہولناک موت کا سایہ طاری تھا جس کے نیچے طبقوں کا گلا گھونٹا جارہا تھا۔ عوام مشکل سے سانس لیتے تھے۔ مسلمان اور ہندو حکمران نہتے اور تنہا کر دیئے گئے تھے۔ مسلم اور ہندو خاندانوں، قبیلوں اور ذاتوں کو جو سپاہیوں، حکمرانوں اور لیڈروں کو مہیا کرتی تھیں ذمہ داری کے عہدوں سے خارج کر دیا گیا اور غلام کسانوں کی حیثیت سے کام کرنے کے لائق کر دیا گیا۔ مسلمان اور ہندو علماء کو معاونت سے محروم کر دیا گیا اور آہستہ آہستہ اپنے پیشوں کو چھوڑنے کے لئے مجبور کیا گیا۔ جہاں تک عوام کا تعلق تھا بے انتہا بھاری مالگذاری کا تعین، وصولی کی سختی، آبادی میں اضافہ اور زمین پر دباؤ نے کسانوں کے ابتر معیارِ زندگی کو پست کر دیا۔ بلکہ حکمرانوں کی اقتصادی حکمتِ عملی کاریگروں اور دست کاروں پر تباہی لائی جس کے باعث ان میں سے بہت سے زمین مزدوروں کی حالت میں پہنچ گئے۔ دریں اثنا صنعتی ترقی کے راستہ میں پیدا کی جانے والی رکاوٹوں نے روزگار کے نئے راستوں کا پیدا ہونا روک دیا۔ 1827ء میں انگلستان کی تجارتی پالیسی کے بارے میں لکھتے ہوئے مانٹگمری مارٹن نے کہا "انگریزی تجارت کی ظالمانہ خود غرضی کے شکار مصیبت زدہ لوگوں کو اور بھی زیادہ مفلس بنانے کے لئے ہم نے حتی الوسع سب کچھ کر ڈالا ہے"[35]

شاید یہ ضروری تھا کہ ماضی ایک سخت اور دردناک موت مر جائے تاکہ حال جنم لے۔

حواشی آٹھواں باب

1۔ ٹاون سنڈ ڈبلیو۔ جے۔ ورک مین ایچ۔ بی۔ اینڈ ان زس چارج۔ اے نیو ہسٹری آف میتھوڈزم۔ صفحہ 375۔

2۔ اورٹن جے۔ کے۔ دی ایونجلسٹ روائی ول ایٹ ٹینتھ سنچوری۔ صفحہ 159۔

3۔ ایضاً۔ صفحہ 148۔

4۔ دیکھو دی اکونامک ڈیولپمنٹ آف انڈیا۔

5- اسٹوکس ایرک دی انگلش یوٹیلیرنس اینڈ انڈیا۔ صفحہ XIII۔
6- کوپ لینڈ آر ولیر فورس۔ صفحہ 317۔
7- فارسٹ جی۔ ڈبلیو۔ سیلکشنس فرام دی جنٹس اینڈ ادر آفیشیل آئی ٹینگر آف دی ماؤنٹ اسٹیورٹ الفنسٹن لندن (1884) صفحہ 57۔
8- ایضاً۔ صفحہ 355۔
9- مالکوم۔ میوآئر آف سنٹرل انڈیا۔ جلد 2۔ (1880 ایڈیشن) صفحہ 358۔
10- اسپیر ٹی۔ جی۔ پی۔ دی بناس۔ صفحہ 131۔
11- ایضاً۔ صفحہ 136۔
12- ایضاً۔
13- ایچ کول بروکس منٹس۔ پیرا 37۔ دیکھئے سلکشن آف پیپرس فرام ریکارڈس ایٹ ایسٹ انڈیا ہاؤس۔ جلد 1 (1820) صفحہ 50۔
14- دیکھئے کارس پیٹرس آر۔ دی لٹل ورلڈ آف دی انڈین ڈسٹرکٹ آفیسر (میکلان) 1918۔ بکس 1، 2 اور 4۔
15- فرمنجر ففتھ رپورٹ۔ جلد 3۔ صفحہ 504۔
16- ایضاً۔
17- ایضاً۔ صفحہ 505۔
18- ایضاً۔ صفحہ 504۔
19- ایضاً۔ جلد 3۔ صفحہ 503۔
20- ایضاً۔ صفحہ 503۔
21- دیکھئے رپورٹ آن دی ایڈمنسٹریشن آف دی پنجاب ٹریٹریز 55-1854ء۔ صفحہ 59۔
22- اسٹوکس ایرس۔ دی انگلش یوٹی لی ٹیرین اینڈ انڈیا۔ صفحہ 164۔
23- رتنا سوامی ایم۔ سم انفلوینسز ڈیٹ لیڈ دی برٹش ایڈمنسٹریٹو سسٹم ان انڈیا۔ حوالہ کتاب مذکورہ (دی ورک سائٹیڈ) او۔ پی۔ سٹ۔ صفحہ 127 وغیرہ۔
24- دی ڈیوک آف ولنگٹن، دی مارکوئیس ویلزلیز گورنمنٹ آف انڈیا حوالہ تقسیم

راے میور دی میکنگ آف برٹش انڈیا۔صفحہ 209۔

25۔ او۔ یلی۔ایل۔ایس۔ایس۔ دی انڈین سروس۔صفحہ 51۔

26۔ بلنٹ۔سر،ای۔ دی آئی،سی،ایس (لندن1937) صفحہ 56—55۔

27۔ ایضاً۔صفحہ 56۔

28۔ ویلزلی ٹو دی کورٹ آف ڈائریکٹرس۔ اپریل 22، 1799۔ ملاحظہ ہو ٹامسن اینڈ گیریٹ ۔ دی رائز اینڈ فل فل مینٹ آف برٹش رول اِن انڈیا (1953ء ایڈیشن) صفحہ 207۔

29۔ ٹامسن۔ایڈورڈ۔ دی میکنگ آف دی انڈین پرنسز۔صفحہ 275۔

30۔ بحوالہ رمینالڈ رینالڈس۔ دی ہوائٹ صاحبس ان انڈیا۔صفحہ 65۔اور رومیش دت ۔ دی اکونامک ہسٹری آف انڈیا انڈر آرمی برٹش رول (چھٹا ایڈیشن) صفحہ 163۔

31۔ فارسٹ جی۔ڈبلیو سیلکشن فرام دی منٹس اور آفیشل رائٹنگس آف الفینٹس۔ صفحہ 102۔

32۔ ٹامسن ۔ایڈورڈ۔ دی میکنگ آف دی انڈین پرنسز۔صفحہ 272۔

33۔ بحوالہ رومیش دت۔ دی اکونامک ہسٹری آف انڈیا ارلی برٹش رول۔

34۔ ایضاً۔صفحہ 165۔

35۔ ایضاً۔صفحہ 289۔

نواں باب

برطانوی حکومت کے سماجی اور اقتصادی نتائج

دیہی معاشیات کا اِنتشار

ہندوستان پر برطانوی غلبہ کی نوعیت ملک گذشتہ تمام غلبوں سے مختلف تھی۔ ماضی میں حکمرانوں کی تبدیلی کا مفہوم محض اس خاندان کا ردوبدل ہوتا تھا جو رعایا پر سیاسی طاقت کا استعمال کرتا۔ لیکن یہ سماجی ڈھانچے، معاشی نظام، مالی تعلقات یا نظامِ حکومت کو متاثر نہیں کرتا تھا۔ برطانوی حکومت میں یہ سب کچھ بدل گیا۔ اور ایک ایسا سماجی اور اقتصادی انقلاب شروع ہوا جو قدیم اداروں کی بربادی اور نئے سماجی طبقوں اور قوتوں کے ظہور کی صورت میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچا۔

ضابطۂ مالگذاری

ایسے ملکوں میں جہاں کے معاشی مسائل غالب طور سے زرعی ہوتے ہیں عوام کی آمدنی کا خاص ذریعہ اراضی ہوتا ہے۔ اور لوگ اپنی پیداوار کا ایک حصہ حکمرانوں کو امن اور قانون، دفاع اور تحفظ کی خدمات کے صلہ میں ادا کرتے رہیں۔ ہندوستانی سماج کے سرمایہ دارانہ حالات سے دوچار ہونے سے قبل اس ادائیگی کی نوعیت گاؤں اور سرکار کے مابین پیداوار کی رسدی تقسیم کی سی تھی۔ گاؤں کی حیثیت ایک انجمن امداد باہمی کی

تھی جس کے فرائض کا تعین رسم و رواج کے ذریعہ ہوتا تھا اور فرد جماعت میں ضم ہوگیا تھا۔ لیکن گاؤں کا باشندہ اور حکمران خاص طور سے اراضی کے استعمال میں دلچسپی رکھتے تھے۔ دونوں میں سے کوئی بھی اس پر قبضہ کرنے کی فکر نہیں کرتا تھا کیوں کہ غیر مزروعہ بنجر اراضی پانی اور ہوا کی طرح بکثرت تھی۔ ان حالات میں شخصی حقوق کا مسئلہ وجود میں آنا مشکل ہی تھا۔ لگان اور مالگذاری کو رسمی محصول سمجھا جاتا تھا اور لگان عائد کرنے کا احساس ناپید تھا۔ زمین کو استعمال میں لانے اور اس کی پیداوار کی تقسیم پر منحصر تعلقات عوام کی سرگرمیوں اور ان کے معاشی اور سماجی رشتوں کا تعین کرتے تھے اس لیے انھیں کی رو سے سماج کے ڈھانچے، طرز اور امور حکومت کی تشکیل ہوتی تھی۔

زرعی اقتصادی نظام کے سماجی ڈھانچہ اور دولت کی فراہمی و تقسیم کا انحصار طریقہ مالگذاری پر ہے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں جب شروع میں نوآبادیاں قائم کیں تو نئے قسم کے لگان کے طریقوں کو مروج کیا۔ اسی کے ساتھ دیہی علاقوں میں اقتصادی اور سماجی تعلقات میں ایک تبدیلی رونما ہوئی۔

1765ء میں جب ادنی صوبوں کی دیوانی یا مالگذاری کا بندوبست ایسٹ انڈیا کمپنی کو منتقل ہوا تو کمپنی کے بیوپاری (تاجر) اس نوعیت کے کوئی انتظامی فرائض کو انجام دینے کے قطعی قابل نہ تھے۔ لگان وصولی کے پرانے طرز کو جاری رکھنے کے لئے کلایو کو مجبور ہونا پڑا اور اس نے یہ کام بنگال کے نواب کے نائب دیوان پر چھوڑ دیا۔ یہ غیر اطمینان بخش ثابت ہوا اور وارن ہیسٹنگز نے پریسیڈنسی کی گورنری اختیار کرتے ہی 1772ء میں نائب دیوان کو ان فرائض سے محروم کر دیا۔ اس کے بعد ایک اطمینان بخش نظام مالگذاری ترتیب دینے اور اس کی ادائگی کی ذمہ داری کا تعین کرنے کے لیے آزمائش و فروگذاشت کا دور شروع ہوا۔ مذاکرات کے دوران کئی پیچیدہ سوالات اٹھائے گئے۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں مزروعہ اراضی کس کی ملکیت تھی، سرکار کو لگان کی ادائگی کے لیے بنیادی طور پر کون ذمہ دار تھا، زرعی پیداوار میں حکومت کا حصّہ کتنا ہوتا تھا اور کیا مغل دور کے زمین دار یا مالگذار کاشت کار زمین کے مالک تھے یا حکومت اور کاشت کار کے درمیان محض ایک کڑی تھے؟

وارن ہیسٹنگز اس مفروضہ کے ساتھ آگے بڑھا کہ تمام اراضی فرماں روا کی ملکیت

تھی اور یہ کہ درمیانی لوگ محض ایجنٹ تھے جو کاشت کاروں سے لگان وصول کرنے کے لیے محصول کے حقدار تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ موجودہ زمین داروں کو اسی حالت میں برقرار رہنے کی اجازت دی جا سکتی تھی جب وہ مالگذاری کی اتنی ہی رقم ادا کرنا قبول کرتے جتنی کھلے بازار میں نیلامی بولی بولنے والے دینے کو تیار ہوتے۔ نیلام کے وقت پرانے زمین دار نئے بولی بولنے والے کے مساوی سمجھے جاتے تھے تاکہ جہاں تک ہو سکے زیادہ سے زیادہ ہی لگان کی رقم وصول کی جا سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال میں زیادہ تر اراضی نئے نیلام بولنے والوں کو دے دی گئی۔ اس طرح بہت سے پرانے زمیندار خاندان نکال باہر کیے گئے۔ "سرکار اور زمین جوتنے والوں کے بیچ قدیم قائم شدہ کڑی" توڑ دی گئی اور زمین دار اور لگان دار کے درمیان کے قدیم رشتے کو بڑا سخت نقصان پہنچا۔

مطالبے میں بے انتہا اضافے اور سرکاری احکام کے ماتحت کلکٹروں کی طرف سے استعمال کئے جانے والے اصولی کے طریقوں نے زمین داروں کی بدحالی اور بھی فزوں کر دی۔ کاشت کار بھی محفوظ نہیں رہ سکے۔ کیوں کہ لگان کی حد درجہ زیادتی اور نئے کسانوں کی حرص کے آخری شکار وہی تھے۔ اس کا نتیجہ ٹھیکیداروں کے ذریعہ بڑے پیمانے پر کاشت کاروں کی بے دخلی اور ان پر جبر" باقی دار زمین دار، فرار ہونے والے کاشت کار اور زمین کو خیرباد کہنے والی رعیت" کی شکل میں نمودار ہوا۔ یہ دیہی تنظیم میں پڑنے والی پہلی دراڑ تھی۔

ہیسٹنگز کے اقدام سے پیدا ہونے والے افسوسناک حالات نے زمین کی ملکیت سے متعلق مفروضہ کو کھلی بحث کا موضوع بنا دیا۔ فلپ فرانسس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ فرماں روا نہیں بلکہ زمین دار زمین کا مالک ہے۔ وارن ہیسٹنگز نے اس کی مخالفت کی۔ ان مباحثوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1777ء سے 1783ء میں نئی اسکیمیں تیار کی گئیں جن سے کاشت کاروں کی حق تلفی کی بنا پر زمین داروں کی اہمیت میں اضافہ ہوا۔ اس کے بعد 1793ء میں کارنوالس نے بنگال میں استمراری بندوبست کے منصوبے کا فیصلہ کیا۔

1793ء کے استمراری بندوبست کی رو سے زمیندار اپنی جائداد کا مالک و مختارِ کل قرار دیا گیا۔ اس کو سرکاری لگان ادا کرنے کے بعد بقیہ پوری رقم مالگذاری اپنے تصرف میں رکھنے کی اجازت حاصل تھی۔ شروع میں اس کا حصہ تھوڑا ہوتا تھا۔ لگان

کا صرف گیارہ فی صد۔ جس کی وجہ سے اسے اپنی آمدنی کا بڑا حصہ سرکار کو دے دینا پڑتا تھا۔ لیکن اس حالت میں جب کہ مالگذاری کی رقم ادائیگی متعین ہو چکی تھی۔ زمین داروں کے ذریعہ کاشت کاروں سے وصول کیا جانے والا لگان بلا تعین وصراحت چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس سے زمیندار کو موقع ہاتھ آیا کہ وہ کاشت کار کو اس کی برداشت کی حد تک نچوڑ لے۔ اس طرح زمین سے اقتصادی لگان وصول کرنے کا حکومت کا فوری مقصد حل ہو گیا۔

لیکن بالآخر استمراری بند وبست نے حکومت کے مقابلہ میں زمین داروں کو زیادہ فائدہ پہنچایا کیوں کہ آبادی میں اضافہ، زراعت کی توسیع، قیمتوں میں چڑھاؤ اور اراضی کی بڑھتی ہوئی قلت کے ساتھ زمین دار کی حالت بہتر ہوئی۔ کسی جائداد پر اس کے حق وراثت کو تسلیم کرنے کے لئے اب اس کی ضرورت نہیں تھی کہ کسی باضابطہ دستاویز ملکیت کی تکمیل کی جائے یا اس کی توثیق کے لئے بخشش یا نذرانہ ادا کیا جائے۔ جیسی صورتِ حال ماضی میں تھی۔ وہ اپنی ملکیتِ اراضی کو بیع، رہن یا ہبہ کے ذریعہ کسی حاکم اعلیٰ کی اجازت کے بغیر منتقل یا بیع کر سکتا تھا۔ وہ مغل نظام حکومت کے ان تکلیف دہ ضوابط سے چھٹکارہ پا گیا جس نے اس کے اقتدار کو بہت زیادہ محدود کر دیا تھا۔ اور لگان کے علاوہ اور بھی محصول وصول کرنے اور ادائیگی کا حساب دینے کا پابند کیا تھا۔ لیکن انگلش زائیدہ زمیندار تمام سیاسی اور قومی فرائض سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اب وہ عہدِ مغلیہ کا امیر جاگیر دار نہیں رہا اور ایک ادنیٰ سرمایہ دار "نو دولتیہ رئیس" بنا دیا گیا۔

سابق لگان کے ٹھیکیدار جاگیر دار یا اصطلاح کے انگریزی مفہوم کے لحاظ سے زمین دار بن گئے جو ہندوستان میں وہی حقوق اراضی رکھتے تھے جو برطانیہ میں مالکانِ اراضی۔ مثلاً اگرچہ ہندوستان میں حکومت اور مالگذاری کے ٹھیکیدار پیداوار کے ایک حصہ پر دعویٰ تو رکھتے تھے لیکن انھیں کاشت کاروں کو ان کے پٹے کی زمینوں سے بے دخل کرنے یا من مانے ڈھنگ سے لگان میں اضافہ کرنے کا حق حاصل نہیں تھا۔ دراصل برطانوی تسلط سے پہلے ملک کے کسی بھی حصے میں زمینداروں کو دیے جانے والے لگان اور حکومت کی طرف سے وصول کی جانے والی مالگذاری کے بیچ تفریق کا وجود ہی نہ تھا۔ استمراری بند وبست نے پرانے رشتے کو ختم کر دیا اور زمین داروں کو حقوقِ ملکیت بخشا۔

زمین دار یا زرعی پٹہ دار کے رتبہ اور فرائض منصبی کی تبدیلی نے ہندوستانی

دیہات کے سماجی اور سیاسی تنظیم کو متاثر کیا اور آخر کار اس کی علیحدہ حیثیت اور خود کفیل کا خاتمہ کر دیا۔ اس تبدیلی کے دو خاص نتائج یہ تھے :۔ (1) زمین کی اجارہ داری کا قیام اور اس کی منتقلی نئے زردار طبقہ کے ہاتھوں میں جو لگائی ہوئی لاگت کا زیادہ سے زیادہ معاوضہ پانے کے سوا اراضی سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ (2) زمین داریوں اور پٹہ کی اراضیات کی شکمی داری جس کے باعث حصولِ اراضی کے لیے ہوڑ میں اضافہ کے ساتھ اصلی زمیندار اور کاشت کار کے بیچ دلالوں اور لگان وصول کرنے والے درمیانی لوگوں کا ایک سلسلہ وجود میں آیا۔

یہ تبدیلیاں مرشد قلی خاں کے زمانہ سے رونما ہوئیں جس نے بہت سے جاگیر داروں اور تعلقداروں کی جگہ نئے کسانوں کو رکھا۔ زیادہ تر ہندوؤں کو۔ اس طرح صوبہ پر برطانوی قبضہ کے وقت بنگال کے زیادہ تر زمین دار خاندان وہ تھے جو اس کی حکومت کے ابتدائی زمانہ میں وجود میں آئے تھے۔ اگرچہ ان میں سے کچھ ایسے تھے جو سو ڈیڑھ سو سال سے زیادہ کے قبضہ کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ وارن ہیسٹنگز نے اپنی مالگذاری کے بندوبست کے ذریعہ اس طبقہ کی تنظیم میں مزید انقلاب پیدا کیا۔ اس نے زمین داریوں کو نیلام کر کے لگان تعین کرنے کے طریقے کا آغاز کیا۔ اس طرح لگان لگانے کے جابرانہ انداز اور وصولی میں سختی نے حالات کو اور بھی بگاڑ دیا۔ 1793ء میں استمراری بندوبست کے نفاذ نے اس عمل کی تکمیل کر دی۔ بندوبست کے بعد کے بائیس برس کی مدت میں جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ بنگال کی نصف اراضی بیع نامہ کے ذریعہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں پہنچ گئی۔ اور زیادہ تر منتقل شدہ اراضیات نئے خریدار سوداگروں اور کلکتہ کے دولت مند طبقہ کے پاس چلی گئیں۔

اس طریقہ سے استمراری بندوبست سے پیدا شدہ زمینداروں کی پہلی پود کو سزا بھگتنی پڑی۔ لگان کا بھاری بوجھ اور بیع نامہ کرنے کا سخت قانون ان کے لیے سب سے زیادہ تباہ کن ثابت ہوا۔ حسبِ ذیل حالات برطانوی دور کے آغاز میں بنگال میں مالگذاری کی نامساوی طرز پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ٹوڈرمل کا تخمینہ	1596ء	107 لاکھ روپیہ
مرشد قلی خاں کا تخمینہ	1722ء	145 لاکھ روپیہ

علی وردی خاں کا تخمینہ	1755ء	186 لاکھ روپیہ
میر قاسم کا تخمینہ	1763ء	256 لاکھ روپیہ
کارنوالس کا تخمینہ	1793ء	286 لاکھ روپیہ

اس فہرست کی تشریح کرنے میں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ نوابوں کے عہد میں حقیقی وصولی شاذو نادر ہی مقررہ رقم کے برابر ہوتی تھی کیوں کہ سال بہ سال بھاری بقایا جات رہ جاتے تھے جب کہ کمپنی کے بقایا جات ½ 2 فی صدی سے زیادہ کبھی نہیں ہوتے تھے۔

اس طرح 65—1764ء میں مغل ایجنٹوں کے ذریعہ بنگال میں وصول کی ہوئی مالگذاری کی رقم قیمت میں 818000 پونڈ کے برابر ہوتی تھی۔ 66—1765ء میں جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے مالی نظام کا پہلا سال تھا یہ رقم 1470000 پونڈ تک پہنچ گئی۔ 91—1790ء تک اس کو 2860000 پونڈ تک پہنچا دیا گیا اور اسی سال کی وصولی کی بنیاد پر اِستمراری بندوبست کیے گئے!

1793ء میں زمینداروں کے ذریعہ وصول کیے ہوئے کل زر لگان کا 89 فی صدی کمپنی کا حصہ ہوا جب کہ انگلینڈ میں اسی دوران حکومت کو ادا کی جانے والی رقم کل زر لگان کی 5 سے 10 فی صد کے درمیان تھی۔ درحقیقت ہندوستانی زمیندار کا حصہ معمولی سے معمولی ہوتا تھا جو اس کو وصولی کی صعوبتوں کے معاوضہ کے طور پر حکومت کے لئے فرائض کو انجام دینے اور اپنے ذاتی مصارف میں اِستعمال کے لیے ملتا تھا۔ وصولی کے نظام کا بدترین پہلو یہ تھا کہ زمین داروں کو سخت پابندی کے ساتھ مقررہ دن غروبِ آفتاب سے پہلے سرکاری لگان جمع کرنا پڑتا تھا۔ اگر ٹھیک ساعت پر ادائیگی نہیں کی جاتی تو زمیندار بے دخل کر دیا جاتا تھا۔ اور پوری جائداد یا اس کے ایک حصہ کو عام نیلام کے ذریعہ فروخت کر دیا جاتا تھا۔ کسی عذر کی شنوائی نہیں کی جاتی تھی۔ اور مجبوریوں کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن ایسی حالت میں جب کہ سرکار اپنی مالگذاری نیزہ کی نوک پر وصول کرتی تھی زمیندار کو اِختیار نہ تھا کہ وہ کاشت کار کو لگان وقت سے ادا کرنے کے لیے مجبور کرے۔ بقول کلکٹر مدنا پور" وہ سب (زمین داران) کہتے ہیں کہ اس طرح کا سخت اور جابرانہ نظام ملک میں اس سے پہلے کبھی نہیں اِستعمال ہوا تھا۔ .... نیلام اور

قرقی کے طریقہ نے کچھ ہی برسوں کے درمیان بنگال میں زیادہ تر بڑے زمینداروں کو مفلسی اور بھکاری کی نوبت تک پہنچا دیا اور بنگال زرعی املاک میں اس سے زیادہ تبدیلیاں پیدا کردیں جتنی شاید اتنی ہی مدت میں کسی بھی زمانہ یا ملک میں اندرونی ضوابط کے زیر اثر رونما ہوئی ہوں۔"[2]

استمراری بندوبست کے شروع کے چند سالوں میں موجودہ زمینداروں کی طرف سے جائداد کی منتقلی نے تشویشناک صورت اختیار کرلی۔ 1796ء میں اراضیات جن کا لگان 2870061 روپیہ مندرجہ کاغذات اور تینوں صوبوں کے دسویں حصہ کے برابر تھیں ایک ہی سال کے اندر فروخت کردی گئیں۔[3] بقول بیڈن پاول 97-1796ء اور 98-1797ء کے درمیان دو برسوں میں بالترتیب 14 لاکھ اور 22.7 لاکھ ادائیگی کی اراضیات کی فروخت عمل میں آئی اور صدی کے ختم ہوتے ہوتے ندیا، راج شاہی، بشن پور اور دیناج پور کے راجاؤں کی جاگیروں کا بیشتر حصہ منتقل کردیا گیا تھا۔ بردوان کی جاگیر بری طرح کاٹ کر چھوٹی کردی گئی۔ اور بیر بھوم کے زمین دار مکمل طور سے تاراج کردیے گئے۔ متعدد چھوٹے زمینداروں کی بھی یہی حالت ہوئی۔ درحقیقت یہ کہنا کافی ہے کہ استمراری بندوبست کے فوراً بعد آنے والے دس برس کے عرصہ میں جاگیروں کی جو اس بندوبست کا موضوع بنی تھیں ساخت اور ملکیت میں مکمل تبدیلی رونما ہوئی۔[4] زمینداروں کی مصیبت اس کی موجب ہوئی کہ سرکار 1799ء کے مشہور ریگولیشن کو بنا کر ان کی مدد کرے۔ نئے قانون نے زمینداروں کو کاشت کاروں کو بے دخل کرنے، بقایاجات کی عدم ادائیگی کی صورت میں اس کے زرعی ذخیرہ اور راونداروں کے قرقی کرنے اور اسے اس کی قوتِ برداشت کی حد تک دبانے کے لئے اس کے خلاف اور دوسری کارروائیاں کرنے کے استبدادانہ اختیارات عطا کیے۔ 1799ء کے قانون نے ایک طرف بے سہارا کاشت کار طبقہ کے استحصال کے سیلاب کے دروازے کھول دیئے اور دوسری طرف لگان کے ٹھیکیدار کو اراضی کے مختارِ کل کی حیثیت سے مستقل کردیا۔

استمراری بندوبست کے ذریعہ عمل میں آنے والی تبدیلیوں کا دوسرا اثر حقوق

زمین داری کی عوامی تقسیم کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہ عمل تیزی سے ہوا۔ بہار اور بنگال 39 اضلاع میں 20 سال کے اندر جاگیروں کی تعداد 110456 کے او نچے ہندسے تک بڑھ گئی۔ ان میں سے 4. فی صد جاگیریں بڑی تھیں (ہر ایک 20000 ایکڑ سے زیادہ)، 11 فی صد اوسط رقبہ کی (500 اور 20000 ایکڑ کے درمیان) اور 88 فی صد چھوٹی (500 ایکڑ سے کم)۔ اور اس کے برخلاف انگلینڈ میں 2.4 فی صد جاگیریں 13 ایکڑ کے اوسط رقبہ کی تھیں، 12 فی صد 180 ایکڑ کی اور 85.6 فی صد 4260 ایکڑ کی[5]۔ بیس برس میں پٹنہ کمشنری میں جاگیروں کی تعداد دگنی اور ترہٹ کمشنری میں تین گنی ہو گئی۔

ان ریگولیشنس نے تقسیم در تقسیم کے رجحان کو تیز کر دیا۔ مغلوں کے عہد میں خاندان کا سربراہ زمین دار منتخب ہوتا تھا۔ انگریزوں نے اس رواج کو خیر باد کہہ دیا اور اراضی کی جائداد اور منقولہ کے وجود کو تسلیم کیا جس پر ہندوستانی قانونِ وراثت کا اطلاق ہوتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی شرکاءِ وراثت کے بیچ جائداد کی تقسیم ہونے لگی۔ پٹہ پر حاصل کی ہوئی اراضیات کے رقبہ کے چھوٹے ہوتے جانے اور غیر منافع بخش کاشت کرنے خطرے کو کورٹ آف ڈائرکٹرس نے 1808ء ہی میں محسوس کیا لیکن کوئی تدارک نہ کیا گیا۔ چوں کہ زمین داروں کے بچوں کے لیے روزگار کا کوئی متبادل ذریعہ نہ تھا اس لیے ہندوستان میں حقِ جیٹھائی رائج نہیں کیا جا سکا اور جائداد کا بٹوارہ نہیں روکا جا سکا۔

نہ صرف کاشت کی اراضیوں بلکہ لگان وصولی کے حقوق کی بھی تقسیم در تقسیم ہونے لگی۔ نئے زمین داری حقوق گرانقدر ملکیت ثابت ہوئے اور استمراری بندوبست کے صرف بیس سال بعد زمین داری کے حقوق جن کی مالیت مالگذاری کی مقررہ رقم کی گیارہ فی صد سے زیادہ نہیں تھی زمین کی تقریباً اٹھائیس فی صد سالانہ آمدنی کے بدلے فروخت کیے جا رہے تھے۔ کورٹ آف ڈائرکٹرس نے لکھا "اس لیے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زمین داروں کے محصول شروع سے ان کی برائے نام رقم سے بہت زیادہ تجاوز کر چکے ہوں گے، یا یہ کہ بالآخر من مانی وصولی سے ان کی یافت میں اضافہ ہوا ہوگا یا یہ کہ اس وقفہ میں ملک کی زرعی خوش حالی اور زرعی جائداد کی قیمت تیزی سے ضرور بڑھی ہوگی جو شاید بے مثال ہے۔"[6] ایسا ہو سکتا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ لگان وصولی کے اختیارات کی ایک اہمیت ہو گئی جو انھیں پہلے حاصل نہ تھی اور وہ

بازار میں آزادانہ طور سے خرید و فروخت کی جانے والی ایک جنس بن گئے۔ زمین، کاشت کار کے لئے پیداوار اور روزی روٹی کا ذریعہ ہونے کے بجائے سٹے بازی کی چیز بن گئی اور زردار طبقہ کے لئے منافع کمانے کا وسیلہ۔ زمین دار اپنی آمدنی کا اجارہ ایک دلال (پٹندار) کو دیتا تھا جو پھر اسے ایک اسامی (در پٹندار) کو ٹھیکہ پر دیتا تھا اور آخر الذکر بھی متعدد ماتحت اسامیوں (سہ پٹندار) سے ربط قائم کرتا تھا۔ علیٰ ہٰذا القیاس اس طرح لگان حاصل کرنے والوں کا ایک سلسلہ قائم کیا گیا اور اس برائی نے اتنی بدصورت شکل اختیار کرلی کہ کہا جاتا ہے، زمین داری کے خاتمہ کے وقت بنگال میں پٹہ کی کچھ اراضیات ایسی تھیں جہاں اصلی زمین دار اور حقیقی کاشت کار کے درمیان کچھ نہیں تو ڈیڑھ سو درمیانی مفاد والے حائل تھے۔ ہر ایک ماتحت ایجنٹ اس کڑی کے ہر دوسرے شخص سے زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا اور تمام زائد مطالبہ کی وصولی کا بوجھ آخرکار کاشت کار کے اوپر پڑتا تھا۔

جائداد سے متعلق تعلقات میں یہ تغیر ملک کے لئے بڑی اہم بات تھی۔ یہ نئے سماجی طبقوں کو معرض وجود میں لائی۔ (۱) دولت مند زمین دار جو زمین کو زیادہ سے زیادہ مالی منافع کے لئے استعمال کی جانے والی جائداد منقولہ سمجھتے تھے۔ (۲) بے دخل کیے ہوئے کاشت کار جن کے پاس کچھ باقی نہ تھا سوائے اس کے کہ اپنی محنت بیچ کر روزی کمائیں۔

دراصل درمیانی لوگ سب ہی دولت مند نہیں تھے۔ ہر ایک کا مفاد ادنیٰ ہوتا تھا۔ اور جہاں تک آمدنی کا تعلق ہے ان کی معاشی حالت کاشت کار کی حالت سے محض تھوڑی ہی بہتر تھی۔ اس طرح تقسیمِ اراضی کے عمل نے زمین دار، گماشتہ اور کاشت کار کو برابر کر دیا۔ سرایچ اسٹریچی نے اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا "ہم نے سب کچھ خاموشی سے بدل دیا۔ کاشت کار، زمین دار اور گماشتہ ریگولیشن کی ہموار کرنے والی قوت کے ذریعہ بڑی حد تک برابری کے درجہ پر پہنچا دیئے گئے ہیں۔"[2]

لہٰذا دونوں طبقوں کے درمیان مفاد کا ٹکراؤ تھا۔ مزید براں دونوں کے بیچ کوئی قدرِ مشترک نہ تھی۔ زیادہ تر زمین دار تاجر تھے جو اپنے فاضل سرمایہ کو

نفع بخش کاروبار میں لگانے کی تلاش میں اراضی خریدتے تھے۔ وہ لوگ کھیتی باڑی کے کاروبار سے ناواقف تھے اور زرعی ترقی میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے جو کاشت کاروں پر چھوڑ دی گئی تھی۔ جن کے پاس اسے پورا کرنے کے لئے نہ تو وسائل تھے، نہ جانکاری اور نہ ارادہ۔

یورپ میں زرعی انقلاب مہم زمین داروں کی طرف سے زمین پر سرمایہ لگانے اور اس کی اصلاحات کے ذریعہ برپا ہوا تھا۔ ہندوستان میں زمین دار محض لگان لینے والے غیر حاضر باش تاجر تھے جو کھیتی کی ترقی کی بہ نسبت اپنے لگان کی زیادہ پروا کرتے تھے۔ دیہی آبادی کے فطری رہنما ہونے کے بجائے کمپنی کے عہد حکومت میں ہندوستانی زمین دار غیر ملکی سیاسی طاقت کے ایجنٹ کا کردار ادا کرتے تھے۔ پابندی کے ساتھ مالگذاری کی مقررہ رقم سرکار کو ادا کرنے کی ذمہ داری کے بدلے میں انھوں نے سیاسی طور سے غیر محفوظ اور اقتصادی طور سے کمزور کاشت کار طبقہ سے من مانی رقم وصول کرنے کا حق خرید لیا۔[5] ماضی میں ہندوستان کی رعیت نے اپنی ذات میں مزدور، کسان اور زمیندار کی خوبیاں جمع کر رکھی تھیں۔ برٹش نظام مالگذاری نے زمین دار کے کردار سے مزدور اور کسان کے کرداروں کو علیحدہ کر دیا اور اس طرح استحصال کنندہ اور استحصال شدہ دو طبقوں کو جنم دیا۔

کاشت کاروں کا استحصال اور زراعت کا زوال

نئے ریگولیشن کے بدترین نتائج میں سے ایک کاشت کار کو بے انداز مصیبت کا ہدف بنانا تھا۔ جدید جاگیر دار قدیم زمینداروں سے مختلف تھے۔ ان کا سلسلہ گاؤں سے نہیں تھا۔ یہ لگان وصول کرنے والوں کی ایک جماعت تھی جو اپنی لگائی ہوئی دولت سے صرف منافع حاصل کرنے کے چکر میں رہتی اور اپنی رعیت سے غیر منصفانہ سلوک کرتی تھی۔ ایک ہی زد میں اس نے کاشت کاروں کی دخل کاری کے پرانے حقوق کو مٹا دیا اور ان کو عارضی اسامی کی حد تک گرا دیا۔ انھیں کمر توڑ مالگذاری اور بے دخلی کا شکار بنایا۔ اسامیوں کے گذارے کے لئے محض واجبی مقدار چھوڑ کر جاگیر کی پوری فاضل آمدنی وہ اپنے تصرف میں لاتی تھی۔

مختصر یہ کہ کارنوالس کا قائم کردہ نظام مغربی تصور کے مطابق ارضی جائداد کی تخلیق کا موجب ہوا۔ جاگیروں کی بار بار نیلامی نے جائداد کے بٹوارے کے قدیم حقوق کو ایسا بکاؤ مال بنا دیا جسے لوگ بلا شرکت غیرے اپنی ملکیت میں لیتے اور تصرف میں رکھتے تھے لیکن جاگیروں کے مالکان اب وہ طبقے نہیں رہے جو اپنے گاؤں یا اسامیوں کے مفاد کو ملحوظ رکھتے تھے۔ بہت سے خریدار شہروں میں رہنے والے غیر حاضر زمین دار تھے جو کبھی بھی اپنی زمینداریوں میں نہیں آتے تھے اور جن کے گماشتے اسامیوں سے مختلف زندگی گذارتے تھے۔

ساہوکار اور رعیت داری بندوبست

مدراس اور بمبئی میں رعیت داری نظام کے رائج ہونے سے پیدا ہونے والے نتائج بھی اسی طرح انقلاب انگیز تھے۔ صرف اتنا ہوا کہ زمین دار کی بجائے کاشتکار مالک ہوگیا۔ ارضی جائداد منقولہ کی منظوری نے زمین کو پٹہ پر دینے، اسے رہن اور بیع کرنے کے حقوق اُسے دے دیئے۔ ایسے حقوق جو یا تو وہ ماضی میں رکھتا ہی نہ تھا یا جو بہت محدود کر دیئے گئے تھے۔ بدقسمتی سے ان قیمتی اختیارات کی بازیابی ان حالات کے سدھارنے میں ناکام رہی۔ کیوں کہ حکومت نے ان پر بھاری لگان کا اتنا بوجھ لاد دیا کہ ان کو صرف ایک قلیل منافع حاصل ہوتا تھا۔ اس لئے اولاً ارضی جائداد کی قدر و قیمت اس حد تک گھٹا دی گئی کہ دوسروں سے اس کی خریداری غیر منافع بخش ہوگئی۔

لیکن حکومت نے جلد ہی بے انتہا لگان کی غلطی کو محسوس کر لیا اور اس میں تخفیف کرنا شروع کیا۔ اس سے بالآخر زمین کے مالک سرکار کو ادا کی جانے والی مالگذاری سے فاضل لگان پانے لگے۔ فوراً ہی زمین کی قیمتوں میں اضافہ رونما ہوا۔ جائداد منافع دینے لگی اور سرمایہ لگانے والے کو راغب کرنے لگی۔ بنگال میں دولت مند طبقہ نے حقوق زمین داری کی بے دھڑک خریداری کی۔ بمبئی اور مدراس میں یہ غیر مناسب تھا کہ کاشتکار کو بے دخل کیا جائے۔ اس لئے ساہوکاروں نے قرض دے کر کھیتوں اور فصلوں پر قبضہ کیا۔ یہ اس لئے ممکن ہوا کہ لگان کی وصولی کی سختی نے کسان کو ایسے سال میں بھی سرکاری لگان ادا کرنے کے لئے مجبور کر رکھا تھا جب فصل نہیں ہوتی تھی۔ ساہوکار اس کی جہالت اور ناعاقبت اندیشی کا فائدہ اٹھاتے اور اس کو قرض کی سہولتیں ایسی

شرطوں پر دیتے جو اس کو دائمی قرض کے جال میں پھانس لیتی تھیں۔
ایک بار کسان ساہوکار کے چنگل میں آجاتا تو وہ اپنے شکار کو قید میں رکھنے کے لئے اپنی تمام تر عیاری اور چالاکی کو استعمال کر ڈالتا تھا۔ سود کی در اتنی اونچی مقرر کی جاتی تھی کہ کاشت کار حد سے حد قرض کا بیاج ہی ادا کر پاتا۔ آمدنی کی مد میں کمی اور اُتار چڑھاؤ کے سبب زر اصل کی ادائیگی اس کی طاقت سے باہر ہوتی تھی۔ اگر کوئی قرض دار اپنی غیر معمولی مشقت اور چوکسی سے قرض کو ادا کرنے اور اپنے کو آزاد کرانے کی کوشش کرتا تھا تو اس کو ایسا کرنے بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ حساب میں گھپلا اور دستاویزات میں جعل کر دیا جاتا تھا جس کی وجہ سے سود کا بقایا قرض دار کی طرف سے اس کی ادائیگی کی بہ نسبت زیادہ تیز رفتاری سے بڑھتا تھا۔ کاشت کار خود کو بے یار و مددگار پاتا۔ کیوں کہ تحفظ کے لئے وہ کسی سے رجوع نہیں کر سکتا تھا۔ عدالتوں کے دروازے اس کے لئے کھلے تو ضرور تھے لیکن انگریزوں کے قائم کردہ عدالتی نظام کے ماتحت اسے اپنے قرض خواہ کے خلاف کامیابی کا کوئی امکان مشکل ہی سے نظر آتا تھا۔ اس کے پاس طویل مقدمہ بازی کے لئے وسائل ہوتے نہ تھے اور اگر کبھی وہ یہ راستہ اختیار کرنے کی جرأت کرتا تو اس کو ایسی دستاویز کا سامنا کرنا پڑتا جس پر اس کے انگوٹھے کا نشان ہوتا تھا اور جس کے مضمون سے وہ عموماً ناواقف ہوتا اور عدالتیں جو برٹش طرز انصاف سے سرشار ہوتی تھیں ساہوکار کی بہی اور دستاویزات کو قرض کا صحیح ثبوت مان لیتی تھیں اور ایسی جھوٹی شہادت پر ڈگری دے دیتی تھیں جسے قرض خواہ عدالت میں پیش کرتا تھا۔ اگر قرض دار عدالت میں نہیں جاتا تو ساہوکار کھیت کی پیداوار پر اپنا قانونی حق رکھتا تھا جس کو وہ بازار بھاؤ سے کم پر خرید لیتا تھا۔ لیکن اگر قرض دار عدالت میں جاتا تو ساہوکار سے کئے گئے تحریری معاہدہ کی رو سے حسبِ معمول وہ اپنی اراضی سے ہاتھ دھو بیٹھتا تھا۔
زمین داری نظام نے زمین دار (مالگذار کسان) اور اسامی کے تعلقات میں تغیر پیدا کر دیا تھا۔ رعیت داری نظام نے قرض خواہ اور قرض دار کے تعلقات کو بدل ڈالا۔ اور اس طرح دیہی سماج میں ایک دوسرے لالچی اور استحصالی عنصر کو شامل کر دیا۔
اس کے بعد دونوں طبقوں ساہوکاروں اور کاشت کاروں کے بیچ مستقل کشمکش کا آغاز ہوا۔ اول الذکر کوشش کرتا تھا کہ آخر الذکر کی محنت کی سالانہ پیداوار

کا بیشتر حصہ حاصل کرے۔ برٹش ضوابط اور برٹش قوانین ؟ کی مدد سے وہ اپنے مقصد کے حصول میں آسانی کے ساتھ کامیاب ہو جاتا تھا جیسا کہ کیپٹن ونگیٹ نے 1852ء میں کہا "قرض خواہ اور قرض دار کے درمیان یہ افسوسناک کشمکش دونوں کو مکمل طور سے بے زر کرنے والی ہے......... یہ سوچ کر مایوسی ہوتی ہے، پھر بھی اس حقیقت پر پردہ ڈالنا کمزوری ہوگی کہ یہ طبقہ طبقاتی بیر اور عوام کی پستی جو تیزی سے ملک میں پھیلتی جارہی ہے ہماری حکومت اور ہمارے قوانین کا کرشمہ ہے۔ تھوڑے لوگوں کو خوش حال بنانے کے لئے پورے عوام کی بربادی اور مفلسی کچھ اضلاع میں افسوسناک رفتار سے بڑھ گئی ہے اور تمام اضلاع میں بڑھتی جارہی ہے اور میری رائے میں برائی کا سراغ اس عظیم قوت میں ملتا ہے جو قانون قرض خواہ کے ہاتھ میں دیتا ہے۔" ساہوکار طبقہ کے بارے میں کیپٹن ونگیٹ نے آگے یہ بیان کیا کہ "ذلیل سود خوروں کا ایک گروہ تیزی سے وجود میں آرہا ہے جو تھوڑی رقم کم مدت کے لئے غیر معمولی اونچی شرح سود پر آبادی کے سب سے نچلے طبقے کو دیتا ہے جن کے پاس گاؤں کے نسبتاً زیادہ معقول مہاجنوں سے قرض حاصل کرنے کے لئے کافی ساکھ نہیں ہے۔"[15]

دکن اور شمالی ہند کے کچھ اضلاع میں شروع کے افسران بندوبست نے ایک محال داری یا مشترکہ دیہی بندوبست قائم کیا گیا۔ اس طرح کا بندوبست ملک کے قدیم طرز سے مطابقت رکھتا تھا لیکن آغاز ہی سے اس طرح کے بندوبست کے متعلق خیال تھا کہ یہ ایک عبوری اقدام ہے۔ بالآخر اس کے بجائے رعیت واری طریقہ رائج کیا جائے گا جیسا کہ مدراس کے بورڈ آف ریونیو نے 1818ء میں رائے ظاہر کی "دیہی بندوبست کا آغاز اگرچہ ہر ایک گاؤں پر مالگذاری متعین کرنے اور زمین کو مشترکہ طور سے عوام کو یا گاؤں کے مکھیا کے حوالے کرنے سے ہوا تاہم اس کا ابتدائی منشاء ہر ایک کھیت کا نہیں بلکہ ہر ایک کاشت کار کی مسلّم اراضی کا بتدریج تقسیم اور بٹوارہ کرنا تھا۔ لہٰذا جہاں کہیں گاؤں والوں کا مفاد اس بات کی اجازت دے گا مشترکہ بندوبست دھیرے دھیرے انفرادی بندوبست میں بدل جائے گا۔ اس طرح رعیت واری طریقہ کے مخصوص فوائد میں سے ایک فائدہ دیہی بندوبست میں شامل تھا۔ اس قانون کو ہمہ گیر طور سے فوراً رائج کرنا نہ تھا۔ عوام کو ایک ایسے انتظام کو قبول کرنے کے لئے مجبور نہیں کرنا تھا جو خیالی طور سے کتنا ہی مناسب رہا ہو۔ بہت ساری باتوں

میں طریقہ لگان داری قدیم دستور اور باشندوں کے حالات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ یہ امید کی گئی کہ جیسے جیسے ان کے وسائل بہتر ہوں گے اس انتظام کی رکاوٹوں پر قابو پالیا جائے گا اور چنانچہ کلکٹروں کے ذریعہ اس کو نافذ کرانے کے بجائے اس کی تائید کرانا تھا۔"

ہندوستانی متوسط طبقہ کا ظہور

رعیت داری بندوبست کے مقصودہ سیاسی نتائج کو تھیکرے کے الفاظ میں بہترین پیرایہ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ اس نظام کی موافقت کرتے ہوئے اس نے کہا "چوں کہ عموماً ہم ہندوستان کے معاملات کو انگریزی نظروں سے دیکھتے ہیں اور یورپ کے نظریات کو ہندوستانی انداز میں زیرِ عمل لاتے ہیں اس لئے یہ ضروری ہے کہ درجات کی ترتیب یا دوسرے الفاظ میں حالات کی نابرابری کے متعلق جس کو لوگ ایک منظم سماج کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کچھ کہا جائے۔

"اس لیے زمین داری سے متعلق حالات کی یہ برابری، کاشت کاروں کے بیچ زمین کی یہ عام تقسیم اگر چہ کھیتی باڑی کی ترقی کے لیے انتہائی موزوں نہ بھی ہو، ہندوستان میں پائی جانے والی جائداد کی صورتِ حال، روایات اور رواج کی اِصلاح کی مناسبت سے بہترین ہے۔ یہ ایسے ملک کے حالات کے لیے اور زیادہ موزوں ثابت ہوگی جس پر تھوڑے غیر مانوس لوگ حکومت کرتے ہیں۔ اور جہاں خودداری، بلند خیالی اور اولوالعزمی کو دبایا جانا چاہیئے۔ یہ بہت مناسب ہے کہ انگلستان میں زمین کی پیداوار کا ایک خاصہ حصہ کچھ امیر خاندانوں کی امداد کے لئے، سلطنت کی خدمت اور حفاظت کے لئے، قانون سازوں، دانش وروں اور بہادروں کو پیدا کرنے کے لئے تصرف میں لایا جائے یا دوسرے الفاظ میں لگان کا زیادہ حصہ دولت مند شرفاء اور رؤساء کو ملنا چاہیئے جن کو پارلیمنٹ میں، فوج اور بحریہ میں، سائنس اور فلاح عامہ کے شعبوں میں رہ کر اپنے ملک کی خدمت کرنا ہے۔ اِطمینان، آزادی اور بلند خیالات نے جو اس لگان کی رقم کے استعمال کی دین ہے انھیں انگلستان کو ترقی کی چوٹی پر پہنچانے کے لائق کردیا ہے ہوسکتا ہے کہ وہ لمبی مدت تک اس سے لطف اُٹھا سکیں مگر ہندوستان میں جذبۂ حکمت، آزادی اور غور و فکر کو جو عموماً دولت کی بہتات کی دین ہے دبا دیا جانا چاہیے۔ یہ امور

براہِ راست ہماری قوت اور مفاد کے مخالف ہیں۔ حالات کی نوعیت اور تمام حکومتوں کے ماضی کے تجربات کی روشنی میں اس موضوع پر زیادہ کہنا غیر ضروری ہے۔ ہمیں فوج کے سپہ سالار، سیاست داں اور قانون ساز نہیں چاہئیں۔ ہم کو ضرورت ہے جفاکش کاشت کاروں کی .... اس سیاسی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو ایسے چھوٹے مالکوں کے بیچ زمین کی عام تقسیم جو آسانی سے حکومت کے خلاف متحد نہیں ہو سکتے ایک اہمیت کی چیز ہے۔"[12]

جیسا کہ مسٹر تھیکرے نے لکھا، انگریزوں کے مقاصد میں ایک ایسا طبقہ بنانا اور اس کو ترقی دینا شامل نہ تھا جو "سلطنت کی حفاظت کے لئے قانون سازوں، دانشوروں اور بہادروں" کو فراہم کرتا ہے۔ لیکن قوانین ہمیشہ اپنے بنانے والوں کی خواہشات کے مطابق کام نہیں کرتے۔ برٹش حکومت نے نئے قوانینِ اراضی و دیوانی رائج کر کے ایک ایسا سماجی طبقہ پیدا کر دیا جس نے بالآخر اسی طاقت کو نیست و نابود کر دیا جس نے اس کو پیدا کیا تھا۔

اس طرح انگریزوں کے رائج کردہ قوانینِ اراضی زمین سے متعلق پرانے نظام کو منتشر کرنے اور ایک نئے سماجی طبقے کو وجود میں لانے کے ذمہ دار تھے۔ لگان حاصل کرنے والے جدید زمین دار، ساہوکار اور تاجر اس نئے متوسط طبقہ کے مرکزی حصے بنے جو ملک کے اندر انیسویں صدی میں ظہور پذیر ہوا۔ ان لوگوں نے ان روایاتی ذاتوں کے ساتھ مل کر جن کا پیشہ درس و تدریس یا سرکاری ملازمت تھا سب سے پہلے انگریزی تعلیم کے فوائد حاصل کئے۔ انیسویں صدی کا وکیل، ٹیچر، سرکاری ملازم، تاجر، صنعت کار اسی مختلف العناصر جماعت کے تعلیم یافتہ طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ انھیں لوگوں سے مل کر ملک کے روشن خیال فرقہ کی تشکیل ہوئی جو مشرق اور مغرب کے بیچ کی کڑی بنا اور ہندوستانیوں کو سیاسی رہنمائی عطا کی، ان کی تمنائیں اور خواہشات ہندوستان کی تمنائیں اور خواہشات بن گئیں۔

دوسری طرف بے دخل کاشت کاروں، دیہی دست کاروں اور خدمت گاروں سے جو گاؤں کے اتحاد کے زوال نیز مختلف طبقوں کے تعلقات کے تعین میں امداد کے بجائے رقابت کے رواج پانے کے سبب زرعی آبادی سے اپنا روایتی رشتہ کھو چکے

تھے، بے زمین ابھرتی مزدور والا طبقہ ملک کا پست ترین (پرولتار) طبقہ ترکیب پایا۔ کارل مارکس کے الفاظ میں "پیداوار کے طریقے یا حالات بنیادی طور سے سماجی ڈھانچہ کا تعین کرتے ہیں جو نتیجے میں رجحانات، افعال اور تہذیبوں کو جنم دیتے ہیں۔"[18] ہندوستان میں بہرحال یہ مالی رشتوں میں تبدیلی تھی جس نے سماجی انقلاب برپا کیا۔"

لہٰذا تاریخی حیثیت سے ہندوستان کے متوسط طبقہ کا ارتقا مغرب میں (اس طرح کے طبقہ) کے ارتقا سے مختلف تھا۔ وہاں کا متوسط طبقہ زیادہ تر سوداگروں اور صنعت کاروں کے ساتھ ساتھ ذی شعور اور علمی پیشوں سے متعلق افراد سے بنا تھا۔ یہ طبقے اپنی روزی کے لئے زراعت پر انحصار نہیں کرتے تھے لیکن ان میں سے چند شہرت اور نفع کے لئے جاگیریں خرید بھی سکتے تھے۔ جب کہ ہندوستان کے متوسط طبقہ کی بنیاد ملک کا نہتی نظام تھا اور بڑی حد تک زرعی محنت کے ثمرے پر گذر کرتا تھا۔ جہاں تک کسان طبقے کے استحصال کا تعلق ہے یہ جدید طبقہ حکمران طاقت کی معاونت کرتا تھا۔ اور ماتحت ایجنسی کی حیثیت سے اس کی خدمت کرنے پر قانع تھا۔

برطانوی حکومت کے شروع سال، انیسویں صدی کے درمیان تک کی مدت، انگریز حکمرانوں اور نو دولتیوں، زمین داروں، تاجروں اور ساہوکاروں کے درمیان باہمی تعاون کے رہے۔ لیکن یہ میل جول زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہا۔ اس طبقے کی فطری جبلت، تجارت، صنعت اور ملازمت میں داخل ہونے کے مواقع تلاش کرنے والی تھی لیکن اس میدان میں اس کو برطانیہ کے ان متوسط طبقوں کی سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جو ہندوستان میں برطانوی حکومت کی پشت پناہ خاص طاقت تھے۔ ہندوستان کی قومی تحریک دونوں ملکوں کے درمیانی درجہ کے لوگوں کے ٹکراؤ کا اظہار تھی۔ ایک جائداد اور رسوخ کی تمنا کرتا تھا، دوسرا پہلے ہی اسے پا چکا تھا۔

یہ نیا طبقہ یورپ میں اپنے جوڑ کی طرح منافع کے مقصد سے بھرپور تھا لیکن اس کے حصول میں تجارت اور کاروبار میں انگریزوں کی اجارہ داری اور صنعتی ترقی کے لیے وسائل اور مناسب حالات کی قلت اس کے راستے کا روڑا تھیں۔ یہ بڑی حد تک ایک شہری طبقہ تھا جس کے مفاد شہری تھے۔ اس کے اندر مغربی تعلیم کی طلب،

سرکاری ملازمت کی آرزو اور علمی پیشوں کے شوق کی نشوونما ہوئی۔ اس نے اپنے حکمرانوں کے مغربی چلن، رسم ورواج اور طور طریقوں کی اندھی تقلید کی۔ لیکن نہ تو حکمران طبقہ اس کی عزت کرتا تھا اور نہ وہ دیہی عوام جس کی بہبود وترقی کے لئے اس نے کچھ بھی نہیں کیا اس سے محبت کرتے تھے۔ پھر بھی اس طبقے نے وہ طاقت مہیا کی جس نے روایات کا طلسم توڑ دیا......... اس نے دانش وروں کا ایسا دستہ تیار کیا جو ہندوستان کی تحریکِ آزادی کا ہراول بنا۔ لیکن یہ انگریزوں کے رائج کردہ زمینی قوانین کا بالکل ہی ناگہانی نتیجہ تھا۔

گاؤں کے تنظیمی اداروں کی پراگندگی

ہندوستان میں انگریزوں کے قائم کردہ نظام مالگذاری اور سرکاری ملازموں کے ہاتھوں میں عدلیہ اور امورِ عامہ کے کاموں کے دیئے جانے کے طریقۂ عمل نے پرانے درمیانی وسیلوں، زمین داروں، کسانوں اور گاؤں پنچایتوں کے اختیارات کو سلب کردیا۔ یہ اس قدیم سماجی ڈھانچہ کے انحطاط کا باعث ہوا جس کے اندر زرعی آبادی صدیوں سے رہتی آئی تھی۔ بعد کے منتظلین نے اس انجام کو ناپسند کیا اور سر چارلس مٹکاف نے اپنی مشہور تجویز میں شمالی ہندوستان میں گاؤں کے تنظیمی اداروں کی بقا کے لئے ایک مضبوط دلیل پیش کی۔ اس نے لکھا "گاؤں کے تنظیمی ادارے چھوٹے پیمانہ کی جمہوریہ ہیں جن میں اپنی ضروریات کی وہ سب چیزیں موجود ہیں جو بیرونی اثرات سے آزاد ہیں......... وہ دائمی نوعیت کی معلوم ہوتی ہیں۔" اس نے مزید لکھا "دیہی اداروں کا اتحاد جن میں سے ہر ایک بذاتِ خود ایک علیحدہ سلطنت ہے، میں مانتا ہوں کہ کسی اور دوسرے اِتحاد سے زیادہ تمام تغیرات اور تبدیلیوں کے درمیان جسے انھوں نے بھگتا ہے، ہندوستان کے عوام کی محافظت میں مددگار ہوا ہے اور یہ ان کی خوش حالی اور آزادی، خود مختاری کے ایک بڑے حصے سے لطف اندوز ہونے میں بڑی حد تک معاون ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ گاؤں کے آئینی اداروں کو کبھی درہم برہم نہ کیا جائے، اور میں ہر اس چیز سے ڈرتا ہوں جس میں انھیں منتشر کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔" شمالی ہند میں بندوبست سے متعلق عمل درآمد کے دوران رابرٹ برڈ کی

طرف سے اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے قدم اُٹھایا گیا تھا۔ لیکن ملک کے اس حصہ میں محال داری بندوبست گاؤں کے تنظیمی اداروں کے انحطاط کے عمل کو روکنے میں ناکام رہا، کیوں کہ اگرچہ مسلّم گاؤں کی مالگذاری مقرر کر دی گئی تھی لیکن حکومت کی طرف سے زمین پر انفرادی اختیارات کی منظوری اور ضمانت دے دی گئی تھی۔ زراعت پر آبادی کے بڑھتے ہوئے دباؤ نے اراضی کو بیش قیمت جائداد بنادیا اور اس کی قیمت متواتر بڑھتی رہی۔ زرعی پیداوار کے لئے بازاروں کے کھلنے اور کسانوں کی طرف سے نقد فصلوں کے اگانے سے بھی اس طرح کے نتائج برآمد ہوئے۔ ان تبدیلیوں نے دیہی تنظیم کو بھاری نقصان پہنچایا اور " گاؤں کی جمہوریہ " جو مٹکاف کو " دوسری چیزوں کی نسبت زیادہ دائمی " معلوم پڑتی تھی شمال کے محال داری علاقوں میں اسی طرح کالعدم ہوگئی جس طرح بنگال میں زمین داری نظام اور دکن میں رعیت داری نظام کے تحت ہوئی تھی۔

قدیم دیہی تنظیم کے ٹوٹنے کے ساتھ وہ سماجی رشتے ٹوٹ گئے جنھوں نے دیہی سماج کے مختلف عناصر کو ایک ساتھ جوڑ رکھا تھا، متحدہ خاندان کے رواج اور پنچایتوں کو تباہ کن چوٹ پہنچی، باہمی تعاون کی جگہ مقابلہ (ہوڑ) نے لے لی۔ قیمتوں، لگان اور مزدوریوں کا تعین خریدنے اور فروخت کرنے والوں کے باہمی سمجھوتوں کی بنا پر ہونے لگا۔ گاؤں کی اجتماعی طرز زندگی نے شخصی انانیت کے لئے راہ ہموار کر دی۔

پیداوار کے طریقوں اور دیہی معیشت کے ڈھانچے میں بھی بنیادی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ زرعی پیداوار دیہی آبادی کی ضروریات کو پورا کرنے کے بجائے بیرونی بازار کے مطالبات کے مطابق بنائی جانے لگی۔ کسان کے روپیہ کی ضرورت میں اضافہ ہوا اور اسے حاصل کرنے کے لئے وہ نقد فصلیں اُگانے لگا۔ ماضی میں وہ صرف آب و ہوائی وجوہات کی بنا پر آمدنی کی کمی اور بیشی سے دوچار ہوتا تھا۔ اب وہ بازار کے اُتار چڑھاؤ کے باعث قسمت کے تغیرات کا سامنا کرنے لگا۔ دنیا کے کسی بھی حصہ میں زرعی پیداوار کی قیمت میں گراوٹ اس کے لئے اتنی ہی تشویش کی بات ہوتی جتنا سوکھے کی وجہ سے فصلوں کی خرابی، مقررہ وقت پر لگان کی رقم کی ادائیگی کی اہم ضرورت۔ اور سال میں نقد روپیہ کی دوسری ضروریات اسے فصل کٹنے کے فوراً ہی بعد پیداوار کو فروخت کر دینے پر مجبور کرتی تھیں۔ اس طرح کاشت کار روپیہ بچانے کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ لیکن کچھ تو

اپنے چھوٹے کھیتوں کی وجہ سے، کچھ بھاری سرکاری مالگذاری کے سبب اور کچھ زمین داروں کی طرف سے کمر توڑ لگان لگائے جانے اور ساہوکاروں کو بھاری سود کی رقم دینے کی وجہ سے وہ اس تبدیلی سے فائدہ حاصل کرنے میں ناکامیاب رہتا تھا۔ زیادہ تر فائدہ غلہ کے تاجر اور غلہ بازار کے آڑھتیے اُٹھاتے تھے۔

ملک کی دیہی معیشت میں کی جانے والی تبدیلیوں کے خراب نتائج کو بھگتنے والا صرف کاشت کار ہی نہ تھا۔ گاؤں میں بیرونی مال کی آمد نے گاؤں کی صنعت و حرفت کو بھی کاری ضرب لگائی تھی۔ گاؤں کا کاریگر اپنے لئے اِمداد اور اپنی مصنوعات کے لیے بازار کھو بیٹھا۔ ایک صنعتی کاریگر سے بدل کر وہ کبھی اسامی اور کبھی اُجرتی جفاکش کی حیثیت سے کھیتی باڑی کے کام کا متلاشی بے زمین مزدور بن گیا۔ برباد شدہ کاشت کار طبقہ کے بعد جولاہے اور گاؤں کے دوسرے کاریگر تھے جو انیسویں صدی کے پہلے نصف میں دیہی طبقہ مزدوراں (پرولتار) کے اہم ترین عنصر بنے۔

بھاری مالگذاری اور زراعت کی تنزلی

جب انگریزوں کے قائم کردہ زمینی حقوقِ ملکیت نے قدیم دیہی تنظیم کا شیرازہ بکھیر دیا، بھاری مالگذاری نے زرعی ترقی کو روک دیا اور کھیتی کرنے والی جماعتوں کو بدترین مفلسی اور عدم وسائل کی حالت میں ڈال دیا۔

اِبتدائی انگریز حکمرانوں کا نظریہ یہ تھا کہ یورپ کے برعکس ہندوستان میں زرعی اراضی فرماں روا کی ملکیت تھی۔ اور یہ کہ حقِ تسلّط کی بنا پر ہندوستان کی تمام اراضی ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملکیت ہو گئی ہے اور حکومت آقا کی حیثیت سے کل اِقتصادی لگان (از روئے اِندراجات تمام بچت) کی حق دار تھی جو کسی بھی خطۂ ارض کے لئے پیداوار پر خرچ ہونے والی لاگت کو پیدا کی ہوئی فصل کی قیمت سے نکال کر حاصل کیا جاتا تھا۔

بنگال میں اِستمراری بندوبست کے وقت تخمینہ شدہ اِقتصادی لگان 89 فی صد سرکاری مالگذاری مقرر کی گئی تھی۔ بقیہ گیارہ فی صد زمین دار کے لئے مالگذاری وصول کرنے کے حق المحنت کے طور پر چھوڑ دی گئی۔ شمالی ہندوستان میں 1822ء کے ریگولیشن VII کی دفعات کے ماتحت مالگذاری زمین کی کل پیداوار کا 80 فی صد مقرر کی گئی۔!

بمبئی پریسیڈنسی میں پہلے باقاعدہ بندوبست سے پیشتر تجرباتی بندوبست کے تحت (28-1824) مالگذاری کی شرح اتنی اونچی مقرر کی گئی تھی کہ گورنر بمبئی بروچ کے متعلق یہ لکھنے کے لئے مجبور ہوا کہ "......... یہاں کے لئے تجویز شدہ منصوبہ کے مطابق مقررہ مالگذاری سراسر ناممکن العمل ہے۔ اس پچھلے سال میں ساڑھے چار لاکھ کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ ایسی صورتِ حال ہے جس کے بارے میں مجھے خوش فہمی نہیں ہے جب کہ مالگذاری کے ذرائع اور اس میں اضافہ کرنے کے اصول مکمل طور سے اندھیرے میں ہیں"[17] ضلع احمد آباد میں گاؤں کو سب سے زیادہ بولی بولنے والے کو دیئے جانے کی کارروائی " مالگذاری کو بلند ترین حد تک کھینچنے کا رجحان "[18] رکھتی تھی۔ دکن اور خاندیش کے اضلاع مالگذاری کے بوجھ کی ایسی ہی داستان سناتے تھے۔ 1824ء میں پرنگل نے باقاعدہ پیمائش اور بندوبست کی کارروائی کا آغاز کیا —— اور 1828ء میں اس کام کو چھوڑ دیا گیا۔ مالگذاری کی رقم کے سرکاری حصہ کو پیداوار کا پچیس فی صد محدود کرنے کے اصول کو منظور کیا گیا۔ لیکن یہ صرف کاغذ پر تھا۔ عملی طور پر مالگذاری کل پیداوار کے تناسب سے کہیں زیادہ اونچی شرح پر مقرر کی گئی۔ ایسا اس وجہ سے تھا کہ زمین کی پیمائش " نہایت ناقص "تھی اور" پیداوار کے اندازے " جس پر مالگذاری منحصر تھی نہایت مبالغہ آمیز تھے"[19] دوبارہ پیمائش میں جس کو 1835ء میں مسز گولڈ سیڈ اور ونگیٹ نے شروع کیا۔ مالگذاری مقرر کرنے کا اصول ہی بدل دیا گیا۔ حکومت پیداوار کا حصہ طلب کرنے کے بجائے زمین کی تخمینہ شدہ قیمت پر ٹیکس لگانے لگی۔

مدراس میں قبل کے بندوبستوں میں سرکاری مالگذاری مجموعی زمینی پیداوار کا 45 سے 55 فی صد مقرر کی گئی۔ پیداوار پر خرچ کی لاگت کو پیداوار کی قیمت کا نصف مان لینے سے پریسی ڈنسی کی مالگذاری پورے اقتصادی لگان کو ہڑپ کر گئی۔ اسے تکلیف دہ تصور کیا گیا اور حکومتِ مدراس نے کورٹ آف ڈائرکٹرس سے مالگذاری کی حد مجموعی پیداوار کی ایک تہائی مقرر کرنے کی سفارش کی تاہم کورٹ نے " شبہہ کا اظہار کیا کہ آیا ایک تہائی یا پیداوار کا کوئی اور تناسب مالگذاری کے تعین کا مستقل معیار سمجھا جا سکتا ہے"[20] پھر بھی ارضی محصول کی حد کل پیداوار کا ایک تہائی مقرر کرنے کا اصول بالآخر اس پریسیڈنسی کے لئے منظور کر لیا گیا لیکن اس مفروضہ کی بنا پر کہ پیداوار پر لاگت کا

خرچ مجموعی پیداوار کی قیمت کا نصف ہوتا ہے۔ ٹیکس کی شرح زمین کے اِقتصادی لگان کی $66\frac{2}{3}$ فی صد ہوتی ہے۔ نسبتاً چھوٹی کاشتوں میں جہاں پیداوار پر لاگت کا خرچ نسبتاً زیادہ ہوتا ہے، یہ اور بھی زیادہ ہوگا۔ کبھی کبھی تو زیادہ تر کسان کا کل خالص منافع لے لیا جاتا تھا۔

مالگذاری کی اِتنی اونچی شرحیں ہوتے ہوئے دولت کا زراعت میں اِکٹھا ہونا یا اراضی کی ترقی کے لئے مالکانِ اراضی کے پاس کسی اور ترغیب کا باقی رہنا نا ممکن تھا۔ مستقل طور سے بندوبست شدہ علاقوں میں زمین دار اپنے فرائض کو اپنے لگان کی وصولی تک محدود سمجھتا تھا جس کا زمین کی پیداوار سے تعلق نہیں تھا۔ ان علاقوں میں لگان اس منافع پر منحصر ہوتا تھا جو لگان گذار سے حاصل کر لیا جائے نہ کہ زمین کی پیداوار کے اِضافہ پر۔ زمین دار کسان سے کمر توڑ لگان وصول کرتا تھا۔ اور پوری اِقتصادی بچت اپنے تصرف میں لے آتا تھا۔ اس طرح موسم اور تقدیر کے نشیب و فراز سے نپٹنے کے لئے کچھ بھی باقی نہیں رہتا تھا۔ رعیت داری علاقوں میں سرکار نے بے اِنتہا لگان لینے والے زمینداروں کا رول ادا کیا۔ مدراس، بمبئی پریسیڈنسیوں اور شمالی ہند کے بندوبست شدہ محال داری علاقوں میں زمینی مالگذاری اتنی زیادہ تھی جو اراضی کی زائد پیداوار اسی میں ہڑپ ہو جاتی تھی[21] کاشت کار آبادی کے ہاتھوں میں سرمایہ کی کمی کے سبب زرعی پیداوار کی ترقی ٹھپ ہو گئی۔

ایک سخت زمینی مالگذاری کی پالیسی اختیار کرنے کے اسباب کی تشریح کرنا مشکل نہیں ہے۔ وہ (اسباب) ایسٹ انڈیا کمپنی کی اپنی فتوحات کے اِخراجات کو پورا کرنے نیز اپنے خرچیلے طریق حکومت کی کفالت کرنے کی فکر میں مضمر ہیں۔ 1808-1799ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا کل خرچ 10 ملین پونڈ اور 2-1801ء میں 12.4 ملین پونڈ تھا تب سے اس میں مسلسل اِضافہ رونما ہوا اور 26-1825ء میں 24.4 ملین کے اونچے ہندسے تک پہنچ گیا۔ 1826ء میں لارڈ ولیم بنٹنگ کی آمد کے ساتھ چھٹنی اور تخفیفِ مصارف کا طریقِ عمل اگلے چھ برسوں تک جاری رہا اور 36-1835ء میں سالانہ خرچ کو کم کر کے 16 ملین پونڈ کر دیا گیا لیکن اس میں دوبارہ اِضافہ کا رُجحان رونما ہوا اور 1857ء کے غدر کے وقت یہ 32 ملین پونڈ کے اونچے ہندسہ تک

پہنچ چکا تھا۔

ہندوستان کو اپنے زوال پذیر وسائل کے ساتھ حکومت کے اس بھاری خرچ کو برداشت کرنا پڑا۔ بیرونی فاتحین کے ہاتھوں اپنی تجارت اور صنعت کے برباد ہو جانے سے ٹیکس کے بوجھ کو بہت زیادہ خوش حال نہ رہنے والے کاشت کار کو برداشت کرنا پڑا۔ 93-1792ء میں بنگال پریسیڈنسی کی مالگذاری کی رقم 3.1 ملین تھی۔ 36-1835ء میں یہ بڑھ کر 3.3 ملین ہو گئی تھی۔ چوں کہ صوبہ استمراری بندوبست شدہ تھا۔ اضافہ خاص طور پر توسیع کاشت کی وجہ سے ہوا تھا۔ مثال کے طور پر 11-1810ء میں مدراس میں مالگذاری کی وصولی ایک ملین پونڈ سے کچھ ہی زیادہ تھی۔ 26-1825ء میں یہ رقم 4 ملین پونڈ سے کچھ ہی کم یعنی پندرہ سال کے عرصہ میں چوگنا اضافہ ہو گیا۔ بمبئی پریسیڈنسی بھی یہی کہانی دہراتی ہے۔ پریسیڈنسی کی مالگذاری کی وصولی 1817ء میں 800000 پونڈ تھی جو 1818ء میں بڑھ کر 1150000 پونڈ ہو گئی اور 38-1837ء میں 1.80 ملین ہو گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں مالگذاری ہندوستان کی مالیات کی ریڑھ کی ہڈی تھی اور اس کی شرح کے تعین میں بہ نسبت اس کے کہ کاشت کار طبقہ کتنا ادا کر سکتا ہے۔ حکومت کی ضرورتوں کو زیادہ مدنظر رکھا جاتا تھا۔ یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس قسم کے غیر منصفانہ طرز لگان کے ماتحت کاشت کار تباہ ہو گئے اور زراعت انتہائی پستی کی حالت کو پہنچ گئی۔

"اراضی سے متعلق فسادات عام طور سے ایک ناقص زمینی نظام اور زمین سے بے مدلگاؤ کے درمیان تصادم سے پیدا ہوتے ہیں جس سے زرعی سماج کے سب سے زیادہ فضول خرچ طبقے بھی مبرا نہیں ہوتے"[22] ان ناساعد حالات میں بھی ہندوستانی کاشت کار زمین سے چپکا رہا اور اپنے غیر منافع بخش پیشہ سے گذر کرنے کے لئے محنت کرتا اور پسینہ بہاتا رہا۔" زمین سے لگاؤ" کی بنا پر اتنا نہیں جتنا بخوبی سمجھ میں آنے والی اس وجہ سے کہ اس کے پاس روزگار کا کوئی متبادل ذریعہ نہیں تھا۔ ایک بڑھتی ہوئی آبادی کو زوال پذیر زراعت پر گذر کرنے کے لئے ناکارہ کر دیا گیا۔ عوام کی مصیبت قحط اور بیماری کے حادثہ میں اضافہ اور ملک میں شدید بے روزگاری، اس نظام کے ناگزیر نتائج تھے۔

برطانوی مالی حکمتِ عملی اور زمینی مالی نظام نے ان قدیم اداروں اور دیہی تنظیم کو نیست و نابود کر دیا جن کے ماتحت ہندوستان کے کاشت کار صدیوں رہ چکے تھے۔ وہ ڈول جس نے سماجی نظام کو بیرونی اثرات سے محفوظ رکھا تھا توڑ ڈالا گیا اور ذاتی ملکیت، شخصی مہم، سرمایہ کی ذخیرہ اندوزی اور تکنیکی ترقی کی اساس پر منظم سماج کے قیام کے لئے راستہ کھول دیا گیا۔

حواشی نواں باب

1- میوچیپ، جے۔ برٹش امپیریلزم ان انڈیا۔ صفحہ 24۔
2- مراسلہ مورخہ 12ر فروری 1802ء۔ بحوالہ ففتھ رپورٹ (فرمنیجر، حجم 1) صفحہ 108۔
3- مل، ہسٹری آف برٹش انڈیا۔ جلد 5۔ صفحہ 367۔
4- میکنیل، جے، میمورنڈم آن دی ریونیو ایڈمنسٹریشن آف دی لور پراونس آف بنگال (کلکتہ 1873)۔ صفحہ 9
5- فلپس، ایچ، اے، ڈی، اورایڈمنسٹریشن آف انڈیا (1886ء)۔ صفحہ 5۔ فٹ نوٹ ٹیبل (مصنف کی نکالی ہوئی فی صدی)۔
6- ریونیو لیٹر ٹو بنگال، مورخہ 28ر اکتوبر 1814ء پیرا 39۔ ملاحظہ ہو سیلکشن آف پیپرس فرام رکارڈس ایٹ ایسٹ انڈیا ہاؤس (1820ء)۔ جلد 1۔ صفحہ 166۔
7- مل۔ ہسٹری آف برٹش انڈیا۔ جلد 5۔ صفحہ 72-371۔
8- یہ کہ سرکاری مالگذاری حاصل کرنے کے خیال سے نجی زمینی جائداد ایک اور نئے زمیندار طبقہ کو وجود میں لایا گیا۔ اس کا اندازہ تھامس منرو، پرنسپل کلکٹر آف سیڈڈ ڈسٹرکٹس کے حسب ذیل بیان سے کیا جا سکتا ہے۔ (ملاحظہ ہو مورخہ 15ر اگست 1807ء کے مراسلہ کا پیرا 2۔ اکسٹریکٹ پروسیڈنگز، بورڈ آف ریونیو ایٹ فورٹ سینٹ جارج 4 ر فروری 1808ء۔ سیلکشن آف پیپرس فرام رکارڈس ایٹ ایسٹ انڈیا ہاؤس۔ جلد 1۔ 1820ء۔ صفحہ 95-94)

"یہ طے کرنے میں کچھ دشواری ہے کہ مجموعی یا کل زمینی پیداوار کا کتنا

حصہ زمین داروں کے لئے چھوڑدیا جائے تاکہ سرکاری مالگذاری کی ضمانت کے لیے زمین اور نجی جائداد کو قابلِ فروخت بنایا جاسکے۔ اگر ہندوستان میں کبھی بھی زمین داروں نے مالگذاری ادا کی ہوتی تو پیداوار کا وہ حصہ جو اس وقت شہنشاہ کو ملتا تھا، اس موقع پر مالگذاری تعین کرنے کا معیار بنایا جاتا لیکن اس سے زیادہ صاف اور کوئی حقیقت نہیں ہے کہ مالابار ساحل کے علاوہ ہندوستان میں نجی زمینی جائداد کا وجود کبھی تھا ہی نہیں۔"

9۔ کیپٹن ونگیٹ، ریونیو سروے کمشنر بمبئی نے قرض خواہ اور قرض دار کے تعلقات کی ابتری کے مسئلہ پر غیر معمولی بصیرت کا اظہار کیا جب اس نے اس کی توضیح کی کہ کس طرح برطانوی حکومت میں دکن کے کاشت کاروں کے قرضوں میں اضافہ ہوا تھا۔ (ملاحظہ ہو لیٹر نمبر 319۔ مورخہ 24 ستمبر 1852ء۔ کیپٹن جی ونگیٹ کی طرف سے رجسٹرار آف دی کورٹس آف صدر دیوانی عدالت بمبئی کو) " یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ تمام تر مفید مقاصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے، مرہٹوں کے دورِ حکومت میں قرض دار اور قرض خواہ کے درمیان تعلقات قرض ادا کرائے جانے کے کسی بھی قانونی ذریعہ کے لحاظ کے بغیر طے پاتے تھے۔ قرض خواہ خصوصاً اپنے قرض دار کی ایمان داری اور اعتماد پر بھروسہ کرتا تھا۔ اور ایسا ہی ضرورت کے ماتحت ہوتا کہ قرض اسی وقت تک نہ دیا جائے جب تک مالی ضمانت نہ دی جائے جیسے زیور کی گروی یا کھیت، مکان یا کھڑی فصل کا رہن، کھیتی باڑی والے گاؤں میں ساہوکار اور کاشت کار کے تعلقات آپسی مفاد اور بھروسہ کے تھے۔ بنیا کاشت کار کو اتنا قرض دیتا تھا جتنے کے بارے میں اس کو اطمینان رہتا کہ وہ ادا کرسکے گا یا کردے گا۔ لیکن اس سے زیادہ نہیں۔ اور رواج و رائے عام سے منظور شدہ شرح سے زیادہ سود پر نہیں۔ اگر بنیا اس شرحِ سود سے زیادہ لینے پر بضد ہوتا جتنی جائز بھی جاتی تھی تو یہ ممکن نہ ہوتا کہ اس کے قرض دار اپنی اقساط کو حسبِ معمول پابندی کے ساتھ ادا کرتے اور اس کے پاس دباؤ ڈالنے کا بھی کوئی ذریعہ نہیں ہوتا تھا۔ ان انتظامات کے تحت گاؤں کا ساہوکار اور کسان میل جول سے کام کرتے تھے اور دونوں یکساں طور پر خوش حالی اور بدحالی میں مل کر حصہ

بتائے تھے

ہمارے نظام کے ماتحت یہ خوش گوار اور باہمی مفید صورتِ حال مکمل طور سے اُلٹ دی گئی ہے۔ رعیت کی خوش حالی اب گاؤں کے ساہوکار کے لئے ضروری نہیں ہے۔ آخرالذکر کو اب اول الذکر کے اعتماد اور ایمان داری پر بھروسہ کرنے کا موقع حاصل نہیں ہے۔ باہمی اعتماد اور خیر سگالی کی جگہ عدم اعتماد اور نفرت نے لے لی ہے۔ ساہوکار کے پاس اپنے قرض دار کے تن اور دھن پر مکمل قبضہ کرنے کے لئے عدالت میں مقدمہ دائر کرنے کے لئے ہر وقت مسالہ تیار رہتا ہے۔ اول الذکر کا فائدہ آخرالذکر کو لاعلاج قرض داری کی حالت میں مبتلا کرنے میں ہے تاکہ وہ اس کے، اس کی محنت کے پورے ثمرے پر قبضہ کر سکے، علاوہ اتنے کے جو اس کے محض زندہ رہنے کے لئے ناگزیر ہے۔ زحمت کے بغیر وہ ایسا کرنے کے قابل ہو گیا ہے، جب تک ایک کسان زیادہ پھنسا ہوا نہ ہوتا ساہوکار اس کو فضول خرچی میں مبتلا ہونے کے ذرائع مہیا کرنے کے لئے تیار رہتا اور آئندہ ادائگی کے لئے بالکل پریشان نہ کرتا۔ قرضہ پڑا رہے اور وہ جب چاہے اسے ادا کرے۔ سادہ لوح اور بے پروا کسان آسانی سے جال میں پھنسا لیا جاتا ہے اور صرف اس وقت اسے اپنی حماقت کا احساس ہوتا ہے جب کنڈلی اسے پوری طرح جکڑ لیتی ہے اور چھٹکارا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس دن سے آئندہ کے لئے وہ اپنے قرض خواہ کا غلام بن جاتا ہے۔ آخرالذکر اس بات کا دھیان رکھتا ہے کہ وہ کبھی بھی اس کے قرض کے سود کو کم نہ کرے گا چاہے وہ کچھ بھی کرے۔ غریب کسان زرِ اصل سے چھٹکارہ نہیں حاصل کر سکتا۔ وہ مشقت کرتا ہے تاکہ دوسرے آرام کریں اور بوتا ہے تاکہ دوسرے کاٹیں۔" (ملاحظہ ہو دکن رعیتس کمیشن رپورٹ: جلد II۔ صفحات 88—87)

10۔ لیٹر نمبر 319۔ مورخہ 24 ستمبر 1852ء۔ ٹو دی رجسٹرار صدر دیوانی عدالت بمبئی دکن رعیتس کمیشن رپورٹ جلد 2۔ صفحہ 89—88۔

11۔ تجویز مورخہ 5 جنوری 1818ء۔ پیرا 286۔ ملاحظہ ہو سلیکشن آف پیپرس فرام دی رکارڈس آف انڈیا ہاؤس 1820ء۔ جلد ا۔ صفحہ 946۔

12- رپورٹ آف مسٹر تھیکرے آن مالابار، کنارا اینڈ سیڈڈ ڈسٹرکٹس۔ مورخہ 4 ر اگست 1807ء۔ ملاحظہ ہو فرمنگر ففتھ رپورٹ۔ جلد III ۔صفحہ 76-575۔

13- دیکھئے شمپیٹر، کیپٹل ازم، سوشل ازم اینڈ ڈیموکریسی (سیکنڈ ایڈیشن 1947ء) صفحہ 120۔

14- کارل مارکس، برٹش رول ان انڈیا، نیویارک ڈیلی ٹریبون، میں مضمون مورخہ 15 ر جون 1853ء۔ مارکس انجلس، سلیکٹڈ ورکس۔ جلد 1 (ماسکو ایڈیشن) صفحہ 317۔

15- منٹ۔ مورخہ 7 ر نومبر 1830ء بحوالہ آر۔ سی۔ دت۔ اکونامک ہسٹری انڈر ارلی برٹش رول۔ صفحہ 87-386۔

16- گورنر جنرل کا مراسلہ کورٹ آف ڈائرکٹرس کو۔ مورخہ 7 ر اپریل 1831ء۔ پیرا 101۔ دیکھئے آر۔ سی۔ دت۔ اکونامک ہسٹری انڈر ارلی برٹش رول۔ صفحہ 85-384۔

17- تجویز مورخہ 25 ر اپریل 1821ء۔ سیلکشن آف پیپرس فرام رکارڈس ایٹ ایسٹ انڈیا ہاؤس۔ جلد 3۔ (1826ء) ۔صفحہ 662۔

18- بمبئی کے گورنر الفنسٹن کی تجویز۔ مورخہ 6 ر اپریل 1821ء پیرا 45 ۔ ملاحظہ ہو سیلکشن آف پیپرس حوالہ مذکورہ پیرا 686۔

19- بمبئی ایڈمنسٹریشن رپورٹ 1872-73ء۔ صفحہ 410۔

20- ریونیو چھٹی کورٹ آف ڈائرکٹرس کی طرف سے مدراس کو مورخہ 12 ر دسمبر 1821ء۔ پیرا 34۔ سیلکشن آف پیپرس فرام دی رکارڈس ایٹ ایسٹ انڈیا ہاؤس۔ جلد 3 - 1826ء۔ صفحہ 523۔

21- رعیت داری طریقہ کے رائج ہونے سے بیچ والے زمین دار جو مفلس کاشت کار کا سب سے بڑا آسرا تھے اپنے سرمایہ کے ساتھ غائب ہو گئے .... لیکن سرکار زمین کی صرف ایک ہی فاضل پیداوار پر قبضہ اور تصرف رکھتی ہے جب کہ رعیت داری کاشت کاروں کے مقدر میں پریشانی ہے جس سے پونجی کی عدم موجودگی میں بچا نہیں جا سکتا ہے۔ کلکتہ ریویو۔ جلد 75۔ LXXV - 1863ء صفحہ 119۔

22- کلکتہ ریویو۔ جلد 38 - 1868ء۔ دی لینڈ سسٹم آف انڈیا۔ صفحہ 111۔

دسواں باب

برطانوی حکومت کے سماجی اور اقتصادی نتائج

تجارت اور صنعت کا زوال

۱۔ سترھویں صدی میں ہندوستان کی صنعتی اور تجارتی برتری

صنعتی میدان میں ہندوستان کی برتری سترھویں صدی کے آخر میں اپنے عروج کو اس وقت پہنچی جب انگلستان میں انگریزوں کے فیشن اور لباس کے طرز میں نمایاں تبدیلی ہونے کی وجہ سے ہندوستان کے سوتی کپڑوں کی مانگ یکایک وہاں بڑھ گئی۔ انگلستان کے لوگوں نے اپنے اندر ہلکے سوتی لباس کو کھردرے اونی لباسوں پر جسے وہ صدیوں سے پہنتے آرہے تھے ترجیح دینے کا شوق پیدا کیا۔ عورتیں تو ہندوستانی چھینٹ اور سفید سوتی کپڑوں کے لئے دیوانی ہو رہی تھیں۔ اٹھارھویں صدی کے اوائل کے ایک مکتوب میں تحریر ہے کہ "اچانک ہم نے دیکھا کہ ہماری تمام عورتیں کیا امیر اور کیا غریب سفید سوتی کپڑوں میں جو چھاپے ہوئے اور جا بجا رنگے ہوئے تھے ملبوس نظر آنے لگیں اور کپڑا جتنا ہی زرق برق اور بھڑک دار ہو اتنا ہی زیادہ مرغوب ہوتا تھا۔ اس سے پہلے ہندوستانی موٹے کپڑے انگلستان میں درآمد ہوتے تھے لیکن ان کو لباس کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ لباس میں فیشن کی تبدیلی سے چھینٹ کا درجہ اس طرح بلند

ہوا کہ وہ فرش پر پڑے رہنے کے بجائے ان کی پیٹھ پر آ گئی اور بجائے پیروں کے پیچھے روندے جانے کے عورتوں کا اندرونی لباس (پیٹی کوٹ) بن گئی"۔

ڈیفو نے ماتم کیا ہے کہ " یہ (یعنی ہندوستانی کپڑا) ہمارے گھروں میں گھس گیا، ہماری الماریوں اور ہماری خواب گاہوں میں پہنچا، پھر وہ گدا بن کر کرسیوں کی زینت بنا اور آخرکار ہمارا بستر ہندوستانی چھینٹ کے سوا اور کچھ رہ ہی نہیں گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً ہر چیز جو اون یا ریشم سے بنتی تھی وہ خواہ عورتوں کے لباس سے تعلق رکھتی ہو یا ہمارے مکانات کی آرائش سے، سب ہندوستانی تجارت کی فراہم کردہ ہو گئی"۔

مانگوں کا جو یہ موقع فراہم ہوا تھا اس سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے فوراً فائدہ اٹھا کر ہندوستان سے سوتی کپڑوں کی کثیر مقدار انگلستان بھیجنا شروع کی، جب کہ اچھی طرح معلوم ہے کہ پہلے 1600ء میں کمپنی صرف اس غرض سے بنائی گئی تھی کہ سیاہ مرچ کی تجارت میں ڈچوں سے مقابلہ کرے اور ایک عرصۂ دراز تک سیاہ مرچ اور دوسرے مسالے ہی وہ خاص چیزیں رہیں جن کو انگلستان میں بھیجا جاتا تھا۔ 1670ء میں اچانک سوتی کپڑوں کی مانگ میں اضافہ ہوا۔ اس کا فوری اثر یہ ہوا کہ ڈائرکٹروں نے ہندوستان میں ان کی خریداری کا آرڈر بھیج دیا۔ چوں کہ یہ کپڑے بہت مرغوب ہو گئے تھے اس لئے انگلستان نے 1684ء میں ان پر درآمد ٹیکس معاف کر دیا۔ اور اس نے مانگوں کو اور بھی زیادہ ترقی دے دی۔ اور جب 1698ء میں فرانس سے درآمد ممنوع کر دی گئی تو ہندوستانی چھینٹ کمپنی کی ان تمام اشیا میں جو ہندوستان سے انگلستان میں درآمد ہوتی تھیں سب سے بڑی مد ہو گئی۔

ابھی تک کمپنی کی فہرست میں شورہ، نیل، سیاہ مرچ اور دوسری چیزیں خاص طور پر تھیں لیکن 1688ء کے بعد بہت قسم کے سوتی کپڑے فہرست پر تقریباً پوری طرح قابض ہو گئے تھے۔ مسالے تو بالکل ایک گوشہ میں ڈال دیئے گئے تھے۔

ہندوستان کی تجارت کی ساخت میں اس تبدیلی کی وجہ سے برطانیہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی مخالفت پھر ابھری۔ حملہ دو طرف سے شروع ہوا۔ ایک تو اس اصول تجارت کے حامیوں کی جانب سے جو بنیاین یا ہر چیز میں نفع ڈھونڈنے پر مبنی تھا اور دوسرے اون اور ریشم سے کپڑا تیار کرنے والوں کی طرف سے۔ اول الذکر کا حملہ

ہندوستان کی تجارت پر اس بنیاد پر تھا کہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انگلستان کا خزانہ بذریعہ برآمد ہندوستان منتقل ہوجاتا ہے اور سونا اور چاندی دے کر ملک کو ملتا کیا تھا صرف ہندوستان کا ملبوں تخریب وغیرہ یعنی تجارتی مال کی صحن پر چھائیں۔ دیوے نانٹ لکھتا ہے کہ " اگر یورپی ممالک اس بات پر متفق ہوجائیں کہ ہندوستان کے اشیار کا کوئی معاملہ نہ کریں تو دنیا کے اس طرف کے ممالک خزانے کے ایک بڑے اور مسلسل خرچ سے محفوظ ہوجائیں گے"
دوسرا اہلِ قلم خالص انجیل کی زبان اور لہجہ میں فریاد کرتا ہے کہ " اے بیت المقدس! اے بیت المقدس! تیری تباہی تیرے ہی لوگوں سے ہے۔ اے انگلستان! اجنبی تجھ کو نگل رہے ہیں۔ اجنبی تجھ کو کھا جائیں گے۔ تو نئی نئی چیزوں کا شوقین ہے جو تیری بربادی کا باعث ہوگا"[4]

ہندوستان سے کمپنی کی تجارت پر دوسرا حملہ اس بنیاد پر تھا کہ سوتی کپڑوں کی درآمد نے اُون اور بٹے ہوئے سِلک کی صنعتوں کو برباد کردیا ہے جس سے جولاہوں میں بے روزگاری اور پریشانی پیدا ہوگئی ہے۔ اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں ہوسکتا کہ برطانیہ کے کپڑے بُننے والوں کی جگہ ہندوستان کے سوتی کپڑوں کے لے لینے سے ضرور کپڑے کی صنعت میں بے روزگاری پیدا ہوئی ہوگی لیکن اس زمانہ کے پمفلٹ بازوں نے کاریگروں کی مصیبت کی ایک بھیانک بلکہ مبالغہ آمیز تصویر کھینچی۔ یہ لوگ ہندوستان سے درآمد پر پابندی لگانے کے معاملے کو ایک قومی مسئلہ بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ بیان کیا جاتا تھا کہ سترھویں صدی کے آخر میں " کپڑا بُننے کی تجارت میں کام کرنے والوں کی آدھی تعداد ملک میں اوپر نیچے کینٹر بری سے لندن اور لندن سے ناروچ تک روٹی کی تلاش میں دوڑ رہے تھے"[5]

مصیبت صرف جُلاہوں تک محدود نہ تھی۔ حکومت کے خزانے پر بھی اس کا اثر پڑا۔ چوں کہ محاصل میں کمی آگئی اور غریبوں کی امداد کے لئے روپیہ کا خرچ بڑھ گیا،[6] زمین کے لگان اور مکانات کے کرایے میں کمی ہوجانے کی وجہ سے زمین داروں کا منافع گھٹ گیا، ان حالات میں یہ قدرتی بات تھی کہ یہ ایجیٹیشن ملک گیر وسعت اختیار کرے۔ اس ایجیٹیشن کا سب سے پہلا ثمرہ یہ ہوا کہ کمپنی نے ان جولاہوں، نمونہ بنانے والوں اور کاریگروں کو واپس بلالیا جن کو انگلستان سے ہندوستان میں انگریزوں کے

ذوق کے بارے میں ہندوستانی جولاہوں کو مشورہ دینے اور اس بات پر راغب کرنے کے لئے کہ یورپ میں جس نمونہ کے کپڑوں کی بہت مانگ ہے اس طرح کے کپڑے تیار کئے جائیں بھیجا تھا۔ لیکن اس معمولی رعایت سے رائے عامہ مطمئن نہیں ہوئی۔ قوم کے مزاج میں اتنا اُبال آگیا تھا کہ اب ایک ایسے قانون کو زیادہ عرصہ تک ٹالا نہیں جاسکتا تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہندوستان کے سوتی کپڑوں کی درآمد کی تجارت کو یا تو روک دے یا اس پر پابندی لگا دے۔[7]

فتح بنگال سے قبل صنائع ملکی کو محفوظ رکھنے کا برطانوی نظام

چنانچہ اس کے مطابق ایک قانون 1700ء میں منظور ہوا جس کی دفعات کے مطابق یہ طے پایا کہ یوم میکائیل (29 ستمبر 1701ء) سے سلک کی تیار شدہ تمام اشیاء، بنگالی، اور سلک ڈی یونیٹوں کو ملا کر بنا ہوا تمام سامان جو ایران، چین یا ایسٹ انڈیز میں تیار کیا گیا ہو اور ہر قسم کی چھینٹ جس پر نقش و نگار ہوں یا وہ رنگی یا چھپی ہوئی ہو یا جس پر داغ لگے ہوں جو انگلستان مملکت ویلس اور بروک آن ٹویڈ کے شہر میں درآمد ہوئے ہوں یا آئندہ ہوں ان سب کو پوری سلطنت میں نہ کوئی پہنے گا اور نہ کسی طرح استعمال کرے گا۔[8] اس قانون نے اس چھینٹ کو مستثنیٰ کردیا جس پر انگلستان میں نقش و نگار بنائے گئے ہوں یا وہ وہاں چھاپی گئی ہو۔ اس طرح بہت سی امدادی صنعتیں جو ہندوستانی چھینٹ کے نمونہ پر کام کررہی تھیں محفوظ رہ گئیں۔ اس ایکٹ میں یہ بھی ضابطہ بنایا گیا تھا کہ مقفول گودام قائم کئے جائیں جس کے ذریعہ اس مال کے درآمد کو جو تجارت چلانے کے لیے کیا جائے اس مال سے جدا کردیا جائے جو اہلِ وطن کے استعمال کے لیے ہو۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ تجارت کرنے سے جو منافع ہوتا تھا وہ قائم رہ گیا بلکہ برطانوی فن جہازرانی اور جہاز کے سامان کی لدائی کی صنعت کی ہمت افزائی بھی ہوتی۔

لیکن 1700ء کا ایکٹ ہندوستانی چھینٹ کی انگلستان میں درآمد کو مکمل طور پر نہ روک سکا۔ اس لئے 1702ء میں سادے سوتی کپڑوں پر پندرہ فی صد درآمد ٹیکس لگایا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے موٹی اور سستی قسم کی چھینٹ کے قیمتی

قسم کی ململ اور تنزیب کی مانگ اور بڑھی۔

ہندوستان کی سفید چھینٹ کی مانگ 1719ء میں 20 لاکھ 88 ہزار چار سو اکیاون تھان کی حیرت انگیز عدد تک پہنچ گئی جب کہ 1698ء میں صرف 2 لاکھ 47 ہزار 2 سو 14، 1701ء میں 9 لاکھ 51 ہزار ایک سو 9 اور 1718ء میں 12 لاکھ بیس ہزار تین سو چوبیس تھی۔ جو کپڑا درآمد ہوتا اس پر انگلستان میں کام ہوتا تھا یعنی بغرض فروخت انگلستان میں ان پر نقش بنائے جاتے تھے اور وہ چھاپے جاتے۔ اس طرح ایک رنگنے اور چھاپنے والی بارونق صنعت کو فروغ ملا۔ البتہ عام جولاہے ان سے فائدہ نہ اُٹھا سکے سوائے ان کے جنھوں نے اون کی قدیم روایتی تجارت ترک کر دی اور سوتی کپڑے بُننا شروع کر دیا جو ایک ایسی صنعت تھی جس نے اس وقت انگلستان میں بس قدم جمانا شروع کیا تھا۔

1719ء میں ہندوستانی اشیا کے خلاف ایجیٹیشن شروع ہوا اور ایک نیا قانون 1720ء میں پاس کیا گیا جس نے ہندوستان کی سلک یا چھینٹ کا پہننا جس پر انگلستان میں نقش و نگار بنائے گئے ہوں یا یہاں رنگی گئی ہو یا اس پر ٹھپے لگائے گئے ہوں اس تعزیر کے ساتھ ممنوع کر دیا کہ اگر کوئی پہنے گا تو ہر جرم کے لئے پہننے والے پر پانچ پونڈ اور بیچنے والے پر بیس پونڈ جرمانہ ہوگا۔

نیا قانون بھی اپنے سے پہلے قانون سے کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ سفید چھینٹ کی درآمد جو گھٹ کر 1722ء میں 7 لاکھ اٹھارہ ہزار چھ سو 78 رہ گئی - پھر بڑھ کر 1723ء میں 11 لاکھ 15 ہزار 11 تھان اور 1724ء میں[10] 12 لاکھ 11 ہزار چھ سو 14 تھان ہوگئی۔ اسی طرح بنگال کے سلک کی درآمد جو 1721ء میں 55 ہزار 491 تھان تھی وہ کم ہو کر 1723ء میں 18 ہزار 439 تھان ہوگئی لیکن 1723ء میں بڑھ کر 58 ہزار 729 اور 1727ء میں 79 ہزار 602 تھان ہوگئی۔ پمفلٹ بازوں نے پھر ہندوستان کے بُنے ہوئے کپڑوں کی مذمت شروع کی۔ "انگریزی تجارت کا ایک منصوبہ" کے عنوان سے جو پمفلٹ نکلا اس کے اختراع پسند مصنف نے ہندوستانی اشیاء کو روکنے میں قانون کی ناکامی پر ماتم کرتے ہوئے 1728ء میں لکھا کہ " ہمارے اندر دو چیزیں ایسی ہیں جن پر ہمارا قابو نہیں چلتا ہے۔ ایک ہوائے نفس اور دوسرے

فیشن[11] ہندوستان کی تیار کی ہوئی چیزوں کے خلاف درآمد روکنے کی محفوظ پالیسی اختیار کرنے میں انگلستان تنہا نہ تھا۔ اس وقت بنیا پن کی اسپرٹ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ تمام یورپین ممالک نے ہالینڈ کے واحد استثنا کے ساتھ یا تو ہندوستان کے سوتی کپڑوں کی درآمد قطعی بند کرنے کی محفوظ پالیسی اختیار کرلی یا ان پر بھاری درآمد ٹیکس لگادیا۔ لوئی پانزدہم نے 1727ء میں جو شاہی فرمان جاری کیا وہ اس زمانہ کی اسپرٹ کا ایک نمونہ ہے۔ اس قانون سے ہندوستان کے سوتی کپڑوں کے پہننے اور فروخت کرنے کی سزائیں فرانس میں زیادہ سخت کردی گئیں۔ اسمگلنگ کو اس طرح روکا گیا کہ تیسری مرتبہ یہ جُرم کرنے پر سزائے موت مقرر ہوئی۔

اس درمیان میں انگلستان کے اندر سوتی کپڑوں کی صنعت ترقی کرتی رہی اور اٹھارھویں صدی کے وسط تک اس کے قدم پوری طرح جم گئے۔ 1744ء میں کمپنی کے ڈائرکٹروں نے ہندوستان کو لکھا "یہاں چھپائی نے اتنا بڑا کمال حاصل کرلیا ہے کہ اگر تم ان ہدایات پر عمل کرسکو تو خیر ورنہ تم مقدار کم کرسکتے ہو۔"[12] انگریز چھاپنے والوں کی نفاست کے بارے میں اس وقت کہا گیا تھا کہ "یہ انگریزوں ہی کے لئے مخصوص تھا کہ ہندوستان نے چھاپنے کا جو بہترین کام کیا تھا اس کی نقالی کی کوشش کریں اور اس میں اس درجہ کمال حاصل کرلیں جو کوئی بھی تصور نہیں کرتا تھا۔"[13] 1754ء میں چھپے ہوئے کپڑے کا ایک ٹکڑا جو ایک دکان دار نے ویلس کی شہزادی کو پیش کیا تھا فن کاری میں ہندوستانی چھینٹ سے کہیں زیادہ افضل تھا۔[14]

یورپ میں درآمد پر پابندی اور انگلستان میں صنعت کی نشو ونما ان دونوں کے اثر کے نیچے ہندوستان کے سوتی کپڑوں کی تجارت اٹھارھویں صدی کے وسط سے زوال کی جانب رجوع ہونا شروع ہوتی۔ لیکن بہرحال ہندوستان کی صنعت میں اُبھرنے کی قوت اور اس کے سوت اور سلک دونوں کے بنائے ہوئے سامانوں کی بہترین نفاست کا اعلیٰ ثبوت ہے کہ 1750ء کے بعد بھی یہ چیزیں برابر یورپ میں درآمد ہوتی رہیں۔ 1760ء میں جسے ایک معتدل سال خیال کیا جاسکتا ہے۔ جنگِ پلاسی کے بعد صرف انگلستان کو جو مال ہندوستان سے بھیجا گیا اس میں 981709 تھان سفید چھینٹ اور 51108 بنگال کا تیار کردہ سلک اور

212910 تھان نقش و نگار والی چھینٹ اور 665 سوسی کے تھان تھے۔ اسی سال دوسرے جو مال ہندوستان سے بھیجے گئے وہ یہ تھے:۔

سیاہ مرچ 3133884 پونڈ، قہوہ 186 پونڈ (اس سے پہلے سال کافی کی مقدار 971464 پونڈ تھی)، اون 75543 پونڈ تھی اور شورہ 37780 CWT۔[15]

لیکن جب تک بیرونی حکومت مضبوطی سے ہندوستان میں قائم نہیں ہوگئی اور نئے حکمران نے سیاسی طاقت سے ناجائز فائدہ اُٹھاکر ہندوستان کے محکوم رعایا کے فنی اور کاریگروں کا گلا گھونٹ نہیں دیا تب تک ہندوستان کی صنعت نے دم نہیں توڑا۔

انیسویں صدی کے اول دس سال تک وہ برابر مقابلہ پر ڈٹی رہی۔ یہ 1820ء کے بعد ہی ہوا جب ان کی اشیا کی بیرونی مانگوں کی کمی نے ان پر سخت حملہ کیا۔ حسب ذیل نقشہ[16] ظاہر کرے گا کہ ہندوستان سے سوتی کپڑوں کی برآمد 1795ء—96 سے 1822—30ء کے 35 سال کے درمیان کتنی کم ہوگئی۔ (نقشہ صفحہ پر ہے)

2۔ ہندوستان کا صنعتی زوال

انیسویں صدی کے اول دہائیوں میں نہ تو مروّجہ درآمدی ٹیکسوں نے اور نہ سوتی کپڑوں کی تیاری میں اِسٹیم کی طاقت اور مشینری کے اِستعمال سے اخراجات میں کمی ہی نے انگلستان کو اس قابِل بنایا کہ وہ یورپ کے بازاروں میں ہندوستان کے سامانوں کا مقابلہ کر سکے۔ ہندوستان کی قیمت انگلستان کی قیمتوں سے برابر پچاس ساٹھ فی صدی کم ہی رہی۔ اس لئے اپنے سامانوں کے لئے موافق فضا پیدا کرنے کے لئے برطانیہ نے اپنی سیاسی طاقت اپنے شکست خوردہ حریف کی تیار شدہ اشیاء کا گلا گھونٹ دینے کے لئے اِستعمال کی۔ ہندوستان کی اشیاء کی درآمد پر بہت ہی بھاری ٹیکس لگا دیئے گئے۔ اور ہندوستانی اشیاء پر کمر توڑ دینے والا بوجھ لاد دیا گیا۔ 1812ء میں انگلستان کے اندر ہندوستان سے درآمد شدہ اشیاء پر ٹیکس کی شرح حسب ذیل تھی:۔

چھینٹ سادی سفید — 68 پونڈ 6 شِلنگ 8 پینس فی صدی

کل مال کی قیمت پر اسی حساب سے

" اور اس کے علاوہ گودام کا ٹیکس 3 پونڈ

کلکتہ کے بندرگاہ سے سوتی تھانوں کی برآمد

سال	برطانیہ	امریکہ	ہیمبرگ	کاپن ہیگن	پرتگال	کل ملکوں کی میزان کل
1795–96	19875	434412½	344268	186549	527088	2122089½
1796–97	162195	522692	104574	307073	185077	1712247
1797–98	161276	457945	28532	64374	401391	14566143
1798–99	177197	239928	86277	8415	183125	1454463
1799–1800	305119	776919	8744	199473	1122853	3026253
1823–24	106516	38440	x	x	x	2189926
1824–25	167524	123748	x	9178	112165	1543095
1825–26	111295	146184	x	1646	133014	1256573
1826–27	47572	21648	x	x	83867	970223
1827–28	50654	10521	x	x	54003	978858
1828–29	32626	23780	x	x	20045	819171
1829–30	13043	3771	x	x	x	695725

	6 شلنگ 8 پنس۔
سوت سے تیار شدہ سامان خواہ مکمل سوت ہی تیار ہوئے ہوں یا جزءًا اور جن پر کوئی ٹیکس نہیں لگا ہے۔	27 پونڈ 6 شلنگ فی صد کل مال کی مالیت پر اور اسی حساب سے 10 پونڈ کا اضافہ۔
ستل پاٹی چٹائی یا بوریا۔	68 پونڈ 6 شلنگ 8 پنس فی صد کل مال کی قیمت پر اسی حساب سے بہ اضافہ 2 پونڈ 13 شلنگ 4 پنس۔
سلک کا سامان یا ایک چمکدار ریشمی کپڑا یا دوسرا سادہ یا نقش و نگار بنا ہوا سلک کا کپڑا جس کا اور کہیں ذکر نہیں آیا ہے۔	گھر کے استعمال کے لئے ممنوع۔ ایضاً
مندرجہ بالا پر جب کہ وہ اس لیے درآمد کیا گیا ہو کہ پھر برآمد کر دیا جائے گا گودام ٹیکس۔	3 پونڈ 6 شلنگ 8 پنس فی صد کل مال پر اسی حساب سے۔
شکر۔	1 پونڈ 13 شلنگ فی ہنڈرویٹ۔
نیل۔	10 پونڈ 4 شلنگ فی 100 پونڈ وزن پر علاوہ ازیں 2 پونڈ 13 شلنگ 4 پنس فی صد کل مال کی قیمت پر۔

ولسن لکھتا ہے کہ ''اس لئے یہ ضروری ہوگیا کہ موخرالذکر (یعنی برطانوی کاریگروں) کی حفاظت یا تو مال کی قیمت پر 70 — 80 فی صدی ٹیکس لگا کر یا مثبت طور پر مال کا داخلہ بند کر کے کی جائے ''[18] وہ آگے چل کر کہتا ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا ہوتا تو پسلے اور مانچسٹر کی ملیں شروع ہی میں بند ہو گئی ہوتیں اور اسٹیم کے پاور کے باوجود مشکل ہی سے پھر جاری ہو سکتیں۔ ان کا وجود ہندوستان کے کاریگروں کو قربان کر کے ہوا۔ اگر ہندوستان آزاد ہوتا تو وہ اس کا جواب دیتا، برطانیہ کے مال پر ناقابلِ برداشت ٹیکس لگاتا اور اپنی صنعت کو ختم ہونے سے بچا لیتا۔ اپنی

مدافعت کے اس فعل کی اس کو اجازت نہ تھی وہ اجنبیوں کے رحم و کرم پر تھا۔ برطانیہ کا مال زبردستی اس پر بلا کسی ٹیکس کے لاد دیا گیا اور بیرونی مال تیار کرنے والوں نے سیاسی ناانصافی کا بازو ایک ایسے مقابل کو نیچے گرانے اور آخر کار گلا گھونٹ دینے کے لئے استعمال کیا جسے وہ برابری کے مقابلے میں ہرا نہیں سکتے تھے۔[19]

برطانیہ کا تیار شدہ مال ہندوستان بھیجا جاتا تھا۔ اس میں 1813ء کے بعد عظیم اضافہ اُس وقت ہوا جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی اجارہ داری ختم کر دی گئی اور ہندوستان کی تجارت سب کے لئے کھول دی گئی۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ برطانوی مال کی قیمتیں گر گئی تھیں جیسا کہ سیلکٹ کمیٹی کے سامنے بعض گواہان نے بیان دیا تھا۔[20] بلکہ اس کی زیادہ تر وجہ برطانیہ کی تجارتی پالیسی اور ہندوستان پر اس کا سیاسی اقتدار تھا۔

صنعت کو تباہ کرنے کے لئے سیاسی طاقت کا استعمال

ایک بااقتدار حکمران کی حیثیت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی دلچسپی اس امر میں ہونی چاہیئے تھی کہ وہ رعایا کی ان کارروائیوں کی ہمت افزائی کر کے جو پیداوار سے تعلق رکھتی ہیں اس کی دولت میں اضافہ کرے لیکن تاجروں کی ایک جماعت ہونے کی وجہ سے اس کی دلچسپی صرف منافع کے اضافہ میں تھی۔ آدم اسمتھ نے لکھا کہ "بحیثیت ایک بااقتدار حکمران کے ایسٹ انڈیا کمپنی کی دلچسپی اس میں ہونی چاہیئے تھی کہ یورپین سامان جو مملکت ہندوستان کو بھیجا جاتا ہے جہاں تک ممکن ہو سستے داموں بکے اور اور ہندوستان کا سامان جو وہاں سے یہاں آتا ہے اس کی اتنی اچھی قیمت ملے یا اس قدر گراں بیچا جائے جتنا ممکن ہو لیکن تاجر کی حیثیت سے ان کی دلچسپی بالکل اس کے برعکس ہے۔ بحیثیت حکمران ان کا فائدہ اسی میں ہونا چاہیئے جس میں ملک کا فائدہ ہو لیکن تاجر کی حیثیت سے ان کا فائدہ بالکل اس کے برعکس ہے۔"[21] کمپنی نے اس ترکیب سے چیزوں کی قیمتیں رکھیں کہ کاریگر تباہ ہو جائے۔ اس نے جولاہوں پر ستم ڈھایا اور دوسری پابندی لگانے والی ایسی پالیسیاں اختیار کیں جنھوں نے ہندوستانی صنعت کو اور بالخصوص بنگال کی سوتی صنعت کو تہ و بالا کر دیا۔ جیسا کہ کمپنی کے ایک

ہم عصر معترض نے 1767ء میں کہا تھا "ملک کے اندر کی کل تجارت جس ڈھنگ پر وہ سر دست چلائی جارہی ہے اور اس سے بھی زیادہ جس عجیب انداز میں ملک کا سرمایہ یورپ میں لگایا جارہا ہے وہ ظلم کا ایک نہ منقطع ہونے والا سلسلہ ہے جس کے مضر اثرات کو ملک کا ہر جولاہا اور ہر کاریگر محسوس کر رہا ہے کیوں کہ ہر چیز جو تیار ہوتی ہے اس پر اجارہ داری ہے جس میں انگریز بنئے اور کالے گماشتے مل مل کر من مانے طور پر طے کرتے ہیں کہ کتنی مقدار میں ہر کاریگر چیز دے اور اس کی اسے کیا قیمت ملے۔"[22]

ہندوستان کا مال خریدنے اور ہندوستان میں کمپنی کو سرمایہ مہیا کرنے کا انتظام کچھ اس طرح کیا گیا تھا کہ اس کا نتیجہ ظلم اور "غریب جولاہوں کا حق مارنا" تھا۔ ایجنٹ کو جن کو گماشتہ کہا جاتا تھا کمپنی نے زیادہ تر ماہانہ تنخواہ پر مقرر کیا تھا۔ ہر گماشتہ جس کے ساتھ ایک کلرک اور ایک خزانچی ہوتا تھا مقررہ اوقات پر گاؤں میں خریداری کرنے جاتا تھا۔ جب میر جعفر 1757ء میں گدی پر بٹھایا گیا تو انگریزوں کے گماشتے اتنے طاقتور ہو چکے تھے اور اتنے اختیارات انھیں حاصل ہو گئے تھے جن کا راجاؤں اور زمینداروں کے اختیارات کوئی مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔" 1765ء کے بعد جب نواب کے اختیارات کا نقاب قطعی طور پر اتار پھینکا گیا تو ان کو براہ راست حکمران کے تفویض کردہ اختیارات مل گئے اور وہ حکمران کی جانب سے اپنے اختیارات برتتے تھے۔ وہ صرف تجارتی ایجنٹ نہ تھے بلکہ قانون بناتے تھے اور مجسٹریٹ کے بھی اختیارات برتتے تھے کوئی اپیل نہ تھی ولیم بولٹ اپنے بیان میں یہ اضافہ کرتا ہے کہ "غریب جولاہوں کی منظوری عام طور پر ضروری نہیں خیال کی جاتی تھی کیوں کہ گماشتے کمپنی کے نظام سے وابستہ ہونے کی وجہ سے جہاں چاہتے ان سے دستخط کرا لیتے اور جو رقم جولاہے کو دی جاتی تھی اس کے لینے سے اگر وہ انکار کرے تو یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ ہاتھ پیروں اور کمر سے باندھ دیا جاتا تھا اور کوڑے لگانے کے بعد ہی اسے چھوڑا جاتا تھا۔"[23]

کچھ جولاہوں کے نام کمپنی کے دفتر میں رجسٹرڈ تھے۔ اور ان کو کسی دوسرے کے ہاں کام کرنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ ایک گماشتہ سے دوسرے گماشتے کے ہاں غلام کے طور پر گماشتوں کے ہر جانشین کے ظلم اور بدمعاشی برداشت کرنے کے لئے تبدیل کر دیئے جاتے تھے۔[24] چپراسی اور چوکیدار ان پر نگرانی کے لئے مقرر تھے

تاکہ وہ کمپنی کے گماشتوں کے علاوہ اور کسی کے ہاتھ کوئی سامان نہ بیچیں اور ذرا سا شبہہ اس بات کا ہو جاتا تھا کہ جولاہے کا کچھ اس طرح کا ارادہ ہے تو کرگھے سے کپڑے کے ٹکڑے قبل اس کے کہ کپڑا پورے طور پر تیار ہو کاٹ لیے جاتے تھے۔[25] اگر سخت نگرانی کے باوجود کسی جولاہے نے ہمت کر دی کہ اپنا مال کسی دوسرے کے ہاتھ دلال کی چشم پوشی یا حمایت سے بیچ دیا تو دلال اور جولاہا دونوں گرفتار کر لئے جاتے تھے اور قید کر دیئے جاتے تھے۔ لوہے کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں لگا دی جاتی تھیں۔ کثیر رقم جرمانہ کیا جاتا تھا۔ کوڑے مارے جاتے تھے اور جس چیز کو وہ سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے یعنی ذات اس سے نہایت ذلت کے ساتھ محروم کر دیئے جاتے تھے۔[26] کمپنی کے سرمایے سے گماشتوں نے اپنی ذات میں شخصی اور ذاتی کاروبار کو بھی جمع کر لیا تھا اور اپنے من مانے اختیارات کو اپنے لئے ان ہی موافق شرائط پر سامان خریدنے کے لئے استعمال کرتے تھے جن پر وہ کمپنی کے سامان خریدتے تھے۔" ولیم بولٹس اس پر اپنی بات ختم کرتا ہے کہ "اس محکمہ کی جو بدمعاشی جاری تھی وہ تصور سے پرے ہے اور سب کا نتیجہ غریب جولاہوں کو ٹھگنا تھا کیوں کہ دام جو کمپنی کے گماشتے اور ساتھ ہی ساتھ خریدار سامانوں کے مقرر کرتے ہیں وہ کم سے کم پندرہ فیصدی اور بعض حالات میں چالیس فی صدی اس سے کم ہوتا ہے جو تیار شدہ اشیاء کے دام عام بازار میں آزادی سے بیچنے پر ملتے۔"[27]

دوسری ظالمانہ کارروائی یہ تھی کہ کچے مال کے دام اتنے بڑھا دیئے گئے جس میں ہندوستان کے دستکاروں کو سخت نقصان تھا۔ اس طرح کی ایک مثال بیان کی جا سکتی ہے۔ کمپنی کے ملازمین نے ایک پرائیویٹ کمپنی کلکتہ کے ممبرانِ کونسل کو ملا کر اس غرض کے لئے بنائی کہ بنگال میں مال بنانے والا سامان کل کا کل خرید لیا جا سکے تاکہ من مانی قیمت پر بیچا جا سکے۔ اس طرح بھاؤ بڑھا دیا جائے۔ ان لوگوں نے سورت سے 25 لاکھ کی روئی خریدی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوراً سولہ سے اٹھارہ روپیہ من تک کا مروجہ بھاؤ بڑھ کر 28 سے 30 روپیہ من تک چڑھ گیا۔ یہ جولاہوں کے لئے تباہ کن تھا۔ وہ اپنے تیار شدہ مال کے زیادہ دام لے نہیں سکتا تھا کیوں کہ دام تو کمپنی کے خریداری کے ایجنٹ مقرر کرتے تھے اور اسے مجبور ہو کر ناقابلِ برداشت

گراں قیمت کچے مال کی دینی پڑتی تھی۔

کمپنی اور اس کے ملازمین کی ان کارروائیوں کا لازمی نتیجہ تباہ کن ثابت ہونا ہی تھا۔ کاریگر برباد ہو گئے۔ البتہ کمپنی کی ملازمت میں جو چند مہم جو تھے انھوں نے ضرور بڑی دولت اکٹھا کر لی اور وہ انگلستان آرام اور فراوانی کی زندگی گذارنے کے لئے واپس چلے گئے۔ لیکن ایسا وہ صرف افسانوی مرغی کو ذبح کر کے کر سکے جو سونے کا انڈہ دیتی تھی۔ ہندوستان کے تیار شدہ مال کے دام اسی نسبت سے مزدوری میں اضافہ کئے بغیر بڑھ گئے۔ ہندوستان کے تیار شدہ مال کی خوبی جاتی رہی۔ اس طرح برطانیہ کی کی حکومت کا ابتدائی عہد لوٹ کھسوٹ، ظلم اور ہندوستانی دست کاری اور کاریگری کی بربادی کی ایک دردناک داستان ہے وہ قصبے جو پہلے صنعتی نقطۂ نظر سے بہت کامیاب تھے ویران ہو گئے اور کاریگر اپنا قدیم کاروبار چھوڑ کر روزی کمانے کے لئے زراعت میں اُجرت پر مزدوری کرنے والے کی حیثیت سے لگ گئے۔ 1762ء میں کمپنی کے ڈائرکٹر مقیم مُرشدآباد مسٹر زیچر نے رپورٹ کی کہ " یہ ملک جو ایک ظالمانہ اور خود مختار حکومت کے نیچے خوش حال تھا اب تباہی کے کنارے لگ گیا ہے حالاں کہ انگریزوں کا اس کے نظم و نسق میں اتنا بڑا حصہ ہے۔ میں فکرمندی کے ساتھ اس کی تباہ شدہ حالت دیکھ رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی وجہ وہ اجارہ داری ہے جو کمپنی کو ابھی حال کے سالوں میں ملک کی تمام اشیاء پر حاصل ہوئی ہے۔"[28] برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ذمہ دار ممبر ولیم فلرٹن نے بنگال میں کمپنی کی حکومت کے بارے میں زیادہ صاف گوئی سے ان الفاظ میں کام لیا ہے " ماضی کے سالوں میں بنگال کے ممالک قوموں کے لئے غلہ کے گودام اور مشرق میں تجارت، دولت اور اشیاء کی تیاری کے مخزن رہے ہیں لیکن ہماری غلط حکمرانی کی ایسی تیز رفتاری رہی ہے کہ بس بیس سال کے اندر ان ممالک کے بہت سے حصے بیابان نظر آتے ہیں۔ کھیت جوتے نہیں جاتے ہیں۔ کثیر رقبوں پر جھاڑیاں اُگ آئی ہیں۔ کھیت جوتنے والا لوٹا جاتا ہے۔ اشیاء تیار کرنے والے پر ظلم ہوتا ہے۔ قحط بار بار برداشت کرنا پڑا ہے۔ اور آبادیاں اُجڑ گئی ہیں۔"[29] 1789ء تک بنگال کا خوش حال صنعتی صوبہ اس طرح برباد ہو گیا تھا کہ ہندوستان میں کمپنی کا

ایک تہائی رقبہ لارڈ کارنوالس کے قول کے مطابق "ایک جنگل میں بدل گیا تھا جس میں صرف وحشی جانور رہتے تھے۔"[50]

اِقتصادی زوال کے اندرونی اسباب

ملک کا صنعتی زوال خواہ کس قدر مضبوط رہا ہو یہ بیرونِ ملک کے حکمرانوں کی مخالفت کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا پھر بھی حقیقت یہ ہے کہ خود اس صنعتی ڈھانچے میں کمزوریاں تھیں جن پر بھی صنعتی زوال کی ذمہ داری ایک حد تک عائد ہوتی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ ہندوستانیوں نے اپنے مال کے بازاروں کو بڑھانے میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔

یہ ایک ایسا معاملہ تھا جس نے جیسا کہ آدم اِسمتھ نے بیان کیا ہے کام بانٹ بانٹ کر کرنے کو محدود کر دیا اس لئے صنعتی ترقی بھی محدود ہو گئی۔ اس سے بھی زیادہ خراب بات یہ تھی کہ ہندوستان کی بیرونِ ملک کی تجارت کا بیشتر حصہ برطانوی فتح کے پہلے ہی بیرونی لوگوں کے ہاتھ میں جا چکا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ جہاں تک بیرونِ ملک کے بازاروں میں مال بیچنے کا سوال تھا ہندوستان کے کاریگر اور اشیاء بنانے کا کام کرنے والے بیرونی تاجروں کے رحم و کرم پر تھے۔

دوسرے مغرب کی بنیاپن کی جارحیت کے خلاف ہندوستان کے پاس خود اپنی کوئی قومی تجارتی پالیسی نہ تھی۔ بلکہ مغل شہنشاہان اپنی عظمت و شان کے زمانہ میں بھی فیکٹریوں کے قیام، ہندوستانی تجارت اور بازار پر قبضہ کرنے کے لئے یورپین طاقتوں کی کشمکش کے بس خاموش تماشائی رہے۔ جب سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں انگلستان کے اندر ہندوستان کے بنے ہوئے مال پر بھاری بھاری درآمد ٹیکس لگائے جا رہے تھے تو گو ہندوستان میں خود مختار اور با اِقتدار حکومت قائم تھی لیکن اس نے انگلستان کے خلاف جوابی کارروائی نہیں کی۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے اِقتصادی مسائل کو ابھی تک قومی نقطۂ نظر سے دیکھنا ہی شروع نہیں ہوا تھا اور یہ امر مشتبہ ہے کہ اگر سیاسی حالات بدل کر بدتر نہ ہو گئے ہوتے تب بھی ملک بیرونی تجارت کو اس سے مختلف نظریے سے دیکھتا جیسا کہ اس نے عمل کیا۔

تیسرے سمندر پر ہندوستان کی کمزوری اس کے صنعتی زوال کی اسی طرح ذمہ دار تھی جس طرح اس کی سیاسی غلامی کی۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں یورپین طاقتوں نے سمندر کی تجارت کے ساتھ سمندری ڈاکہ کو بھی شامل رکھا۔ کسی تاجر کے لیے مال جہاز پر لاد کر کسی دوسرے ملک کو سمندر کے ذریعہ سفر کرنا اس وقت تک خطرناک تھا جب تک کہ سمندری ڈاکوؤں کے خلاف مسلح محافظت کا معقول انتظام نہ ہو۔ بحری طاقت نہ ہونے کی وجہ سے ہندوستان سمندر پار کی تجارت کو قائم نہ رکھ سکا جسے یورپین اقوام نے زبردستی چھین لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس وقت یورپ تیزی سے صنعتی انقلاب سے گذرا ہندوستان پر صنعتی زوال کی آفت آئی اور وہ ایک پس ماندہ زراعتی ملک میں تبدیل ہو گیا۔

چوتھے انجمن تجار کا نظام جس نے وسطی زمانہ میں صنعت اور تجارت کی یورپ میں تشکیل کی ہندوستان میں بہت کمزور تھا ذات پات کا نظام جو انجمن تجار کی خدمات انجام دیتا تھا صنعت کو بیرونی حملوں سے بچانے میں ناکام رہا۔ جب بیرونی تاجر صنعتی سامانوں کو خریدنے کے لیے منظرِ عام پر آیا تو کاریگر صرف اپنی انفرادی حیثیت کے ساتھ بیرونی خریداروں کی ایک ایک منظم جماعت کے بالمقابل تھا جسے اجارہ داری کا حق حاصل تھا۔ بہت سی صورتوں میں وہ خریدار کے آرڈر پر اشیاء تیار کرنے کے لئے اس سے پیشگی رقم لینے پر انحصار رکھتا تھا۔ ایک آزاد انجمن تجار اور ایک ایسی جماعت کے نہ ہونے سے جو رقوم کا بندوبست کرے ہندوستان کا مال تیار کرنے والا قیمتوں کے طے کرنے اور بیرونی لوگوں سے بلا پیشگی رقم لئے مال تیار کرنے میں اپنی مرضی کا مختار نہیں رہ گیا تھا۔

سب سے آخر میں یہ کہ ہندوستان کے پاس صنعت میں ایسے مہم باز جدت پسند نہیں تھے جیسے انگلستان میں تھے۔ اگر ہندوستان میں ایجادات یا صنعت و حرفت میں کسی قسم کی ترقی نہیں ہوئی تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ہندوستان کی دماغی اہلیت یا اس کی فنی کاری دوسروں کی بہ نسبت کمتر تھی بلکہ وہ ترقی پسند طبقہ جس نے مغرب میں پہلے بازاروں پر قبضہ کر لیا اور پھر اپنے ملک کی بنی ہوئی چیزوں کی پیداوار کو ان بازاروں میں بھیجنے کے لیے منظم کیا ہندوستان میں سرے سے موجود ہی نہ تھا۔

زراعت کا زوال

ہندوستان کی صنعت کے ساتھ ہی ساتھ زراعت اور تجارت کا بھی زوال ہوا۔ اس کے لئے جو واقعات ذمہ دار تھے وہ خالص سیاسی تھے۔

زراعت پر آفت اس لیے آئی کہ حکومت نے ایک تباہ کن شرح مالگذاری مقرر کی۔ کمپنی کے ملازمین کاشت کاروں کو مجبور کرتے تھے کہ وہ وہی فصل اگائیں جس سے ان کا فائدہ تھا بجائے اس کے کہ کاشت کار کے لئے نفع بخش ہو۔ ڈچوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ اسپائس جزیرہ میں "یہ لوگ" وہ تمام گرم مسالہ جو ایک زرخیز سال میں پیدا ہوتا تھا، پھونک دیتے تھے سوائے اس کے کہ جو یورپ کے بازاروں میں اس منافع کے ساتھ بیچ سکتے جسے وہ کافی سمجھتے تھے۔[31] انگریز کمپنی نے بنگال میں وہی تخریبی پالیسی اختیار کی۔ آدم اسمتھ نے لکھا ہے کہ ایک افسر یعنی فیکٹری کے ایک کلرک کے لئے یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی کہ وہ ایک کاشت کار کو پوست کا ایک عمدہ کھیت جوتنے کو کہے اور پھر اس میں دھان یا کوئی دوسری فصل بونے کا حکم دے۔ بہانہ یہ کیا جاتا تھا کہ ایسا اس لئے کیا گیا تاکہ غذائی پیداوار میں کمی نہ ہو لیکن اصل وجہ یہ ہوتی تھی کہ اس افسر کو اس بات کا موقع ملے کہ وہ اس افیون کو بہتر قیمت پر بیچ سکے جو اس کے پاس اس وقت کثیر مقدار میں آگئی تھی۔ دوسرے مواقع پر حکم برعکس کر دیا گیا ہے۔ دھان یا کسی دوسری جنس کی ایک نہایت اچھی پیداوار دینے والا کھیت جوتا گیا اور پھر اسے پوستہ کی کاشت میں اس وقت بدل دیا گیا جب افسر نے دیکھا کہ افیون سے غیر معمولی نفع ہونے کی توقع ہے۔[32]

تجارت میں انتشار

زراعت اور صنعت کے ساتھ ہندوستان کی تجارت کو بھی نقصان پہنچا۔ اس کی تباہی ملازمینِ کمپنی کی جانب سے اجارہ داری کے نظام نے (جو کبھی کبھی مطابقِ قانون لیکن اکثر خلافِ قانون رہتی تھی) برپا کی جس کی وجہ سے اس کا دھارا فطری راہوں سے الگ ہٹ گیا۔

(الف) اندرونی تجارت

ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ مال لے جانے کے ٹیکس (محصولِ عبور) اور کسٹم ڈیوٹی سے اِستثنا فرخ سیر کے زمانے سے ملا ہوا تھا۔ لیکن کمپنی نے اس رعایت سے ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ اس طرح اس نے خزانے کو اس کا جائز مطالبہ اس نجی مال پر بھی ادا نہ کرکے جو کمپنی کے نوکروں کا تھا گھاٹے میں ڈالا۔ یہ کمپنی کے ملازمین اکثر اپنے دستخط سے پروانے جاری کردیتے تھے جس سے ان کا مال ملک کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بلا محصولِ عبور ادا کئے لے جایا جاتا تھا۔ کمپنی کے ملازمین کے دستخط شدہ پاس جنھیں "دستک" کہتے تھے بِکاؤ مال ہوگئے اور اکثر ہندوستان کے تاجر بھی کمپنی کے ملازمین سے انھیں خرید لیتے تھے تاکہ محصول دینے سے بچ جائیں۔

بنگال میں سیاسی طاقت سنبھالنے کے بعد کمپنی ملک کی تجارتی کارروائیوں پر بھی کنٹرول کرنے لگی۔ ہندوستانی اور بیرونی تاجروں کو ان کے کاروبار سے امتیازی ٹیکس کے ذریعہ نیز زیادہ اہم اشیاء پر تجارتی اِجارہ داری قائم کرکے باقاعدہ نکال باہر کیا گیا۔ کلایو کے زمانہ میں تقریباً تمام اندرونی تجارت پر کمپنی اور اس کے ملازمین کی اِجارہ داری تھی۔

ولیم بولٹس لکھتا ہے "اور ان تمام چیزوں کی کل اندرونی تجارت جو ملک پیدا کرتا ہے بلکہ چند ان چیزوں کی تجارت بھی جو درآمد کی جاتی ہیں اجارہ داری پر چل رہی ہے جو کمپنی کے چند اونچے درجہ کے ملازمین کو ان کے بنیوں اور پٹھوؤں کے ساتھ حاصل ہے۔ کلکتہ کی گورنمنٹ نے جو بھی احکامِ عام گذشتہ سالوں میں ان اجارہ داریوں کے متعلق جاری کئے ہیں نہ صرف اُنھوں نے بلکہ ڈائرکٹروں کے کورٹ نے جو متضاد اور خلاف قانون احکام مقامی حالات کی لاعلمی یا لیڈن ہال میں پارٹیوں کے حالات کے ماتحت جاری کئے ہیں انھوں نے بھی ان شرمناک حالات کی نشوونما کی ہے۔"[33]

محاصلِ عبور کا نظام ان اِجارہ داریوں کے قائم رکھنے کے لئے ساز و سامان کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور اس لئے بھی تاکہ اِجارہ داروں کو اپنے معاملات میں نقصان نہ

اٹھانا پڑے، مثلاً بالائی ہندوستان (اُتر پردیش) میں روئی کی فصل اس سال اچھی ہوئی جس سال بنگال کی اونچی سطح کے کمپنی کے ملازمین نے بمبئی سے روئی لانے کی اجارہ داری حاصل کی تھی۔ بنگال کے ہندوستانی تاجروں نے شمالی اور جنوبی ہندوستان سے کثیر مقدار میں روئی لانا شروع کیا۔ نتیجہ میں کمپنی کی اجارہ داری خطرے میں پڑ گئی اور بڑے نقصان کا خطرہ پیدا ہوا۔ فوراً اس روئی پر جو بہار سے گذر کر بنگال پہنچی 30 فیصد ٹیکس لگا دیا گیا جس سے دام چڑھ گئے اور اجارہ داران نقصان سے بچ گئے۔[34]

اندرونِ ملک کی تجارت کمپنی کے ملازمین کے ہاتھوں میں تھی اور اس کے منافع سے کمپنی کے بدکردار ملازمین دولت جمع کرتے تھے۔ بجائے اس کے کہ یہ منافع کمپنی کو ملے، کمپنی کے اونچے عہدے کے ملازمین نے بڑی کثیر دولت جمع کی۔ اس کاروبار میں گورنر جنرل نے بھی حصہ لیا۔ اس قسم کی کارروائیوں نے نہ صرف ہندوستانیوں کو اندرونِ ملک کی تجارت سے باہر دھکیل دیا بلکہ اس سے اشیاء تیار کرنے والے اور اسے استعمال کرنے والے دونوں گھاٹے میں رہے کیوں اوّل الذکر کو سستا بیچنا اور موخر الذکر کو گراں خریدنا پڑا۔[35] 1770ء کا بنگال کا قحط تجارت میں انھی اجارہ داریوں کے سلسلہ کی کارروائیوں کا نتیجہ تھا۔ انگریزوں نے کل چاول خرید کر اور پھر اس کو بیچنے سے انکار کر کے سوائے افزائشِ قیمت کے قحط کو پیدا کیا۔"[36]

دوسرے طریقوں سے بھی کمپنی نے اپنی سیاسی طاقت اپنے رقیب تاجروں کو تجارت سے باہر مار کھدیڑنے کے لیے استعمال کی۔ اکثر ایسی مثالیں پیش آئیں کہ "نجی تاجروں کی چیزیں یورپین تک کی بالخصوص امریکیوں، مغلوں یا ہندوؤں کی ملکیت والی اشیاء اس اجارہ داری کے نتیجے کے طور پر عام شرک پر روک دی جاتی تھیں اور کرایہ وصول کرنے والے گودام تک لے جائی جاتی تھیں۔[37] ان اشیاء کے مالکان کو اکثر مجبور کیا جاتا تھا کہ اپنی مرضی کے خلاف انہیں ایسے جہازوں پر لادیں جن کے بارے میں ان کی رائے اچھی نہیں تھی اور ایسے سفر پر روانہ ہوں جس کی منزل اور جس کا انتظام ان کی اپنی تجارتی اسکیم کے خلاف ہوتا تھا۔[38] راستہ کے باہر اور نامانوس بندرگاہوں پر چھوڑ دیئے جانے سے سامان کا نقصان ہو جاتا تھا اور کبھی کبھی وہ ضائع بھی ہو جاتا تھا۔ امریکہ کے لوگ جو باہر ایران اور عرب مال بھیجنے کے خاص تاجر تھے وہ مکمل طور

پر برباد ہوگئے اور ان کی جگہ کمپنی اور کمپنی کے ملازمین نے لے لی۔[39]

مغل حکومت کے زمانے میں بھی مال کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لیے محصول لگتا تھا اور کسٹم ڈیوٹی بھی تھی۔ انگریزوں نے بنگال میں طاقت حاصل کرنے کے بعد ان کی شرحوں میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا اور ان چیزوں پر بھی کسٹم ڈیوٹی لگا دی جو ابھی تک اس سے بری تھیں اور نئے نئے محاصل درآمد و برآمد اور چنگی کی حد بندیاں کھڑی کیں۔ اس طرح محاصل عبور اور کسٹم ڈیوٹی کا ایک مکمل محکمہ ملک کے اندر قائم ہو گیا۔ ایسے ٹیکس چنگی اور دوسری قسم کے محاصل لگانے کے دو اہم مقاصد تھے۔ اول یہ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے رقیبوں یعنی ڈچوں، فرانسیسیوں اور ہندوستانی تاجروں کو بھی ملک کی اندرونی تجارت سے نکال باہر کیا جائے۔ دوسرے، کمپنی کے خزانہ میں کارآمد اضافہ ہوا۔ اس رقم کا ایک جزء کمپنی کے فوجی اور غیر فوجی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے استعمال کیا جائے اور ایک جزء سے انگلستان پہنچنے کے لیے ہندوستانی سامان خریدا جائے۔ جیسا کہ بھاری اور ناقابلِ برداشت محاصل لگانے کا انجام ہمیشہ ہوتا ہے مندرجہ بالا دو اغراض ایک دوسرے سے متضاد ثابت ہوئے کیوں کہ وہ محاصل جو اتنے اونچے ہوں کہ ناقابلِ برداشت ہو جائیں ان سے زیادہ رقم نہیں ملتی۔

آخر کار اندرونی تجارت پر محاصلِ عبور میں اٹھارھویں صدی کے آخر میں کمی کی گئی اور پھر ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات میں پارلیمنٹ کی تحقیقات کے بعد 1838ء میں وہ قطعی طور پر ختم کر دئے گئے۔

(ب) بیرونِ ملک کی تجارت

انگریز اپنے وطن میں صاف دماغ کے ساتھ سمجھے ہوئے تھے کہ برطانیہ کی خوشحالی کو فروغ دینے کے لئے ہندوستان کے وسائل کو کس طرح استعمال کیا جائے۔ بہت قبل 1769ء میں کمپنی کے ڈائرکٹروں نے ہدایات جاری کی تھیں کہ بنگال میں کچے سلک کی تیاری کی ہمت افزائی کی جائے اور سلک سے کپڑوں کے تیار کرنے کو روکا جائے۔[40] اسی مکتوب کے اندر اس امر کی بھی سفارش کی گئی ہے کہ سلک کے لچھے بنانے والوں کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ کمپنی کی فیکٹریوں میں کام کریں۔ اپنے گھروں میں کام کرنے

سے ان کو منع کیا جائے۔ اس خط کے اندر ہندوستان کی اقتصادیات کو نوآبادیاتی نمونہ پر ڈھالنے کی پالیسی کا خلاصہ درج کر دیا گیا ہے جس کا اصل کام یہ تھا کہ ہندوستان کا کچا مال ان کے وطن کی صنعت کے لئے سستے داموں خریدا جائے اور اس کے تیار شدہ مال کو گراں قیمت پر بیچا جائے۔ 1789ء کی سیلکٹ کمیٹی نے بہت صحیح اظہارِ خیال کیا ہے کہ اس خط میں جبر اور ہمت افزائی کا ایک مکمل منصوبہ ہے جو بڑی حد تک بنگال کی اشیاءِ پیداوار پر لازمی اثر انداز ہوگا۔ اس کا یہ ضروری نتیجہ ہوگا کہ یہ بنگال کی مصنوعات پر بڑی حد تک تباہ کن اثر ڈالے جس سے اس صنعتی ملک کے پورے خدوخال بدل جائیں گے تاکہ برطانیہ کی صنعتی پیداوار کی متابعت میں کچے مال کی تیاری کا ایک میدان تیار ہو جائے۔[41]

یہ منصوبہ برطانیہ کی اٹھارھویں صدی کی تجارتی پالیسی سے مطابقت رکھتا تھا۔ بہت قبل 1721ء میں شہنشاہ کی تقریر میں یہ کہا گیا تھا کہ اگر ہمت افزائی کر کے نوآبادیات کو اس پر راغب کیا جا سکے کہ وہ بحری ذخیرہ تیار کریں جو بیرونی ملکوں سے درآمد کیا جاتا ہے تو یہ نہ صرف قوم کی دولت اور اس کی طاقت میں اضافہ کرے گا بلکہ اس مفید کام میں نوآبادیات کے لگ جانے سے ان کی توجہ ان صنعتی مالوں کی تیاری سے ہٹ جائے گی جو برطانیہ کے اسی قسم کے مال کے معاملہ میں خلل انداز ہوتے ہیں۔[42] اس پالیسی کا نفاذ اول اول شمالی امریکہ میں کیا گیا لیکن ان نوآبادیات کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد برطانیہ نے اپنا رُخ ہندوستان کی طرف موڑا تاکہ ہندوستان وہی کارکردگی پیش کرے جو اس کی اقتصادیات میں امریکہ کی نوآبادیات نے 1776ء سے قبل پیش کی تھی۔

ہندوستان کی اقتصادیات کو کلاسیکی نوآبادی ڈھانچہ میں ڈھالنے کا مقصد برطانیہ کی حکمرانی کے شروع زمانہ میں بڑی مضبوطی سے قائم رہا۔

کمپنی کو ہندوستان اور چین کی تجارت کی اجارہ داری مل گئی تھی۔ جب تک کمپنی ہندوستان میں بغیر سیاسی طاقت کے تھی اس اجارہ داری کا نفاذ صرف ان انگریز تاجروں پر ہوتا تھا جو کمپنی سے متعلق نہ تھے۔ ہندوستان پر فتح حاصل کرنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کو یہ اختیار مل گیا کہ وہ یورپین کمپنیوں کو ہندوستان کی تجارت سے باہر نکال پھینکے۔ ڈچ اور فرانسیسیوں کے لئے کمپنی کے مقبوضہ علاقوں میں ہندوستانی مال خریدنا ممنوع کر دیا گیا۔ مال تیار کرنے والوں اور کاریگروں کو اپنا مال غیر برطانوی کمپنیوں کے ہاتھ

بیچنے سے روک دیا گیا اور ڈچ اور فرانسیسی کمپنیوں کے گماشتوں کو انگریز کمپنی کے ایجنٹ اکثر پیٹتے بھی تھے اور پریشان کرتے تھے۔ صرف چین کی افیون اور چائے کی تجارت ایسی تھی جس میں دوسری یورپین کمپنیوں کی شرکت کی ہمت افزائی کی جاتی تھی۔ لیکن یہ اس ضرورت کی ایجاد تھی کہ چین کی چاندی کی زیادہ سے زیادہ مقدار ہندوستان میں سرمایہ لگانے کے لئے مل جائے۔[43]

کارنوالس کی تقرری کے بعد ایک نمایاں تبدیلی ہوئی۔ فریر نے اس کو اس طرح بیان کیا ہے کہ "بے ضابطہ ملوکیت پرستی اب باضابطہ ملوکیت پرستی میں تبدیل ہوگئی۔" ہیسٹنگز کے آخری برسوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کے لوگ ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں کہ وہ اپنے وطن کو جس طرح بھی ہو سکے دولت کما کر لے جائیں۔ کارنوالس کے آخری زمانہ میں دولت کے لئے اسی طرح کی دوڑ ہے لیکن وہ زیادہ باضابطہ ہے۔"[44]

پٹ کے انڈیا ایکٹ اور کارنوالس کے اصلاحات نے ملوکیت پرستی کے مقصد کو آگے بڑھانے میں بڑی امداد کی۔

ایسی تبدیلیاں واقع ہو رہی تھیں جن کا لازمی تقاضہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کامل طور پر حکومت کے تابع ہو جائے۔[45] ان حالات میں برطانیہ کی تجارتی پالیسی میں جس میں اب تک اس بات پر زور دیا جاتا تھا کہ ایک معقول تجارتی منافع حاصل کیا جائے اور ہندوستان سے بچت کی رقم روانہ کی جائے۔ اب اس کے بجائے زور اس جانب منتقل ہو گیا کہ ہندوستان کے بازاروں کو برطانوی صنعت کو نفع پہنچانے کے لئے لوٹ کھسوٹ کر کے تجارت کی مقدار میں اضافہ کیا جائے۔ 1773ء سے ہر بیس سال میں پارلیمنٹ کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات میں جانچ کرنے کے ضابطہ نے مالکانِ صنعت کو یہ موقع فراہم کیا کہ انگلستان کی جو تجارتی پالیسی مرتب کرے وہ اس پر اثر ڈال سکیں۔ 1813ء سے باضابطہ کوشش ہندوستان کے اندر برطانوی مال کی تجارت کی توسیع کی ہوتی رہی۔

1793ء سے 1813ء تک بیس سال کے درمیان انگلستان اور ہندوستان کے درمیان تجارت کی مقدار دو ملین پونڈ کی سالانہ اوسط قیمت کے حساب سے تھی۔ ملک کی بڑی وسعت اور ان بیانات کے پیشِ نظر جو ہندوستان کی دولت کے متعلق

اٹھارھویں صدی میں انگلستان پہنچے تھے۔ یہ تیجہ بہت ہی حقیر تھا اس لئے 1813ء میں چارٹر کی تجدید کے وقت کمپنی کو اجارہ داری کے جو حقوق دیئے گئے تھے ان پر سخت حملہ ہوا اور تجارت میں اس کو جو مراعات دی گئی تھیں ان کے واپس لے لینے کا مطالبہ زیادہ شدت اختیار کر گیا۔ تجدید کے نتیجہ میں کمپنی اجارہ داری سے محروم ہو گئی اور تجارت برطانیہ کے تمام بسنے والوں کے لئے کھول دی گئی۔ کچھ ہی دنوں بعد اقوام برطانیہ پر ہندستان کے اندرونی حصوں میں آباد ہونے کے سلسلہ میں جو پابندیاں لگی تھیں وہ بھی ہٹالی گئیں اور برطانیہ کے سرمایہ داروں کو یہ اجازت دے دی گئی کہ وہ مستقل قیام اختیار کر کے اپنا سرمایہ کھیتوں کی کاشت اور صنعتوں کے قائم کرنے میں لگائیں۔

(ج) آزاد تجارت کا عہد

کمپنی کی اجارہ داری کے ختم ہونے اور تجارت کو انفرادی محنت و کوشش کے لئے آزاد کر دینے سے انگلستان اور ہندوستان کے تجارتی تعلقات میں ایک نئے عہد کا آغاز ہوا۔ اجارہ داری کے واپس لئے جانے سے ہندوستان میں برطانیہ کے مال کی برآمد میں ایک جاذب نظر اضافہ ہوا۔ 1.8 ملین پونڈ کی قیمت کی اشیاء کے بجائے جو 1814ء میں ہندوستان میں درآمد کیں عین 1819ء میں ایسے تیار شدہ برطانوی مال کی مقدار 5.4 ملین پونڈ کی قیمت کی ہو گئی۔ یہ اعداد و شمار بھی اضافہ کی حد کو اس طرح ظاہر نہیں کر سکتے جس طرح مسٹر کرافرٹ نے اسے بیان کیا ہے۔ انھوں نے اسے تجارت کی تاریخ میں عدیم المثال قرار دیا ہے[46] کیوں کہ 1813ء میں سکے کی قیمت اس کی مقررہ قیمت سے 26-25 فی صد گھٹ گئی۔ اگر اس واقعہ کو بھی حساب میں شامل کیا جائے تو 1814ء کی رقم گھٹ کر 1.4 ملین ہو جائے گی[47] اس کے علاوہ 1814ء میں قیمتیں فرانس کی جنگوں کی وجہ سے بڑھی ہوئی تھیں اور 1829ء میں قیمتیں نیچے اُتر کر اپنی عام سطح پر آ گئی تھیں۔ اس لئے مقدار کے لحاظ سے برطانیہ نے جو مال ہندوستان کو ان پندرہ سالوں میں برآمد کیا وہ بڑھ کر چوگنا ہو گیا ہوگا۔

برطانیہ سے جو مال ہندوستان کو برآمد کیا جاتا تھا اس کی زیادہ اہم مدوں میں مقدار کی زیادتی سے جو حسبِ ذیل فہرست میں دیا ہے اس کا ثبوت فراہم ہوگا۔[48]

شے	1814	1824	مکمل اضافہ	اضافہ فی صدی
تانبا، بنا اور بے بنا (ہنڈرویٹ)۔	37619	41742	4123	11
لوہا، لوہے کی سلاخ، قفل کا کھٹکا اور سانچے (ہنڈرویٹ)۔	186454	438629	252175	135
بڑے عرض کی نفیس سیاہ باتات، اون اور ریشم کا بنا ہوا کپڑا اور اونی کپڑا (تھان)۔	17790	49502	31712	178
چھینٹ سادی یا چھپی ہوئی (گز)۔	680258	34843110	34162876	2205
سوت کی بٹی ہوئی رسّی (پونڈ)۔	8	4558185	4558177	56.977213

1813ء میں کمپنی کی جانب سے پورے اطمینان سے یہ اعلان کیا گیا کہ اس کا امکان باقی نہیں رہا ہے کہ جو اشیا ہندوستان کے لوگوں کے استعمال کے لئے موزوں ہیں ان کی مقدار میں یا ان کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ اور اسی طرح اس کا بھی امکان نہیں ہے کہ جو چیز ہندوستان تبادلہ میں فراہم کر سکتا ہے ان کی مقدار یا ان کے تنوع میں اضافہ کیا جا سکے۔[49]

ہندوستان کے تجارتی ڈھانچے میں تبدیلی

برطانیہ نے اپنا بازار ہندوستان میں پھیلانے کے لئے سب سے زیادہ اہم قدم یہ اُٹھایا کہ ملک پر آزاد تجارت کو اس وقت لاد دیا جب کہ اس کی صنعت رو بہ زوال

تھی۔ ہندوستان کو اس پر مجبور کیا گیا کہ وہ برطانوی درآمد مال کو یا تو بلا ادائیگی محاصل یا برائے نام محاصل پر قبول کرے جب کہ ہندوستان کا مال جو انگلستان کو جاتا تھا اس پر بھاری درآمد ٹیکس لگے ہوئے تھے۔[50] یہ پالیسی فوراً عمل لائی۔ ہندوستان کی بیرونی تجارت میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ ہندوستان کی سمندر پار کی تجارت 18.64 کروڑ (18.64 ملین) سے بڑھ کر 35.87 ملین 1846 سے 1851 کے پانچ سالوں کے اندر ہوگئی۔ دوسرے پانچ سال کے اندر کا اضافہ اور بھی قابلِ توجہ ہے۔ تجارت کی اوسط سالانہ قیمت بڑھ کر 52.70 کروڑ روپیہ ہوگئی جس میں برآمد کی رقم 26.85 کروڑ اور درآمد 25.82 کروڑ تھی۔

عام طور پر تجارت کی توسیع ملک کے لئے فائدہ مند ہوتی ہے لیکن اس وجہ سے کہ ملک کی تجارت کے ڈھانچے میں انتہا پسندانہ ترمیمات ہوئی تھیں۔ تجارت کی توسیع ہندوستانی صنعت کے لئے تباہ کن ثابت ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام کنگال ہو گئے۔ اٹھارھویں صدی میں دنیا کے خاص الخاص سوتی کپڑوں کو تیار کرنے اور انھیں باہر برآمد کرنے والے کی حیثیت سے گھٹ کر صرف ستر سال کے اندر ہندوستان باہری مال کے استعمال کرنے والے بڑے سے بڑے ملک کی قطار میں آگیا۔

حسبِ ذیل فہرست سے ظاہر ہوگا کہ ہندوستان کی صنعتی پوزیشن میں 1814ء سے 1835ء تک بیس سال کے درمیان کیسی نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔[51]

سال	برطانیہ کے سوتی کپڑوں کا سامان جو ہندوستان کو برآمد کیا گیا۔	ہندوستان کے سوتی کپڑوں کے تھان جو مملکت برطانیہ میں درآمد کئے گئے۔
	گز	گز
1814	818208	1266608
1821	19138726	534495
1828	42822077	422504
1835	51777277	306068

1814ء سے 1835ء کے درمیان ہندوستان سے جو مال برطانیہ کو بھیجا جاتا تھا وہ قریب 1.3 ملین گز سے گھٹ کر 3. ملین گز سے قدرے زائد رہ گیا۔ اس درمیان میں دوسرے ملکوں کو جو مال ہندوستان برآمد کرتا تھا اس میں بھی کمی آگئی۔ مثلاً امریکہ کو جو مال بھیجا جاتا تھا وہ سوتی کپڑوں کے تھان کی 13633 گانٹھ کے بجائے گھٹ کر 1829ء میں صرف 258 گانٹھ رہ گیا اور ڈنمارک جس نے 1457 گانٹھ 1800ء میں لی تھیں پھر 1820ء کے بعد کبھی بھی 150 گانٹھ سے زیادہ نہیں لیں۔

نہ صرف یہ کہ ہندوستان نے اپنی تیار کی ہوئی چیزوں کے لئے بیرونِ ہند کا بازار کھودیا بلکہ خود اس کے گھر کے بازار میں بیرونِ ملک کی اشیا کا سیلاب آگیا۔ حسبِ ذیل فہرست ہندوستان کو درآمد ہونے والے برطانوی سامانوں میں اضافہ کو ظاہر کرے گی۔[52]

ملین پونڈ کے حساب سے

1813	.11	
1831	1.65	
1835	1.79	(اس تعداد میں چین کو جو مال بھیجا گیا وہ بھی شامل ہے۔)
1840	3.86	
1845	4.21	
1850	5.22	
1855	5.84	
1856	6.30	

سلک اور اونی کپڑے اور مشنری اور دھات کا بنا ہوا مال بھی ہندوستان میں درآمد ہونے والی اشیاء تھیں۔ جو مال باہر سے ہندوستان میں آتا تھا اس کے مقابلہ نے ہندوستان کی صنعت کو برباد کر دیا اور مزدور کے روزگار کی راہوں کو تنگ کر دیا۔ دوسری جانب ہندوستان سے جو مال باہر جاتا تھا اور جس میں روئی اور سلک کا کچا مال غذائی اشیا افیون، نیل اور جوٹ شامل تھے۔ اس نے ملک کو زراعتی پیداوار میں بچت سے محروم کر دیا۔ کچے مال کا دام بڑھا دیا اور آئندہ زراعتی پیداوار کی کمی اور قحط کا سنگِ بنیاد رکھا جو ملک پر اپنا قبضہ ایک سو سال تک رکھے رہے۔ اس طرح ہندوستان میں

"بیرونی تجارت ملک کے وسائل کے لوٹ کھسوٹ اور اس کی اقتصادی غلامی کا ایک ذریعہ تھی۔"

ہنری سنٹ جارج ٹکر، جارج تھامسن اور دوسرے ان کے طرز پر سوچنے والے انگریزوں نے برطانیہ کی اس تجارتی پالیسی کی جس پر وہ ہندوستان میں عمل پیرا تھا ترس کھایا ہے۔ ہنری سنٹ جارج ٹکر نے 1833ء میں لکھا "وہ تجارتی پالیسی کیا ہے جسے ہم نے اس ملک میں ہندوستان کے متعلق اختیار کیا ہے۔ سلک کے کپڑے بنانے والے اور سلک کے تھان جو سلک اور سوت کی ملاوٹ سے تیار ہوتے ہیں وہ عرصہ ہوا کہ ہمارے بازاروں سے کلیتاً ختم کئے جا چکے ہیں اور کچھ تو ابھی حال ہی میں جبراً 67 فی صدی ٹیکس لگائے جانے کے نتیجہ میں اور دراصل بہتر مشینری کے استعمال سے سوت کے بنے ہوئے ہمارے کپڑوں نے جو ہندوستان سے آنے والے مال میں سب سے زیادہ خاص پیداوار تھی نہ صرف یہ کہ ان کی جگہ لے لی ہے بلکہ ہم واقعی اسے باہر بھیجتے ہیں حتی کہ ہمارے ایشیائی مقبوضات میں لوگوں کے استعمال کی چیزوں کا وہ ایک جز بن گئے ہیں۔ اس طرح ہندوستان ایک مال تیار کرنے والے صنعتی ملک کے بجائے ایک زراعتی ملک میں تبدیل ہو گیا ہے۔"

انگلستان میں ہندوستان کے مال پر جو درآمد ٹیکس لگا تھا اور جو ہندوستان کی صنعتوں کو نقصان پہنچا رہا تھا 1840ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کے خلاف پارلیمنٹ میں عرض داشت پیش کی۔ لیکن یہ بعد از وقت کوششیں بالکل بیکار تھیں کیوں کہ ہندوستان کو ایک صنعتی ملک کے بجائے ایک زراعتی ملک میں تبدیل کرنے کا ملوکیت پرستانہ منصوبہ اس وقت تک تقریباً تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔

ادائیگیوں کا توازن

برطانیہ کی برآمد کو ہندوستان میں بڑھانے میں ایک رکاوٹ باقی رہ گئی تھی۔ اگر ہندوستان کو وہ تمام برطانیہ کا مال جس کی مقدار روز بروز بڑھتی جاتی تھی اپنے استعمال میں صرف کرنا تھا تو یہ بھی ضروری تھا کہ وہ کچھ مال تیار بھی کرے اور درآمد کے بدلہ میں کچھ دے۔ "ادائیگیوں میں توازن پیدا کرنے کا مسئلہ آسانی سے قابو میں آنے والا نہ تھا۔" ہندوستان

یں اشیا کی پیداوار میں جو اضافہ ہوا وہ اس کا مقابلہ نہ کر سکا جو درآمد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ہندوستان میں خریداری کی طاقت کی کمی برطانوی مصنوعات کی خریداری کو آگے بڑھانے میں رکاوٹ تھی۔ اس کی خاص صنعت جو زرِ مبادلہ کما سکتی تھی یعنی سوتی کپڑے بنانے کی صنعت وہ برباد ہو چکی تھی اور اس کی جگہ بازار مشین کے بُنے ہوئے سستے کپڑوں سے پٹا پڑا تھا۔ کچی روئی ایک دوسری چیز تھی جسے وہ انگلستان کے ہاتھ بیچ سکتا تھا لیکن روئی کے مال کے دام امریکہ کی روئی سے زیادہ تھے اور یہاں کی روئی امریکہ کی روئی سے کمتر درجہ کی تھی۔[57] سیاہ مرچ، شکر اور دارچینی کی مانگ بھی بڑی حد تک گر گئی تھی۔

اس کے علاوہ دنیا کے بازاروں میں ہندوستان کی چیزوں کی قیمت بہت کم ہو گئی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ تجارت میں لین دین کے شرائط بھاری حد تک ملک کے خلاف چلے گئے تھے۔ حسبِ ذیل فہرست سے کچھ اندازہ ہو گا کہ جو خاص قسم کا مال ہندوستان سے باہر برآمد کیا جاتا تھا ان کی قیمتیں کتنی گر گئی تھیں۔[58]

شے	1793 ایس ڈی۔	1815 ایس ڈی	بیشی یا کمی فی صدی	1831 ایس ڈی	1815 کے مقابلے میں فیصدی کمی
کچی روئی لباس وغیرہ میں تہ دینے کے لئے، فی پونڈ	1 · ¾	·11–½	·9–	·–5	56
نیل فی پونڈ	7–4½	8 · 10	9+	4·0	54
چاول فی ہنڈریٹ ویٹ	کچھ نہیں	23·9	—	14·10	39
شورہ "	59·9	87 · 0	45–	36 · 0	58
کچا سلک فی پونڈ	21– 0	18 – 0	13–	13–7½	24
دارچینی (سیلون) فی پونڈ	12–0	13– 8	13+	8 · 9	35
سیاہ مرچ فی پونڈ	1– ½	0 ·10½	27–	0 · 3½	64
شکر فی ہنڈرڈ ویٹ	66 · 6	49 · 1	26+	26 · 2	46

اس کمی کی وجہ اِجارہ داری کا خاتمہ اور ہندوستان سے آزاد تجارت کا قیام بتایا گیا ہے[59] لیکن سب سے بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ برطانیہ کے بازاروں میں ہندوستانی اشیاء کی مانگ گھٹ گئی تھی۔ ہندوستان کی بیرونِ ملک کی تجارت کے ڈھانچے میں ایک اِنتہاپسندانہ ترمیم ہوگئی تھی۔ کپاس اور سِلک کی مصنوعات جو گذشتہ زمانہ میں ہندوستان سے باہر جانے والے مال میں سب سے بڑی مِقدار ہوتی تھیں اب وہ اشیاءِ درآمد بن چکی تھیں۔ سیاہ مرچ اور شکر کی مانگ بھی اس وجہ سے گھٹ گئی تھی کہ ان کی سپلائی کے نئے وسائل پیدا ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ سالانہ مطالبات کی ادائیگی کا سوال بھی تھا اور جو سونا اور چاندی کے نہ ہونے سے اشیا کی شکل ہی میں دیئے جاتے تھے اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ تجارت میں لین دین کے شرائط ہندوستان کے خلاف جارہے تھے۔

1832ء میں کمپنی کے چارٹر کی تجدید کے وقت ادائیگیوں کے بقائے پر تنقید کرتے ہوئے مسٹر 'میکی لاپ' نے پارلیمنٹ کی سب کمیٹی کے سامنے بیان دیا کہ "ہندوستان سے زرِ مرسلہ وصول کرنے کی راہ میں بڑی مشکلات حائل ہیں۔ اس بات کی تفصیل کے لئے کہ کس طرح یہ مشکل اپنا عمل دخل رکھتی ہے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ نیل اور دوسری اشیا کا ایک بڑا حصہ جو گذشتہ دو سال میں درآمد ہوا ہے ان کے دام فی روپیہ ایک شلنگ 3 پنس سے زیادہ نہیں ملے ہیں۔ حالاں کہ وہاں کے سِکّے کی اصل قیمت ایک شلنگ ½ 11 پنس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افراد اور کمپنی دونوں نے اب حال میں اپنے مطالبات کی وصولی اس طرح کی ہے۔ سامان کے بجائے چاندی یہاں لاتے ہیں۔"[60] صدیوں سے ہندوستان اپنی دِساوری جنسوں کو دوسرے ملکوں کو بھیجتا رہا تھا اور وہ بدلہ میں سونا اور چاندی دینے پر مجبور ہوتے تھے۔ اب پانسہ پلٹ گیا تھا۔ ہندوستان جو درآمد کرتا تھا اس کے بدلہ میں سوائے سونا اور چاندی کے اور کچھ نہیں دے سکتا تھا لیکن ہندوستان سونا اور چاندی پیدا تو کرتا نہ تھا اور جیسا کہ مسٹر 'میکل لاپ' نے کہا کہ ہندوستان اور چین سے ادائیگی کا یہی طرز اگر قائم رہا تو اس ملک (انگلستان) سے ان ملکوں میں اشیا کی درآمد میں رکاوٹ ڈالے گا۔[61]

ادائیگی کے مضر توازن کا علاج

(الف) زراعت کی ترقی

ایک طریقہ ہندوستان کی ادائیگی کے توازن کے مسئلہ کو حل کرنے اور اس میں برطانوی مال کی خریداری کی طاقت پیدا کرنے کا یہ تھا کہ اس کے زراعتی وسائل کو ترقی دی جائے۔ انگلستان کی بہت سی تجارتی انجمنوں نے پارلیمنٹ کی سب کمیٹی (1832ء) کے سامنے زور دیا کہ ملک کے زراعتی وسائل کو ترقی دینے کی پوری کوشش کی جائے مثلاً مانچسٹر کے چیمبر آف کامرس نے بیان دیا ہے کہ "ہندوستان کی قابلِ برآمد اشیاء کی ترقی اور اس میں اضافہ بلاشبہہ اس ملک کی بڑی بھلائی کا موجب ہوگا اور اس میں صرف ہندوستان ہی کی نہیں اس ملک کی بھی بھلائی ہے۔ ہندوستان کی روئی کی صنعت میں ترقی دینا مملکت برطانیہ کے سوتی کپڑے بنانے والوں کے لئے انتہائی اہمیت کا حامل ہے حتیٰ کہ ہندوستان اس سلسلہ میں جو کارکردگی دکھا سکتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ ہر فیکٹری کو تیزی سے ترقی کرنے کے لئے سامان ملتا رہے۔"[62] گلاسگو کے چیمبر آف کامرس نے بھی اسی طرح کے خیال کا اظہار کیا ہے "ہندوستان سے قابلِ برآمد اشیا کی پیداوار میں ترقی اور اضافہ بلاشبہہ یہی اثرات پیدا کرے گا" (یعنی ہندوستان میں برطانوی مال کے لئے بازار میں وسعت پیدا کرنے کے اثرات)[63]

1840ء میں اس کو بڑے پیمانہ پر تسلیم کیا جاتا تھا کہ برطانیہ لامحدود مدت تک ہندوستان میں برطانوی مال کا سیلاب لا نہیں سکے گا، اگر اس نے ہندوستان کو اس قابل نہ بنا دیا کہ وہ بھی تبادلہ میں کچھ سامان بھیج سکے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی پر دباؤ ڈالنے کے لئے کہ وہ ہندوستان کے زراعتی وسائل کو ترقی دے ایک عوامی ایجیٹیشن انگلستان میں چلایا گیا۔ یہ تجویز کیا گیا کہ زمین کی مالگذاری کم کی جائے، ذرائع آب پاشی کو ترقی دی جائے، تجارتی فصلیں خاص طور پر روئی کی کاشت شروع کی جائے اور کچی روئی جو ہندوستان میں پیدا کی جائے اسے انگلستان کی درآمد تجارت میں امریکہ کی روئی پر ترجیح دی جائے جو اب انگریز کی نوآبادی نہیں رہ گیا ہے اور جہاں روئی غلاموں کی محنت

سے پیدا کی جاتی ہے۔ یہ ایجی ٹیشن جس کی مخصوص مثال وہ چھ لکچرس ہیں جو 1839ء میں جارج ٹامس نے ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن میں دیئے تھے "ہندوستان کی زراعت کی ترقی یا برطانیہ کے مطالبات کو امریکہ سے ہندوستان منتقل کرنے میں زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکا لیکن اس نے اس ناانصافی کے چہرے سے نقاب اُٹھادیا جو انگلستان ہندوستان پر کر رہا تھا اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ اس کی پالیسی نے ہندوستان کی زراعت کو کتنا نقصان پہنچایا ہے۔

ہندوستانی روئی کے خراب قسم ہونے اور برطانیہ کی ملوں میں باریک کپڑا تیار کرنے کے لئے موزوں نہ ہونے پر تنقید کرتے ہوئے ٹامسن کہتا ہے کہ "ہندوستان کی سرزمین ایک لعنت میں گرفتار ہے۔ اس کو جوتنے والا کاشتکار اسے اپنے لئے دولت کے حصول کا ذریعہ نہیں سمجھتا بلکہ ایک ایسی جگہ سمجھتا ہے جہاں اس کو اس کی محنت کا معاوضہ بھی نہیں ملتا اور جہاں وہ اپنے کو دولت مند بنانے کے لئے فصل نہیں اُگاتا ہے بلکہ ایک ملکی اجنبی کو دولت مند بناتا ہے جو اس کی ملکیت کا اپنے کو فتح کی بنیاد پر دعویدار قرار دیتا ہے اور جو اس کی صنعت کی پیداوار کی کل بچت سے اسے محروم کر دیتا ہے اس لئے اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ وہاں صنعت جاں بلب ہے اور ترقی کی رفتار رُکی ہوئی ہے۔ وہاں کے لوگ زرعی غلاموں کی حیثیت میں آگئے ہیں۔ درحقیقت یہ لوگ کاشت کار بہ رضائے مالکان ہیں۔ یہ ان لوگوں کے رحم پر ہیں جن کا واحد مقصد مالگذاری وصول کرنا ہے۔ اِتنا زیادہ سے زیادہ ٹیکس لگا دیا گیا ہے جو برداشت سے باہر ہے اور اس اِضافہ کی حد نہ ختم ہوئی ہے نہ کبھی ہوگی۔ رعیت یعنی کاشت کار بقایے میں پڑ جاتے ہیں۔ اس وقت ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ کلکٹر ان کو ان کی روئی کا آخری پونڈ یا جنس کا آخری دانہ لے کر کچل ڈالتا ہے اور انھیں اس بات کے لئے چھوڑ دیتا ہے کہ وہ سانس روک کر انکساری کے ساتھ بہت آہستہ الفاظ میں گاؤں کے مہاجن سے مدد مانگے تاکہ وہ کچھ بیج کر اپنے کھیتوں پر چھڑک سکے اور اپنے فاقہ کش خاندان کے جسم و جان کو بچا سکے تا آنکہ دوسری فصل پیدا ہو جائے۔ تب وہ (کلکٹر) سمجھتا ہے کہ اس نے ان کے ساتھ بڑے رحم کا برتاؤ کیا ہے۔"[65] ٹامسن سوال کرتا ہے کہ ان حالات میں ہندوستان کی زراعت میں کس ترقی کی امید کی جا سکتی ہے۔

(ب) ہندوستان کو نوآبادی بنانا

چونکہ حکومت زراعت کو کسی قسم کا تحفظ دینے یا ہندوستان کی دوسری قسم کی پیداوار کی ترقی میں مدد دینے پر تیار نہ تھی اس لئے برطانوی صنعت کاروں کے سامنے بطور تدارک جو تجویز آئی وہ یہ تھی کہ ہندوستان کو نوآبادی بنا دیا جائے اور اندرون ملک میں برطانیہ کے باشندوں کو بسا کر اور برطانوی سرمایہ لگا کر پیداوار میں اضافہ کروا کسایا جائے۔ پارلیمنٹ کی سیلکٹ کمیٹی کے سامنے لیورپول ایسٹ انڈیا کمیٹی نے بیان دیا "ہم خاص طریقہ پر یہ تجویز کریں گے کہ لائق لوگوں کی اور خاص ان لوگوں کی جو ہندوستان میں مختلف قسم کی چیزوں کو پیدا کرنے اور ان کو ترقی دینے کے بہترین طریقوں سے واقفیت رکھتے ہیں ہمت افزائی کی جائے تاکہ وہ وہاں جا کر ملک کے اندرونی حصوں میں آباد ہو جائیں۔ اسی طرح سرمایہ داروں کی ہمت افزائی کی جائے اور ان کو تحفظ دیا جائے تاکہ وہ اپنا سرمایہ اس زمین پر لگائیں جو ان کو آسان شرائط پر دائمی طور پر دی جاتے۔ ملک کے مختلف حصوں کے آپس میں آزادانہ ربط قائم کرنے کے لیے پل اور سڑکیں بنائی جائیں۔"[66] گلاسگو چیمبر آف کامرس نے اسی طرح اس خواہش کا اظہار کیا کہ "ہندوستان کی سلامتی اور اس کے اندر امن و امان کے قیام کے ساتھ ان تمام برطانوی رعایا کو جن کے ہنر، سرمایہ اور مہم جوئی سے بہتر اور مفید نتائج کی توقع ہے ہندوستان جانے کی سہولت دی جائے اور ان کی ہمت افزائی کی جائے۔"[67]

مانچسٹر چیمبر آف کامرس کے اظہار کے مطابق ہندوستان میں پیداوار اور تجارت بڑھانے کا بالکل "کھلا" ذریعہ یہ ہے کہ برطانوی باشندوں کو ہندوستان میں زمین حاصل کرنے کی اجازت دی جائے۔[68] چیمبر نے آگے چل کر کہا کہ "اگر مضرت رساں پابندیاں ہٹالی جائیں اور برطانیہ کے سرمائے، ہنر اور مہم جوئی کو آزادی دے دی جائے تو ہندوستان کی زرخیز زمین اور وہاں کے لوگوں کی محنت کرنے کی عادتیں اور امن پسند مزاج کی امداد سے وہ سب کچھ حاصل ہو جائے گا جس کی ضرورت ہے۔"[69] ہولٹ میکنزی سے جب سوال کیا گیا کہ وہ کیا خاص فوائد ہیں جو یورپ کے لوگوں کے اس ملک میں بس جانے سے ہندوستانی حکومت کو محاصل میں حاصل ہوں گے تو اس نے جواب دیا کہ "میرا

خیال ہے کہ ہر یورپین جو ہندوستان کے کسی حصہ میں آباد ہوجاتا ہے وہ وہاں کے محاصل میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرے گا کیوں کہ وہ مال کا نفع بخش استعمال کرنے والا ہوگا یعنی وہ وہ مال استعمال کرے گا جس پر ٹیکس لگ سکتا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ وہ ذرائع پیداوار کو بہت ترقی دے گا اور اس طرح ملک کی دولت میں عام طور پر اضافہ کرے گا۔ اس کی مثال بہت سے دیسی باشندوں میں یورپین عادتوں کی نقل کرنے کا جذبہ پیدا کرے گی اور یہ عادتیں دیسی لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ آسائش اور زیادہ خرچ کی ہیں۔ عادتوں کے تبدیل ہونے سے مختلف قسم کے ٹیکسوں اور ملک کی دولت میں اضافہ ہوگا اور اندرونِ ملک استعمال کرنے اور بیرونِ ملک بھیجنے کے لئے مال افراط سے پیدا ہوگا۔ ان اضلاع میں جہاں استمراری بندوبست نہیں ہے زراعت کی ہر ترقی کے معنی حکومت کی مالگذاری میں اضافہ کے ہیں۔ جہاں آب پاشی کا انتظام نہیں ہے وہاں آبپاشی کے بندوبست کرنے سے وہ زمین جو نسبتاً کم پیداوار دیتی رہی ہے بہت زیادہ پیداوار دینے والی بن جائے گی اور چوں کہ وہ بنجر زمین جس پر مالگذاری تشخیص نہیں کی گئی ہے حکومت کی ملکیت ہے اس لئے یا تو فوراً یا مستقبلِ قریب میں ہر حالت میں جہاں زمین زیرِ کاشت لائی جائے گی حکومت کے خزانہ میں اضافہ ہوگا۔ میرا یقین ہے کہ یورپ کے لوگوں سے ربط وضبط قائم کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ شراب اور منشیات کا استعمال کرنے لگیں گے جو بات اگرچہ اخلاق کے نقطۂ نظر سے افسوس کے قابل ہے لیکن حکومت کے محاصل کے لئے نفع بخش ہوگی۔ ان کے نوکر زیادہ اچھے لباس پہنتے ہیں اور چوں کہ لباس کی اشیاء پر ٹیکس عائد ہے اس لئے بھی محاصل میں اضافہ ہوگا۔[75] اس کے علاوہ بھی حکمران حکومت کے باشندوں کو اندرونِ ملک میں آباد کرنے کے بڑے بڑے سیاسی فائدے تھے کیوں کہ اس سے بیرونی حکمرانوں کے خلاف عوام کے متحد ہوجانے میں رکاوٹ پیدا ہوگی اور ان کی طرف سے بغاوت کا کوئی ارادہ فوراً ادھورا کیا جا سکے گا۔

یورپ کے لوگوں کے اندرونِ ملک میں بسنے اور مستقل قیام کرنے پر جو پابندیاں عائد تھیں وہ 1824ء ہی میں دور کی جا چکی تھیں۔ اس کے بعد کے سالوں میں بڑی زبردست کوششیں برطانوی اقوام کے لوگوں اور برطانوی سرمائے کو

ملک کے اندرونی حصوں میں داخل کرنے کی ہمت افزائی کے لئے کی گئیں۔ ان کو زمین یا تو ملکِ مطلق کے طور پر معاف یا ساٹھ سال کے طویل مدت کے پٹے پر کاشت کرنے اور زراعتی صنعت کے استحکام کے لئے دینے کی پیش کش کی گئی۔ اندرونِ ملک کی تجارت پر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے پر جو ٹیکس تھا وہ پہلے ہی ختم کر دیا گیا تھا اور ہندستان کی عام تجارت و صنعت کا دروازہ بیرونی مہم بازوں کے لئے کھول دیا گیا۔

نوآبادیاتی پالیسی کی ناکامی

لیکن ہندوستان کو اس طرح کی نوآبادی نہیں بنایا جا سکتا تھا جس طرح امریکہ، کناڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کو بنا لیا گیا تھا۔ کیوں کہ ہندوستان اچھی طرح آبادی سے معمور تھا اور بہت ترقی یافتہ ملک تھا جب کہ موخر الذکر اس وقت جب وہاں یورپین جاکر بسے محض بڑے بڑے غیر آباد علاقے تھے اور ترقی کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

اس کے علاوہ انگریز، زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی کاشت میں ہندوستان کے کاشت کاروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اپنی جدت پسند طبیعت کے موافق جو فصل انھوں نے کاشت کرنے کے لئے مناسب سمجھی وہ صرف قہوہ اور چائے کی تھی۔ کاشت کے روزگار کے دوسرے دروازے ان پر ملک کی زرعی حالات کی بنا پر بند تھے نیز ہندوستان کی آب و ہوا اس سے بہت زیادہ مختلف تھی جس کا اپنے وطن میں انگریز عادی تھا۔ ہندوستان پر برطانوی قبضہ کے شروع شروع میں ان لوگوں میں جو یہاں آئے شرح اموات بہت اونچی رہی۔ جو لوگ موت سے بچ گئے ان کی صحت بیماریوں اور ہندوستان کی گرمی کے موسم کی سختیوں سے بہت گر گئی۔ بالآخر یورپین لوگ اندرونِ ملک میں تجارت میں جس من چلے پن کی ضرورت تھی اس میں ہندوستانیوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ہندوستان کے لوگ کفایت شعار، محنت کش اور ذہین ہوتے ہیں۔ جوں ہی کوئی غیر ملکی ہندوستان میں ایک صنعت قائم کرتا تھا ہندوستانی پیچھے رہنے والے نہ ہوتے۔ چوں کہ ان کا معیارِ زندگی پست تھا اس لئے وہ اپنی چیزیں یورپین لوگوں کی چیزوں سے کم دام پر بیچ سکتے تھے۔ اس مشکل کا اندازہ منرو نے پہلے ہی کر لیا تھا، جس نے اس پارلیمنٹری کمیٹی کے سامنے جو 1815ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات

پر مقرر کی گئی تھی، بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ" ہندوستان کے لوگ اسی طرح دُکانداروں کی ایک قوم ہیں جس طرح ہم لوگ ہیں۔ وہ اپنی دُکان کو کبھی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ یہ اس کو اپنے تمام معاملات میں قائم رکھتے ہیں خواہ وہ مذہبی ہوں یا سماجی۔ ان کے تمام مقدس مقامات اور یاترا کی جگہیں گویا اتنے سب میلے ان کی ہر طرح کی اشیا کے بیچنے کے لئے ہیں۔ مذہب اور تجارت ہندوستان میں فن کے اِعتبار سے دو بہنیں ہیں۔ کسی بڑے مجمع میں ایک کا وجود دوسرے ساتھی کے بغیر مشکل ہی سے ملے گا۔ دیسی باشندوں کا یہی تجارتی مزاج ہے جس کی بنا پر میں سوچتا ہوں کہ کسی یورپین کا ہندوستان کے اندرونِ ملک حصہ میں زیادہ عرصہ تک ٹھہرنا ناممکن ہو گا اور جلد یا بدیر وہ ساحل تک کھدیڑ دیا جائے گا۔ یورپین تاجر جو ایک مہینہ کے اندر کھانے پینے پر صرف کرتے ہیں وہ ایک ہندو کے سال بھر کے تجارتی منافع کے برابر ہو گا۔ اس لئے ان دونوں کا مقابلہ برابر کی سطح پر نہیں ہے۔ اس کی مثال تو یوں ہے کہ دو آدمی کسی ایک بازار میں خریدنے گئے ایک کو بھاری محصول دینا ہے اور دوسرے کو کچھ نہیں دینا ہے.......... اس لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ (یعنی یورپین) زیادہ عرصہ تک اس نابرابری کی سطح پر مقابلہ کو قائم رکھ سکے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ سرمایہ کی ایک بڑی رقم لگا کر ایک نئی صنعت قائم کر دے یا کسی پرانی صنعت جیسے نیل یا شکر کو ترقی دے دے، ہندو خاموشی سے اس بات کا اِنتظار کرے گا کہ دیکھیں کاروبار میں جو کامیابی ہونی چاہئے وہ ہوتی ہے یا نہیں۔ اگر اس کو معلوم ہوا کہ یہ کامیاب ہوسکتی ہے تو وہ بھی اس کو چلا دے گا اور یورپین کو میدان خالی کرنا پڑے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ یہ طریقہ جو اِختیار کیا جا رہا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ کل یورپین مجبور ہو کر ساحلِ سمندر کا رخ کریں گے اور اس میں بھی مجھ کو کوئی شک نہیں کہ جب ہندو انگلستان کے تاجروں سے براہ راست معاملہ کریں گے تو ان کے بہت سے ایجنٹ جو ساحل پر آباد ہو گئے ہیں انہی وجوہات کی بنیاد پر یعنی ہندوؤں کی بہتر اقتصادی اہلیت اور ذہانت کی بنا پر ہندوستان چھوڑ دینے پر مجبور ہوں گے۔"[71] یہ بات کہ بعد کو جو واقعات پیش آئے وہ بالکل اسی کے مطابق تھے جن کا اندازہ کیا گیا تھا۔ منرو کی اعلیٰ پیش بینی ثابت کرتی ہے ہندوستان کو انگریزوں کی قیام گاہ بنانے میں برطانیہ والے ناکام رہے۔ ان کا

سرمایہ صرف ان صنعتوں میں اور تجارتی کارروائیوں میں بہتا رہا جن سے ہندوستانی، برطانوی افراد کو مخصوص مراعات دیئے جانے کی وجہ سے الگ کر دیئے گئے تھے۔ چائے اور قہوہ کی کاشت، نیل کی پیداوار، جہاز رانی، بیرونی زرِ مبادلہ کے بینک اور انشورنس ہی بیرونی سرمایہ کے اصل مرکز تھے۔ اس نے ادائیگی کے توازن کے مسئلہ کو حل کرنے کے بجائے اور پیچیدہ کر دیا۔ اس نے لامعلوم درآمد کی اس فہرست میں اور اضافہ کر دیا، جس کی قیمت کچے مال اور غذائی اشیاء کے برآمد سے ادا کی جاتی تھی۔

(س) رسل و رسائل کی ترقی

اندرونِ ملک میں رسل و رسائل و حمل و نقل کے ذرائع کی ترقی اور ڈلہوزی کے پلان کی رو سے ریلوے کا ایک جال ہندوستان بھر میں پھیلانا ہندوستان کی اقتصادیات کو انگریزوں کے اغراض کے تابع بنانے کی ان کی تدبیر سے عین مطابق تھا۔ اگر ہندوستان کی تیار کردہ اشیاء کو اندرونِ ملک سے جمع کرنا اور برطانیہ کے تیار شدہ مال کو اندرونِ ملک پہنچانا تھا تو یہ ضروری تھا کہ سستے اور آسان ذرائع عبورِ ملک کے لئے فراہم کئے جائیں۔ برطانوی سرمایہ لگانے کے لئے یہ نفع بخش ذرائع فراہم کرے گا۔ یہ صحیح ہے کہ پوری دلجمعی سے ریلوے کی تعمیر کا کام اسی وقت شروع ہوا جب ملک کا نظم و نسق کمپنی سے نکل کر تاج کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔ لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کی پالیسی نے پہلے ہی اس کی جانب نشان دہی کر دی تھی۔ پالیسی تو وہی رہی لیکن 1857ء کے انتقال کے بعد اس کی رفتار تیز ہو سکی۔

(5) دولت کی مسلسل نکاسی

ہندوستان کی بیرونی تجارت کا رنگ و روپ جس نے ہندوستان اور انگلستان دونوں کی اقتصادیات پر دوررس قسم کے اثرات ڈالے، یہ تھے کہ ہندوستان سے جو زائد مال برآمد کیا جاتا اس کا صلہ نہیں ملتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ پالیسی اختیار کی کہ وہ اس مالگذاری سے جو بنگال سے وہ وصول کرتی ہندوستان کا مال خریدتی۔ ان خریداریوں کا نام "راس المال" رکھا گیا تھا۔ ان کے ذریعہ سے ہندوستان کی

دولت کا اخراج ہو رہا تھا۔ بنگال کے محاصل اور بنگال کے بارے میں ایک بیان[72] کے مطابق کمپنی کے انتظام کے چھ سال کے اندر ملک کے محاصل کی رقم 13066761 پونڈ تھی اور کل اخراجات 9027609 پونڈ تھے۔ اس طرح 4039152 پونڈ جو بچ جاتا تھا وہ اشیا کی شکل میں انگلستان بھیج دیا جاتا تھا۔

لیکن ملک کی آمدنی کا ایک تہائی جو اس طرح بلا معاوضہ باہر نکل جاتا تھا، بنگال کے اقتصادیات کے ذرائع کے مکمل اخراج کو ظاہر نہیں کرتا ہے۔ کمپنی کے ملازمین نے بڑی کثیر بھی دولت بنالی تھی اور اُسے اپنے وطن بھیج دیا تھا۔ ان رقموں کی مقدار کا بھی اس طرح بھیجی گئیں کوئی حساب نہیں بنایا جاسکتا۔ لیکن ہنری ورلسٹ"[73] گورنر بنگال نے 1766 اور 1768ء کے تین سال کے دوران میں برآمد درآمد کے جو اعداد و شمار دیئے ہیں ان سے ان کے حدود کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ان اعداد و شمار کے مطابق ان تینوں سالوں میں درآمد اشیاء کی مجموعی قیمت 624375 پونڈ تھی جب کہ کل برآمد اشیاء کی قیمت 5311250 پونڈ تھی۔ اسی طرح 4686875 پونڈ کا فرق تھا یا سالانہ 1.5 ملین کی اوسط کا فرق رہتا تھا۔ دولت کی اس مسلسل نکاسی کی مقدار سال بہ سال بڑھتی رہی۔ کچھ مدت گذرنے کے بعد ہندوستان کے محبان قوم نے برطانیہ کی حکومت پر حملہ کرنے میں اسے ایک نمایاں پوائنٹ قرار دیا۔

بعد کے سالوں میں دولت کی اس مسلسل نکاسی کے حساب میں اختلاف ہے۔ "ولیم ڈگبی" اس خزانہ کو جو نجی طور پر منتقل ہوا برآمد کی اس بچت میں شامل کر کے جو تجارت کے سرکاری اعداد و شمار میں درج ہیں یہ اندازہ کرتا ہے کہ غالباً پلاسی اور واٹرلو کے درمیان ایک ہزار ملین پونڈ کی رقم ہندوستان کے ذخیروں سے نکل کر انگلستان کے بینکوں میں پہنچ گئی"[74]۔ اس سے 17.2 ملین پونڈ سالانہ کی اوسط ہوتی ہے۔ پروفیسر "فربر" "تجارتی موسموں" کی تجارت کے اعداد و شمار کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہندوستان کی دولت کی مسلسل نکاسی کا اس معنی میں جو اوپر بیان کی گئی وجود تھا لیکن یہ رقم بھاری مقدار تک نہیں پہنچی۔ 1763ء اور 1793ء کے درمیان دولت کی نکاسی ہندوستان سے مغرب کی جانب سالانہ 1.0 ملین پونڈ سے زیادہ نہ شمار کرنی چاہئے"[75]۔ جان اسٹریکی کا خیال ہے کہ پروفیسر فربر حقیقت سے

قریب پہنچ گئے ہیں کیوں کہ وہ تحقیق کرنے والوں میں زمانہ قریب کے ہیں اور امریکی نژاد ہیں جن کی کوئی نیت اعداد و شمار گھٹا کر دکھانے کی نہیں ہو سکتی۔"[76]

صحیح مقدار کے تعین کے لئے ضروری مواد کی عدم موجودگی میں کسی کے لئے یہ بہت بڑی جسارت ہوگی کہ وہ اس بحث میں کہ واقعی کس قدر رقم سالانہ ہندوستان سے انگلستان گئی کسی فریق کی ہمنوائی کرے۔ اگر ڈگبی کا اندازہ مبالغہ آمیز نظر آئے تو یہ قطعی ہے کہ فریر نے جو اندازہ کیا ہے وہ واقعی سے کم ہے کیوں کہ وہ خود یہ تسلیم کرتا ہے کہ جن نتائج پر وہ پہنچا ہے اس میں خامی ہے کہ "پورے برِاعظم یورپ کے درآمد و برآمد کے صحیح صحیح اور مکمل اعداد و شمار پر وہ مبنی نہیں ہیں۔"[77] بہرحال جو کچھ بھی ہو اس بارے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہے کہ برطانیہ کے ہندوستان فتح کرنے کے نتیجہ میں ہندوستان کی بیرونی تجارت کو ہندوستان کے باشندوں کی لوٹ کھسوٹ کے لئے ایک آلہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔

ہندوستان کا خسارہ اور انگلستان کا نفع

ہندوستان سے دولت کی مسلسل نکاسی انگلستان کی صنعتی ترقی میں معاون ثابت ہوئی۔ جو شہادت ملتی ہے اس کی بنا پر اس معاملہ میں کسی شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے کہ انگلستان کا وہ عظیم الشان صنعتی محل جو پلاسی کے بعد بلند ہوتا گیا زیادہ تر ہندوستان کی صنعتوں کی بربادی پر تعمیر ہوا تھا۔ خود انگریز مورخین کے قول کے مطابق انگلستان کے صنعتی انقلاب اور ہندوستان میں برطانیہ کی حکومت کے قیام میں بڑا قریبی رشتہ ہے۔

"یہ بنگال میں برطانوی حکومت کے شروع کے ایام میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے ملازمین کی ہندوستان کی لوٹ ہی تھی جس سے وہ سرمایہ حاصل ہوا جس نے صنعتی انقلاب کی ابتدا میں صنعتی پیداوار کے لئے ضروری جوش پیدا کیا۔"[78] بروک آدم تسلیم کرتا ہے کہ "ہندوستان کے خزانے کے مسلسل آنے سے قوم کے نقدی سرمائے میں جو کثیر اضافہ ہوا اس کی وجہ سے نہ صرف قوم کی توانائی میں ترقی ہوئی بلکہ کام کو حسب ضرورت موافق بنانے اور اس کی رفتار کو زیادہ تیز کرنے میں بھی مدد ملی۔

پلاسی کے بعد بہت جلد بنگال کی لوٹ کا مال لندن پہنچنے لگا اور اس کا فوری نتیجہ برآمد ہوا۔ پلاسی کی لڑائی 1757ء میں لڑی گئی تھی اور جس تیزی سے تبدیلیاں واقع ہوئیں اس کی کوئی اور مثال ملنی مشکل ہے۔ 1760ء میں مشین سے چلنے والا کرگھا آگیا اور دھات کو پگھلانے کا کام لکڑی کی بجائے کوئلہ سے لیا جانے لگا۔ 1764ء میں ہارگریوز نے سوت کاتنے کا متحرک آلہ ایجاد کیا اور 1779ء میں کرامپٹن نے ایک قسم کے کاتنے کی مشین بنائی اور 1785ء میں کارٹ رائٹ نے ایک پاور لوم بنایا اور ان سب سے زیادہ 1768ء میں واٹ نے اسٹیم انجن کو مکمل کر دیا۔ پھر بھی اگرچہ ان مشینوں نے وقت کی تیز رفتاری کے لئے راستے بنائے لیکن انھوں نے اس تیز رفتاری کو پیدا نہیں کیا۔ بذاتِ خود ایجادات غیر متحرک ہوتے ہیں۔ ایسے بہت سے اہم ترین ایجادات صدیوں تک بے کار پڑے اس بات کا اِنتظار کرتے رہے کہ کافی توانائی پیدا ہو کر ان کو حرکت میں لائے۔ قوت کے اس اِجتماع کو ہمیشہ رقوم کی شکل اِختیار کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور ایسی رقم جو جمع کر کے نہ رکھی جائے بلکہ مسلسل حرکت میں رہے ہندوستان کے خزانہ کی مسلسل نکاسی اور اس کے بعد جو قرضہ کا پھیلاؤ آیا ان سے پہلے کوئی ایسی کافی قوت جمع نہ تھی جو حرکت پیدا کر سکتی اور وٹیس صاحب اگر اس سے صرف پچاس برس پہلے ہوتے تو وہ اور ان کے ایجادات ایک ساتھ ہی ختم ہو جاتے۔

غالباً جب سے دنیا شروع ہوئی ہے کسی سرمائے سے اِتنا منافع حاصل نہیں ہوا جو ہندوستان کی لوٹ سے حاصل کیا گیا کیوں کہ پچاس سال تک برطانیہ کا کوئی مدِ مقابل نہ تھا۔[79]

1694ء سے 1757ء تک نشو و نما کی رفتار نسبتاً سست رہی۔ 1760ء سے 1815ء تک رفتار تیز اور مقدار بہت بھاری تھی۔

کنگھم نے انگلستان کے صنعتی اِنقلاب کے وسائل کے بارے میں کوئی واضح بات نہیں کہی لیکن اس وجہ کے بارے میں کہ اِنقلاب 1760ء کے بعد کیوں ہوا اس سے پہلے کیوں نہ آیا وہ بروک "آدم" کی تائید کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "ایجادات اور دریافتیں اکثر اِتفاقیہ ہونے والی معلوم ہوتی ہیں۔ لوگ عام طور پر یہ رجحان رکھتے ہیں کہ نئی مشین کو اٹھارھویں صدی کی اِیجادات کی باکمال ذہانت کا خاص اور ناقابلِ فہم نتیجہ سمجھیں لیکن یہ کہنا

کہ کلارک، رائٹ اور ویلیس اس معاملہ میں خوش قسمت تھے کہ وقت ان کے ساتھ تھا۔ یہ معنی رکھتا ہے کہ ان کی اعلیٰ قابلیت سے انکار کیا جائے۔ ولیم لی اور ڈوڈو ڈوڈلے کے زمانہ سے بہت سے لوگ اپنے ہوئے جو طبع زاد امور پر قادر تھے لیکن زمانہ کے حالات ان کی کامیابی کے لئے ناساز گار تھے۔ کثیر صرف والے اوزاروں کے بروئے کار آنے یا ان کی ان کار روائیوں کے پیدا ہو جانے سے جن میں کثیر سرمایہ لگانے کی ضرورت ہوتی ہے کوئی آدمی خواہ کتنا ہی توانائی رکھتا ہو اس کے لئے ان میں لگ جانے کی کوشش کرنا اس وقت تک قطعی بے کار ہوگا جب تک کہ اس کو کثیر سرمایہ پر قدرت حاصل نہ ہو اور بڑے بڑے بازاروں تک اس کی رسائی نہ ہو۔ اٹھارھویں صدی میں ان حالات کا ادراک روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔"

دوسری جانب بعض حلقوں میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ برآمد کی بچت کو دولت کی نکاسی قرار دینا غلط ہے کیوں کہ ہندوستان جو کچھ ادا کر رہا تھا وہ اس اچھی حکومت اور امن و امان کے دام کے برابر تھا جو برطانیہ نے ہندوستان کو دیا۔ رہا اس سے پہلے کے زمانہ کا معاملہ تو اس پر جان اسٹریچی کی جن کے مورثان ہندوستان میں اعلیٰ عہدوں پر رہ چکے تھے شہادت حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا بنگال کو اس خراج کے بدلہ میں جو اس نے فاتحین کو دیا اچھی حکومت قانون کا راج اور امن نہیں ملا۔ بلا شبہہ ایسا ہوا۔ اور تمام حالات میں اچھی حکومت قانون کا راج اور امن قیمتی چیزیں ہیں لیکن فتح کے تقریباً پندرہ سال تک یہ بات کہ اب بنگال کو اس کے ہمسایے تہ و بالا نہیں کریں گے وہاں کے بدقسمت باشندوں کے لئے کوئی فائدہ مند چیز ثابت نہیں ہوئی کیوں کہ اب زیادہ ظلم او[illegible] کے ساتھ اس کے حکمران اس کو تباہ و برباد کر رہے تھے۔ مرہٹوں کے سی حملے نے ملک کے ایک حصہ کو اس قدر مکمل طور پر تباہ نہیں کیا جس طرح کہ کمپنی اور سب سے زیادہ ان کے ملازمین نے اپنی ذاتی حیثیتوں میں بنگال کے میدان کو چوس کر خشک کر دیا۔ درحقیقت دولت مند بننے کے اندھے جوش میں انھوں نے بنگال کے کاشت کاروں سے اس سے زیادہ وصول کیا جتنا کہ وہ کاشت کاران مہیا بھی کریں اور زندہ بھی رہ سکیں۔ اور کاشت کاران واقعی مر گئے۔"

یہ بات بھی کہ اچھی اور قانون اور امن کی حکومت جو برطانیہ نے قائم کی وہ آخر میں

ملک کے لئے قابلِ قدر ثابت ہوئی بحث کی محتاج ہے کیوں کہ برطانوی فوج کا اور امورِ عامہ کا انتظام زیادہ تر انگلستان کو فائدہ پہنچانے کے لئے استعمال ہوتا تھا کہ ہندوستان کے وسائل کی ترقی اور اس کے باشندوں کو دھنی بنانے کے لئے۔ اس میں ذرا بھی شک نہ ہونا چاہئے کہ ہندوستان کو ان اخراجات کا ذمہ دار قرار دینا ناانصافی تھی۔ اس طرح اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ دولت کی ہندوستان سے نکاسی صنعتی انقلاب کے ابتدائی دور میں انگلستان کی اقتصادی ترقی میں مددگار ہوئی۔[52]

(6) نتیجہ

سر اسٹیمفورڈ ریفلس گورنر جاوا نے ڈچ کمپنی کے بارے میں کہا تھا کہ "ڈچ کمپنی جس کے تمام تر خیالات اور جذبات صرف روپیہ کمانے تک محدود تھے اپنی رعایا پر ویسی ہی نگاہ ڈالتے یا ان کا ایسا ہی خیال کرتے تھے جیسے پہلے مغربی انڈیا کا کاشت کار ڈاکوؤں کے اس گروہ کو دیکھتا تھا جو اس کی جائداد پر آ گئے ہوں۔ اس لئے کہ موخرالذکر نے انسانی جائداد کی قیمت ادا کی ہے جب کہ دوسرے نے نہیں۔ لوگوں سے ان کی انتہائی طاقت بطور ان کے حصے کے استعمال کرنے کے لئے موجودہ تمام مشینریوں کی تمام ظالمانہ طاقتوں کو کام میں لایا ہے۔ یعنی ان کی محنت کا آخری قطرہ۔ اور اس طرح ایک خودسر اور نیم وحشی حکومت کی برائیوں میں اسے سیاست دانوں کی تمام ذہنی جدت پسندیوں اور تجارت کی خود غرضیوں کو اجارہ داری سے بھرپور کر کے اضافہ کیا ہے۔"[53] ہندوستان میں انگلش کمپنی نے انہی طریقوں کو اختیار کیا جو اس کی بہن ڈچ کمپنی نے ایسٹ انڈیز میں اختیار کیا تھا۔[54] اس نے ملک کی تجارت اور صنعت کو برباد کیا۔ اس نے شروع اس طرح کیا کہ ہندوستان کے مال کو یورپ کے بازاروں سے نکالا۔ پھر ہندوستان کے کرگھوں کو توڑ ڈالا اور چرخہ کو ختم کر دیا اور آخر میں اس ملک میں جو سوت کی ماں تھی سوت کا سیلاب لے آیا۔[55] اس نے جولاہوں اور دوسرے کاریگروں کو ستایا اور اپنے رقیب اشیاء بنانے والوں کو کچلنے کے لئے انسانیت سوز مظالم کئے۔ یہ کوئی غیر معروف بات نہیں ہے کہ ایسی مثالیں بھی پیش آئیں کہ کاریگروں کے انگوٹھے اس لئے کاٹ ڈالے گئے تاکہ وہ کچے سلک کا پھانہ بنا سکیں اور باریک نفیس کپڑا نہ تیار کر سکیں۔ ان سب باتوں کے

علاوہ ایک ظالمانہ اور نا انصافی پر مبنی سالانہ خراج برطانیہ والے ہندوستان سے زبردستی لیتے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہندوستان میں کوئی سرمایہ جمع نہیں ہو پاتا تھا اور نہ اس کی زراعت یا صنعت میں کوئی ترقی ہو پاتی تھی۔ وہ ملک جو کبھی اپنی دولت کے لئے تمام دنیا میں شہرت رکھتا تھا اسے گھٹا کر افلاس و بیماری، مصیبت اور فاقہ کشی تک پہنچا دیا گیا۔

ملک کے اِقتصادی زوال کے ساتھ ایک سماجی اِنقلاب بھی آیا۔ گاؤں کا طبقہ جو امداد باہمی کی زندگی گذارتا تھا برباد ہو گیا۔ نئے اِقتصادی رشتے جو مغرب کی اِنفرادی مِلکیت، جدت پسندی، مقابلہ اور بازاروں کے اِقتصادی نظام کے اصول پر مبنی تھے نشوونما پانے لگے۔ مارکس کو اس سماجی اِنقلاب میں اِنسان کے نوشتۂ تقدیر کی تکمیل کے اسباب نظر آئے۔ اس نے لکھا ہے "یہ صحیح ہے کہ انگلستان، ہندوستان میں ایک سماجی اِنقلاب لانے میں اپنے مذموم ترین مفادات کے جذبہ سے معمور ہے اور اس کو عمل میں لانے میں جس طور و طرز کو اِختیار کر رہا ہے وہ احمقانہ ہیں لیکن سوال یہ نہیں ہے کہ کیا بنی نوعِ اِنسان اپنے نوشتۂ تقدیر کو ایشیا کی سماجی زندگی میں بنیادی اِنقلاب لائے بغیر تکمیل تک لے جا سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو انگلستان کے جرائم خواہ کچھ بھی ہوں وہ تاریخ کا غیر شعوری آلہ اس اِنقلاب کے لانے میں ہے۔"[86]

انگلستان میں بھی زرعی اِنقلاب نے محنت کش طبقہ کو زمین سے جدا کر دیا تھا اور بے روزگاری کو بڑھا دیا تھا جس سے بڑی مصیبت اور پریشانی پیدا تھی۔ لیکن صنعتی اِنقلاب جو اس کے بعد جلد ہی آ گیا اس نے تمام بے روزگاروں اور مزدوروں کو نئے سامان بنانے والی صنعتوں میں ضم کر لیا۔ پریشانی کی مدت بہت کم رہی۔ اس کے برخلاف ہندوستان میں مزدور طبقہ صنعتوں سے نکال دیا گیا لیکن کوئی اور اسی طرح کی صنعت نہیں تھی اور نہ زراعت ہی میں اتنی وسعت ہوئی کہ یہ مزدور ان میں سما جاتے۔

ملک کی اِقتصادی ترقی بیرونی لوٹ کھسوٹ کے نظام کا ایک پہیہ بن گئی۔

اس سماجی اِنقلاب سے ہندوستان میں اِنسانوں پر جو مصیبت آئی وہ وہاں سے اس قدر زیادہ تھی کہ اس کا اندازہ ممکن نہیں ہے اور اس سے زیادہ عرصہ تک قائم رہی۔

1857ء تک اِقتصادی اِنقلاب کا پہلا دور مکمل ہو چکا تھا۔ اس درمیان میں نئی طاقتوں نے تعمیرِ جدید کرنے اور نیا نظام قائم کرنے کا کام شروع کر دیا۔ اس سال کے

واقعات نمایاں طور پر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ پرانا عہد ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا اور ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہو رہا ہے۔

حواشی دسواں باب

1۔ اے بریف ڈیڈیکیشن آف دی اورجنل پروگریس اینڈ ایمنس انگریزان ولن مینوفیکچر لندن 1727ء۔ صفحہ 50۔ بحوالہ ٹامس ایف جے مرکنٹائی لزم اینڈ ایسٹ ٹریڈ۔ صفحہ 26۔

2۔ ویکلی ریویو 3 رجنوری 1708ء۔ بحوالہ ٹامس پی۔ جے اوپی سٹ۔ صفحہ 38۔

3۔ ٹامس پی۔ جے اوپی سٹ۔ صفحہ 38۔

4۔ ایضاً۔ صفحہ 47۔

5۔ ایضاً۔ صفحہ 55۔

6۔ غریبوں کی امداد کا کام ضلع کے اندر بکھرے ہوئے کلیسائی حلقوں کے سپرد ہو گیا جہاں ایک گرجا اور ایک پادری ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر گلوسٹر جہاں زمین کی کل سالانہ آمدنی فاقہ کش غریبوں میں تقسیم کر دی گئی۔ دیکھو بالا صفحہ 56۔

7۔ تجار اور محفوظ تجارت کے علمبرداروں میں جو کشمکش اور اس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا جو رویہ ہندوستانی مال کے خلاف قانون بنانے میں ٹال مٹول کا رہا اس کی دلچسپ اور مفصل بحث مذکورہ حوالہ میں دیکھئے۔ صفحہ 117—67۔

8۔ ایضاً۔ صفحہ 115۔

9۔ ایضاً۔

10۔ دیکھئے بال کرشن اوپی سٹ اینڈکس سی (ٹیبل) باب 7 تک۔ صفحہ 9—308۔

11۔ بحوالہ ٹامسن شکس لکچرس آن دی رسورسز آف انڈیا (لندن 1842ء صفحہ 483) اور بال کرشن اوپی سٹ صفحہ 64—263۔

12۔ دیکھئے ٹامس پی۔ جے اوپی سٹ۔ صفحہ 163۔

13۔ بینس ہسٹری آف کاٹن مینوفیکچرس۔ صفحہ 261۔

14- ٹامس پی۔ جے او پی سٹ۔صفحہ 64-163-
15- دیکھئے بال کرشن او پی سٹ۔صفحہ 310-308-
16- سلک کمیٹی رپورٹ 1843ء۔جلد 2۔پارٹ 2۔صفحہ 887-883-
17- ایضاً۔جلد 2۔اینڈکس 5۔صفحہ 607-592-
18- مل جیمس ہسٹری آف برٹش انڈیا (کمنٹی نیوڈ یائی ولسن)۔جلد 7 (لندن 1858ء)
صفحہ 385-
19- ایضاً۔
20- سلک کمیٹی رپورٹ 1833ء۔جلد 2۔مسٹر میکی لاپ کی شہادت۔صفحہ 516
21- آدم اسمتھ دی ویلتھ آف نیشنز (ماڈرن لائبریری ایڈیشن) صفحہ 3-602
22- بولٹس ولیم کان سی ڈریشن آف انڈین افیرس۔صفحہ 191-
23- ایضاً۔صفحہ 193-
24- ایضاً۔
25- ایضاً۔
26- ایضاً۔صفحہ 194-
27- ایضاً۔صفحہ 153-
28- دیکھو دت آر۔پی۔انڈیا ٹوڈے (بمبئی 1947ء) صفحہ 92-
29- ایضاً۔صفحہ 93-
30- لارڈ کارنوالس کی منٹس مورخہ 19 ستمبر 1789ء۔دیکھئے فرنیچر ففتھ رپورٹ۔
جلد 2۔صفحہ 512-
31- آدم اسمتھ او پی سٹ۔صفحہ 600-
32- ایضاً۔صفحہ 601-
33- ایضاً۔ولیم او پی سٹ۔صفحہ 195-
34- ایضاً۔صفحہ 196-
35- مکالے ٹی۔بی۔کرٹیکل اینڈ ہسٹاریکل ایسیز ڈبلس ڈبل والیوم ایڈیشن (1923ء)
36- مارکس کیپٹل (ماسکو ایڈیشن) جلد 1۔صفحہ 753

37- بولٹس ولیم اور پی سٹ - صفحہ 197-
38- ایضاً - صفحہ 197-
39- ایضاً-
40- جنرل لیٹرس ٹو بنگال مورخہ 17 مارچ 1769ء - دیکھئے دت آر - سی - اکونامک ہسٹری آف انڈیا انڈر ارلی برٹش رول - صفحہ 256-
41- نائنتھ رپورٹ آف دی سیلک کمیٹی 1789ء - صفحہ 64-
42- ریز آر دی دی کمرشیل پالیسی آف انگلینڈ ان دی ایٹینتھ سنچوری اکونامک لندن 1925-
43- سر جان میک پھرسن ہندوستان میں برطانوی حکومت کے اس وقت کے سربراہ نے اپنی نجی حیثیت میں ڈچوں کو 1785ء میں پیشکش کی کہ وہ اگر افیون بذریعہ جہاز بٹے ویا لے جائیں تو ان کو ہر سہولت دی جائے گی۔ اس نے صاف صاف یہ دیکھا کہ ڈچ کمپنی کے ہاتھ افیون بیچنے میں انگریزی کمپنی کو منافع ہوگا کیونکہ اس کے دام چین میں ملیں گے نہ کہ بنگال میں۔ ڈچوں کے نمائندے 'ہرک لاٹ' نے کہا کہ وہ بٹیویا کے ڈچ گورنر جنرل کو اس بات کا پابند نہیں کر سکتا کہ وہ انگریز کمپنی کو کثیر رقم چاندی کے سکہ میں ادا کرے اور اس لئے یہ نجی پیش کش منظور نہ ہو سکی۔ میک پھرسن نے اپنی پوری کوشش افیون اور شورہ پر ڈچوں کو زیادہ سے زیادہ الاؤنس بمقدارِ امکان دینے کی کی۔ فرر ہولڈن جان کمپنی ایٹ ورک کیمبرج ہارورڈ یونیورسٹی (1948ء) صفحہ 87-
44- فریر ہولڈن اور پی سٹ - صفحہ 227-
45- ایضاً - صفحہ 302-
46- ایوی ڈنس بفور دی سیلک کمیٹی آن ایسٹ انڈین افیرس 1833ء رپورٹ - جلد 2 - پارٹ 2 - صفحہ 311-
47- ایضاً - صفحہ 511-
48- ایضاً-
49- ایضاً - صفحہ 512-

50۔ بیوچیپ جان برٹش امپیریل ازم ان انڈیا۔ صفحہ 29۔
ہندوستان کی صنعت کے زوال اور سوتی کپڑوں کی صنعت کے مانچسٹر میں عروج نے بعد ہندوستانی سوتی کپڑوں سے مقابلہ کا خطرہ ختم ہوگیا۔ اس لئے دھیرے دھیرے ہندوستانی اشیاء پر محصول کم کردیا گیا۔ 1840ء میں برطانوی مال جو ہندوستان میں درآمد کیا جاتا تھا اس پر پہلے 3 فی صدی ٹیکس تھا جب کہ ہندوستانی سوتی سامانوں جو انگلستان میں درآمد کئے جاتے تھے ان پر محصول 10 فی صدی تھا۔

51۔ ایضاً۔ صفحہ 29۔

52۔ ایضاً۔ صفحہ 30۔

53۔ مکرجی میوریلس آف دی انڈین گورنمنٹ۔ لنڈن 1852ء

54۔ ٹامس سکس لکچرس اوپی سٹ۔

55۔ لیٹرس ٹو ہسکنس 1823ء ری پرنٹڈ ال میوریلس آف انڈین گورنمنٹ اوپی سٹ صفحہ 494۔

56۔ ادائیگیوں میں توازن کی مشکلات کا کچھ اندازہ حسبِ ذیل اعداد و شمار سے ہوسکتا ہے۔

1806ء میں کلکتہ کی بندرگاہ سے 1460000 پونڈ قیمت کے تھان باہر بھیجے گئے اور 1836ء میں جو سوتی تھان باہر بھیجے گئے ان کی قیمت صرف 108000 تھی اور 1805ء میں کچی روئی 400000 پونڈ قیمت کی اور 1835ء میں 487000 پونڈ قیمت کی تھی۔

57۔ سیلکٹ کمیٹی رپورٹ 1883ء جلد 2۔ پارٹ 2۔ صفحہ 516۔

58۔ ایضاً۔ صفحہ 514۔

59 ایضاً۔ صفحہ 515۔

60 ایضاً۔ صفحہ 577۔

61 ایضاً۔ صفحہ 577۔

62 ایضاً۔

63 ایضاً۔ صفحہ 578۔

64- ٹامس جارج، سکس لکچرس آن دی رسورسز آف انڈیا۔ لندن۔ صفحہ 184-
65- ایضاً۔ صفحہ 70-
66- ایضاً سیلکٹ کمیٹی رپورٹ۔ جلد 2- پارٹ 2- صفحہ 578-
67- ایضاً-
68- ایضاً-
69- ایضاً-
70- سیلکٹ کمیٹی رپورٹ (1833ء) جلد 2- پارٹ 1- سوال 89- صفحہ 41-
71- برٹش پارلیمنٹری رپورٹ پیپر، ہاؤس آف کامرس ریٹرنس وغیرہ 13-1812ء-
جلد 7- پارٹ 1- صفحہ 51-150-
میٹٹس آف ایوی ڈنس ...... آف دی افیرس آف دی ایسٹ انڈیا کمپنی۔
ایوڈنس بائی کرنل ٹامس منرو۔
72- فورتھ رپورٹ آف دی ہاؤس آف کامنس 1773ء- دیکھئے بوچامپ
جون کو بھی۔ او پی سٹ۔ صفحہ 25-
73- ہنری ورلسٹ ریویو آف دی رائس وغیرہ آف دی برٹش گورنمنٹ آف انڈیا
فیکٹر ان دی بیمپ او پی سٹ۔ صفحہ 26-
74- ڈگبی ولیم پراس پرس برٹش انڈیا۔ صفحہ 33-
75- فربر جان کمپنی ایٹ ورک (کیمبرج 1948ء)- صفحہ 305-
76- اسٹریچی جان دی اینڈ آف دی اِمپائر۔ صفحہ 63-
77- فربر او پی سٹ۔ صفحہ 305-
78- اِسٹریچی جان او پی سٹ۔ صفحہ 67-
79- بروکس آدمس دی لاز آف سویلیزیشن اینڈ ڈکے۔ صفحہ 60-259-
80- کنگھم ڈبلیو گروتھ آف انگلش انڈسٹری اینڈ کامرس ماڈرن ٹائمس۔ پارٹ 2-
صفحہ 610-
81- اِسٹریچی جان مری لینڈ آف اِمپائر او پی سٹ۔ صفحہ 41-
82- ایضاً۔ صفحہ 60-

83- بحوالہ مارکس دی برٹش رول ان انڈیا۔ دیکھئے مارکس انجلس سیلکٹڈ ورکس فارن لینگویج پبلشنگ ہاؤس ماسکو۔ جلد ا۔ صفحہ 313۔

84- ایضاً۔

85- ایضاً۔ صفحہ 315۔

86 ایضاً۔ صفحہ 317۔

ہماری مطبوعات

جدید سیاسی فکر	سید انوار الحق حقی / ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی	14/25
جدید ہندوستان کے معمار	آئی۔ سی ہاچ، آر / ڈاکٹر قیام الدین احمد	14/-
جغرافیہ کی ماہیت اور اس کا مقصد	ایس۔ ڈبلیو وولرج / انیس احمد صدیقی	19/-
جدید ہندوستان کے سماجی و سیاسی افکار	ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی	47/-
اورنگ زیب کے عہد میں مغل امراء	محمد اطہر علی / امین الدین	28/-
بادشاہ	میکاولی / ڈاکٹر محمود حسین	14/-
برطانیہ کا دستور اور نظام حکومت	محمد محمود فیض آبادی	36/-
تاریخ آصفی	مرزا ابو طالب / ڈاکٹر ثروت علی	10/-
تاریخ اور سماجیات	عائشہ بیگم	10/50
اسلامی تہذیب و تمدن	عماد الحسن آزاد فاروقی	14/-
اسلامی سماج	ریوبن لیوی / ڈاکٹر مشیر الحق	60/-
اکبر سے اورنگ زیب تک	ڈبلو ایچ مورلینڈ / جمال محمد صدیقی	21/50
البیرونی کے جغرافیائی نظریات	ڈاکٹر حسن عسکری کاظمی	11/-
تاریخ فلسفہ سیاسیات	پروفیسر محمد مجیب	18/-
تاریخ ہندی فلسفہ	ایس۔ این داس گپتا	12/50
تحریک آزادی ہند	ظہور محمد خاں	2/25
تحریک خلافت	قاضی محمد عدیل عباسی	65/-
قدیم ہندوستان میں شودر	ڈاکٹر رام سرن شرما / جمال الدین محمد صدیقی	14/50
مہاتما گاندھی	بی۔ آر۔ نندا / علی جواد زیدی	60/-
مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال	ڈاکٹر ریاض احمد خاں شیروانی	37/-
مغل دربار کی گروہ بندیاں اور ان کی سیاست	ڈاکٹر ستیش چندر /	22/-
(دوسری طباعت)	ڈاکٹر قاسم صدیقی	

فسانۂ آزاد (جلد سوم، حصۂ اوّل)	رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی	67/50
فسانۂ آزاد (جلد سوم، حصہ دوم)	رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی	67/50
فسانۂ آزاد (جلد چہارم، حصۂ اوّل)	رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی	50/-
فسانۂ آزاد (جلد چہارم، حصۂ دوم)	رتن ناتھ سرشار / امیر حسن نورانی	50/-
فکر و تحقیق (۱) جنوری تا جون 1989	قومی اردو کونسل	15/-
فکر و تحقیق (۲) جولائی تا دسمبر 1989	قومی اردو کونسل	15/-
فکر و تحقیق (۳) جنوری تا جون 1990	قومی اردو کونسل	15/-
فکر و تحقیق (۴) جولائی تا دسمبر 1990	قومی اردو کونسل	15/-
فکر و تحقیق (۵) جنوری تا جون 1992	قومی اردو کونسل	20/-
فکر و تحقیق (۶) جولائی تا دسمبر 1992	قومی اردو کونسل	20/-
فکر و تحقیق (۷) جنوری تا جون 1997	قومی اردو کونسل	30/-
فکر و تحقیق (۸) جولائی تا دسمبر 1997	قومی اردو کونسل	30/-
آہنگ و عروض	ڈاکٹر کمال احمد صدیقی	18/-
املا نامہ	مرتب: پروفیسر گوپی چند نارنگ	9/-
اردو تصویری لغت	شیاملا کماری / ڈاکٹر علی وقار قیصی	30/-
اردو صرف و نحو	ڈاکٹر اقتدار حسین خاں	16/-
اردو افعال	سونیا چرنیکوا	24/-
اردو املا (دوسری طباعت)	رشید حسن خاں	زیر طبع
اردو انسائیکلوپیڈیا (حصۂ اوّل)	پروفیسر فضل الرحمٰن	300/-
اردو انسائیکلوپیڈیا (حصۂ دوم)	پروفیسر فضل الرحمٰن	450/-
اردو انسائیکلوپیڈیا (حصۂ سوم)	پروفیسر فضل الرحمٰن	450/-
اسکول لائبریری	سید حسین رضا رضوی	20/-

ایلس آئینہ گھر میں	لیوئیس کیرل/ڈاکٹر عبدالحی	12/-
بابر نامہ	ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی	12/-
باتیں کرنے والا غار	دولت ڈوگائی/اے کے لوتگیا	3/50
باپو اور بچے	پی۔ ڈی۔ ٹنڈن/تاجور سامری	2/25
بچوں کے حالی	صالحہ عابد حسین	3/75
بچوں کے ڈرامے	اظہر افسر	10/50
بچوں کی مسکان	سیدہ فرحت	3/75
بچوں کی نظمیں	جگن ناتھ آزاد	5/-
بچوں کے نہرو	ایم چیلاپتی راؤ/پریم نارائن	7/50
بکری دو گاؤں کھا گئی	م۔ ندیم	9/-
بگلا اور کیکڑا	الکا شنکر	7/-
بوڑھیا اور کوا	شنکر	7/50
بے زبان ساتھی	وکیل نجیب	10/-
بیربل کی شوخیاں	ثریا جبیں	8/-
بے زبانوں کی دنیا	حیدر بیابانی	18/-
بینک کی کہانی	غلام حیدر	4/50
چراغ کا سفر	سید محمد ٹونکی	1/50
چڑیا اور راجہ	مدھو ٹنڈن/راتل ویاس	7/-
چڑیاں	سلطان آصف	3/-
چلو چاند پر چلیں	جے پرکاش بھارتی/ڈاکٹر محمد یعقوب عامر	5/-
چندا ماما کے گاؤں میں	قاضی مشتاق احمد	5/-

وفادار نیولا	شنکر	7/-
ہری اور دوسرے ہاتھی	شنکر / پریم نارائن	6/-
ہمارا سنیما	پریمپال اشک	10/-
ہمارا قومی گیت	سید محمد ابراہیم فکری	10/-
ہماری لوک کہانیاں	پریمپال اشک	18/-
ہمارے ٹیگور	صفدر حسین	8/50
ہمارے جانباز	پریمپال اشک	13/-
ہمالیہ کے بنجارے	شیام سنگھ ششی	6/50
ہندوستان کی آبادی	محمد ابوذر	8/75
ہندوستان کی بزرگ ہستیاں (حصہ اوّل)	صفدر حسین	15/-
جامع انگریزی اردو لغت (حصہ اوّل)	کلیم الدین احمد	400/-
جامع انگریزی اردو لغت (حصہ دوم)	کلیم الدین احمد	600/-
جامع انگریزی اردو لغت (حصہ سوم)	کلیم الدین احمد	600/-
جامع انگریزی اردو لغت (حصہ چہارم)	کلیم الدین احمد	600/-
جامع انگریزی اردو لغت (حصہ پنجم)	کلیم الدین احمد	600/-
جامع انگریزی اردو لغت (حصہ ششم)	کلیم الدین احمد	600/-
توضیحی لسانیات	ایچ، اے، گلیسن / عتیق احمد صدیقی	23/-
چندر دیو	ایم نثار / کشور سلطان	3/-
حاتم طائی کا قصہ	مرتب: ڈاکٹر نورالحسن نقوی	13/-
حالی	صالحہ عابد حسین	4/-
حرف حرف نظم	وقار خلیل	5/-